

ترجمہ قرآن کے اُصول و ضوابط کے حوالہ سے
حضرت شیخ المشائخ قبلہ پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی لازوال تحریر

أُصُولُ التَّرْجُمَةِ

تصنیف
شیخ المشائخ پیر طریقت رہبر شریعت
شیخ الحدیث و التفسیر مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ



دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ
بیرون یکوہ تپشاور شہر
091-2560759

مکتبہ دارالعلوم

أُصُولُ تَرْجَمَه

حضور قبلہ پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، کی تراجم کے اُصول کے حوالہ سے ایک لازوال تحریر

أُصُولُ تَرْجَمَه

از

شیخ المشائخ، پیر طریقت رہبر شریعت شیخ الحدیث والنفیس

مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ادارہ غوثیہ معینیہ پشاور پاکستان

ناشر

مکتبہ آواز حق دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت پشاور شہر

0316-9567661

[Click For More Books](#)

For More Books Madni Library Group Whatsapp +923139319528

﴿جملہ حقوق بحق مکتبہ آوازِ حق محفوظ ہیں﴾

نام کتاب	: اصول ترجمہ
مصنف	: شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
کمپوزر	: عاطف شہزاد چشتی
نظر ثانی	: اُستادِ حدیث سید ظاہر علی شاہ، پروفیسر آلِ اظہر صاحب
ناشر	: مکتبہ آوازِ حق دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت پشاور شہر
تعداد	: 1100
سال اشاعت	: جنوری، 2017ء
قیمت	: 530 روپے

نوٹ:- مجاز فرد جگر گوشہ شیخ المشائخ صاحبزادہ مولانا ڈاکٹر صدیق علی چشتی، مہتمم جامعہ غوثیہ معینیہ، کی تحریری اجازت کے بغیر کسی فرد یا ادارے کو بھی حضرت شیخ المشائخ پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کوئی بھی کتاب چھاپنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ بصورتِ خلاف ورزی سخت قانونی کارروائی کی جائے گی۔

حضور شیخ المشائخ حضرت مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام کتب سے حاصل ہونے والی آمدنی اور رائیٹی ادارہ ”آوازِ حق پشاور“ کے لیے وقف ہے۔

التماس

حضرت قبلہ شیخ المشائخ پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ تحریر ”أصول ترجمہ“ دراصل اُن کی زیر سرپرستی شائع ہونے والے جریدہ ماہنامہ آوازِ حق میں ماہ بہ ماہ قسط وار شائع ہوتی رہی۔ حضرت شیخ المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی حیات میں ہی اسے کتابی شکل میں ترتیب دے کر نظر ثانی کر لی تھی مگر زندگی نے وفانہ کی۔

اس کتاب کی تدوین و اشاعت میں قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کے حوالہ جات میں ہر ممکن احتیاط برتی گئی ہے تاہم ادارہ کسی بھی نادانستہ غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے اور اس کی نشان دہی کے لیے قارئین کا ممنون ہوگا۔

اس کتاب کے مضمون اور بیان کردہ حقائق کے حوالہ سے ہم اپنے معزز قارئین کی آراء، تجاویز اور مثبت تنقید کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

اس کتاب کے حوالہ سے قارئین کے ذہن میں کوئی اشتباہ ہو تو اس کو دور کرنے کے لیے بھی ادارہ اس سے رابطہ کیا جاسکتا ہے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اُس کا ازالہ کیا جاسکے۔

منجانب:-

صاحبزادہ ڈاکٹر مولانا صدیق علی چشتی

﴿کتاب ملنہ کہ پتہ﴾

- ☆ المکتبۃ النظامیۃ جامع مسجد ابوالیوب انصاری گھنٹہ گھر پشاور۔ 0335-8317496
- ☆ نظامیہ کتاب گھر۔ زبیدہ سنٹر ۴۰ اردو بازار لاہور 0301-4377868
- ☆ دارالنور دکان نمبر ۴ مرکز الاولیٰ دربار مارکیٹ لاہور 04237247702
- ☆ مکتبہ غوثیہ۔ یونیورسٹی روڈ، بالمقابل عسکری پارک کراچی 021-34926110
- ☆ مکتبہ اعلیٰ حضرت دربار مارکیٹ لاہور 04237247301
- ☆ مکتبہ المصطفیٰ چکدرہ 0343-9070902
- ☆ شبیر بردار زبیدہ سنٹر ۴۰، اردو بازار لاہور 042-37246006
- ☆ مکتبہ امام احمد رضا کری روڈ راولپنڈی 0514907446
- ☆ اہل السنہ پبلی کیشنز دینہ جہلم 03335833360

انشاء اللہ عزوجل

مدنی مقصد: مجھے اپنی اور ساری دنیا کے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرنی ہے۔

M. Shahid Raza Attari

0306-0313-7919528

مدنی اسلامی بکس، قرآن

مدنی عطر ہاؤس

امپورٹڈ عطریات، قرآن پاک، اسلامی بکس، تسبیحات، ٹوپی، عمامے
موزے، مسواک، گلوز، میلاد پرچم، بینرز، گاہول سیل پوائنٹ

Shop # 2-3 Ground Floor, Waqas Plaza, Amin Pur Bazar, Faisalabad.
Ph: 041-2621568 E-mail: muhammadshahidattari@yahoo.com

Click For More Books

دوران مطالعہ ضرور ناظر لائن کیجئے، اشارات لکھ کر صفحہ نمبر نوٹ فرمالیجئے۔

[illegible]

For More Books Madni Library Group Whatsapp +923139319528

[illegible]

Islami Books Quran & Madni Ittar House Ameen Pur Bazar Faisalabad

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ	11
2	حالاتِ مصنف بقلم مصنف	15
3	مذہبی تعلیم میں آنے کے غیبی اسباب	18
4	ابتدائیہ	29
5	محركات ثلاثہ	47
6	پہلا باب	65
7	ترجمہ اور مستقل فن	68
8	مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کی تعریف	68
9	فنِ ترجمہ سے غرض و غایت	68
10	فنِ ترجمہ کا موضوع	69
11	ایک مغالطہ کا ازالہ	70
12	ترجمہ کی تعریف کا تجزیہ	75
13	ترجمہ کی تعریف کا ایک کمال	78
14	ترجمہ کی مذکورہ تعریف کا ایک اور کمال	80
15	ترجمہ کی مذکورہ تعریف کے فوائد	83
16	ایک مغالطہ کا ازالہ	87
17	ایک مغالطہ کا ازالہ	95

101	ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام کا فرق	18
102	ترجمۃ الالفاظ کی دو قسموں کی تفریق	19
106	ترجمہ کی عمومی شرائط	20
118	اعترافِ حقیقت	21
146	ایک ضروری وضاحت	22
149	عمومی شرائط کے مدارج	23
151	شرائط کی اہمیت اور مقامِ عبرت	24
168	دوسرا باب	25
169	ترجمۃ القرآن کی تعریف	26
177	ترجمۃ القرآن کی تعریف کا تجزیہ	27
182	ایک اشتباہ کا ازالہ	28
186	ایک متوقع اشتباہ کا ازالہ	29
187	ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ	30
191	آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم اول اور مفہوم ثانی	31
193	مفہوماتِ قرآنیہ کی ایک اہم تقسیم	32
194	ترجمۃ القرآن کی تعریف کا ایک اور مقتضاء	33
196	ترجمۃ الالفاظ کی دو قسموں کی تفریق	34
200	بامحاورہ اور بے محاورہ ترجمہ کی قسمیں	35

204	ترجمۃ القرآن کا موضوع	36
205	بے مقصد اور غیر معیاری ترجمہ کی تین قسمیں	37
207	تراجم کی دنیا میں سب سے بڑا ظلم	38
216	نادان دوست کا کردار	39
223	دوسری بحث	40
245	حاصل الکلام فی تعریف الترجمة	41
249	التوضیح المزیذ ودفع المظنہ	42
256	درء الشبهات	43
267	خلاصۃ البحث فی الباب	44
277	تیسری بحث	45
283	چند ناگزیر حقائق سے آگاہی	46
289	چند حقائق بطور نتیجہ	47
294	طبقہ جامع الشرائط	48
296	علماء حق کو مشورہ	49
299	ایک بے مقصد بحث کی نشان دہی	50
308	نہایت قابل توجہ المیہ	51
313	ایک کثیر الورود اشتباہ کا ازالہ	52
316	غیر معیاری تراجم کا ایک اور فساد	53

323	چوتھی بحث	54
326	مخصوص شرائط کی تفصیل اور فلسفہ	55
336	ایک اشتباہ کا ازالہ	56
343	ایک اشتباہ کا ازالہ	57
359	ایک اشتباہ کا ازالہ	58
361	مخصوص شرائط کا اجمال	59
368	حقیقت کا اظہار	60
388	مخصوص شرائط کی تفصیل	61
395	افسوس بالائے افسوس	62
400	ایک ضروری وضاحت	63
403	متوقع اشتباہ کا ازالہ	64
409	پانچویں بحث	65
409	پہلا زاویہ	66
422	ترجمۃ القرآن کا دوسرا زاویہ	67
427	قرآن شریف سے منسوب ہر صفت واجب التعظیم ہے	68
436	ایک اشتباہ کا ازالہ	69
438	کچھ تحسین اور کچھ شکوہ	70
442	طویل تجربہ کا خلاصہ	71

پیش لفظ

اہل علم پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کا حق ادا کرنا نہایت مشکل اور پیچیدہ کام ہے متعلقہ زبانوں کے روزمرہ ومحاورات، گرائمر، تشبیہات اور استعارات سے واقفیت رکھنے کے علاوہ ان زبانوں کے مزاج کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ جس کے بغیر ترجمہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کا ترجمہ کرنا کلام الہی ہونے کے اعتبار سے اور بھی احتیاط کا متقاضی ہے۔ اردو زبان قرآن کے تراجم کے حوالہ سے دو سو سال کی شاندار تاریخ رکھتی ہے جس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء و مشاہیر نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اور وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔

قرآن مجید کے ان تراجم میں کئی ایسی خصوصیات ملتی ہیں جو کہ مختلف مترجمین کے اپنے آپس مناج کے یکسانیت کو ظاہر کرتی ہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ بہت سارے ایسے پہلو بھی ہیں جن میں اردو کے یہ تراجم ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد جہات لئے ہوئے ہیں۔ اس حوالہ سے قرآن مجید کے بہت سارے مقامات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ برصغیر میں قرآن مجید کی اردو زبان میں ترجمہ کے حوالہ سے اسکی دو سو سالہ تاریخ میں آج تک جتنے بھی تراجم ہوئے ہیں ان کی اکثریت ترجمہ کے حوالہ سے مختلف لسانی کمزوریوں کا شکار رہی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف مسلمان قارئین مختلف لسانی و اعتقادی مغالطات میں پڑتے ہیں بلکہ ان غیر معیاری تراجم کی وجہ سے غیر مسلموں کو بھی سوالات اٹھانے کے مواقع ملتے ہیں۔ قرآن شریف کے ترجمہ کی اہمیت نہ

پیش لفظ

صرف اس وجہ سے ہے کہ اسلامی معاشرہ میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں، پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں اور کلام اللہ کا ترجمہ ہونے کی حیثیت سے اس سے استفادہ کرتے ہیں، تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کلام اللہ کا ترجمہ کہہ کر اس پر اعتماد کرتے ہیں بلکہ غیر مسلموں کا وہ طبقہ جو قرآن شریف سے روشنی لینے کی خواہش رکھتا ہے اور اس مقصد کیلئے لسانی مجبوری کی وجہ سے صرف ترجمہ پر اکتفا کرتا ہے۔ نیز وہ طبقہ جو قرآن شریف کا اپنی دسترس زبان میں کیے ہوئے ہر ترجمہ کو ”معنوی قرآن“ کہہ کر اس کی غلطیوں کو قرآن شریف کی طرف منسوب کرتا ہے اور قرآن شریف کو غیر فطری کتاب کہنے جیسے اعتراضات اٹھاتا ہے، بالخصوص مستشرقین یورپ اور امریکہ کی ایسے مواقع پر خاص نظر ہوتی ہے۔

قرآن شریف کا ترجمہ سب سے مشکل اور سب سے اہم ترین عبادت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ جس زبان میں بھی کیا گیا ہو وہ اُس زبان میں ”معنوی قرآن“ کہلاتا ہے اور بعض احکام کے حوالہ سے یہ بھی لفظی قرآن جیسا ہوتا ہے۔ انجام کار جن قارئین کو قرآن شریف کے معیاری اور غیر معیاری تراجم کی تمیز نہیں ہوتی وہ غیر معیاری اور غلط ترجمہ کو بھی معنوی قرآن سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں جس سے کئی اور غلطیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں جس وجہ سے قرآن شریف کے غیر معیاری ترجمہ کو اگر الہیات کے حوالہ سے اُمّ الاغلاط کہا جائے تو بے مصرف نہ ہوگا۔ اس عظیم علمی دینی کوتاہی یعنی غیر معیاری تراجم کی اصل وجہ قرآن کریم کے ترجمہ کی فطری شرائط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب ”اصول ترجمہ“ پاکستان کے معروف عالم دین حضرت شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی نور اللہ مرقدہ کی ایسی تصنیف ہے جس میں انہوں نے ترجمہ قرآن کے حوالہ سے نہ صرف مترجم کیلئے لازمی اصول و شرائط بیان کئے ہیں بلکہ موجودہ اردو تراجم میں موجود خطرناک

پیش لفظ

علمی و اعتقادی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب کے عمیق مطالعہ سے نہ صرف فن ترجمہ کے ضروری قواعد سے شناسائی حاصل ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے آخری الہامی کتاب قرآن مجید کے نص کو سمجھنے کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ”اصول ترجمہ“ میں اس بات کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف اردو تراجم قرآن کو کن کن مشکلات اور علمی کمزوریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ حضور شیخ المشائخ رحمہ اللہ نے اس تصنیف میں وضاحت کی ہے کہ قرآن مجید کا معیاری ترجمہ کیسا ہو جو کہ نہ صرف ترجمہ کے حوالہ سے مختلف ضروریات و تقاضوں کو پورا کرتا ہو بلکہ علمی و اعتقادی مسائل کو بھی مد نظر رکھتا ہو۔

بد قسمتی سے ترجمہ قرآن کے اصول و ضوابط کے حوالہ سے مارکیٹ میں کوئی بھی معیاری کتاب دستیاب نہیں ہے جس میں اس موضوع کے مختلف جہات و جوانب کو جامع انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ اس حوالہ سے زیر نظر کتاب قرآن فہمی اور تراجم قرآن کے حوالہ سے علمی حلقوں میں ایک بے نظیر و بی مثال اضافہ ہوگا جو قرآنی علوم بالخصوص ترجمہ قرآن کے جملہ شائقین کی راہنمائی کے لئے کافی ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

قرآنی علوم کے شائقین کے لئے بالعلوم اور حضرت شیخ المشائخ قبلہ پیر محمد چشتی رحمہ اللہ کی تحریرات اور علمی جواہر پاروں سے شغف رکھنے والے قارئین کے لئے بالخصوص یہاں ایک اہم بات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ زیر نظر کتاب ”اصول ترجمہ“ اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ ترجمہ قرآن کے حوالہ سے اس کتاب میں بیان کیے گئے اصول و ضوابط کو پہلی بار واضح مثالوں کے ذریعہ ایسی شرح و بسط کے ساتھ قارئین تک پہنچایا جا رہا ہے جس سے ایک طرف عام مسلمان جو قرآن فہمی کا جو یاں ہے، کو علمی فائدہ ہوگا تو دوسری طرف علم دین سے وابستہ علماء کرام کو بھی ترجمہ قرآن کے حوالہ سے اپنے منہج کو صحیح سمت میں ڈھالنے اور غلطیوں

پیش لفظ

سے بچنے کے راہنما اصول میسر آئیں گے۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”اصول ترجمہ“ کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد جہاں قرآن فہمی کی نئی جہتیں کھلتی ہیں وہاں قرآنی نص سے دیگر علوم و فنون مثلاً علم کلام، علم نحو، بلاغت، معقولات سمیت علم تصوف اور سلوک و عرفان کے عملی تطبیقات سے بھی (پڑھنے والے کی ذاتی استعداد کے مطابق) شناسائی حاصل ہوتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ قرآن فہمی کے حوالہ سے حضرت قبلہ شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی نور اللہ مرقدہ الشریف کے ہاتھ کی تحریر کردہ ”اصول ترجمہ“ اور ”تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن، ۳ جلدیں“ کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کے ترجمہ میں غلطی سے بچاؤ ممکن ہوگا بلکہ قرآن کریم کے ظاہری و پوشیدہ اسرار و معارف سے بھی تعارف و آگہی حاصل ہونے کا بہترین ذریعہ میسر ہوگا۔

مولانا صدیق علی چشتی،

جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت، پشاور شہر،

استاذ شعبہ تقابل ادیان، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

حالات مصنف بقلم مصنف

نوٹ: زیر نظر مضمون حضرت شیخ الشارح قبلہ پیر محمد چشتی صاحب نے اپنی حیات میں ہی آج سے قریب پانچ (۵) سال قبل سپرد قلم کیا تھا۔ لہذا قارئین سے گزارش ہے کہ اس مضمون کو اسی تناظر میں دیکھا اور پڑھا جائے۔

آج 2010ء سے تقریباً 73 سال قبل شاگردوم میں پیدا ہوا۔ شاگردوم نام کا یہ وسیع و عریض گاؤں درہ تریچ کی آخری آبادی ہے ضلع چترال تحصیل ملکھو کا یہ درہ میری پیدائش سے پہلے بھی مردم خیزی میں مشہور تھا جس میں نوابی دور کے علم دشمن ماحول میں بھی محمد جناب شاہ اور قاضی بدر الدین خواجہ جیسی ہستیاں بالترتیب عصری اور مذہبی علوم کی روشنی پھیلا رہی تھیں۔ نوابوں کے تعلیم دشمن ماحول سے آزادی اور ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو جانے کے بعد بھی چترال کے اس درہ سے اچھے خاصے اہل علم پیدا ہوئے میری پیدائش ریاستی دور کے جس ماحول میں ہوئی وہ کچھ اس طرح تھا کہ نوابوں کے بچوں کیلئے ابتدائی تعلیم کا انتظام مقامی طور پر میسر تھا جبکہ قرآن شریف ناظرہ پڑھنے اور نماز و روزہ جیسے ضروری احکام سے روشناس ہونے کے ساتھ مڈل تک دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے پشاور، دہلی، لاہور اور انگلینڈ کا رخ کیا کرتے تھے جبکہ رعایا کے بچوں کی تعلیم کا قطعاً کوئی انتظام ہی نہیں تھا مگر یہ کہ نوابوں کے کارندوں سے چھپ کر ریاست کی حدود سے نکلنے میں کامیاب ہوتا تو سفر و غربت اور بے وطنی کی صعوبتیں برداشت کر کے مذہبی یا عصری تعلیم کی کچھ روشنی پاتا جن کی تعداد اکائیوں سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

فقدانِ تعلیم کی اس بد حالی کے ساتھ معاشی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ نوابوں کی گزر اوقات رعایا سے ظلم و وصول کیے جانے والے غلبتائے عشر پر ہوا کرتی تھی تو عام آدمیوں کی معیشت کا کہنا ہی کیا تھا درہ تریچ میں سب سے زیادہ قطعہ اراضی کے مالک ہونے کے باوجود ہمارے

خاندان میں بھی عمومی خوراک جو کی روٹی یا باجرہ کی روٹی ہوا کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہمارے خاندان پر رب کریم جَلَّ جَلَالُہٗ وَعَمَّ نَوَالُہٗ کا خاص کرم یہ تھا کہ ہرن کے گوشت سے ہمارا گھر کبھی خالی نہ ہوتا تھا، میرے دادا جان (نام رحیم ولد عبدالکریم) جو اپنے وقت کے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ وفاداری، امانتداری، سخاوت، شجاعت اور صدقِ لہجہ میں مشہور تھے جن کی وفا شعاری کو دیکھ کر مہتر چترال نواب محمد ناصر الملک رَحْمَةُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے انہیں امین دربار کے عہدے پر فائز کیا تھا جسکی بدولت اُنکے بیٹوں کو شاگردوں سے ملحق بالائی شکار گاہوں کی اختیارداری اور ہر جگہ سے شکاری اجازت تھی۔ میرے تایا شہزادہ رحیم (مرحوم) سرکاری شکاری ہونے کی بنا پر پورے چترال میں شکاری کے نام سے ہی مشہور تھے میرے (مرحوم) والد اُن سے عمر میں تقریباً تین سال چھوٹے تھے، گھریلو ذمہ داریوں سے زمینوں کی دیکھ بھال تک جملہ انتظامات کے نگران تھے جبکہ میرے چچا امام رحیم (مرحوم) اُن کے نائب و معاون تھے۔ میرے والد محمد رحیم ولد نام رحیم ہرن کے شکار سے لے کر ہر موسم کے پرندوں تک کا شکار کرنے میں پورے درہ تریچ میں اپنی مثال آپ تھے۔ شانِ قدرت ہے کہ شکار کر کے کھانے اور کھلانے والے اس عظیم شکاری کو اس حوالہ سے وہ شہرت نہیں ملی جو اُن کے بڑے بھائی شہزادہ رحیم کو ملی۔

علاقائی ماحول اور خاندانی روایات کا شعور پانے کے بعد میں بھی اُس راہ پر چلنے لگا جس پر چلتے ہوئے اپنے بڑوں کو دیکھا تھا لیکن شکار کے حوالہ سے میرے اور میرے بڑے بھائی جان مولانا شیر محمد مدظلہ العالی کا معاملہ اپنے بزرگوں سے مختلف رہا کیوں کہ ہمارے والد مرحوم و مغفور نَوْرُ اللہ مَرْقَدُہُ الشَّرِیْفِ اپنے بڑے بھائی سے کئی گنا زیادہ فعال اور ہر موسم کے شکار کا بہترین شکاری ہونے کے باوجود اپنے بڑے بھائی جیسی شہرت اس حوالہ سے نہ پاسکے جبکہ میرے بڑے بھائی میرے مقابلہ میں کئی گنا اچھا شکاری ہوتے ہوئے بھی اس حوالہ سے میری شہرت کو نہ پہنچ پائے حالانکہ وہ ہر موسم کے اچھے شکاری تھے چھوٹے پرندوں کے شکار کے حوالہ سے میری فنکاری کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی درخت کے نیچے بیٹھ کر گھنٹہ سے دو گھنٹے کے دوران میں پچاس

حالات مصنف بقلم مصنف

ساتھ کی تعداد میں پرندے مار گراتا تھا مجھے مواد پہنچانے اور ذبح کرنے پر مقرر لڑکوں کا کہنا ہے کہ روزانہ کی یہ تعداد دو سو سے بھی زیادہ ہوا کرتی تھی۔ صحیح تعداد کے متعلق حتمی صورت مجھے یاد نہیں ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ)

یہاں پر شاید قارئین کو اُن پرندوں سے متعلق تعجب ہو کہ اس کثرت سے آنے والے وہ کیسے پرندے ہونگے اور وہ شکار گاہ کیسی ہوگی؟ تو اس کے متعلق یہ ہے کہ اُن دنوں میں یعنی آج سے تقریباً نصف صدی قبل ہر قسم شکار کی بہتات ہونے کی طرح گندم اور باجرہ کی فصل جب پکنے کے قریب ہوتی تھی تو اُسے کھانے کے لیے پرندوں کی یہ نسل کثیر تعداد میں آیا کرتی تھی۔ جس کو کھوار زبان میں شوچ کہا جاتا ہے جو جسامت میں اندازاً تین چڑیوں کے برابر ہوتا ہے اور رنگت کے اعتبار سے اُن کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک خاکستری سفید، دوسری وہ جس کا سر اور گردن سمیت سینے کا بالائی حصہ سرخ باقی سارا حصہ خاکستری جو خوبصورتی و دلکشی میں اپنی مثال آپ ہے اور گوشت اُس کا بہت لذیذ ہوتا ہے۔ درہ تریچ سمیت چترال کے بالائی حصہ کی تینوں تحصیلوں میں اُس کی کثرت کیساتھ آمد کا موسم ماہ ستمبر ہوا کرتا تھا لیکن دُنیا کی ارتقائی زندگی کے دوسرے شعبوں میں نمایاں تبدیلیاں آنے کی طرح ہر موسم کے شکار میں بھی کافی حد تک تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ کیمیائی کھاد کی وجہ سے گندم کی پیداوار زیادہ ہونے کی بناء پر باجرہ کی کاشت ہی ہمارے علاقہ سے ناپید ہو چکی ہے یہ باجرہ بھی خاص نسل کا ہوتا تھا جس کو کھوار زبان میں اڑین کہا جاتا تھا جو آج سے نصف صدی قبل ہماری عمومی خوراک ہوا کرتا تھا اور گندم کی فصل ستمبر میں پکنے کے بجائے ترقی کر کے اگست کے اوائل میں ہی تیار ہوتی ہے جس وجہ سے شوچ کی اُس کثرت سے آمد ہی نہ اُس کے شکار کا رواج۔ اگر کوئی اِکا دُکا دانہ اڑتا ہوا نظر آتا ہے اُسے ماضی کی یادگار تصور کیا جاتا ہے۔ جس درخت کو میں نے شکار گاہ بنایا ہوا تھا وہ شملک کی درمیانہ سائز کی لمبائی والا درخت تھا جس کی لمبائی اندازاً ۱۵ سے ۲۰ فٹ تک ہوگی جس کے نیچے اندازاً آٹھ کنال میں پھیلی ہوئی گندم کی فصل اور بعض سالوں میں اڑین کی فصل ہوا کرتی تھی۔ وہ دلکش و حسین منظر میرے

لئے بھولنے کی چیز نہیں ہے جب لیبرک و اشپوز و سِرک شوچ کاروم (سیل) آکر اوپر سے درخت کو ڈھانپتا تھا اور نیچے سے میں شونجور سے انہیں مار گرایا کرتا تھا۔ الغرض اُس وقت کے شکار کے حوالہ سے اپنے ماضی کے کن کن حسین جھروکوں کا تصور نہیں کرتا بلکہ ایک ایک کے تصور پر کلام اقبال بے ساختہ زبان پر آتا ہے کہ ع

یاد آتا ہے مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

مذہبی تعلیم میں آنے کے غیبی اسباب:- برادری کی بزرگ ہستی صوفی گل محمد مرحوم کے پاس دوسرے لڑکوں کے ہمراہ قرآن شریف کا ناظرہ سبق پڑھ رہا تھا۔ ایک دن سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے ہاتھوں مار پڑی انہوں نے کہا کہ ”شیر دشمن بتی گوئے تہ کریو کتابان برے تان اچا کسیر“ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ شیر محمد عالم دین بن کر آئے گا تجھ پر کتابیں لاد کر اپنے پیچھے پھیرائے گا۔ مزید وضاحت اس کی یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی صاحب کا نام شیر محمد ہے جس کو لڑپن میں شیر کہہ کر پکارا جاتا تھا اور وہ مذہبی تعلیم کے لیے مسافرت میں تھا۔

صوفی گل محمد کی اس بات کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں نے بھی مذہبی تعلیم کے لیے مسافرت اختیار کی، عرصہ ایک سال تک انگور کلی علاقہ ورسک چارسدہ میں ترکی حاجی صاحب مرحوم کے مدرسہ میں اپنے بڑے بھائی مولانا شیر محمد اور گاؤں کے اور چند لڑکوں کے ہمراہ مولانا عبدالعزیز چترالی (مرحوم) کے درس میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ دوسرے سال میں پشاور شہر میں آکر اُس وقت کے دارالعلوم سرحد واقع مسجد غلام جیلانی میں داخلہ لیا تقریباً تین سال تک یہیں پر ابتدائی کتابیں حضرت مولانا مفتی عبداللطیف، حضرت مولانا پائندہ محمد عرف کابل اُستاد، حضرت مولانا محمد عمر چکسر استاذ جیسے کہنے مشق و مشفق اساتذہ سے پڑھی۔ اس دوران کے میرے رفقاء درس میں سے مولانا محمد وزیر سکھو چترال (مرحوم)، مولانا کبیر شاہ سکھو چترال (حیات)، مولانا حاجی ابراہیم سکھو ورسک چترال (حیات)، مجھے یاد ہیں جو ہر اعتبار سے قابل

حالات مصنف بقلم مصنف

ستائش طلباء تھے۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی سے ان تین سالوں میں دارالعلوم کے تمام طلباء میں نمایاں حیثیت رہی کسی بھی کتاب اور کسی بھی امتحان میں کوئی اور مجھ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے نہیں پایا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دارالعلوم کے سالانہ جلسہ میں طلباء کی نمائندگی کرتے ہوئے عربی زبان میں جو تقریر کیا کرتا تھا وہ مزید شہرت کا سبب بنی۔ تین سال یہیں پر اوسط درجہ تک کتابیں پڑھنے کے بعد اُس وقت کے جامعہ اشرفیہ واقع ہندو متروکہ بلڈنگ نیلا گنبد لاہور چلا گیا لیکن لیٹ پینچنے کی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا تو مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی میں داخلہ لیا لیکن اسباق میں تسلی نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ کر اُس وقت کے احسن المدارس واقع جامع مسجد الحنفیہ راولپنڈی میں جا کر داخلہ لیا اور مولانا اللہ بخش نور اللہ مرقدہ الشریف اور سید عارف اللہ شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نگرانی میں چند کتابیں پڑھ کر سالانہ ماہ رمضان کی تعطیلات میں دورہ تفسیر پڑھنے کے لیے وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ حضرت ابوالحق مولانا عبدالغفور ہزاروی کے درس تفسیر میں شامل ہوا۔ جس میں (40) شرکاء درس میں سے جن رفقاء کے نام مجھے یاد ہیں، اُن میں:

- ۱۔ پیر طریقت رہبر شریعت مولانا علاء الدین صدیقی مالک النور چینل انگلینڈ (حیات)۔
- ۲۔ مولانا عبداللہ شاہ (مرحوم) مہتمم مدرسہ انوار الابرار ملتان۔
- ۳۔ مولانا حافظ فضل احمد حال امریکہ۔
- ۴۔ مولانا شیخ الحدیث نور حسین شیخ الدرس جامعہ مراڑیاں شریف گجرات۔
- ۵۔ مولانا صادق شاہ کشمیری جن کی حیات و ممات کا علم نہیں ہے۔
- ۶۔ پیر طریقت رہبر شریعت مولانا عابد حسین شاہم (مرحوم) جو حضرت جماعت علی شاہ محدث علی پوری نارووال پنجاب کے سجادہ نشین تھے۔
- ۷۔ مولانا مفتی عبدالشکور جو حضرت ابوالحق نور اللہ مرقدہ کے صاحبزادے تھے جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

حالات مصنف بقلم مصنف

وزیر آباد کے دورہ تفسیر میں چالیس (40) دن کا دورانیہ کامیابی کیساتھ گزارنے اور امتیازی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد دوسرے سال مولانا غلام رسول رضوی شیخ الحدیث و بانی جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے درس میں شامل ہو اس دوران اُن سے استفادہ کرنے کے علاوہ اُس وقت کے متعدد مشاہیر علماء لاہور سے بھی مستفیض ہونے کا اچھا موقع مل گیا۔ تعلیمی سال یہیں پر کامیابی کے ساتھ گزارنے اور امتیازی پوزیشن پانے کے بعد حضرت استاذ العلماء دُنیا ئے تدریس کے تاجدار مولانا عطاء محمد چشتی نَوْر اللہ مَرْقَدَةُ الشَّرِیف کے درس میں سیال شریف حاضر ہوا یہیں پر ایک سال کامیابی کے ساتھ گزارنے کے بعد جب استاذ مکرم بندیا ل کو منتقل ہوئے اُن کی ہمراہی میں وہیں جا کر دو سال تک حضرت کی کفش برداری کی سعادت پائی۔ سیال شریف سے لے کر بندیا ل شریف تک اس دورانیہ میں حضرت مولانا صاحبزادہ عبدالحق بندیا لوی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد اشرف سیالوی، حضرت شیخ المعقولات والمعنولات مولانا غلام محمد تونسوی جیسے قابل فخر رفقاء درس کی معیت رہی، بحمدہ سبحانہ و تعالیٰ اب تک یہ سب کے سب حیات ہیں، جو علمی امانت کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔

درس نظامی کی آخری کتابوں کے اختتام پر غالباً 1961ء تھا، ملتان جا کر دورہ حدیث شریف کی تکمیل کے لیے شیخ الحدیث مولانا السید احمد سعید الکظمی نَوْر اللہ مَرْقَدَةُ الشَّرِیف کے درس حدیث میں شامل ہوا، اُسی سال تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان کی بنیاد بھی رکھی گئی تھی جس کے صدر حضرت غزالی زماں اور ناظم اعلیٰ مولانا غلام جہانیاں سکند ڈیرہ غازی خان مقرر ہوئے تھے اُن ہی کی کوششوں سے 1961ء میں تنظیم المدارس پاکستان کے زیر انتظام مدارس کے اُن طلباء کا تحریری امتحان لیا گیا تھا جو دورہ حدیث پڑھ کر فارغ تحصیل ہونے والے تھے و ن یونٹ کا زمانہ تھا موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر مغربی پاکستان کہا جاتا تھا، سیاسی آزادی نہیں تھی، فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان (مرحوم) کا دور تھا، ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) ایوب خان کے وزیر

خارجہ تھے۔ تنظیم المدارس پاکستان کے اُس تاریخی امتحان میں مجھے ملک بھر سے فارغ تحصیل ہونے والوں میں پہلی پوزیشن پانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ جس کے بعد میری تدریسی خدمات حاصل کرنے کیلئے جامعہ غوثیہ کھروڑپکا ملتان، جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سراج العلوم خانپور رحیم یار خان کے منتظمین ایک دوسرے سے آگے بڑھنے لگے جبکہ میرے شیخ فی الحدیث حضرت غزالی زماں نور اللہ مرقۃ الشریف مجھے اپنے مدرسہ انوار العلوم ملتان میں ہی مقرر کرنا چاہتے تھے لیکن خانپور کے حافظ سراج احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طلب کو اپنی پسند پر ترجیح دیتے ہوئے مجھے خانپور ضلع رحیم یار خان بھیج دیا۔ جہاں پر تقریباً دو سال تک منتہی طلباء کو پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی جن میں سے مولانا سید محمد فاروق القادری سجادہ نشین خانقاہ قادریہ، گڑھی اختیار خان ضلع رحیم یار خان، مولانا عزیز الرحمن درانی سکنہ خانپور، مولانا حافظ محمد خان، مولانا محمد احمد سکنہ خاص رحیم یار خان حال انگلینڈ، مولانا نذیر احمد حال مقیم مکہ معظمہ، مولانا حبیب الرحمن مرحوم سکنہ دنین چترال کے نام اس وقت یاد ہیں جبکہ حافظ سراج احمد مرحوم اور اُن کے صاحبزادے مولانا مختار احمد درانی مہتمم مدرسہ سراج العلوم جس اخلاص و محبت سے پیش آتے رہے، وہ اب بھی مجھے یاد ہے۔

1964ء میں جب جامعہ عباسیہ بہاولپور اسلامی یونیورسٹی میں تبدیل ہو کر تخصص فی التفسیر والحدیث کے لیے اُمیدواروں کو امتحان کے لیے بلایا گیا میں بھی اپنے شیخ فی الحدیث کی ہدایات کے مطابق سراج العلوم خانپور کی تدریس سے استعفیٰ دے کر اُس میں شامل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی غیبی توفیق سے اُس تاریخی امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی جس کا ملک بھر میں چرچا ہوا، سکالرشپ کے خصوصی اعزاز کے ساتھ تخصص فی التفسیر والحدیث کی کلاسوں سے مستفیض ہونے کے ابھی صرف چھ (6) ماہ گزرے تھے کہ جامعہ انوار العلوم ملتان کے طلباء نے کچھ داخلی سازشیوں کے دخل عمل سے ہنگامہ برپا کیا تو حضرت غزالی زماں نے حالات کنٹرول کرنے کے لیے شیخ الدرس بنا کر انوار العلوم ملتان بھیج دیا۔ شبانہ روز محنت کر کے جب یہاں پر خوشگوار علمی فضا قائم

حالات مصنف بقلم مصنف

کرنے میں کامیاب ہوا تو یہاں کے کچھ کہنے مشق سازشیوں نے میری سادگی اور نوجوانی کی ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر اعتماد کا ایسا دھوکہ دیا کہ حضرت غزالی زماں اور مفتی مسعود علی القادری رَحِمَهُمَا اللہُ تَعَالٰی سے ہدایات لیے بغیر محض سازشیوں کے دھوکہ میں آ کر موسم گرما کی تعطیلات کا اعلان کر دیا۔ میرا یہ فیصلہ نہ صرف دینی مدارس کے مزاج و روایت کے منافی تھا بلکہ ہر اعتبار سے نامناسب و غلط تھا مجھے اپنی اس غلطی کا احساس تب ہوا جب حضرت غزالی زماں نَوْرُ اللہِ مَرْقَدُہُ الشَّرِیف کی طرف سے تفصیلی خط گھر کے پتہ پر وصول ہوا، جس میں اس کے پس منظر سے مجھے آگاہ کرنے کے ساتھ اس کو نوجوانی کی ناتجربہ کاری اور حاسدوں کی سازش سے بے علمی کا نتیجہ قرار دے کر مجھے جلد از جلد انوار العلوم واپس پہنچنے کا فرمایا گیا تھا۔ حضرت کا یہ مکتوب گرامی اُس وقت مجھے وصول ہوا جب میں بیماری سے نڈھال تھا اور علاج کے لیے میوہسپتال لاہور جانے کی تیاری تھی جس کے بعد حضرت مفتی اعجاز دلی شیخ الحدیث جامعہ نعمانیہ لاہور نَوْرُ اللہِ مَرْقَدُہُ الشَّرِیف کی وساطت سے میوہسپتال لاہور کے ایک بڑے ڈاکٹر جو پیر محمد کرم شاہ الازہری مرحوم کے برادر محترم تھے جن کا نام گرامی یاد نہیں آ رہا۔ اللہ تعالیٰ اُس جہاں میں انہیں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے کی نگرانی میں زیر علاج رہا۔ تقریباً تین ماہ لاہور میں علاج کے اس دورانیہ میں جامعہ نظامیہ لاہور میں بڑی کلاسوں کو چند اسباق بھی پڑھاتا رہا، اس دوران مجھ سے استفادہ کرنے والوں میں سے قاری خوشی محمد مرحوم اور مولانا حکیم اللہ اوگی مانسہرہ (ابھی حیات ہے) کے نام اس وقت یاد ہیں۔

علاج سے فائدہ نہ ہونے پر کچھ تجربہ کار حضرات کے مشورے اور حضرت غزالی زماں کی نگرانی میں حضرت کے ہمسایہ حکیم عطاء اللہ مرحوم سکنہ محلہ قدیر آباد ملتان کے پاس پہنچا۔ نبض دیکھ کر انہوں نے مجھے تسلی دی اور فرمایا کہ جگر کی حرارت حد اعتدال سے تجاوز کیے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، ڈاکٹروں کی غلط تشخیص اور بے مصرف گرم دوائیوں نے

حالات مصنف بقلم مصنف

”جلتے پرتیل کا کام“ کیا ہے۔ انجام کار حکیم عطاء اللہ مرحوم کے علاج سے چند ہفتوں میں بیماری سے نجات پانے کے بعد تصوف کی جان ”فصوص الحکم“ شریف پڑھنے کا دیرینہ شوق پورا کرنے کے لیے حضرت غزالی زماں کی اجازت سے مہر آباد شریف گوگڑاں، ضلع لودھراں امام الواصلین، افضل العالمین، سدا کا ملین، جامع المعقول والمنقول سیدی وسندی و مرشدی امام شاہ نور اللہ مرقۃ الشریف کی خدمت میں مہر آباد شریف پہنچا۔ صحیح النسب بخاری سادات کی یہ بستی کسی وقت ”چاہ نئی والا“ کے نام سے مشہور تھی، لیکن حضرت امام الواصلین کی علمی شخصیت، قال اللہ قال الرسول کی تعلیم و تبلیغ اور خلق خدا کی روحانی تربیت کی بدولت آہستہ آہستہ بستی کا نام تبدیل ہو کر سیدوں کی بستی مشہور ہونے لگی اور جس روز حضرت پیر مہر علی شاہ نور اللہ مرقۃ الشریف نے اپنے چہیتے خلیفہ کی احوال پرسی کے لیے یہاں پر قدم رنجہ فرمایا اس دن سے اس کا نام مہر آباد شریف پڑ گیا اور یہ دلکش نام اتنا مشہور ہوا کہ نئی نسل کو پرانے نام کا پتہ ہی نہیں ہے یہیں پر ڈیڑھ ماہ میں حضرت امام الواصلین نور اللہ مرقۃ الشریف سے فصوص الحکم شریف کا درس سبقاً سبقاً پڑھا۔ درس کے اختتام پر عید الفطر کی صبح کو عید گاہ جانے سے قبل اپنے مبارک ہاتھوں سے میری دستار بندی فرمائی۔ یہاں پر اگر مہر آباد شریف میں قیام کے دوران حضرت کے لیل والنہار کے حوالہ سے اپنے حسین مشاہدات کا تذکرہ کروں یا فصوص الحکم شریف کے درس کے حوالہ سے فیوضات و برکات اور مکاشفات کی تفصیل میں جاؤں تو اس سے مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن میں نے یہیں پر اپنے ماضی کے جھروکوں کی صرف اور صرف اجمالی جھلک ضبط تحریر میں لانے کے سوا اور کچھ نہ کرنے کا التزام کیا ہوا ہے ورنہ مہر آباد شریف سے میری کافی سے زیادہ حسین یادیں وابستہ ہیں۔ تاہم فرمان الہی ”وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“ (۱) پر عمل کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت کے فیض رساں درس میں فصوص الحکم شریف پڑھنے

کے بعد شرح صدر کی وہ توفیق مجھے میسر ہوئی جس کے بعد الہیات کے مشکل سے مشکل مسائل آسان ہونے لگے، درس نظامی کے جملہ فتون و کتب میں پوشیدہ رموز کا عقدہ کھلنے لگا اور بالخصوص قرآن و سنت کے معارف تک رسائی کی سبیل میسر ہوئی جسکے بعد فتاویٰ درالختار کی اُس بات پر مجھے حق الیقین کا درجہ حاصل ہوا جو انہوں نے امام مجد الدین فیروز آبادی صاحب القاموس فی اللغة سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وَمِنْ خَوَاصِّ كُتُبِهِ أَنَّ مَنْ وَاظَبَ عَلَى مَطَالَعَتِهَا الشَّرْحَ صَدْرُهُ لِفَكِّ الْمُعْضَلَاتِ وَحَلِّ الْمَشْكَلَاتِ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے کہ جو ہمیشہ اُن کا مطالعہ کرتا ہے اُس کو لا ینخل اور مشکل مسائل کا عقدہ کھولنے کے لیے شرح صدر کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔

اس کے بعد حضرت غزالی زماں نَوْرَاللّٰہ مَرْقَدَہ الشَّرِیف کی طرف سے جامعہ غوثیہ سکھر جا کر شیخ الدرس کا منصب سنبھالنے کا حکم ملا۔ تقریباً دو سال تک وہیں پر حضرت مولانا مفتی محمد حسین قادری نَوْرَاللّٰہ مَرْقَدَہ الشَّرِیف کی نگرانی میں خدمات انجام دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس دوران حضرت مفتی صاحب مرحوم کی کمال شفقت و محبت کیساتھ نواب وحید احمد خان ایڈووکیٹ مرحوم کا اخلاص اور حاجی محمد یعقوب مرحوم اور اُن کے بیٹوں کی میری ساتھ محبت بھولنے کی چیز نہیں ہے۔

یہاں پر مجھ سے درس پڑھنے والے حضرات میں صرف مولانا شمیم الحسن قادری حال خطیب کشمور، مولانا محمد فاروق مرحوم، مولانا مفتی محمد شریف خطیب روہڑی سکھر، مولانا حبیب احمد شیخ الحدیث جامعہ نوریہ کوئٹہ بلوچستان کے نام یاد ہیں۔

۱۔ فتاویٰ الدر المختار، ج 1، ص 358، مطبوعہ مجتہائی دہلی۔

حالات مصنف بقلم مصنف

بعد ازاں حضرت غزالی زمان کی ہدایات کے مطابق جامعہ غوثیہ معینیہ پشاور کی بنیاد 31 دسمبر 1966ء کو رکھ کر حسب استطاعت مذہبی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ اب تک میرے حلقہ درس سے بلا واسطہ علم و عمل کی تربیت حاصل کرنے کے بعد نمایاں خدمات انجام دینے والے حیات حضرات میں مندرجہ ذیل کے نام یاد ہیں:

- (1) مولانا ڈاکٹر صدیق علی چشتی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد۔
- (2) مولانا سید محمد فاروق القادری، سجادہ نشین خانقاہ قادریہ غفوریہ گڑھی اختیار خان، ضلع رحیم یار خان۔
- (3) مولانا شاہ منیر چشتی، شیخ الحدیث دارالعلوم جامعہ جنیدیہ کارخانہ خیبر روڈ پشاور۔
- (4) مولانا سید محمد عرفان المشہدی خطیب یورپ۔
- (5) مولانا حبیب احمد نقشبندی شیخ الحدیث جامعہ نوریہ کوئٹہ بلوچستان۔
- (6) مولانا محمد قاسم چشتی شیخ الدرس دارالعلوم جامع مسجد العربی النہان، خاران بلوچستان۔
- (7) مولانا مفتی غلام صدیق قادری خطیب اعظم کوہ دامن اضاحیل مٹی سرحد۔
- (8) مولانا محمد صدیق نقشبندی شیخ الدرس دارالعلوم غوثیہ خالو غازی ہری پور۔
- (9) مولانا پیر سید شیخ الدرس دارالعلوم قادریہ غفوریہ طارق آباد سوات۔
- (10) مولانا قاری محمد انور بیک امجدی چشتی قادری خطیب الجامع السہری مسجد پشاور و مہتمم مدرسہ حدیقۃ القرآن پشاور۔

- (11) مولانا محمد یعقوب القادری خطیب بروٹھہ اٹک۔
- (12) مولانا سید منیر اللہ شاہ قادری خانقاہ قادریہ گڑھی بلوچ پشاور۔
- (13) مولانا محمد درود پکتیا افغانستان۔
- (14) مولانا محبت الرحمن فاروقی ملکو چترال۔
- (15) مولانا قاری عطاء اللہ خطیب بلیم چترال۔

حالات مصنف بقلم مصنف

- (16) مولانا جہاں شاہ راین چترال۔
- (17) مولانا محمد ضیاء الدین کراچی، اُستاد جامعہ وقاریہ نارتھ ناظم آباد کراچی۔
- (18) مولانا خوزادہ عبدالرحمن لوگرافغانستان۔
- (19) مولانا سید محمد صدیق بخاری خطیب شاہور جنوبی وزیرستان۔
- (20) مولانا سید افضل مہتمم مدرسہ اسلامیہ حیات العلوم جلال آباد افغانستان۔
- (21) مولانا حبیب اللہ خان شیخ الدرس دارالعلوم قادریہ اسہڑ لوئر دیر۔
- (22) مولانا عزیز الرحمن درانی خان پور ضلع رحیم یار خان۔
- (23) مولانا نعمت اللہ استاذ جامعہ شمس العلوم نقشبندیہ خاران بلوچستان۔
- (24) مولانا شادی خان چشتی خطیب ڈوڈا لکی مروت۔
- (25) مولانا صاحبزادہ عبدالولی مہتمم مدرسہ جامعہ مومنیہ قادریہ ماشوگر ضلع پشاور۔
- (26) مولانا صاحبزادہ حمد اللہ سجادہ نشین حاجی محمد امین عمر زئی چارسدہ۔
- (27) مولانا میاں محمد عمر انبار مہمند ایجنسی۔
- (28) مولانا محمد اسحاق صدیقی شیخ الدرس فیضان مدینہ ایبٹ آباد۔
- (29) مولانا الشیخ محمد عبداللہ خطیب داؤد زئی پشاور۔
- (30) مولانا محمد صاحب الحق کٹھانہ پاتراک کوہستان ضلع دیر۔
- (31) مولانا عبدالقادر چشتی خطیب کالام ضلع سوات۔
- (32) مولانا احسان الملک باچا خطیب راموڑہ چکدرہ۔
- (33) مولانا صاحبزادہ فضل منان خطیب کوہاٹ۔
- (34) مولانا نور عزیز چشتی لیکچرار ڈگری کالج بروک و سپور چترال۔
- (35) مولانا حبیب اللہ چشتی خطیب پڑانگ غارنگی۔
- (36) مولانا کلیم اللہ اُستاد دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ پشاور۔

(37) مولانا قاری محمد حکیم مہتمم و خطیب جامعہ نجم النساء، گلہار پشاور،..... الحمد للہ علی توفیقہ
افاضہ و تربیت کا یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔

عمر کی اس منزل میں ماضی کے نشیب و فراز کے آئینہ سبق سے جن تلخ و شیرین تجربات کا احساس
کر رہا ہوں انہیں آئندہ کی امانتِ حیات کو با مقصد بنانے کے لیے رہنما اصول سمجھ کر سفرِ حیات
طے کر رہا ہوں، جن کی کچھ جھلکیاں یہ ہیں۔

جوانی کی عمر میں جو کام مجھے کرنے چاہئے تھے اور جن کو بہتر انداز میں انجام دے سکتا تھا وہ نہ کر
پایا، جس کی سب سے بڑی وجہ مذہبی تعصب سے آلودہ معاشرہ ہے، تحقیق دشمن ماحول اور
محدودیت کا زندان ہے، سیاست نا آشنا معاشرہ کا حصہ ہونا ہے، اپنے وجود میں موجود خداداد
صلاحیتوں سے بے اعتنائی اور رنگ آلود ماحول کی خرابی سے ناتجربہ کاری تھی۔ اے کاش! عمر کی
اس منزل میں پہنچ کر تجربہ کی جو روشنی محسوس کر رہا ہوں یہ اگر جوانی میں مجھے حاصل ہوتی تو ع
ہم بھی آدمی تھے بڑے کام کے

○ اللہ تعالیٰ ﷻ کا بے حد احسان ہے کہ عصیت کے اُس حصار سے نکال کر حق پرستی،
حق جوئی اور حق بنی کی شاہراہ استقامت پر چلنے کی توفیق دی، لقمہ حلال نصیب فرمایا، صبر و
استقامت اور قناعت کی دولت سے سرفراز فرمایا۔

○ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت مجھ پر یہ بھی ہوئی کہ ابناء جنس کی روش کے برعکس کسی مذہبی ادارہ،
انجمن، مدرسہ اور کسی بھی فورم کو حصولِ دنیا کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ عائلی مصارف سے اضافی
وسائل کو دینی مدرسہ سے لے کر تبلیغ حق کی راہ میں صرف کرنے کی توفیق شامل حال رہی،
تقریر سے لے کر تحریر تک اور خطابت سے لے کر تذریس تک حسب استطاعت جس کی توفیق
مل رہی ہے۔ اُسے دُنیاوی لالچ، شہرت، معاوضہ، نام و نمود وغیرہ کسی بھی دُنوی مفاد سے
بالا تر رہ کر حَسْبَةُ لِلّٰہ انجام دینے کی بھی توفیق مل رہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے
احسان در احسان اور کرم بالائے کرم سمجھتا ہوں۔

حالات مصنف بقلم مصنف

○ رب کریم ﷺ کی مجھ پر خصوصی عنایت یہ بھی رہی کہ قناعت کی توفیق سے مجھے نوازا ہے کہ عائلی زندگی میں ماہہ الکفاف سے زیادہ کی خواہش کبھی نہیں کی۔ ضروریات زندگی کے تمام گوشوں میں کفایت شعاری کی اس توفیق کا ثمرہ ہے کہ کئی بار گزراوقات مشکل سے ہونے کے باوجود کسی کو بھی اپنی بے استطاعتی پر مطلع ہونے نہیں دیا، اپنے کسی بھی قریبی دوست احباب اور عقیدت کیشوں کا زیر احسان نہ ہوا، ہر حال میں ورثہ نبوت، محراب و منبر کے تقدس اور علمی وقار کے تحفظ کو پیش نظر رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھ سے قائم کردہ دارالعلوم کے مصارف کے لیے حکومتی امداد یا اہل ثروت کی زکوٰۃ و خیرات کو بھی کبھی خاطر میں نہیں لایا، دُنیا سے استغناء کی یہ توفیق رب کریم جل جلالہ و عم نوالہ کی مجھ پر خصوصی عنایت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ورنہ ۔

مَنْ اَنَّمْ كِه مَنْ دَانَم

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَصَحَابَتِهِ اَجْمَعِينَ
وَ اَنَا الْعَبْدُ الضَّعِيفُ

پیر محمد

چشتی طریقہ، والحنفی مسلک، والمسلم ملہب،
والجترالی مولدا، والبشاوری مسکنا

☆☆☆☆☆

ابتدائیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلٰی الدِّیْنِ كُلِّهِ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ (۱) وقال فی احاطة بعثته ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ (۲) فقال لتکمیل مراده سبحانه و تعالیٰ ﴿وَاَوْحٰی اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ لِاَنْذِرْكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (۳) وقال لاظهار المقصد من انزاله ﴿کَتَبْنَاۤ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ مُبَرَّکًا لِّیَذَّبُرُوْا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُوْلُوْا الْاَلْبَابِ﴾ (۴) فَصَلَّوْاۤ اِلَیَّ وَتَسْلِمٰتِهٖ عَلَیْهِ وَ عَلٰی مَنْ اتبعه اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔

بعد الحمد والصلوة! اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے کرم پر جتنا شکر ادا کروں کم ہوگا کہ مولائے کریم نے مجھے قرآن کریم کے معارف کا جو یاں بنایا اور زندگی کے ہر مرحلہ میں اس سے رہنمائی و دستگیری پانے کی توفیق بخشی، سخی و فیاض قرآن نے کسی بھی مشکل میں مجھے مایوس نہیں کیا۔ تسلسل کے ساتھ درس قرآن اور نصف صدی پر مشتمل مطالعہ قرآن کے طویل تجربہ نے مجھے بہت کچھ دیا اور قرآنی معارف کے لاناہایت ہونے سے متعلق علم الیقین سے عروج دے کر مجھے حق الیقین کے رُتبے تک پہنچایا۔ مقصد نزول قرآن کو پیش نظر رکھ کر ہر جدید مطالعہ نئے سے نئے معارف کے

(۱) الفتح: 28۔

(۲) الاعراف: 158۔

(۳) الانعام: 19۔

(۴) ص: 29۔

أصول ترجمہ

انکشاف کا موجب بنا، تدبر فی القرآن کے اس طویل دورانیہ میں مجھ پر حدیث نبوی ﷺ کا لا تنقضی عجائبہ (۱) کے حقیقی معارف منکشف ہوئے۔ جن کی ایک جھلک اس طرح ہے کہ قرآن شریف کی ہر آیت اور ہر جملہ بنیادی طور پر دو قسم معانی کا حامل ہے:

اول:- وہ جنہیں عام حالات میں لسانِ قرآنی والے یعنی عرب محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ سکتے ہیں انہیں مفہوم اول اور معانی اولیہ یا قرآن شریف کی بنیادی تعلیمات اور عمومی مفہومات بھی کہا جاسکتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ سمجھ اجمال کے درجہ میں ہو یا تفصیل کے انداز میں۔ اجمال کی مثال کے لیے آیت کریمہ ﴿وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا

(۱) قرآن شریف کے تعارف میں وارد پوری حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس طرح ہے:

”وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مَعْمَرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ سَعِيرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَمْرَةُ الزِّيَّاتِ، عَنْ أَبِي الْمُخْتَارِ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أُحْيَى الْحَارِثِيُّ الْأَعْوَرُ، عَنْ الْحَارِثِ الْأَعْوَرِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، يَتَقَارَبَانِ فِي حَدِيثِهِمَا وَاللَّفْظُ لَفْظُ ابْنِ أُحْيَى الْحَارِثِ، عَنْ الْحَارِثِ الْأَعْوَرِ، عَنْ عَلِيٍّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّهَا سَتَكُونُ فِتْنَةٌ قَالَ: قُلْتُ فَمَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: كِتَابُ اللَّهِ فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ، هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ يَرُدُّهُ مِنْ جَبَارِ قَصَمَهُ اللَّهُ، وَمَنْ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللَّهُ هُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ وَالذِّكْرُ الْحَكِيمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ رَدٍّ، وَلَا تَنْقُضِي عَجَائِبُهُ، وَهُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَهُ الْجِنَّ حِينَ سَمِعَتْهُ أَنْ قَالُوا: إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا، مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ وَمَنْ دَعَى إِلَيْهِ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ وَمَنْ اعْتَصَمَ بِهِ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“ (مسند البراز 18 مجلد كاملا، المجلد الثالث، ج: 3، ص: 71)

أصول ترجمہ

مَعَ الرَّاِکِعِیْنَ ﴿۱﴾ کو دیکھا جاسکتا ہے جسے سننے یا پڑھنے سے ہی اہل لسان اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ اس میں صلوٰۃ قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے اور راکعین کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ باقی رہی یہ تفصیل کہ صلوٰۃ کی کیا حقیقت، ارکان، شرائط و آداب ہیں؟ اور زکوٰۃ کی کیا حقیقت اور تشریح ہے۔ اور اسی طرح رکوع کی کیا حقیقت اور نوعیت ہے؟ اس حوالہ سے پہلے مفہوم کو مفہومِ اجمالی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جس کے مقابلے میں تفصیل کے یہ مراتب مفوض الی الرسول ﷺ ہیں جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ ﴿۲﴾ اس کے ساتھ ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ کی سہیل بھی موجود ہے اور علومِ خادمہ لفہم القرآن کی متعدد راہیں بھی موجود ہیں۔ تفصیلی مفہوم کی تمثیل کے لیے دیباچۃ القرآن یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کو دیکھا جاسکتا ہے جسے پڑھنے اور سننے والا ہر اہل لسان کسی شک و تردد کے بغیر سمجھ لیتا ہے کہ اس میں اللہ ”الرحمن، الرحیم“ کے نام کی مدد سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم میں اجمال کی قطعاً کوئی شکل موجود نہیں ہے۔ بہر حال آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم اول کو سمجھنا عجم کے مقابلہ میں عرب کو آسان ہے کیوں کہ اس سلسلہ میں انہیں کسی فن اور علومِ آلیہ اپنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بخلاف اہل عجم کے کہ انہیں اس حوالہ سے کچھ علوم و فنون کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ جس وجہ سے انہیں علومِ آلیہ لفہم القرآن اور علومِ خادمہ للقرآن جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جیسا علمِ تصریف، علمِ اشتقاق، علمِ متنِ لغت، علمِ نحو، علمِ المعانی، علمِ البیان اور علمِ البدیع وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ غیر اہل لسان یعنی عجم کے لیے ان فنون میں مہارت حاصل کیے بغیر آیاتِ قرآنیہ کے معانی اولیہ کو سمجھنا ممکن نہیں ہے گویا الہیات کی تعلیم و تعلم کے لیے اقوامِ عجم میں قائم مدارس و جامعات میں ان علوم کو حاصل کرنے کے لیے جو محنت کی جاتی ہے اُس سے بنیادی مقصد اور غرض و غایت قرآن شریف

(۱) البقرة: 43-

(۲) النحل: 44-

أصول ترجمہ

کے ان معانی کو سمجھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دوم:- وہ جنہیں المفہوم الثانی من القرآن کہا جاتا ہے یعنی معانی اولیہ کو سمجھنے کے بعد دوسرے درجہ میں اُن کا ادراک ہو سکتا ہے جن کی فہمائش کے لیے بعض مفسرین نے باب الاشارة کا عنوان منتخب کیا ہے جیسا السید محمود الالوسی البغدادی المتوفی 1270ھ آیات قرآنیہ کے معانی اولیہ کے مطابق تفسیر کرنے کے بعد المعانی الثوانیہ کے ان معارف کو ”ومن باب الاشارة“ کے مستقل عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔

محی الدین ابن عربی المتوفی 638ھ نے ان ہی معانی ثوانیہ پر مشتمل چار مجلدات میں جو تفسیر لکھی ہے اُس کا نام ہی ”رحمة من الرحمن فی تفسیر اشارات القرآن“ رکھا ہے۔

قرآن شریف کے مفہوم اول اور مفہوم ثانی کے مابین اس بنیادی فرق کے علاوہ درج ذیل وجوہ تفریق کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے جس کے بغیر معانی اولیہ اور معانی ثوانیہ کے مابین اشتباہ ہو سکتا ہے:

❶ معانی اولیہ کا تعلق جمہور الناس سے ہے اور بلا تخصیص سب اُنہیں سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے پر مکلف و مسئول ہیں جبکہ معانی ثوانیہ ایسے نہیں ہیں بلکہ مفہوم اول اور اصل مقاصد سے اضافی معارف ہونے کی بنا پر اُن کی فہم و ادراک بھی خواص کو ہی نصیب ہو سکتا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن سے متعلق حدیث میں آیا ہے ﴿مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَزَّهَ اللَّهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (۱) امام جلال الدین السيوطی المتوفی 911ھ نے بھی اسے نقل کیا ہے (۲) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے مفہیم قرآنی کی اس تقسیم اور مفہوم ثانی کی توفیق پانے والے سعادت مندوں سے متعلق لکھا ہے ”واهل التدبير والتذكير لما اودع في كتابه العزيز من“

(۱) روح المعانی، ج: 1، ص: 91 تحت تفسیر سورة الفاتحة مطبوعہ دارالاحیاء التراث العربی بیروت۔

(۲) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 181، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

اصول ترجمہ

الاسرار والعلوم يفهم كل عبد على قدر مقامه وذوقه وكشفه“ (۱) اور آیت کریمہ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ (۲) کا عموم بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قرآن شریف کے معانی اولیہ سے ثابت ہونے والے احکام پر عمل کیے بغیر معانی ثوانیہ کا عرفان ممکن نہیں ہے۔ جس کے مطابق آیات قرآنیہ کے یہ دو مفہوم علم و عمل اور اخلاص کے حوالہ سے باہم سبب و مسبب کا ارتباط رکھتے ہیں کہ جس کو معانی اولیہ کا جتنا زیادہ علم ہوگا اور جتنا زیادہ اخلاص کے ساتھ اُن پر عمل ہوگا اُسی تناسب سے اُسے معانی ثوانیہ کا عرفان نصیب ہوگا۔ ان کی مثالوں کے لیے بھی ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کی ترتیب لفظی کی لپیٹ میں پوشیدہ رُموز و اسرار اور حقائق و معارف پر غور کیا جاسکتا ہے جو مختلف وقتوں میں خواص اہل اللہ کے قلوب پر منکشف ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی جب تک اربعہ عناصر کے اس عالم ناسوت کا نظام قائم ہے اُس وقت تک منکشف ہوتے رہیں گے جس کے کچھ رموزات سے میں نے تفسیر ”مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن“ کی پہلی جلد میں پردہ اُٹھایا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ ﴿وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ (۳) کی ترتیب سے لے کر اُس کے مفردات میں پوشیدہ رُموز و معارف پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جنہیں الہیات کے ماہرین ”اسرار الصلوٰۃ والزکوٰۃ“ کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور طبقہ مفسرین سے لے کر اہل کشف و صوفیاء کرام بھی اشارۃ کے عنوان سے انکشافات کرتے ہیں۔ بہر حال ان کی حقیقت وہی ہے جسے آیات قرآنیہ کے معانی اولیہ کے بعد دوسرے درجہ میں معانی ثوانیہ، مفہوم ثانی اور ثمرۃ العمل بالعلم جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

۲ معانی اولیہ کا علم و ادراک اور اُن پر عمل ہر دور تاریخ کے لیے برابر ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ

(۱) مواقع النجوم، ص: 86، مطبوعہ انتشارات مولیٰ طہران۔

(۲) ابراہیم: 7۔

(۳) البقرة: 43۔

أصول ترجمہ

ان کی فہم و ادراک کسی خاص وقت یا کسی خاص ماحول کے ساتھ مختص ہو یا کسی وقت اُن پر عمل کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پابندی ہو بلکہ قرآن کریم کے نزول سے اصل مقصد ہی ان کے مطابق علم و عمل کا اجراء ہے جس میں توقف ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ ان کے برعکس معانی ثوانیہ کا علم و ادراک اور اُن کے مطابق عمل مختلف اوقات و ماحول کے ساتھ مختص ہے۔ جو اپنے وقت سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہو سکتے جس کی تحدید و تعیین فرمانِ الہی ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ﴾ (۱) کے عین مطابق جانبِ ازل سے اور ظہور میں آنا جانبِ ابد سے مربوط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ (۲) ظاہر ہے کہ یہاں پر لفظ ﴿شَيْءٍ﴾ اپنے عموم و شیوع کی بنا پر جملہ اعیان و حوادث کو شامل ہونے کی طرح تمام معارف قرآنی کو بھی شامل ہے جن کا ادراک و انکشاف مختلف ادوار تاریخ میں علمِ الہی کے عین مطابق ہوتا ہے۔

۳۔ معانی اولیہ کا دائرہ کار محدود ہے کہ امورِ مذہبیہ اور شرعی احکام اور علم و عمل تک منحصر ہیں کیوں کہ ان کے نزول سے اصل مقصد علم و عمل کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ معانی ثوانیہ کا دائرہ کار لا محدود ہے کہ شرعی احکام کے ساتھ مربوط ہوتے ہوئے امورِ تکوینیہ سے بھی مربوط ہوتے ہیں جن کی کوئی حد ہی نہیں ہے اسی اعتبار سے حدیث شریف میں قرآن شریف کو ﴿حَبْلُ اللَّهِ الْمَدُودُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ﴾ (۳) قرار دیا گیا ہے ایک اور حدیث میں ان دونوں مفہوموں کی جدا جدا حد بندی کی گئی ہے اور ہر ایک کے ماحول اور وقتِ ظہور کے اختلاف کا اشارہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ﴿إِنَّ لِكُلِّ آيَةٍ ظَهْرًا وَبَطْنًا وَلِكُلِّ حَرْفٍ

(۱) الرعد: 8۔

(۲) الحجر: 21۔

(۳) ترمذی شریف، ج: 2، ص: 220، مطبوعہ میر محمد کراچی۔

حد او مطلعاً (۱)

یہ حقائق خبر احادیث کے ان اشارات تک محدود نہیں ہیں بلکہ قرآن شریف کے متعدد مقامات میں بھی ان دونوں معانی کا افادہ کیا گیا ہے۔ مفہوم اول کے سہل الفہم اور عام ہونے سے متعلق

فرمایا ﴿وَلَقَدْ يَسِّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْكِرٍ﴾ (۲)

اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ ذکر و نصیحت اور علم کے لیے قرآن شریف کا آسان ہونا اُس کے مفہومِ ثانی اور معارفِ غامضہ کے اعتبار سے ہرگز نہیں بلکہ صرف مفہومِ اول کے اعتبار سے ہے مفسرین نے بھی یہی کہا ہے جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ نیز فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ﴾ (۳)

نیز فرمایا: ﴿مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۴)

ظاہر ہے کہ ان آیات میں ﴿کُل شئیء﴾ اپنے عموم و اطلاق کی بنا پر مایحتاج الیہ فی الدین والدنیا سے لے کر کائنات کے جملہ مادیات و معنویات تک سب کو شامل ہیں اور ظاہری دلالت کے اس عموم میں تخصیص کے لیے کوئی واضح دلیل و قرینہ موجود نہیں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے معانی اولیہ اپنی محدودیت کی وجہ سے اُن سب کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ایسے میں قرآن شریف کو ہر شے کے لیے بیان و تفصیل کہنے سے مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ اُس کے مفہومِ ثانی کے اعتبار سے ہے یعنی جس اعتبار سے حدیث میں اسے ﴿حبل

(۱) مشکوٰۃ شریف، ص: 35، کتاب العلم، فصل الثانی۔

(۲) القمر: 40۔

(۳) النحل: 89۔

(۴) یوسف: 111۔

أصول ترجمہ

اللہ المدود من السماء الى الارض ﴿﴾ کہا گیا ہے اسی اعتبار سے قرآن شریف میں بھی ہر شے کا بیان و تفصیل کہا گیا ہے۔

۲ دوسرے انسانوں کو قرآن شریف کا ابلاغ مسلم امت پر جو فرض قرار دیا گیا ہے یہ ذمہ داری قرآن شریف کے معانی اولیہ کے اعتبار سے ہے معانی ثوانیہ کے ساتھ اس عمومی دعوتِ تبلیغ کا تعلق نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (۱) ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ میں لفظ ﴿وَمَنْ بَلَغَ﴾ کا عموم دنیا بھر کے تمام انسانوں کو شامل ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن مجید اپنے مبلغ کے بغیر آپ ہی کسی کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اپنے رسول سید عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے نائبین پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے جس کے لیے ارشاد فرمایا ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ﴾ (۲)

نیز فرمایا: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (۳)
نیز فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ (۴)

اور نائبین سے متعلق فرمایا: ﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ يُؤْذِنُ اللَّهُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾ (۵)

(۱) الانعام: 19۔

(۲) ق: 45۔

(۳) النحل: 44۔

(۴) المائدة: 67۔

(۵) فاطر: 32۔

أصول ترجمہ

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ يَبْلُغُهُ يَكُونُ أَوْعَى لَهُ مِنْ بَعْضٍ مَنْ سَمِعَهُ﴾ (۱) اور یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ کسی بھی عجمی قوم کو ابلاغ القرآن یعنی قرآن شریف کی دعوت و تبلیغ پہنچانا تب ہی موثر اور بامقصد ہو سکتا ہے جب اُس کی زبان میں ہو جو آیت کریمہ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (۲) کا فلسفہ ہونے کے ساتھ مقتضائے عقل بھی ہے جس کی واحد سبیل یہی ہے کہ اُن کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ انہیں پہنچایا جائے جس سے ابلاغ القرآن کا بنیادی فریضہ انجام پانے کے ساتھ فرمان الہی ﴿أَذْغِ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (۳) پر عمل کرنے کے لیے بھی راہ ہموار ہو سکتی ہے خاص کر اُن عجمی اقوام یا ایسی جماعتوں کے لیے جو کسی اسلامی مبلغ کی ذاتی رائے اور کسی کی تفسیر و تاویل کے دخل عمل کے بغیر صرف اور صرف قرآن مجید کا نثر اترجمہ سننے کی خواہش یا فرمائش کرتی ہوں۔

اساسی خطوط اور حاصل الکلام:- حسب ضرورت کسی بھی عجمی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ وجود میں لانا ابلاغ القرآن کی خاص صورت ہے جو مقتضائے وقت کے مطابق مسلم اُمہ کی مسئولیت ہے اور اس کا تعلق صرف اُس کے معانی اولیہ سے ہے کیوں کہ اس سے مقصد لوگوں کی اصلاح احوال کرنا ہوتا ہے کہ قرآن انہیں جس عقیدہ و عمل کی ترغیب دیتا ہے اُسے اپنائیں اور جس عقیدہ و عمل سے ترہیب کرتا ہے اُس سے اجتناب کریں۔ یہ سب کچھ قرآن شریف کے معانی اولیہ کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے جبکہ معانی ثوانیہ عام لوگوں کے علم و عمل سے ماوراء ہونے کی بنا پر اس مقصد سے میل نہیں رکھتے۔ ایسے میں ترجمہ القرآن کا تعلق صرف معانی اولیہ سے ہونے میں کس کو

(۱) بخاری شریف، ج: 2، ص: 631، باب حجة الوداع، مطبوعہ سعید اینڈ کو کراچی۔

(۲) ابراہیم: 4

(۳) النحل: 125۔

أصول ترجمہ

شک ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ترجمۃ القرآن میں ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ استعمال کرنا یا ایسا انداز اختیار کرنا جائز ہو جو آیات قرآنیہ کے دوسرے درجہ کے مفہوم یعنی معانی ثوانیہ کے منافی ہو۔ نہیں ایسا ہر گز نہیں ہے بلکہ ترجمۃ القرآن سے مقصد اُس کے معانی اولیہ کی تبلیغ کرنا اور اُن سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے تین چیزوں کا اکٹھے پائے جانا ضروری ہے:

پہلی چیز:۔ ترجمہ کا یہ عمل ترجمۃ القرآن کی تعریف کے مطابق ہو ورنہ تعریف سے خلاف ہونے والے ترجمہ کو ترجمۃ القرآن کہنا ہی درست نہیں ہے چہ جائیکہ مفید مقصد ہو سکے۔

دوسری چیز:۔ ترجمہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ تین صورتوں سے خالی نہ ہوگا: پہلی صورت: ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق لیکن لسانِ قرآنی کے محاورہ سے خلاف ہوگا۔

دوسری صورت: اس سے برعکس یعنی لسانِ قرآنی کے محاورہ کے مطابق لیکن ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہوگا۔

تیسری صورت: دونوں کے محاورہ سے خلاف ہوگا، ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک بے محاورہ کہلاتا ہے جبکہ بے محاورہ ترجمہ مفید مقصد نہیں ہوتا۔

تیسری چیز:۔ ترجمہ کا عمل اُس کی صحت کے لیے تمام فطری شرائط کے مطابق ہو ورنہ کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی درست نہیں ہو سکتا جب درست ہی نہیں ہے تو پھر مفید مقصد ہونے کا تصور ہی باقی نہیں رہتا اور یہ تینوں باہم متلازم ہیں یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ترجمہ کا عمل اُس کی تعریف کے مطابق ہو لیکن کسی شرط سے خلاف ہو یا بے محاورہ ہو بلکہ یہ دونوں تعریف کے مطابق ہونے کو لازم ہیں کہ انفاک کا تصور نہیں ہو سکتا۔

ترجمہ کے ذریعہ ابلاغ القرآن کا فریضہ ادا کرنے کے لیے اور ترجمہ کو با مقصد اور منشاء

أصول ترجمہ

الہی کے مطابق کرنے کے لیے یہ تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے اساسی خطوط بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی پابندی کرنے والے مترجم سے کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ قرآن شریف کی تفسیر و ترجمہ میں طویل تجربہ مجھے یہ احساس دلا رہا ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں جن حضرات سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں ان چیزوں سے غفلت کی بنا پر ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ ترجمہ کے عمل کو تفسیر پر قیاس کرنے اور اسے آسان سمجھ کر بے احتیاطی کرنے اور ترجمہ کے عرفی و لغوی مفہوم میں تمیز نہ کرنے اور ترجمہ و ترجمانی میں تفریق نہ کرنے جیسے امور کو بھی غلط تراجم میں بڑا دخل ہے جبکہ حقیقت میں یہ سب کے سب ان تینوں سے غفلت کے فروع و تلخ نتائج ہیں۔ اس سلسلہ میں طویل دورانیہ کا تجربہ مجھے یہ بھی بتا رہا ہے کہ غالب اکثریت میں مترجمین کی غفلت کی طرح تراجم پر تبصرہ کرنے والوں کی واضح اکثریت بھی ان امور کی حقیقت و اہمیت سے بے خبر رہی ہے ورنہ حقائق سے آگاہ کوئی شخص بھی ترجمہ القرآن کو لفظی ترجمہ تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ یا لفظ بہ لفظ ترجمہ اور معنوی ترجمہ یا ترجمہ الحرفیہ اور الترجمة التفسیریہ جیسی مہمل تقسیمات کی طرف منقسم نہیں کر سکتا جبکہ مترجمین کی غالب اکثریت کی طرح ان پر تبصرہ و تقابلی گفتگو کرنے والوں کی واضح اکثریت نے بھی یہ سب کچھ کیا ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے شیخ محمود الحسن سے لے کر السید ابوالاعلیٰ المودودی، پیر محمد کرم شاہ الازہری جیسے مشاہیر تک اور السعودیہ العربیہ کے الشیخ المناع القطان سے لے کر حافظ یوسف صلاح الدین، حافظ عتیق الرحمن کیلانی، عبدالرحمن کیلانی جیسے معتربین و مقبولین عند العلماء السعودیہ اور دکتور عبداللہ ابن عبدالحسن الترمذی وزیر الشؤون الاسلامیہ والاوقاف والدعوة والارشاد جیسے حضرات کی اس قسم بے مصرف تقسیم اور مہمل گفتگو جو بالترتیب ان کی درج ذیل تحریروں میں موجود ہیں۔ (مقدمہ موضح الفرقان مع ترجمہ القرآن و تفسیر عثمانی مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور پاکستان، دیباچہ تفہیم القرآن، ص 6، 7، مع تفہیم القرآن، جلد اول، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ضیاء القرآن، ص 12، جلد اول، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور پاکستان، مباحث فی علوم القرآن، ص 85 تا 290،

اصول ترجمہ

مطبوعہ المکتبۃ الرشیدیہ قصہ خوانی پشاور پاکستان، ترجمہ معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ ص 11 تا 9، مطبوعہ دارالسلام کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ، مقدمہ تیسیر القرآن، ص 1، 2 مع تیسیر القرآن مطبوعہ دارالسلام و سن پورہ لاہور پاکستان (جبکہ ان سب سے زیادہ قابل تعجب دکتور عبداللہ ابن عبدالحسن الترمذی وزیر الشؤون الاسلامیہ والاوقاف والدعوة والارشاد السعودیہ العربیہ کا مندرجہ ذیل کلام ہے:

”اننا لندرک ان ترجمة معانی القرآن الکریم مهما بلغت دقتها فانها ستكون قاصرة عن اداء المعانی العظیمه التي يحويها النص القرآنی المعجز وان المعانی التي تؤدیها الترجمة انما هي حصيلة ما بلغه علم المترجم في فهم كتاب الله الکریم وانه يعتریها ما يعتری عمل البشر كله من خطأ ونقص“ حوالہ کے لیے سعودیہ عربیہ سے تقسیم ہونے والے اُن مصاحف کو دیکھا جاسکتا ہے جو اردو، فارسی، پشتو، گجراتی زبانوں میں کیے گئے تراجم کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ان سب کے ابتدائی صفحہ پر بطور تصدیق و توثیق وزیر موصوف کی طرف سے لکھا گیا ہے۔

سعودی عرب کے وزیر امور مذہبیہ کا یہ کلام قابل تعجب اس لیے ہے کہ اس میں ترجمہ القرآن کی تعبیر ترجمہ معانی القرآن سے کی گئی ہے جسے کوئی بھی واقف حال مضحکہ خیز کہے بغیر نہیں رہ سکتا کیوں کہ قرآن شریف کے معانی کی طرف ترجمہ منسوب کرنے کو روایت تسلیم کرتی ہے نہ درایت۔ ترجمہ القرآن کی یہ انوکھی تعبیر خلاف روایت اس لیے ہے کہ جب سے قرآن شریف کی حکمرانی جزیرۃ العرب سے ترقی پا کر عجم کو اپنے دائرہ اقتدار میں لانے لگی اور مختلف زبان کی عجمی اقوام کو اسلام کی دعوت دینے کی ضرورت محسوس ہوئی اُس وقت سے قرآن شریف کے ترجمہ کا سلسلہ شروع ہوا ہے کیوں کہ ابلاغ قرآن کے سلسلہ میں کچھ ایسے حالات اور ایسے ماحول سے بھی واسطہ پڑتا ہے جس میں قرآن شریف کا ترجمہ پیش کرنا وقت کی ضرورت اور ناگزیر فریضہ

أصول ترجمہ

قرار پاتا ہے جس پر عہد صحابہ سے لے کر تابعین و تبع تابعین اور پیشروان اسلام کے مبلغین نے بالیقین عمل کیا ہوگا۔ اُس کا دستاویزی ثبوت اگرچہ کثیر تعداد میں نہیں ملتا تاہم کچھ نہ کچھ دستیاب ہے۔ مثال کے طور پر نو مسلم اہل فارس کی ضرورت کے مطابق حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ کرنے کا تذکرہ حضرت ثمس الائمہ السرخسی المتوفی 483ھ نے کیا ہے جو المبسوط میں موجود ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

”روی ان الفرس كتبوا الى سلمان رضی اللہ عنہ ان يكتب لهم الفاتحة بالفارسية

فكانوا يقرؤن ذلك في الصلوة حتى لانت سنتهم للعربية“ (۱)

اسی طرح امام محی الدین النووی المتوفی 676ھ نے دوسرے انداز سے اسے ذکر کیا ہے اُن کے الفاظ اس طرح ہیں:

”وعن سلمان الفارسي ان رضی اللہ عنہ قومامن الفرس سئلوه ان يكتب لهم شياء

من القرآن فكتب لهم فاتحة الكتاب بالفارسية“ (۲)

اسی طرح ماضی بعید سے لے کر ماضی قریب تک مختلف خطوں کے اسلاف نے دنیا کی

متعدد زبانوں میں قرآن شریف کے جو تراجم لکھے ہیں اُن میں سے کسی ایک سے بھی ترجمہ معانی

القرآن کہنا ثابت نہیں ہے بلکہ سب ہی نے ترجمہ القرآن ہی کہا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ مصلح

الدین سعدی الشیرازی المتوفی 691ھ نے جو ترجمہ لکھا ہے اُسے بھی ترجمہ القرآن ہی کہا ہے اور

دیار ہند میں اولین مترجم قرآن مشہور ہونے والے شاہ ولی اللہ (رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَيْهِ)

المتوفی 1176ھ نے بھی ترجمہ القرآن ہی کہا ہے جو اُس کے نام فتح الرحمن بترجمہ القرآن سے ہی

ظاہر ہے کہ ترجمہ معانی القرآن نہیں کہا ہے۔ اُن کے بعد اُن کے دو بیٹے شاہ رفیع الدین

المتوفی 1233ھ اور شاہ عبدالقادر المتوفی 1230ھ نے بھی اپنے لکھے ہوئے ترجموں کو

(۱) المبسوط فی الفقہ الحنفی، ج: 1، ص: 37، مطبوعہ عباس احمد البازمکة المکرمہ۔

(۲) المجموع فی شرح المہذب، ج: 3، ص: 380، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

أصول ترجمہ

ترجمۃ القرآن کے نام سے ہی یاد کیا ہے اس کے علاوہ قرآن شریف پڑھنے سے عاجز انسان قرأت قرآن کی جگہ ترجمۃ القرآن سے اگر نماز پڑھے اُس کے جواز و عدم جواز سے بحث کرتے ہوئے جملہ فقہاء اسلام نے بھی ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے۔ مثال کے طور پر ساتویں صدی ہجری کے شافعی المذہب فقیہ و محدث و مفسر امام محی الدین النووی المتوفی 676ھ نے لکھا ہے:

”ترجمة القرآن ليست قرآنا باجماع المسلمين“ (۱)

اسی طرح حنبلی المذہب فقیہ و محدث و مفسر حافظ ابن تیمیہ المتوفی 728ھ نے بھی لفظ ترجمۃ القرآن ہی استعمال کیا ہے اُن کے الفاظ اس طرح ہیں:

”واما الاذکار الواجبة: فاختلف في منع ترجمة القرآن“ (۲)

درایۃ سے خلاف اس لیے ہے کہ لفظ ترجمہ کو معانی قرآن کی طرف نسبت کر کے ترجمۃ معانی القرآن کہنے کی مثال لغت میں ملتی ہے نہ بلاغت میں اور نہ مفسرین کے کسی طبقہ میں اسے معقول و مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ قرآن شریف محض الفاظ یا صرف معانی سے نہیں بلکہ الفاظ و معانی دونوں کے مجموعہ سے عبارت ہے جس کے متعلق اصول دین سے لے کر اصول فقہ تک تمام اسلاف کی ایک آواز ہے کہ ”هو اسم للنظم والمعنى جميعا“ یعنی قرآن شریف الفاظ من حیث الدال اور معانی من حیث المدلول کے مجموعہ سے عبارت ہے۔ ایسے میں قرآن شریف کے معانی کی طرف نسبت کرنے کا کیا جواز ہے جسے لغت تسلیم کرتی ہے نہ عرف کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کا تعلق قرآن شریف کے انفرادی اجزاء ”الفاظ فقط یا معانی فقط“ سے نہیں ہے بلکہ خود قرآن سے ہے جو ان دونوں سے مجموع مرکب ہے۔ ایسے میں اس ناقابل فہم تعبیر کو مضحکہ خیز کہے بغیر کون رہ سکتا ہے؟ اور اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کی تعلیم و تعلم کے حوالہ سے اہل علم کے ماحول میں استعمال ہونے والے درج ذیل الفاظ بنیادی

(۱) المجموع المہذب، ج: 3، ص: 380، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

(۲) اقتضاء الصراط المستقیم، ص: 203، مطبوعہ المكتبة السلفية لاہور پاکستان۔

أصول ترجمہ

حیثیت رکھتے ہیں:

- (۱) تفسیر القرآن (۲) تفہیم القرآن (۳) تاویل القرآن (۴) تشریح القرآن
- (۵) فہم القرآن (۶) ترجمانی قرآن (۷) ترجمۃ القرآن۔

قرآن شریف کی طرف ان سب کی نسبت متعارف و معقول ہونے کے بعد ان میں سے بعض وہ ہیں جن کی نسبت قرآن شریف کے الفاظ و معانی کی طرف انفرادی طور پر بھی جائز و متعارف ہے جیسا کہا جاسکتا ہے (تفسیر الفاظ القرآن، تفسیر معانی القرآن، تفہیم الفاظ القرآن، تفہیم معانی القرآن) اور بعض وہ ہیں جن کی نسبت الفاظ کی طرف غیر معقول ہوتی ہے کیوں کہ اُس سے مقصد صرف معانی کی فہم ہوتا ہے جیسا (ترجمانی الفاظ القرآن) کہنے کا نہ کوئی محاورہ ہے نہ اُسے معقول کہا جاسکتا ہے بلکہ ”ترجمانی قرآن“ کہنے سے واحد مقصد معانی کی فہم و تفہیم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جس کے مطابق ”ترجمانی قرآن“ جیسی نسبت استعمال کرنے والے کی توجہ صرف معانی کی طرف ہوتی ہے اور یہی اس سے ملتفت الیہ بالذات ہوتے ہیں ایسا ہی جیسا ترجمان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

اور بعض وہ ہیں جن کی نسبت معانی کی طرف غیر متعارف اور غیر معقول ہے جیسا (ترجمۃ معانی القرآن) کہنا غیر متعارف اس لیے ہے کہ سلف صالحین کے طبقہ فقہاء سے لے کر طبقہ مفسرین اور مفسرین کے متعدد طبقات میں بھی اس قسم نسبت کی کوئی مثال اور کوئی محاورہ موجود نہیں ہے بلکہ سب نے ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے یا ترجمہ کے لغوی مفہوم کے اعتبار سے ترجمۃ الفاظ القرآن کہنے کی بھی کچھ مثالیں ملتی ہیں لیکن ترجمۃ معانی القرآن کہنے کی بعید سے بعید مثال بھی کہیں نہیں ہے اور غیر معقول اس لیے ہے کہ یہ ترجمہ کی حقیقت اور اُس کی تعریف کے منافی ہے اس لیے کہ ترجمہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے عبارت ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں یعنی اُن کی تمام متعارف و قابل فہم حیثیات کے مطابق ہوں اور ظاہر ہے کہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت بھی اس سے مختلف نہیں ہے بلکہ اس کے عربی مفہوم میں بھی اس کے

أصول ترجمہ

الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوں اور اُن کی تمام قابل فہم حیثیات کے مطابق ہوں جس میں اُن کے لغوی معنی سے لے کر مرادی معنی تک اور اشتقاقی و صرنی اور بلاغی حیثیات سے لے کر ترکیبی حیثیات تک سب شامل ہیں جس کے مطابق ترجمہ والی زبان کے یہی الفاظ حاصل بالمصدر المعلوم اور کبھی حاصل بالمصدر المجهول کے انداز پر عرف عام میں ترجمہ القرآن کہلاتے ہیں اور ان ہی کی صحت و سقم اور مطابقت و عدم مطابقت سے بحث کی جاتی ہے جس وجہ سے یہی ترجمہ القرآن کی من حیث الفہم موضوع بھی کہلاتے ہیں کیوں کہ کسی بھی فن کا موضوع وہی چیز ہوتی ہے جس کے عوارضات ذاتیہ سے اُس میں بحث ہوتی ہے اور قرآن شریف کی طرف ترجمہ منسوب کرنے کی ممکنہ صورتیں بھی صرف دو ہیں:

پہلی صورت:- ترجمہ کے مصدری معنی میں جو "ابداً بالفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها" سے عبارت ہے۔

دوسری صورت:- عرفی مفہوم میں جو ترجمہ کے الفاظ سے عبارت ہے۔

جبکہ ان میں سے کسی ایک کی حقیقت بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ اُسے معانی کی طرف منسوب کر کے ترجمہ معانی القرآن کہا جائے۔ ایسے میں سعودی عرب سے اٹھ کر عجم کی یونیورسٹیوں میں پھیلنے والی اس جدید اصطلاح کو خلافِ درایت و غیر معقول نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اور یہ چونکہ قرآن شریف کے ترجمہ سے متعلق ہے جسے اگرچہ حقیقتاً قرآن نہیں کہا جاسکتا تاہم کلام اللہ کی سفارت اور اُس کا ابلاغ ضرور ہے جس کے لیے مسلم اُمہ کو مکلف و مسئول قرار دیا گیا ہے جس میں آیت کریمہ ﴿وَمَنْ بَلَغَ﴾ (۱) سے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے جو کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے جس میں قدرے بے احتیاطی کا انجام بھی متنوع خرابیوں کا حامل ہو سکتا ہے اس لیے یہاں پر مشہور اصول "لامناقشة فی الاصطلاح" سے سہارا لے کر گلو خلاصی نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہ ابلاغ قرآن کا مسئلہ ہے، سفارت بین اللہ و بین العباد کا انداز ہے اور ابلاغ القرآن کی مشکل

أصول ترجمہ

ترین قسم ہے۔ دوسرے فنون کی طرح نہیں ہے جن میں ہر طبقہ کو اپنی صوابدید کے مطابق اصطلاح وضع کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ حقائق کی اس روشنی میں ترجمۃ القرآن کی متعارف اور واقعی اضافت کی جگہ ترجمۃ معانی القرآن جیسی خلاف حقیقت اصطلاح گھڑنے کی حیثیت بدعت فی القرآن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ (أَعَاذَنَا اللَّهُ بِئِنَّهُ) سعودی عرب اور خاص کراؤمور مذہبیہ کے شعبہ اشاعت ترجمۃ القرآن مع الترجمة فی اللسنة المختلفة سے مربوط علماء کی اس بد فہمی سے متاثر ہو کر کچھ عجمی علماء بھی اسے ورد زبان بنا رہے ہیں اور کچھ یونیورسٹیاں بھی اس سے رنگ لے رہی ہیں جس کی ایک جھلک حافظ عتیق الرحمن کیلانی ولد مولانا عبدالرحمن کیلانی لیکچرار کنگ سعود یونیورسٹی الریاض کی درج ذیل عبارت ہے:

”مختلف زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی نص کا بعید ترجمہ کسی دوسری زبان میں پیش کرنا انسانی بساط سے باہر ہے۔ انتہائی کامیاب مترجم بھی صرف قریب ترین مفہوم پیش کر سکتا ہے جس سے گزارا چل جاتا ہے یہ تو عام عبارات کا حال ہے قرآن کریم کی آیات تو ویسے بھی معجزہ ہیں اُن کا ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علماء نے (ترجمہ قرآن) کو غلط عبارت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ درست عبارت (ترجمہ معانی القرآن) ہے۔“ (۱)

کنگ سعود یونیورسٹی الریاض السعودیہ کے معلم لسانیات کا یہ کلام تین وجوہ سے قابل افسوس ہے: پہلی وجہ:- اس میں جن علماء کے حوالہ سے یہ کہا ہے کہ اُنہوں نے (ترجمۃ القرآن) کہنے کو غلط تعبیر قرار دے کر ترجمۃ معانی القرآن کہنے کو درست کہا ہے اُن کا مصداق سعودیہ کے کچھ علماء کے سوا اور کوئی نہیں ہے بلکہ ترجمۃ القرآن کی پوری تاریخ اور کسی بھی خطے کے علماء سے ایسا ثابت نہیں ہے بلکہ اس خلاف روایت و منافی درایۃ انداز تعبیر کے موجد سعودیہ عربیہ کے اُمور مذہبیہ کے چند علماء کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن، ص: 2، مطبوعہ اسلامک پریس و سن پورہ لاہور پاکستان۔

أصول ترجمہ

دوسری وجہ:- اس میں قرآن شریف کے معیاری اور درست ترجمہ کرنے کو ناممکن کہا گیا ہے جو خلاف حقیقت ہے، ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے معروضی حالات کے منافی ہے اور نبی اکرم سید عالم ﷺ کی رسالت کے عموم للعرب والعجم کے بھی منافی ہونے کے ساتھ آیت کریمہ ﴿وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ لِأَنذِرْكُمْ بِهِ وَمَن بَلَغَ﴾ (۱) سے مقصدِ عموم کے بھی منافی ہے کیوں کہ اسلامی روایات اور کل مکاتب فکر اہل اسلام مفسرین کے مطابق اقوامِ عجم کو قرآن شریف پہنچانے سے مقصد اُس کا ترجمہ پہنچانا ہے خاص کر ایسے عجمیوں کو جو قرآن شریف کی کسی سورۃ، آیت یا کسی بھی حصہ کا تھرا ترجمہ سننے اور سمجھنے کی خواہش رکھتے ہوں تو ناممکن ہونے کی صورت میں قرآن انہیں پہنچانے اور انہیں ابلاغ القرآن کرنے کی راہ ہی مسدود ہوگی ایسے میں عموم رسالت للعرب والعجم کا تصور باقی رہتا ہے نہ آیت کریمہ ﴿وَمَن بَلَغَ﴾ سے عموم کا تصور۔ ایسے میں اس قول کو غلط محض کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

تیسری وجہ:- اس میں معیاری ترجمہ کو علی العموم ناممکن کہہ کر متن کے قریب مفہوم کا قول کیا گیا ہے کہ اس سے گزارا چل جاتا ہے یہ ترجمہ کے حوالہ سے معروضی حالات اور مشاہدہ سے خلاف ہونے کے ساتھ تین خرابیوں سے خالی نہیں ہے:

پہلی خرابی:- معیاری ترجمہ کرنے سے مسلم امت کی ناتوانی و عاجزی کو جانتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اُس کے صرف قریب مفہوم دوسروں کو پہنچانے پر مکلف کیا ہوگا یعنی آیت کریمہ ﴿وَمَن بَلَغَ﴾ سے مراد معیاری ترجمہ نہیں بلکہ قرآن شریف کے مفہوم سے قریب مفہوم پہنچانا مراد ہوگا۔ دوسری خرابی:- ترجمۃ القرآن کے واسطے سے ابلاغ القرآن کو صرف مسلم عجم کے لیے خاص قرار دیا جائے گا یعنی آیت کریمہ ﴿وَمَن بَلَغَ﴾ کا غیر مسلم عجم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا بلکہ اس کا مظہر صرف مسلم عجم اور مسلم معاشرہ ہوگا کہ آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم کے قریب مفہوم انہیں پہنچا کر گزارا چلایا جائے کیوں کہ وہ مسلمان ہونے کے ناطے اسے تسلیم کریں گے جبکہ غیر مسلم

أصول ترجمہ

نقرا ترجمہ کے بغیر کسی مسلم مبلغ کی تفسیر، تاویل، تشریح، ترجمانی جیسے کسی بھی عمل دخل کو سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔

تیسری خرابی:- معیاری ترجمہ ناممکن ہونے کے باوجود یہ عقیدہ کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ناممکن کو ممکن بنانے پر مسلم امت کو مکلف کیا ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی قرآن و سنت کے مطابق نہیں کہا جاسکتا بلکہ ہر ایک اہل اسلام کے متفقہ مسلمات سے خلاف و نامعقول ہے۔ ایسے میں علماء سعودیہ کی ان باتوں کو غلط محض کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا جو ابلاغ القرآن کو مشکوک کرنے، دعوت و رسالت کو محدود اور مسلم معاشرہ کے ساتھ مختص کرنے اور قرآن شریف کے فطری و آسان پیغام کو ناقابل فہم قرار دینے کی موجب ہیں۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ علماء کرام کا یہ طبقہ اگر قرآن شریف کو اُس کی آفاقیت کے تناظر میں دیکھتا کہ اُس کا پیغام پوری دُنیا کے لیے ہے، اسود و احمر اور عرب و عجم سب کو روشنی دینے کے لیے ہے جو مسلم معاشرہ کو اُس کے حالات کو پیش نظر رکھ کر اور غیر مسلم عجم کو اُس کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر پہنچانا ہوتا ہے جو فرمانِ الہی ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (۲) کا مقتضاء ہے تو ایسی غلط باتیں کبھی نہ کہتے یا اگر ترجمہ القرآن کی تعریف، اس کے لوازمات اور شرائط کو پیش نظر رکھتے پھر بھی ایسی باتیں نہ لکھتے۔

محركات ثلاثہ:- اس کتاب کے لکھنے کے لیے جو چیزیں باعث اور محرک بنیں اُن میں سعودی عرب کے علماء کرام کی اس قسم کی باتیں سرفہرست ہیں جنہیں محرک اول اور بنیادی بواعث کہا جاسکتا ہے۔

محرک دوم:- برصغیر پاک و ہند کے مختلف مکاتب فکر مشاہیر کے 34 عدد تراجم قرآن جو اردو زبان میں لکھے ہوئے ہیں کے مابین تقابلی جائزہ کیا اور ترجمہ القرآن کی تعریف و شرائط کے میزان

أصول ترجمہ

میں دیکھا تو اکثر کو غلطیوں سے بھرا ہوا پایا۔ اور سورۃ الفاتحہ، البقرہ، آل عمران کے تراجم کا یہ تقابلی جائزہ تین ضخیم مجلدات میں مکمل ہونے کے ساتھ میری حیرت کی انتہا ہونے لگی اور قرآن شریف کے نادان دوستوں کے ہاتھوں اُس پر ہونے والے مظالم پر بیٹھ کے ماتم کرنے لگا جس کی تفصیل تفسیر ”مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن“ کی تینوں مجلدات میں پھیلی ہوئی ہے اور عرصہ چھ سال سے اہل علم کے مطالعہ میں ہے، تخمین و اندازہ سے نہیں بلکہ حق الیقین کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ ترجمہ کے نام سے قرآن شریف پر ہونے والے مظالم، انجانے میں ہونے والی ان تحریفات اور فحش اغلاط کی اس داستانِ غم کی اصل وجہ من حیث الفن ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے بے خبری ہے اور اس کے لوازمات و تقاضوں سے غفلت ہے اور شرائط سے بے توجہی ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مترجمین کو ان کی علمی شہرت کے باوجود عمومی معنی میں فنِ ترجمہ کو دوسرے فنون سے ممتاز کرنے والی تعریف، غرض و موضوع کا بھی احساس نہیں تھا، اُس کے اصول و شرائط کا ادراک بھی نہیں تھا۔ تراجم کی غلطیوں اور اغلاط کے پس منظر و اسباب کی تشخیص کے بعد میں نے ترجمہ کے عمل کو اور خاص کر ترجمۃ القرآن کو ایسی غلطیوں سے بچانے کے لیے اور اس حوالہ سے آئندہ نسل کو روشنی دینے کی غرض سے یہ کتاب لکھنے کا عزم کیا۔ اسی اثناء میں تیسرا محرک اس طرح پیش آیا کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بتاریخ 29 اپریل 2013ء ترجمۃ القرآن کی اہمیت اور غلطی سے محفوظ ترجمہ وجود میں لانے کے لیے ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اُس میں اس موضوع سے متعلق جو مقالہ میں نے پیش کیا اُس میں ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے ناگزیر شرائط پر میں نے روشنی ڈالی تھی اور واضح کیا تھا کہ ان میں سے کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی درست نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ فوق الواحد منحرف ترجمہ کو معیاری کہا جاسکے۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے ایک دانش جو نے اس موضوع سے متعلق خاص سوال پیش کیا جو سابقہ عزائم کے لیے مؤید بنا اور اس عمل میں آنے کے لیے پہلے سے موجود دو سے مل کر ”ثالث ثلاثہ“ بنا۔

مسئلہ یہ ہے کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام بتاریخ 29 اپریل 2013ء مشکلات ترجمۃ القرآن کے نام سے جو کانفرنس ہوئی اُس میں آپ نے جو مقالہ پڑھا اُس کے مطابق قرآن شریف کا درست ترجمہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ آپ نے عام ترجمہ کے لیے دس (10) شرائط سمیت قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے مزید دس (10) شرائط جو پیش کی ہیں اُن کا احاطہ کرنا خاص علماء کے لیے بھی ممکن نہیں ہے چہ جائیکہ عام لوگ اُنہیں سمجھ سکیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ عربی زبان سے ناواقف لوگ قرآن شریف کے معانی کو سمجھنے سے محروم رہیں گے جس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے شرائط کو کم سے کم اور آسان کیا جائے۔

منجانب:- مکی دانش ہو، انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جواب:- سوال کے انداز سے معلوم ہو رہا ہے کہ سائل کو فن ترجمہ کی اہمیت کا احساس نہیں ہے اور نہ ہی ترجمۃ القرآن کے احتیاطی تقاضوں کا ادراک ہے۔ اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے شرط کے مفہوم سے پردہ اٹھادیں یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے ہر دو زبانوں میں اس کا استعمال ایک عمل کو دوسرے عمل پر موقوف کرنے یا اس طرح مربوط کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر اس کا وجود نہیں ہوتا چاہے اس کی نوعیت جیسی بھی ہو۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

”الشَّرْطُ كُلُّ حُكْمٍ مَّعْلُومٍ يَتَعَلَّقُ بِأَمْرٍ يَقَعُ بِوُقُوعِهِ“ (۱)

یعنی ہر وہ معلوم حکم جو کسی ایسی چیز کے ساتھ متعلق ہو جائے کہ اُس کے واقع ہونے کے سبب سے یہ بھی واقع ہو جائے۔

(۱) مفردات القرآن، مادہ: (ش، ر، ط)۔

ان میں سے موقوف کو مشروط اور موقوف علیہ کو شرط کہا جاتا ہے اور مشروط کا وجود بغیر شرط کے نہ ہونے کی طرح شرط کا تصور بھی مشروط کے تصور کے بغیر نہیں ہوتا۔ نیز شرط کے اس عمل کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:۔ اُسے وجود میں لانے کے لیے انسانی عمل دخل ہوتا ہے یعنی جب تک انسان اُس کا ارتکاب نہ کرے اُس وقت تک اللہ تعالیٰ بھی اُس کی تخلیق نہیں فرماتا چاہے انسان کا یہ عمل جائز ہو یا ناجائز فرق صرف یہ ہے کہ ناجائز ہونے کی صورت میں وہ عند اللہ و عند الرسول کا عدم قرار پاتی ہے یعنی غیر موثر ہوتی ہے یا کراہت کے درجہ میں رہ جاتی ہے جس کی مثالوں میں انسانوں کے مابین ہونے والے معاملات میں مقرر کی جانے والی ناروا اور مشروط فاسدہ کی تمام شکلیں شامل ہیں اور جائز ہونے کی صورت میں انسان اُن کی تکمیل سے متعلق مسئول و ذمہ دار ہو جاتا ہے اس کی مثالوں میں مختلف عقود و معاملات میں لگائے جانے والی تمام شرطیں شامل ہیں۔

دوسری قسم:۔ اُس کے وجود و اعتبار میں اور اُس کا کسی کام کے لیے موقوف علیہ ہونے میں انسانی عمل کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ خالصتاً تکوین الہی کا حصہ اور امور تکوینیہ کے قبیل سے ہوتی ہے اس کی مثالوں میں شرعی احکام کے ساتھ مکلف و ذمہ دار ہونے کے لیے عقل کا شرط ہونا، بلوغ کا شرط ہونا، وجوب زکوٰۃ کے لیے نصاب کا نامی اور حولی ہونے کا شرط ہونا اور نماز کی صحت کے لیے طہارت کی شرط ہونے جیسی انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں پائی جانے والی ہزاروں شرطیں شامل ہیں اسی طرح مختلف علوم و فنون میں اور لسانیات میں فصاحت و بلاغت کے حوالہ سے پائی جانے والی وہ شرائط جن کی نشان دہی ان فنون کے ماہرین نے کی ہیں، بھی امور تکوینیہ کے حصے ہیں جس میں انسانوں کے کسب و عمل کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ہر فن کے لوگ اور لسانیات کے ہر شعبہ سے وابستہ حضرات انہیں پیش نظر رکھنے کے پابند ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کلام کے بلیغ ہونے کے لیے فصاحت کا شرط ہونا محض تکوین الہی ہے کہ جب تک کلام کے جملہ مفردات سے لے کر اُن کے ارتباطی انداز تک سب کے سب فصیح نہیں

أصول ترجمہ

ہوں گے اُس وقت تک بلیغ کلام وجود میں لانا ممکن نہیں ہوگا اسی طرح فصاحت کے لیے کلام کے تمام مفردات کا غرابت اور سمعی کراہت سے محفوظ ہونے کی شرط ہونا بھی محض امر تکوینی ہے جس میں انسانوں کے کسب و عمل کا کوئی دخل نہیں ہے یہ الگ بات ہے کہ فن کے ماہرین نے موقوف و موقوف علیہ اور شرط و مشروط کے اس تکوینی ارتباط کی نشان دہی کی ہے تاکہ اُصول فطرت کے اس ارتباط کی پابندی کی جائے اسی طرح علم نحو میں بتایا گیا یہ اُصول فطرت کہ نو (9) اسباب منع صرف میں سے وصف کے لیے شرط یہ ہے کہ محض استعمال و ترکیبی وصف نہ ہو بلکہ اصل وضع کے اعتبار سے وصف ہو یہ سب کچھ لسانِ عربی کے حوالہ سے تکوینِ الہی کے حصے ہیں جس میں نجات کے کسب و عمل کو دخل ہے نہ ہلغاء کے کسب و عمل کو بلکہ ان حضرات نے تکوینِ الہی کے ان اُصولوں کی نشان دہی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔ یہی حال فنِ ترجمہ کا بھی ہے کہ مستقل فن ہونے کی حیثیت سے اُس کی صحت کے لیے جتنی شرطیں بھی ضروری ہیں وہ سب کے سب تکوینِ الہی کے حصے ہیں انسان کو اُن میں قطعاً کوئی عمل دخل و اختیار نہیں ہے کہ کمی بیشی کر سکے۔

عام ترجمہ کے لیے یعنی دُنیا کی کسی بھی زبان میں لکھی گئی کسی بھی فصیح و بلیغ کتاب کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کے لیے ہم نے جن دس (10) شرائط کی نشان دہی کی ہے اُن میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس میں ہمارے کسب و اختیار کو دخل ہو یا مقتضائے فطرت اور تکوینِ الہی کا مظہر نہ ہو یا اُس کے بغیر ترجمہ کی صحت کا تصور ہو سکے۔ مثال کے طور پر ہم نے عام ترجمہ کی صحت کے لیے جن دس (10) شرائط کی نشان دہی کی ہیں، اُن میں؛

① متن سے اصل صاحبِ کلام کے مقصد سمیت اُس کے جملہ لوازمات اور لسانی حیثیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہے کہ جب تک ترجمہ کرنے والے کو اُس سے متعلق ان تمام چیزوں کا احاطہ نہیں ہوگا اُس کے مطابق ترجمہ وجود میں لانا ممکن نہیں ہوگا۔ چاہے مترجم کو ترجمہ والی زبان کے جملہ گوشوں کا احاطہ ہی کیوں نہ ہو وہ کون سا سلیم الفطرت انسان ہو سکتا ہے جو اس کے بغیر

أصول ترجمہ

درست ترجمہ کا تصور کر سکے یا اس شرط کو تکوین الہی کا حصہ کہنے میں تردد کرے یا کسی مترجم کے لیے اس سے بے اعتنائی برتنے کو جائز کہہ سکے۔

عام ترجمہ میں اس کی خلاف ورزی پر مشتمل تراجم کے سلسلہ دراز میں مندرجہ ذیل کو دیکھا جاسکتا ہے:

❶ فتاویٰ رضویہ شریف کی عربی عبارات کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے مولانا محمد احمد مصباحی نے لفظ ”ما بین العذارین والاذن“ کا ترجمہ ”رخساروں اور کان کا درمیانی حصہ“ لکھا ہے جو اصل کے مطابق نہیں ہے کیوں کہ عربی زبان میں ”عذار“ بمعنی ”رخسار“ کی کوئی مثال موجود نہیں ہے بلکہ مردوں میں استعمال ہونے والا یہ لفظ چاہے مفرد ہو یعنی ”عذار“ یاثنیہ یعنی ”عذارین“ اس کے صرف دو مصرف ہوتے ہیں:

پہلا:- داڑھی نکلنے سے پہلے چہرے کا وہ حصہ جو رخسار اور کان کے ساتھ متصل سفید حصے کے درمیان ہوتا ہے۔

دوسرا:- اُسی جگہ پر اُگنے والے بال جو نو جوانی کے اوائل میں باریک ریشمی شکل میں ہوتے ہیں بعد میں آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے داڑھی کا مستقل حصہ بن جاتے ہیں۔

جس کی جغرافیائی حدود اس طرح ہیں کہ اس کے نچلے حصہ میں داڑھی ہوتی ہے اور اوپر

والے حصہ میں سر کے بال ہوتے ہیں اور ہر دو برابر کی جانب میں ایک طرف رخسار ہوتا ہے جبکہ

دوسری طرف کان کے ساتھ متصل وہ سفید جگہ ہوتی ہے جس پر بال قطعاً نہیں ہوتے۔ گویا عذار کا

دوسرا مفہوم مذکورہ حدود اور بعد میں محدود بالوں کی وہ قلمی شکل ہے جو عرض میں ایک طرف رخسار کے

ساتھ متصل ہے۔ دوسری طرف چہرہ کی سمت سے کان کے ساتھ متصل بالوں سے خالی اور سفید حصہ

کے ساتھ متصل ہے جبکہ طول میں داڑھی کے فوقانی حصہ کے ساتھ اور سر کے کان اور چہرے کی

طرف تحتانی حصہ کے ساتھ متصل ہے عربی لغت کی نہایت مشہور کتاب لسان العرب میں لکھا ہے:

”وَعَذَارُ الرَّجُلِ شَعْرَةُ النَّابِتِ فِي مَوْضِعِ الْعَذَارِ“ (۱)

(۱) لسان العرب، ج: 4، مادہ: (ع، ذ، ن)۔

أصول ترجمہ

یعنی مردوں میں استعمال ہونے والا عذارہ بال ہیں جو عذار کی جگہ میں اُگتے ہیں۔

جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مردوں میں استعمال ہونے والے اس لفظ کا اصل

اور وضعی استعمال اُس خارجی جگہ کے لیے ہے جس کی حدود اربعہ ہم نے بتائے ہیں اور دوسرا محاوراتی

استعمال ہے جو اُس جگہ پر اُگنے والے بالوں کے لیے ہوتا ہے۔ فقہاء کرام کی پیش نظر عبارت ”ما

بین العذارین“ میں یہی چیز تشبیہ استعمال ہوئی ہے کیوں کہ ہر مرد میں ایک نہیں بلکہ دو عذار ہوتے

ہیں۔ فقہاء کرام کی یہ عبارت دراصل چہرے کی حدود اربعہ کی تعین کے سلسلہ میں نتیجہ کے طور پر

استعمال ہوئی ہے کہ جب طول میں چہرہ کی حد اسفل الذقن سے لے کر پیشانی کے اوپر والے حصہ

کے ساتھ متصل سر کے بال شروع ہونے والی جگہ تک ہے اور عرض میں ”مِنْ شَحْمَةِ الْأُذُنِ إِلَى

شَحْمَةِ الْأُذُنِ“ ہے جس کا دھونا وضو میں فرض ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ عذار اور شحمة الاذن

کے مابین بالوں سے خالی جگہ کا دھونا بھی فرض میں شامل ہوگا کیوں کہ وہ بھی چہرے کی حدود اربعہ

کے ماتحت ہے لیکن عبارت کا ظاہری انداز اس واحد مقصد پر دلالت کرنے میں سہل الفہم نہیں ہے

کیوں کہ یہ دراصل باب ”تَغْلِيْبُ“ کے قبل سے ہے جس کے مطابق چہرے کے ہر دو جانب

موجود ان قلموں کو جو درحقیقت ایک ایک ہیں ”شحمة الاذن“ پر غلبہ دے کر مذکورہ لفظ ”ما بین

العذارین“ کہا گیا ہے جو کمال ایجاز و اختصار میں چھ الگ الگ چیزوں پر دلالت کر رہا ہے جن

میں سے دو چہرے کی دونوں اطراف میں انفرادی طور پر موجود عذار ہیں جنہیں اُردو محاورہ میں قلم کہا

جاتا ہے اور دو ہر دو کانوں کے ساتھ انفرادی طور پر موجود ”شحمة الاذن“ ہیں اور دو ہر دونوں

جانب انفرادی طور پر موجود ”ما بین شحمة الاذن والعذار“ وہ جگہ ہیں جن میں بال نہیں

ہوتے۔ ہزار رحمت فقہاء کرام کی بلاغت شناسی پر کہ انہوں نے باب ”تَغْلِيْبُ“ کے اس اختصار

میں کمال کیا ہے لیکن مترجمین پر افسوس کہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر رہ کر فقہاء کرام کے

دل زخمی کر دیئے، کیا سے کیا بنا دیا۔ اور فقہاء کرام کی اس حوالہ سے متعدد عبارات جیسی ”فَمَا بَيْنَ

الْعِذَارَيْنِ يَجِبُ غُسْلُهُ، فَمَا بَيْنَ الْعِذَارَيْنِ دَاخِلٌ فِي الْوُجْهِ، مَا بَيْنَ الْعِذَارَيْنِ وَالْأُذُنِ

أُصُولُ تَرْجُمِهِ

يَجِبُ غُسْلُهُ لَأَنَّهُ مِنَ الْوَجْهِهِ“ میں عِدَار کا ترجمہ ”خط، قلم، شحمة الاذن اور داڑھی کے قلم والے حصہ کے درمیان“ جیسے کسی بھی درست انداز میں کرنے کے بجائے ”عِدَار“ کا ترجمہ ”رُخسار“ میں کرنا اُلٹی منطق ہے جس کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ فتاویٰ رضویہ جیسے عظیم سرمایہ ایمان کی عربی عبارات کے تراجم میں اس قسم غلط تراجم پر نظر ثانی کرانا ناشر ادارے پر فرض لازم بنتا ہے۔

دوسری مثال:- ابتدائے وحی سے متعلق بخاری شریف کی حدیث کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی اکرم سید عالم ﷺ کے پاس جب غار حراء میں سورۃ علق شریف کی ابتدائی چند آیات لے کر آئے اور کہا ”اِقْرَأْ“ جس کے جواب میں اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے کہا ”مَا اَنَا بِقَارِءٍ“ اس کے اکثر تراجم مذکورہ اصول سے خلاف کیے گئے ہیں من جملہ اُن میں سے جمعیت الغرباء دہلی کے رہنما مولانا عبدالستار صاحب دہلوی کا ترجمہ بھی ہے جو نصرۃ الباری ترجمہ صحیح البخاری کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں حدیث کے مذکورہ الفاظ ”فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِءٍ“ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے: ”میں نے کہا کہ کیسے پڑھوں میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں“ (۱)

اہل علم جانتے ہیں کہ ترجمہ کے اس انداز کو اُس کے مطابق نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ یہ اُس کی لسانی حیثیت کے منافی ہے کہ اُس میں لفظ ”مَا“ حرف نفی مشابہ بلیس ہے اور ”اَنَا“ محل مرفوع ہو کر اُس کا اسم ہے اور حرف ”ب“ زائد ہے جس کے بعد ”قَارِءٍ“ محل قریب کے مطابق لفظاً مجرور ہے جبکہ محل بعید کے مطابق محل منصوب ہے۔ اس جملہ اسمیہ سے حاصل مفہوم اور اس کے مطابق ترجمہ ”میں پڑھنے والا نہیں ہوں، میں نہیں پڑھتا، میں نہیں پڑھوں گا“ جیسے انداز کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے چہ جائیکہ دو متضاد جملوں میں کیا جائے جیسا اس ترجمہ میں کیا گیا کہ پہلے ”کیسے پڑھوں“ جیسے جملہ انشائیہ میں کرنے کے بعد ”میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں“ جیسے جملہ خبریہ میں کیا

(۱) نصرت الباری، ج: 1، ص: 32۔

أصول ترجمہ

گیا ہے جسے فحش غلطی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ متن کے ایک جملہ کا ترجمہ بھی اُس کے مطابق ایک ہی جملہ میں ہونا ضروری ہے وہ اگر انشائیہ ہے اُس کا ترجمہ بھی انشائی انداز میں اگر خبریہ ہے ترجمہ بھی خبری انداز میں ورنہ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہی یہی ہے کہ ”إِبْدَالُ لَفْظَةٍ تَقُومُ مَقَامَهَا“ (۱) یعنی متن کے لفظ کو ترجمہ والی زبان کے لفظ میں اس طرح بدلا جائے کہ اُس کے لوازمات و تقاضے متاثر نہ ہونے پائیں ورنہ اصل کا کوئی ایک لازمہ یا ایک ضروری تقاضا سے خلاف ہونے کی صورت میں بھی محض لفظی تبدیلی ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایک جملہ والے متن کا ترجمہ دو متضاد جملوں میں کرنے کو اصل کے مطابق کہا جائے۔ تو پھر ترجمہ کے اس انداز کو غلط فحش کے سوا اور کیا کہا جائے جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مترجم نے متن کی لسانی حیثیت والی شرط کو پیش نظر نہیں رکھا ورنہ ایسی ٹھوکر کبھی نہ کھاتا۔

یہ المیہ متن کے صرف ایک جزو ”مَا آتَا بِقَارِءٍ“ کے ترجمہ کا ہے جبکہ اس کے متصل قبل والا جملہ فعلیہ ”فَقُلْتُ“ کے ترجمہ میں فاعل تعقیبیہ کو نظر انداز کرنے کا المیہ اس کے علاوہ ہے کہ اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق ترجمہ ”پھر میں نے کہا“ لکھنے کے بجائے فاعل تعقیبیہ کو ہیچ سمجھ کر ”میں نے کہا“ لکھ دیا ہے حالاں کہ یہ ”قا“، فاعل تعقیبیہ اور حرف عطف ہونے کی بنا پر نہایت اہمیت کی حامل ہے جسے بلاغت کی زبان میں حرف واصل بھی کہا جاتا ہے کہ جس جملہ پر داخل ہوتا ہے اُسے ماقبل یعنی معطوف علیہ والا جملہ کے ساتھ موصول و متصل کر دیتا ہے اور اسے نظر انداز کرنے کی صورت میں ماقبل و مابعد والے دونوں جملے وصل کے زمرے سے نکل کر فصل کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں جو مقتضائے مقام سے خلاف اور بلاغت کے منافی ہے جس کے لیے تلخیص المفتاح میں کہا ہے ”وَمَقَامُ الْوَصْلِ يُبَيِّنُ مَقَامَ الْفَصْلِ“ (۲)

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۱۱، مطبوعہ قاہرہ مصر۔

(۲) تلخیص المفتاح، ص: ۵۔

اصول ترجمہ

ترجمہ قرآن سے قطع نظر عام ترجمہ کی مذکورہ شرط یعنی متن کی لسانی حیثیت اور اس کے جملہ لوازم و تقاضوں کو پیش نظر رکھنے کی اہمیت اور اس سے خلاف ہونے کی مذکورہ عمومی مثالوں کے علاوہ قرآنی مثالوں کی ایک جھلک اشرف علی تھانوی کا مندرجہ ذیل ترجمہ ہے جو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کے ترجمہ میں اس نے لکھا ہے:

”شروع کرنا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔“

ترجمہ کا یہ انداز مذکورہ شرط سے خلاف ہے۔ اولاً اس لیے ہے کہ اس میں بسم اللہ شریف کے دوسرے حصہ یعنی اسم جلالت اور اس کی یکے بعد دیگرے دونوں صفات کے مجموع مرکب کا ترجمہ جملہ میں کیا گیا ہے۔ جو لفظ ”ہیں“ سے ظاہر ہے اور علم نحو و بلاغت سے شناسائی رکھنے والے جانتے ہیں کہ صفت و موصوف کا مجموع مرکب جملہ ہرگز نہیں بلکہ جملہ کے مقابلہ میں مفرد اور مرکب غیر تام ہوتا ہے تو پھر متن سے متضاد اس جملہ کو اس کا معیاری ترجمہ کہنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ لغت کے اعتبار سے نہ علم نحو کی رو سے، علم بلاغت کی روشنی میں نہ مفسرین کرام کی تصریحات میں۔ لسان قرآنی کے ہر شعبہ سے مسترد و مکروہ سمجھے جانے والے اس انداز کو کسی بھی عربی کتاب کا معیاری ترجمہ نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کے مقدس و معجز کلام کا معیاری ترجمہ کہا جائے۔ مقام تعجب ہے کہ متن کی لسانی حیثیت اور اس کے اپنے محاورہ کے مطابق ترجمہ:

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

جیسے کسی بھی انداز سے جب درست ہو سکتا ہے تو پھر اسے چھوڑ کر اس بے ڈھنگے انداز پر چلنے کی کیا ضرورت تھی جو متن کی لسانی حیثیت اور اس کے محاورہ سے سراسر خلاف ہے۔ نیز حضرت شیخ سعدی سے لے کر شاہ عبدالقادر تک جن اسلاف سے تراجم ثابت ہیں ان سب نے بھی ”بِسْمِ اللّٰهِ

أصول ترجمہ

الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ شریف کا ترجمہ اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق ہی کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔)

جو متن کی لسانی حیثیت کے عین مطابق اور بے غبار ہے یہ الگ بات ہے کہ ایجاز و اختصار اور دوسری شرائط کی روشنی میں اس سے بھی بہتر کی گنجائش ہو سکتی ہے جبکہ لفظ ”ہے“ لگا کر متن کی لسانی اور اُس کی محاورتی حیثیت کو مجروح کرنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے جس کا ارتکاب تھانوی نے کیا ہے یا اُس کی اندھی تقلید میں مبتلا کچھ اور حضرات نے کیا ہے۔ جس کی واحد وجہ مذکورہ شرط سے بے توجہی ہے ورنہ متن کی لسانی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والوں سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہو سکتی۔

ثانیاً:- اس میں شانِ الہی کی تعظیم و آداب کو انسانوں کے آداب و تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لا شریک کے لیے جمع کے الفاظ ”ہیں“ استعمال کیے گئے ہیں جو متن کی لسانی و محاورتی حیثیت کے منافی ہونے کے ساتھ پیغمبری طریقے سے بھی خلاف ہے کیوں کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے جمع کے الفاظ کہیں ثابت نہیں ہیں حالاں کہ شانِ الہی کی تعظیم و ادب کے حوالہ سے کوئی اور شخص پیغمبر سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

الغرض ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کے ترجمہ میں تھانوی صاحب نے یہ دو غلطیاں ایسی کی ہیں کہ اُس سے قبل ان کی مثال نہیں ملتی اور ان دونوں کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے بے خبری ہے۔ ایسے میں متن کی لسانی حیثیت کی پابندی کو ترجمہ کے لیے ناگزیر شرط کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

دوسری مثال:- آیت کریمہ ”قَالَ اِنَّهُ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ“ کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ”حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو“ جو متن کی لسانی حیثیت سے خلاف اور غلط فحش ہے کیوں کہ لفظ ”بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ“ لسانِ قرآنی میں ”زرد رنگ کی گائے“ کے سوا

أصول ترجمہ

اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ ”زرد رنگ کا بیل“ ہو کیوں کہ نحوی اصولوں کے مطابق اس پر آیا ہوا الف تانیث جس اسم پر بھی آتا ہے وہ ہمیشہ مونث ہوتا ہے جس کے متعلق علم نحوی کتابوں میں کہا گیا ہے:

”ممتنع صرفہما البتۃ لان الالف قائم مقام السببین التانیث ولزومه“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ الف تانیث ممدودہ ہو جیسے لفظ ”حرآء“ میں ہے یا مقصورہ ہو جیسے لفظ حُملیٰ

میں ہے ان میں سے جو بھی کسی اسم پر آیا ہوا ہو تو اُس اسم کا منصرف ہونا ممکن نہیں ہے کیوں کہ

یہ الف منع صرف کے دو سببوں کے قائم مقام ہے کہ ایک تانیث ہے اور دوسرا لزوم تانیث ہے

کہ یہ جس اسم پر بھی آئے اُس کا مذکر ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مونث ہی ہوتا ہے۔

ایسے میں آیت کریمہ ”بَقْرَةُ صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ زرد رنگ کے بیل میں کرنے کی مثال

اس جہالت سے مختلف نہیں ہے کہ کوئی شخص ”امرئۃ صفرآء“ کے ترجمہ میں زرد رنگ کا مرد کہے یا

”امرئۃ حُملیٰ“ کے ترجمہ میں حاملہ مرد کہے۔ متن کی لسانی حیثیت کے خلاف ایسے غلط تراجم لکھنے

والوں پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ یہ لکھتے وقت اتنا بھی نہیں سوچا کہ آیت کریمہ کے لفظ

”صَفْرَاءُ“ پر آئی ہوئی الف تانیث کو اُس کے مصداق کا مونث ہونا لازم ہے کہ بغیر مونث کے

اس کے استعمال کی قطعاً کوئی مثال عربی زبان میں موجود نہیں ہے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ فحش

غلطی کی اس بدترین مثال کو لکھتے وقت اگر ان کو الف تانیث کے لازم التانیث ہونے کا خیال ہوتا یا

کم از کم مذکر کے لیے اس کے استعمال کو لسانِ قرآنی کے منافی ہونے کا تصور ہوتا یا لفظ ”صَفْرَاءُ“

اور بیل کے مابین تضاد پر نظر ہوتی یا علم نحوی درجنوں کتابوں میں پڑھا ہوا سبق ”ممتنع صرفہما

البتۃ لان الالف قائم مقام السببین التانیث ولزومه“ (۲) یاد ہوتا تو اس شرمناک غلطی کا

ہر گز ارتکاب نہ کرتے۔

متن کی لسانی حیثیت کو پیش نظر رکھنے کی شرط سے غفلت کی وجہ سے غلط ہونے والے

(۱) ہدایۃ النحو، بحث غیر منصرف۔

(۲) ہدایۃ نحو بحث اسباب منع صرف۔

أصول ترجمہ

ترجمہ کی اس مثال میں صرف ایک بار غلطی نہیں کی گئی بلکہ یہاں پر متن کی لسانی حیثیت کو پامال کرنے کی ایک درجن مثالیں قائم کی گئی ہیں۔ ایک آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْهَبُوا بِقُرَّةَ“ کے ترجمہ میں۔ دوسری ”إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بِقُرَّةَ صَفْرَاءُ“ کے ترجمہ میں اور دس بار گائے کی طرف راجع ہونے والے ضمائر کے ترجمہ میں۔

عام ترجمہ کی مذکورہ شرط یعنی متن کی عبارت النص اور اس کی لسانی حیثیت کا ایک پہلو اصل لغت کا بھی ہے جسے متن لغت بھی کہا جاتا ہے اس میں اور لغت میں عموم و خصوص کا فرق ہے کیوں کہ لغت ہر زبان کے الفاظ مفردہ و مواد سے لے کر اس کی جملہ فنی حیثیات و محاورہ تک سب کو شامل ہے جبکہ متن لغت الفاظ مفردہ و مواد کے سوا کسی اور حیثیت کو شامل نہیں ہے جس کے مطابق ہر متن لغت کو لغت کہا جاسکتا ہے لیکن ہر لغت کو متن لغت نہیں کہا جاسکتا۔ اسی وجہ سے اسے لغت کی ایک شاخ کے طور پر مستقل علم شمار کیا گیا ہے جس کے ذریعہ زبان کے مانوس الاستعمال الفاظ کی غیر مانوس الاستعمال اور غریب و شاذ الفاظ سے تمیز کی جاتی ہے جس کے متعلق تلخیص المفتاح میں کہا گیا ہے ”مِنْهُ مَا يُبَيِّنُ فِي عِلْمِ مَتَنِ اللُّغَةِ“۔

جس کی تشریح کے سلسلہ میں امام الفتا زانی نے کتاب المطول علی التلخیص میں کہا ہے؛

”لأن اللغة قد تطلق على جميع أقسام العربية“ (۱)

عام ترجمہ کی پہلی شرط یعنی متن کی عبارت النص کے ساتھ اس کی لسانی حیثیات کے جملہ پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کی ذیلی شاخ ہونے کی حیثیت سے اس کی مستقل اہمیت ہے۔ اس سے بے اعتنائی کے غلط نتائج کی پہلی مثال فتاویٰ رضویہ کی مندرجہ ذیل عبارت ”وللدارد المحقق ابن الهمام علی بعض المشائخ حيث اقتصروا بقول الامامين بانه لا يعدل عن قول الامام الا لضعف دليله“ کا کیا گیا درج ذیل ترجمہ ہے جو مولانا محمد احمد مصباحی نے کیا ہے۔ ”اسی

(۱) کتاب المطول مع حاشیہ میر السید السند، ص: 33، مکتبہ الداوری قم ایران۔

طرح محقق ابن ہمام نے بعض مشائخ کے اُس فتویٰ پر اعتراض کیا ہے جو انہوں نے صاحبین کے قول پر دیا اور فرمایا کہ امام کے قول سے صرف اُسی وقت عدول کیا جائے گا جب اُن کی دلیل کا ضعف ظاہر ہو“ (۱) اِس میں متن لغت کے حوالہ سے پانچ جگہوں میں اصل سے خلاف کیا گیا ہے؛
اول:- متن کے لفظ ”لِذَا“ کے ترجمہ میں ”اِسی طرح“ کہنے میں حالاں کہ عربی زبان کے متن لغت میں لفظ ”لِذَا“ کا تشبیہ کے لیے استعمال ہونے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے جبکہ ترجمہ کا یہ لفظ ”اِسی طرح“ تشبیہ میں صریح و ظاہر ہے تو پھر اُس کے مطابق کیوں کہلائے۔

دوم:- متن کے لفظ ”رَدّ“ کے ترجمہ میں ”اعتراض کیا ہے“ کہنے میں حالاں کہ عربی زبان کے متن لغت میں لفظ ”رَدّ“ اور اس سے اشتقاق پا کر استعمال ہونے والے الفاظ جس چیز سے بھی متعلق ہوتے ہیں اُس سے انکار اور عدم تسلیم پر ہی دلالت کرتے ہیں جس میں مخالف کے لیے نرم گوشے کا احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔ اِس سے برعکس اعتراض کرنے میں بڑی وسعت ہے جس کے مطابق نہ ہر ”رَدّ“ اعتراض ہے اور نہ ہر اعتراض ”رَدّ“ ہے اور کبھی دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں جسے علم کی زبان میں عموم و خصوص من وجہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ متن لغت کے حوالہ سے حقائق کی اِس روشنی میں مولانا محمد احمد مصباحی کے مذکورہ ترجمہ کو اصل کے مطابق کیوں کہا جائے۔

سوم:- متن کے لفظ ”حِثّ“ کے ترجمہ میں ”جو“ کہنے میں جیسا ترجمہ کے الفاظ ”جو انہوں نے صاحبین کے قول پر دیا“ سے صاف ظاہر ہے حالاں کہ عربی زبان کے متن لغت میں لفظ ”حِثّ“ کا اِس قسم معانی و مفہوم کے لیے استعمال ہونے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

چہارم:- متن کے لفظ ”بِأَنَّهُ“ کے ترجمہ میں ”فرمایا“ کہنے میں جیسا ترجمہ کے مذکورہ الفاظ ”اور فرمایا کہ امام کے قول سے معلوم ہو رہا ہے“ یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ عربی زبان کی متن لغت میں لفظ ”بِأَنَّهُ“ کا فرمانے میں استعمال ہونے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے تو پھر یہ اُس

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: ۳، ص: ۱، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔

کے مطابق کیوں کہلائے۔

پنجم:- متن کے لفظ ”الا“ کے ترجمہ میں ”صرف اسی وقت“ کہنے میں جیسا ترجمہ کے مذکورہ الفاظ ”امام کے قول سے صرف اسی وقت عدول کیا جائے گا جب اُن کی دلیل کا ضعف ظاہر ہو“ سے صاف معلوم ہو رہا ہے حالاں کہ عربی زبان کے متن لغت میں لفظ ”الا“ کا استعمال استثناء کے لیے یا کبھی کبھی لفظ ”غیر“ کے اسی معنی کے لیے استعمال ہونے سے خالی نہیں ہوتا جو عربی زبان کی لغت سے قدرے مناسبت رکھنے والوں سے بھی مخفی نہیں ہے چہ جائیکہ ترجمہ کے اس انداز میں استعمال ہونے کی کوئی مثال یا کوئی محاورہ موجود ہو۔

الغرض مترجم کی ان پانچوں غلطیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ترجمہ کی مذکورہ شرط سے یعنی متن کے مفردات کی متن لغت والی حیثیت سے بے اعتنائی کی ہے جس کے نتیجہ میں متن کا مفہوم ہی مسخ ہو رہا ہے جو نہ صرف فتاویٰ رضویہ کے مصنف کے لیے بلکہ جن سے انہوں نے نقل کیا ہے اُن کے لیے بھی روحانی اذیت کا سامان بن رہا ہے جبکہ اُن کے منشاء کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی لغوی حیثیت کے بھی مطابق ترجمہ یوں ہو سکتا ہے ”اور اسی وجہ سے محقق ابن ہمام نے بعض مشائخ پر رد کیا ہے جہاں انہوں نے صاحبین کے قول پر اس تصور کے سبب فتویٰ دیا ہے کہ بے شک وہ امام کے قول سے متجاوز نہیں ہوتا مگر اُس کی دلیل ضعیف ہونے کی وجہ سے“ جو نہ صرف متن کے جملہ مفردات کی لغوی حیثیت کے مطابق اور بے غبار ہے بلکہ اُس کی لسانی حیثیت کے تمام پہلوؤں پر بھی منطبق ہے جس سے بے راہ ہو کر مذکورہ اغلاط کی راہ اختیار کرنے کی واحد وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ عام ترجمہ کی مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کی گئی ہے۔ اس غلطی میں فتاویٰ رضویہ کی جلد اول کے مترجم کے ساتھ جلد دوازدہم کے مترجم بھی کافی حد تک شریک ہیں جو اس کے صفحہ نمبر 117 پر فقہاء کی مذکورہ عبارت کے ترجمہ پر غور کرنے والوں سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ دونوں مترجموں کی اس غلطی کی وجہ سے حضرت ابن ہمام سے لے کر ابن عابدین اور فتاویٰ رضویہ کے مصنف تک سب کو عالم برزخ میں کوفت محسوس ہو رہی ہوگی۔ (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْمُشْتَعَلِي)

دوسری مثال:- بخاری شریف کی ابتدائی حدیث ”اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّتِ“ سے متعلق امام

بخاری نے اپنی سند بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے جو ”حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ“ سے لے کر عمر ابن الخطاب تک جا رہا ہے اس کے ابتدائی حصہ ”حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ“ کا ترجمہ نصرت الباری ترجمہ صحیح بخاری کے مترجم مولانا عبدالستار نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے ”اس کی تفسیر ہم سے بیان کی حمیدی نے“ جو متن لغت کے حوالہ سے ”حَدَّثَنَا“ پر منطبق نہیں بلکہ خلاف ہے کیوں کہ متن لغت کے مطابق ”حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا، أَلْبَسَنَا“ جیسے الفاظ کا تعلق سند کے بعد مذکور ہونے والے کلام کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ نہیں ہوتا چہ جائیکہ تفسیر سے متعلق ہو۔

محدثین نے بھی عربی زبان کے متن لغت کے عین مطابق انہیں بعد السند مذکور ہونے والے متن حدیث سے متعلق استعمال فرمایا ہے۔ حقیقت کی اس روشنی میں مترجم کا یہ کہنا کہ ”اس کی تفسیر ہم سے بیان کی حمیدی نے“ اس کے مطابق کیوں کہلائے مترجم کی اس غلطی کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ لکھتے وقت مترجم نے ترجمہ کی حقیقت کو بھی پیش نظر نہیں رکھا کہ وہ ”إِبْدَالُ الْفَاطِ الْمَتْنِ بِالْفَاطِ اللِّسَانِ الْآخِرِ الَّتِي تَقُومُ مَقَامَهَا“ سے عبارت ہے (۱) یعنی متن کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ کے ساتھ بدلنا ہے جو ان کے قائم مقام ہو جائیں یعنی ان سے متکلم کے مقصد اور ان کی لسانی حیثیت کے عکس ہو جائیں۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری کے مذکورہ الفاظ کے مترجم اس حقیقت کو ہی پیش نظر رکھتے تو ایسی غلطی کبھی نہ کرتے کیوں کہ ”إِبْدَالُ الْفَاطِ الْأَصْلِ بِالْفَاطِ اللِّسَانِ الْآخِرِ الَّتِي تَقُومُ مَقَامَهَا“ کے لیے یہاں پر متن میں صرف تین الفاظ ہیں:

اول:- ”حَدَّثَ“ ہے جو فعل کہلاتا ہے۔

دوم:- لفظ ”نَا“ ہے جو ضمیر منصوب متصل مفعول بہ کہلاتا ہے۔

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۱۱، مطبوعہ دار الحديث قاہرہ مصر۔

اصول ترجمہ

سوم:- لفظ ”الحَمِيدِي“ ہے جو اسم ظاہر اور فاعل کہلاتا ہے۔

اس کے مطابق اُس کا حقیقی ترجمہ ”حدیث بیان کی ہم سے حمیدی نے، حمیدی نے ہم سے حدیث بیان کی، ہم کو حمیدی نے حدیث بیان کی“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا تھا جو ترجمہ کی تعریف کے مطابق ہونے کے ساتھ متن سے متکلم کی مراد کے بھی مطابق ہے جسے چھوڑ کر ترجمہ کے نام سے اس بے ڈھنگاپن میں پڑنے کی وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اصل سوال نامہ کا بقدر ضرورت جواب دینے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ ترجمہ کی حقیقت اور اس کے پس منظر و پیش منظر سے مکمل پردہ اٹھاؤں جو تین بابوں پر مشتمل ہوگا۔

پہلا باب:- عام ترجمہ سے متعلق ہوگا جس میں لفظ ترجمہ اور اُس سے اشتقاق پاکر مختلف معانی کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ اور اُن کے مواقع استعمال کی وضاحت کی جائے گی اور ترجمہ کے لغوی مفہوم اور عرف عام میں متعارف مفہوم کی تفریق بتانے کے ساتھ مستقل فن کی حیثیت سے اُس کی تعریف، غرض، موضوع بھی بیان کیے جائیں گے اور عام ترجمہ یعنی کسی بھی کتاب کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے ناگزیر شرائط کی تفصیل بتائی جائے گی اور مثالوں سے واضح کیا جائے گا کہ اُن میں سے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں بھی ترجمہ بے مقصد، غیر معیاری اور غلط ہو سکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ کے خلاف ترجمہ کو درست کہا جائے۔ ترجمہ الالفاظ اور ترجمہ الکلام کے مابین فرق بتانے کے ساتھ بے محاورہ اور بامحاورہ ترجمہ کے نام سے پھیلنے والے غلط تاثرات کا قلع قمع کیا جائے گا۔

دوسرا باب:- ترجمہ القرآن سے متعلق ہوگا جس کی عظمت شان کی بنا پر تعریف، غرض، موضوع بتانے کے ساتھ اُس انداز تعریف کے گوشوں سے بھی پردہ اٹھایا جائے گا جو حافظ ابن تیمیہ اور کچھ علماء مصر سے منقول ہیں۔ اس کے بعد قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے خصوصی شرائط کی تفصیل بتائی جائے گی جو عام ترجمہ کی شرائط سے اضافی شرائط ہیں اور مثالوں سے واضح کیا

أصول ترجمہ

جائے گا کہ ان میں سے کسی ایک شرط سے خلاف ہونے پر بھی قرآن شریف کا ترجمہ بے مقصد، غیر معیاری اور غلط ہو سکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شرائط کی خلاف ورزی پر مشتمل ترجمہ درست کہلائے۔

تیسرا باب :- اس میں تراجم کے حوالہ سے قرآن شریف کی مظلومیت سے پردہ اٹھایا جائے گا اور مثالوں سے واضح کیا جائے گا کہ ترجمۃ القرآن کے نام سے ایسی ایسی تحریریں وجود میں لائی جا رہی ہیں جنہیں قرآن شریف کا مفہوم یا تفہیم اور تفسیر و تشریح بھی نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ ترجمہ کہلانے کے قابل ہوں۔ سب سے آخر میں منبع اسلام کے اس کردار کا دنیا کی مختلف زبانوں میں معیاری ترجمہ پیش کرنے کے لیے قابل عمل طریقہ بتایا جائے گا۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِي إِلَى سَبِيلِ الرَّشَادِ)



پہلا باب

عربی زبان کا یہ لفظ علم تصریف کے مطابق رباعی مجرد یعنی باب ”فَعْلَلَةٌ“ سے استعمال ہو کر متعدد معانی و مقاصد کا فائدہ دیتا ہے۔

پہلا:- ”پیغام رسانی“ ہے جس کے مطابق ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ترجمہ اللہ کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام و پیغام اور اس کی تعلیمات عام بندوں کو پہنچاتے ہیں۔ حضرت شیخ اکبر محی ابن عربی نے لکھا ہے:

”ثُمَّ قَالَ عَنْهُ التَّرَا جَمَةٌ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ فِي بَابِ الشَّفَاعَةِ“ (۱)
حضرت علی المرتضیٰ نور اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا:

”رَسُوْلُكَ تَرْجُمَانُ عَقْلِكَ وَكِتَابُكَ اَبْلَغُ مَا يَنْطِقُ عَنْكَ“ (۲)

دوسرا:- کسی چیز کی حقیقت بتانے اور اصلیت ظاہر کرنے کے لیے ہے المقامات الحریریہ میں ہے:

”وَ اَحْلُ مُتَرْجَمَةٌ“ (۳)

تیسرا:- کسی کے کوائف اور سوانح بیان کرنا جیسا کہا جاتا ہے (ترجمہ الشیخین، ترجمہ الخلفاء الراشدین، ترجمہ امام ابو حنیفہ یا ترجمہ خواجہ معین الدین حسن)

چوتھا:- کسی مسئلہ یا کسی بھی صورت علمیہ کو خاص عنوان دینا جیسا امام بخاری نے صحیح البخاری میں

(۱) الفتوحات المکیہ، ج: ۴، ص: ۷، مطبوعہ دار صادر بیروت۔

(۲) نہج البلاغہ، خطبہ نمبر: 301۔

(۳) المقامات الحریریہ، نمبر 41، مطبوعہ دار الطباعة المکیہ سوریا۔

أصول ترجمہ

اپنی سوچ کے مطابق ہر مسئلہ کو خاص عنوان سے تعبیر کیا ہے جو بخاری کے تراجم ابواب کے نام سے مشہور ہیں جو مفرد بھی ہوتے ہیں اور متعدد چیزوں سے مرکب بھی بہر حال یہ سب کے سب ترجمۃ الباب کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جن کی حقیقت عنوان یا تعین عنوان سے مختلف نہیں ہیں۔

پانچواں:- کسی ایک زبان کے کلام کا مفہوم و منطوق دوسری زبان والوں کو ان کی زبان میں شفاہۃً و مواجہۃً ادا کرنا یہ کبھی ایک طرف سے ہوتا ہے اور کبھی دونوں طرف سے فعل کے طور پر اس کا استعمال چاہے ماضی میں ہو جیسا کہا جاتا ہے "تَرْجَمَ لَهُ الْكَلَامَ" یا مستقبل میں جیسا کہا جاتا ہے "يَتَرْجَمُ لَهُ الْكَلَامَ" یا اسم فاعل کی صورت میں جیسا کہا جاتا ہے "فَلَانٌ مُتَرْجِمٌ" بہر تقدیر ایسا کردار انجام دینے والے شخص کے لیے غالب استعمال میں ترجمان ہی کہا جاتا ہے جو اسم فاعل یعنی ترجمانی کرنے والے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ عمدۃ القاری شرح بخاری شریف میں اس کی تفہیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

"التَّرجُمانُ هُوَ الْمُعَبِّرُ عَنْ لُغَةٍ بِلُغَةٍ" (۱)

بخاری شریف کی حدیث ہر قل میں ہے: "ذُعَابَتَرُجْمَانِهِ"

اس کے بعد ہے: "فَقَالَ لِلتَّرجُمانِ" (۲)

چھٹا:- کسی فن یا کسی کلام کی تشریح و توضیح کرنا اسی کے مطابق الافضاح فی فقہ اللغۃ میں لکھا ہے:

"تَرْجَمَ فَلَانٌ كَلَامَهُ إِذَا أَوْضَحَهُ وَبَيَّنَّهُ" (۳)

یہی چیز المصباح المنیر میں بھی ترتیب کی تغیر کے ساتھ اس طرح لکھی ہے:

"وَتَرْجَمَ فَلَانٌ كَلَامَهُ إِذَا بَيَّنَّهُ وَأَوْضَحَهُ" (۴)

(۱) عینی علی البخاری، ج: ۱، ص: ۸۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت۔

(۲) بخاری باب کیف کان بدء الوحی، ج: ۱، ص: ۲۔

(۳) الافضاح فی فقہ اللغۃ، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

(۴) المصباح المنیر، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

أصول ترجمہ

اور اسی کے مطابق میرا قرداماد کو ترجمان المنطق کہا جاتا ہے کہ اُس نے منطق کی دور متاخرین میں سب سے زیادہ اور نمایاں تشریح کی ہے۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ترجمان القرآن کہنا بھی اسی بنیاد پر ہے کہ قرآن شریف کی تفسیر و توضیح کرنے میں فائق تھے۔ اُن کے ہم عصر صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے متعلق فرمایا:

”بِعَمَّ تَرْجُمَانِ الْقُرْآنِ ابْنُ عَبَّاسٍ“ (۱)

ساتواں:- کسی بھی کتاب کا دیباچہ اور ابتدائی حصہ جسے فاتحہ الکتاب بھی کہا جاتا ہے۔ المنجد میں لکھا ہے:

”تَرْجَمَةُ الْكِتَابِ فَاتِحَتُهُ“ (۲)

آٹھواں:- کسی کتاب یا کسی بھی تحریر کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اس کتاب میں ہمارے پیش نظر یہی مفہوم ہے، ہماری بحث کا محور بھی یہی ہے اور فارسی، اُردو، پنجابی، کھوار جیسی متعدد زبانوں میں استعمال ہونے والے ترجمہ، تراجم، ترجمۃ الکتاب، ترجمۃ القرآن، دارالتراجم اور شعبہ تراجم جیسے الفاظ اسی سے متعلق ہیں اور عرف عام میں بھی یہی مفہوم مشہور و متعارف ہے۔ اسی کو مستقل فن کی حیثیت حاصل ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں سابق الذکر مفہومات میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ اُسے فن کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہو یا فن کی افادیت اور عموم و بقا کے رنگ میں لیا جاتا ہو بلکہ اُن کی حیثیت مخصوص افعال اور وقتی کردار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ترجمہ کے دوسرے غیر متعارف مفہومات کے مقابلہ میں صرف اسی ایک مفہوم کو مستقل فن کی حیثیت حاصل ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ فن کی تعریف اُن پر نہیں بلکہ صرف اسی پر صادق آتی ہے۔

(۱) التبہیر فی علم التفسیر للسیوطی، ص: 335، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور پاکستان۔

(۲) المنجد، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

اصول ترجمہ

ترجمہ اور مستقل فن:۔ انسانی زندگی کے مختلف شعبہ ہائے حیات کے کسی بھی زاویہ سے متعلق علم کا وہ رنگ، وہ انداز اور تعلیم و تعلم کی وہ سبیل فن کہلاتی ہے جو اُمورِ ثلاثہ یعنی تعریف، غرض، موضوع پر مشتمل ہو۔

تعریف سے مراد اُس کی ایسی پہچان کہ دوسرے فنون سے نکھر کر جدا و ممتاز ہو جائے۔

غرض سے مراد اُسے ایجاد کرنے اور وجود میں لانے سے یا اُس کے مندرجات کو پڑھنے اور حاصل کرنے سے خاص مقصد پیش نظر ہو جسے علت غائی بھی کہا جاسکتا ہے۔

موضوع سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے عوارضات ذاتیہ سے بحث کی جائے۔ مثال کے طور پر علومِ لسانیہ کے سلسلہ دراز میں علمِ تصریف ایک مستقل فن ہے کیوں کہ وہ تعریف، غرض، موضوع سے پہچانا جاتا ہے یعنی کہا جاسکتا ہے کہ ”هُوَ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيهِ عَنْ أَحْوَالِ الْكَلِمَةِ مِنْ حَيْثُ الصِّيغَةِ“ جس سے وہ دوسرے تمام علومِ لسانیہ سے جدا و ممتاز ہو جاتا ہے اور ”كَلِمَةٌ مِنْ حَيْثُ الصِّيغَةِ“ اُس کا موضوع اور صیغوں کی پہچان اُس کے ایجاد سے اور پڑھنے سے مقصود قرار پاتا ہے۔ اسی طرح لفظ ”ترجمہ“ کا متعارف مفہوم کہ وہ کسی کتاب یا کسی بھی تحریر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اس لیے مستقل فن ہے کہ تعریف، غرض، موضوع سے پہچانا جاتا ہے۔

مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کی تعریف:۔ وہ ایسا فن ہے جس میں اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے اُن الفاظ میں بدل دیا جاتا ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکیں یعنی ”هُوَ الْعِلْمُ الَّذِي تُبَدَّلُ فِيهِ الْفَاطُ الْأَصْلُ بِالْفَاطِ اللُّغَةِ الْأُخْرَى الَّتِي تَقُومُ مَقَامَهَا“۔

فنِ ترجمہ سے غرض و غایت:۔ اس عمل سے مقصد ایک زبان میں لکھے گئے علوم و مضامین کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے تاکہ اس کے جاننے والے بھی اُن سے مستفید ہو سکیں بالفاظِ دیگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے ”دوسری زبان والوں کو اصل کے مقاصد سے مستفید ہونے کا موقع دینا۔“

أصول ترجمہ

فنِ ترجمہ کا موضوع:- مافیہ الترجمہ والی زبان کے وہ الفاظ ہیں جنہیں متن کے الفاظ کے متبادل استعمال کیا گیا ہو کیوں کہ ہر فن کا موضوع وہی چیز ہوتی ہے جس کے عوارضات ذاتیہ یعنی اُس کی ذات کو لاحق ہونے والی صفات سے بحث کی جاتی ہو اس فن میں بھی ترجمہ کے الفاظ سے ہی ”مِنْ حَيْثُ الصَّحِيحِ وَالسَّقِيمِ“ اور معیاری و غیر معیاری اور اصل کے موافق یا مخالف ہونے جیسی باتوں سے بحث کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس ترجمہ کے الفاظ اصل کے موافق ہوں وہ معیاری اور جس کے الفاظ اصل سے خلاف ہوں وہ غیر معیاری ترجمہ کہلاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس ترجمہ کے الفاظ اصل الفاظ کے قائم مقام ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں اُسے معیاری کہا جاتا ہے اور جو ایسا نہ ہو اُسے غیر معیاری اور غلط کہا جاتا ہے۔

الغرض لفظِ ترجمہ اور اس سے اشتقاق پا کر استعمال ہونے والے تراجم، مترجم، مترجم جیسے الفاظ کے صرف اسی متعارف مفہوم کو فن کی حیثیت حاصل ہے جبکہ اس کے علاوہ دوسرے استعمالات و مفہومات میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس پر فن کی تعریف صادق آسکے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ترجمہ اور ترجمانی جدا جدا چیز ہیں کیوں کہ ترجمہ ایک مستقل فن ہے جبکہ ترجمانی اسم منسوب ہے یعنی ترجمان کی طرف منسوب ہے اور ترجمانی اسم فاعل کے معنی میں ہے جو ایک زبان کے کلام کو دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرنے والے کو شامل ہونے کی طرح ایک زبان کے کلام کی تعبیر دوسری زبان میں کرنے اور ایک زبان کے کلام کی دوسری زبان میں تفسیر کرنے کو بھی شامل ہے نہ صرف اتنا بلکہ تحریری کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو شامل ہونے کے ساتھ زبانی کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو بھی شامل ہے۔ نیز الفاظ مفردہ کے معانی کو منتقل کرنے والے کو شامل ہونے کے ساتھ مجموعہ کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے والے کو بھی شامل ہے۔ فتح الباری شرح البخاری میں اس کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھا ہے:

أصول ترجمہ

”وَالْتَرْجُمَانُ الْمُعَبَّرُ عَنْ لَفْظَةٍ بِلَفْظَةٍ“ (۱)

اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر ”عَنْ لَفْظَةٍ بِلَفْظَةٍ“ کے دونوں جگہوں میں حرف ”تا“ وحدۃ کے لیے ہے حالاں کہ مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کا متعارف مفہوم تعبیر ”عَنْ لَفْظَةٍ بِلَفْظَةٍ“ میں نہیں بلکہ کتابی شکل کے پورے کلام کو اُس کے تمام مفردات سمیت دوسری زبان میں منتقل کرنا ضروری ہے ورنہ صرف ایک لفظ کو دوسری زبان کے لفظ کے ساتھ بدلنے کو ترجمہ کہنے کا کوئی عرف متعارف نہیں ہے اسی طرح بعض اسلاف نے اسے زبانی کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو شامل کرنے کے ساتھ تفسیر کو بھی شامل قرار دیا ہے جیسا کر مانی شرح بخاری میں مذکورہ حدیث میں استعمال ہونے والے لفظ ”ترجمان“ کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَهُوَ الْمُعَبَّرُ بِلُغَةٍ عَنْ لُغَةٍ وَالْمُفَسِّرُ بِلِسَانٍ عَنْ لِسَانٍ“ (۲)

ظاہر ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں تفسیر کرنا کتابی کلام میں متعارف ہونے کے بجائے ہر دو جانب سے زبانی کلام کو بھی شامل ہے اور اصل کی تشریح و توضیح اور تفسیر کرنے کو بھی حالاں کہ تفسیر فن ترجمہ سے جدا اور مستقل فن ہے جس کی تعریف، غرض، موضوع بھی فن ترجمہ کے ان امور ثلاثہ سے مختلف ہیں۔

حقائق کی اس روشنی میں ترجمانی کو ترجمہ کہنا درست ہے نہ ہر ترجمان کو مترجم کہنا بلکہ ان کے حقائق عام و خاص کی تفریق کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ایسے میں ان سب کو ترجمہ کے قبیل سے قرار دینے کے تصور کو درست نہیں کہا جاسکتا۔

ایک مغالطہ کا ازالہ:- ترجمۃ الكتاب اور ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے ایک قابل افسوس مغالطہ دیکھنے کو یہ بھی ملتا ہے کہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم سے اور خاص کر ترجمۃ القرآن کے

(۱) فتح الباری، ج: ۱، ص: 34، باب بدء الوحي، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی دمشق شام۔

(۲) کرمانی شرح بخاری، ج: ۱، ص: 54، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت۔

أصول ترجمہ

حوالہ سے ترجمانی و ترجمہ کے مابین تمیز نہیں کی جاتی جس میں نہ صرف ترجمہ و ترجمانی سے استفادہ کرنے والے حضرات اشتباہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ عدم تفریق کا یہ تصور لے کر ترجمہ لکھنے والوں نے ترجمہ کے فن کو ہی شرمایا ہے خاص کر ترجمۃ القرآن کے نام سے قرآن شریف کی جو ترجمانی کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں انہیں ترجمہ کہنے کا قطعاً کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ ان کی مثالوں کو ہم نے تفسیر ”مدارج العرفان فی مناہج کنز الایمان“ میں علی وجہ الاتم قارئین کے سامنے پیش کیا ہے یہاں پر ہم صرف اصول بیان کریں گے اس لیے اُن کا اعادہ کرنے یا مترجمین کی اس غفلت کے گوشوں سے پردہ اٹھانے کو مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہاں پر مترجمین کی اس غفلت کا اصل منشاء بتانے پر ہی اکتفا کریں گے وہ یہ ہے کہ ترجمانی کو ترجمہ کا نام دینے والے ان حضرات کو شاید اُن عبارات سے مغالطہ لگا ہو جو کچھ لغت کی کتابوں میں اور بعض شروح حدیث میں لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً لغت کی مشہور کتاب ”لسان العرب“ میں ہے:

”الترجمان هو الذي يترجم الكلام أي ينقله من لغة إلى لغة أخرى“ (۱)

اسی طرح المصباح المنیر میں ہے: ”وترجم كلام غيره إذا عبر عنه بلغة غير لغة المتكلم“ (۲)

صراح میں ہے: ”یعنی بیان کنندہ زبانی بزبانی دیگر و قلترجمه و ترجم عنه“ (۳)
الکواکب الدراری فی شرح البخاری للکرمانی میں ہے: ”ترجمت الشيء إذا بينته ووقفت عليه غيرك ممن لا يقف عليه بنفسه“ (۴)

(۱) لسان العرب، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔۔

(۲) المصباح المنیر، ج: ۱، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

(۳) صراح، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

(۴) الکواکب الدراری، ج: ۱، ص: ۵۴، مطبوعہ دار احیاء التراث بیروت۔

عمدة القاری شرح بخاری میں ہے: "التَّرجُمان الَّذِي يُبَيِّنُ الْكَلَامَ" (۱)

کتابوں میں پائے جانے والی اس قسم کی عبارات کو دیکھ کر حضرات ترجمانی کو ترجمان اور ترجمان کے مفہوم کو ترجمہ سمجھ بیٹھے، ترجمہ کے متعارف مفہوم کو پس پشت ڈال دیا، اس کی فنی حیثیت کو نظر انداز کیا خاص کر قرآن شریف کے ترجمہ جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل کو جیسا چاہا ویسا عربی سے عجمی زبان میں منتقل کیا جو فن ترجمہ کی شرائط پر بھی منطبق نہیں چہ جائیکہ ترجمہ القرآن کی مخصوص شرائط پر پورا اترے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ حضرات لفظ ترجمہ کے لغوی اطلاقات اور عرفی مفہوم کی فنی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر مذکورہ عبارات پر غور کرتے تو اس مغالطہ میں مبتلا نہ ہوتے، ترجمانی کے مفہوم کو ترجمان کا مفہوم سمجھنے کی غلطی کرتے نہ ترجمان کے مفہوم کو ترجمہ تصور کرنے کی کج فہمی میں پڑتے اور نہ ہی ترجمہ کے لغوی مفہوم کو عرفی مفہوم پر محمول سمجھتے کیوں کہ اہل لغت سے لے کر شارحین حدیث تک حضرات کی جن عبارات سے بھی انہیں یہ مغالطہ ہو رہا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں کہ ان میں سے بعض لفظ ترجمان کے مفہوم سے متعلق ہیں کہ ترجمان وہ ہوتا ہے جو دوسرے کا کلام ایک لغت سے دوسری لغت میں تعبیر کرے جیسا لسان العرب کی مذکورہ عبارت "هُوَ الَّذِي يُتَرْجِمُ الْكَلَامَ أَيْ يَنْقُلُهُ مِنْ لُغَةٍ إِلَى لُغَةٍ أُخْرَى" سے صاف معلوم ہو رہا ہے جبکہ ان میں سے بعض لفظ ترجمہ کے لغوی معنی سے متعلق ہیں یعنی لغت کی زبان میں ترجمہ اسے کہتے ہیں کہ تو کسی کے کلام کو دوسری زبان میں بیان کرے جیسا شرح کرمانی علی البخاری، فتح الباری علی البخاری، عمدة القاری علی البخاری، المصباح المنیر، الانضاح فی فقہ اللغة وغیرہ کی عبارات سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان سب نے لفظ ترجمہ کے لغوی مفہوم بیان کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔ ایسے میں ہم مترجمین کی اس غفلت پر تنبیہ کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ مذکورہ عبارات سے مغالطہ کھانے کی مثال ایسی ہی ہے جیسا حدیث "صَلَّى عَلَى قَتْلَى

(۱) عمدة القاری، ج: 1، ص: 84، مطبوعہ دار التراث العربی بیروت۔

أصول ترجمہ

أُحْدِبَعْدَ مَقْتَلِهِمْ بِشَمَانِ سِنِينَ“ (۱) میں لغوی مفہوم بمعنی دُعائیں استعمال ہونے والے لفظ ”صلوٰۃ“ کو صلوٰۃ جنازہ پر محمول سمجھنے کی بے اعتدالی کی گئی ہیں۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ معرکہ اُحد کے آٹھ سال بعد اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے خصوصی اہتمام کے ساتھ شہداء اُحد کے لیے دُعا فرمائی۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں ”إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا فَصَلَّى عَلَى أَهْلِ أُحْدٍ صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ“ دوسری روایت کے الفاظ ہیں ”صَلَّى عَلَى قَتْلَى أُحْدٍ بَعْدَ مَقْتَلِهِمْ بِشَمَانِ سِنِينَ“ جس میں لفظ ”صلوٰۃ“ اپنے لغوی مفہوم بمعنی دُعائیں استعمال ہوا ہے یعنی اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے ایسے اہتمام کے ساتھ اُن کے لیے دُعا فرمائی جیسے نماز جنازہ کی دُعا کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

اس قسم حدیثوں میں ”صلوٰۃ“ اپنے لغوی مفہوم یعنی دُعائیں واضح استعمال ہونے کے باوجود بعض اہل علم نے اُسے صلوٰۃ کے عرفی مفہوم میں ہونے کا تصور کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آٹھ سال بعد شہداء اُحد پر نماز جنازہ پڑھی۔ مذہبی عصبیت کی آلودگی سے پاک و صاف ذہن سے اس پر غور کرنے والے حضرات اس مغالطہ سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے جیسا مترجمین کی مذکورہ کج فہمی پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مذکورہ عبارات سے مراد ترجمہ کے متعارف مفہوم نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان سب کا مفاد مطلق نقل ہے یعنی ”نَقْلُ الْكَلَامِ مِنْ لُغَةٍ إِلَى لُغَةٍ أُخْرَى كَيْفَ مَا اتَّفَقَ“ یعنی عام اس سے کہ شفا ہی ہو یا تحریری اصل کے موافق ہو یا مخالف اور اصل سے زیادہ اور طویل کلام میں ہو یا اُس کے الفاظ کے مطابق نہ تھے الفاظ میں۔ نیز تفسیر و تفہیم اور ترجمانی کو بھی شامل ہے جبکہ ترجمہ کے عرفی مفہوم مطلق نہیں بلکہ شرائط و اُصول کی قید میں مقید ہے یعنی ”إِبْدَالُ الْفَاصِلِ أَصْلِ الْكَلَامِ بِالْفَاصِلِ الْبَدَلِ الْآخِرِ الَّتِي تَقُومُ مَقَامَهَا“ سے عبارت ہے جس میں لغوی مفہوم کے اطلاق سے

(۱) شرح معانی الآثار، ج: 1، ص: 243، مطبوعہ مکتبہ میر محمد آرام باغ کراچی۔

أصول ترجمہ

امتیاز لانے والی چیز یعنی معیارِ ممیز ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ والا کردار ہے۔ امام جلال الدین السیوطی نے اپنے سے پیش رو امام قفال رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے کی گئی تعریف کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”الترجمة إبدال لفظة تقوّم مقامها“ (۱)

علم بلاغت سے آگاہ حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ترجمہ کی تعریف کے سلسلہ میں یہ عبارت صنعتِ استخدا م کے قبیل سے ہے جس میں فعل ”تَقْوُمُ“ کے ضمیر فاعل سابق الذکر ”لَفْظَةُ“ کی طرف نہیں بلکہ اُس کے لازم کی طرف راجح ہو رہی ہے جو ترجمہ والے الفاظ ہیں وہ اس مذکور ”لَفْظَةُ“ کو لازم اس لیے ہیں کہ یہ مُبدل منہ ہیں اور مُبدل منہ کا وجود بدل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ”مَقَامَهَا“ میں ضمیر مجرور مضاف الیہ ”ہا“، ”لَفْظَةُ“ کی طرف نہیں بلکہ اُس کے ضمن میں موجود اسم جنس جمعی کی طرف راجع ہے جو لفظ بمعنی الفاظ ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا آیت کریمہ ”إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا“ (۲) میں لفظ ”بقرة“ سے مراد اسم جنس جمعی ہے جیسا تفسیروں میں لکھا ہوا موجود ہے گویا ترجمہ کی تعریف کے سلسلہ میں یہ مختصر سی عبارت ایک نہ بلکہ دو استخدا م پر مشتمل ہے جو ایجاز و اختصار کے حوالہ سے بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے اور جملہ خوبیوں کے ساتھ اس کی مکمل پہچان کے لیے ہم نے عام فہم انداز میں اس سے حاصل مقصد سطورِ بالا میں بیان کر دیئے یعنی ”الترجمة إبدال ألفاظ أصل الكلام بالفاظ اللسان الآخر التي تقوّم مقامها“ یعنی عرف عام میں متعارف ترجمہ اسے کہتے ہیں کہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں۔

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۱، ص: ۱۱۱، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

(۲) البقرہ: ۷۰۔

ترجمہ کی تعریف کا تجزیہ:- امام قفال اور جلال الدین السیوطی کی طرف سے ترجمہ کی گئی

مذکورہ تعریف کا تجزیہ اس طرح ہے کہ اسے علمی زبان میں حدِ تام کہا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ جنسِ قریب اور فصلِ قریب پر مشتمل ہے اور ان دونوں پر مشتمل ہر تعریف حدِ تام کے قبیل سے ہوتی ہے۔ جنسِ قریب پر اس لیے مشتمل ہے کہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ کے ساتھ

بدلنے کے بعد مافیہ الترجمہ والی زبان کے الفاظ کا یہ اجتماع اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے ترجمہ کے عرفی مفہوم کے لیے جنسِ قریب قرار پاتا ہے جبکہ ترجمہ کا عرفی مفہوم یعنی ترجمہ والے الفاظ کی

اجتماعی حیثیت اُس کی نوع ہے اور اصل کے الفاظ کے قائم مقام ہونے والا کردار اسی نوع کے لیے معیارِ ممیز ہے جسے فصلِ ممیز اور فصلِ قریب بھی کہتے ہیں جو جنسِ قریب میں اس کے ساتھ شریک ہونے والے دوسرے تمام انواع سے اسے ممتاز کرتا ہے ورنہ اس سے پہلے یعنی ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“

والی صفت کے بغیر تفسیر، توضیح، مفہوم تفہیم اور ترجمانی جیسے مختلف انواع پر بھی الفاظ کی تبدیلی کا مفہوم صادق آتا ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جسے کلیات خمسہ عقلیہ کی تمیز ہو۔ الغرض تفسیر، توضیح، تفہیم اور ترجمانی جیسی تمام انواع سے ترجمہ کے اس عرفی مفہوم کو ممتاز کرنے والی چیز الفاظِ مبدلہ کی صفت یعنی ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ والی صفت کے سوا کوئی اور شے نہیں ہے۔

باقی رہا یہ تصور کہ اصل الفاظ کے قائم مقام ہونے والی یہ صفت ترجمہ کے عرفی مفہوم کے لیے فصلِ قریب کس طرح ہے؟

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ کسی بھی نوع کے لیے فصلِ قریب اُس کا وہ اندرونی اور ذاتی

کمال ہوتا ہے جو جنسِ قریب میں اُس کے ساتھ شریک تمام انواع سے اُسے ممتاز کرے اور ”تَقْوُمُ

مَقَامَهَا“ والی صفت بھی ترجمہ والے الفاظ کی ایسی ہی کمال ہے جو الفاظِ مبدلہ میں ترجمہ کے عرفی

مفہوم کے ساتھ شریک ہونے والے دوسرے تمام انواع سے اسے ممتاز کرتی ہے ورنہ اس کے بغیر

دوسری زبان کے الفاظِ مبدلہ پر جیسا ترجمہ صادق آتا ہے ویسا تفسیر، توضیح، مفہوم، تفہیم اور ترجمانی

أصول ترجمہ

جیسے تمام انواع صادق آتے ہیں جس میں ذرہ برابر تفریق نہیں ہے تو پھر اسے فصل قریب کیوں نہ کہا جائے اور صفت و موصوف کے اس مجموعہ مرکب کو یعنی ترجمہ والی زبان کے الفاظ اور "نَقُومُ مَقَامَهَا" والی صفت کی اجتماعی حیثیت کو مستقل عمل کیوں نہ کہا جائے۔

الغرض ترجمہ کے متعارف مفہوم اور مستقل فن ہونے کی حیثیت سے اس کی مذکورہ تعریف کی حقیقت حد تمام کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس میں مُعَرِّف یعنی فن ترجمہ کو تفہیم، تفسیر، توضیح اور ترجمانی جیسے تمام اصناف سے جدا اور ممتاز کرنے والا کردار "نَقُومُ مَقَامَهَا" والی صفت ہے جس کے بغیر ترجمہ کے عرفی مفہوم کا وجود ہے نہ تفسیر و تفہیم اور ترجمانی جیسی توضیحات سے امتیاز کا تصور جس کا واضح نتیجہ یہی ہے کہ ترجمہ کے نام سے وجود میں لائی جانے والی ہر وہ تحریر حقیقی ترجمہ کہلاتی ہے جس میں ترجمہ والے الفاظ متن کے الفاظ کے قائم مقام ہو سکیں ورنہ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتی۔

باقی رہا یہ سوال کہ جب اصل کے قائم مقام اور اُس کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کہلانے کے قابل نہ ہوئی تو پھر اُسے کیا کہا جائے اور کس نام سے پکارا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی خاص نام یا خاص دفعہ مقرر کرنے سے پہلے متن سے مخالفت کی نوعیت اور اُس کی کیفیت و کمیت معلوم کرنا ضروری ہے کیوں کہ "نَقُومُ مَقَامَهَا" سے خلاف ہونے کا مطلب متن سے خلاف ہونا ہے اور خلاف کی نوعیت مختلف ہے کہ کسی ایک لفظ کا بھی خلاف ہو سکتا ہے زیادہ کا بھی اور لغوی معنی کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے مرادی معنی کے اعتبار سے بھی۔ نیز فصاحت کے حوالہ سے بھی ہو سکتا ہے حلاوت و جاذبیت کے حوالہ سے بھی علی ہذا القیاس متن کی مخالفت کا واضح ثبوت اور اس کی نوعیت و کمیت کا تعین ہوئے بغیر کچھ نہیں کہا جاسکتا بلکہ معنوی تحریف سے لے کر التباس الحق بالباطل تک اور حرام سے لے کر مکروہ تحریم و اسانت تک اور مکروہ تنزیہ سے لے کر لاینبغی و نامناسب کی ہر شکل کو شامل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر متن کے مذکر لفظ کا ترجمہ مؤنث میں کیا جائے یا اس سے برعکس، متن میں ایک لفظ فاعل کے طور پر مذکور ہے اُس کا

أصول ترجمہ

ترجمہ مفعول بہ میں کیا جائے یا اس سے برعکس، متن کے مفرد لفظ کا ترجمہ جمع میں کیا جائے یا اس سے برعکس، متن لفظاً و معنایاً ہر طرح سے جملہ خبریہ ہے اُس کا ترجمہ جملہ انشائیہ میں کیا جائے یا اس سے برعکس، مرکب تام متن کا ترجمہ مفرد میں کیا جائے یا اس سے برعکس، پورے متن کا یا اُس کے کسی حصہ کا ترجمہ اصل متکلم یا مصنف کی منشاء سے خلاف کیا جائے جس کے پیچھے مترجم کی ذہنی ترجیح یا عصبیت کا رفرما ہو۔

اس قسم کی تمام صورتوں میں ترجمہ کو معنوی تحریف، حرام اور خیانت کہا جاسکتا ہے جس کی مثالوں سے کچھ پردے ہم نے اس تحریر کے آغاز میں اٹھائے ہیں۔ قارئین کو چاہئے کہ پیچھے مڑ کر انہیں دیکھیں تاکہ ترجمہ کی تعریف میں مذکور لفظ ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ سے خلاف ہونے کے ہولناک نتائج سے آگاہی پائیں اور مزید تفصیل کے لیے ”تفسیر مدارج العرفان فی المقابل بین تراجم القرآن“ کا مطالعہ کریں۔ جس کی تینوں جلدوں میں ہم نے ان کی افسوس ناک مثالوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ جن کا کچھ حصہ بطور مشتمت نمونہ از خروارے اس کتاب کے باب الشرائط میں بھی بیان ہوگا آگے چل کر وہاں بھی دیکھا جائے۔

اس کے علاوہ جن تراجم کے الفاظ و انداز ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ کی صفت سے خلاف ہوں ان کی قدرے تفصیل اس طرح ہے کہ متن کے ایجاز و اختصار کے برعکس تطویل کی جائے، ترجمہ والی زبان کی طرف سے مجبوری کے بغیر متن کی ترتیب سے خلاف کیا جائے، متن کا کوئی لفظ ترجمہ والی زبان میں بھی کثیر الاستعمال و مشہور ہونے کے باوجود اُس کی جگہ ترجمہ والی زبان سے کوئی غیر مانوس الاستعمال لفظ استعمال کیا جائے، ایک سے زیادہ جائز المراد معانی پر مشتمل اصل لفظ کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں لفظ دستیاب ہونے کے باوجود اُس کی جگہ صرف ایک معنی پر منطبق ہونے والا لفظ استعمال کیا جائے، دو مفہوموں پر یکساں مشتمل ہونے والا اصل لفظ کے ترجمہ کے لیے متعارف و معقول طریقہ موجود ہونے کے باوجود اُس کے ترجمہ کے لیے صرف ایک احتمال پر منطبق ہونے والا لفظ استعمال کیا جائے، اسی طرح متن کے محاورہ سے خلاف کیا جائے یا ترجمہ والی زبان

اصول ترجمہ

کے محاورہ سے خلاف کیا جائے یا دونوں کے محاورہ سے خلاف کیا جائے یا ترجمہ کی فطری شرط سے خلاف کیا جائے یا ترجمہ کے احتیاطی تقاضوں کو پیش نظر رکھے بغیر پورے متن یا اس کے کسی حصہ کے ترجمہ کو من پسند روایت پر ہٹا دیا جائے اور اس کے مطابق الفاظ استعمال کیے جائیں، ترجمہ کی تمام ناگزیر شرائط پر حاوی ہوئے بغیر اور جملہ شرائط کے حوالہ سے خود اعتمادی و بصیرت پائے بغیر من پسند اکابرین سے منقول انداز و الفاظ میں کیا جائے۔ اس قسم کے تمام تراجم پر مکروہ تحریم سے لے کر اسات تک اور مکروہ تنزیہ سے لے کر خلاف اولیٰ تک دفعات لگائی جاسکتی ہیں۔

پہلی قسم کی طرح اس کی تفصیلی مثالوں کو بھی ہم ”تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن“ کے تینوں حصوں میں بیان کر چکے ہیں تاہم اس کتاب کے باب الشرائط میں بھی اُن سے اقتباسات لے کر قارئین کی نذر کریں گے مطالعہ جاری رکھ کر باب الشرائط کی آمد کا انتظار کریں جس میں ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف پر کیے جانے والے مظالم اور معنوی تحریفات کی عجیب و غریب مثالیں ملیں گی لیکن کریں کیا جبکہ علماء کرام کی غالب اکثریت اس سے غافل ہے اور شرائط کے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ لکھنے کا گناہ رواج پا رہا ہے اور احتیاطی تقاضوں سے غافل ہو کر ترجمہ القرآن کے نام سے نقل و نقل کا بازار گرم ہوتا جا رہا ہے اور ایسے حضرات ترجمہ القرآن کے نام سے تحریریں وجود میں لا رہے ہیں کہ الہیات کے حوالہ سے اُن کا مایہ علم صفر ہے، عام ترجمہ کی شرائط سے ہی بے خبر ہیں چہ جائیکہ ترجمہ القرآن کی مخصوص اور سخت شرائط کی خوشبو سے مانوس ہوں۔ ہم اس کتاب کے ذریعہ ترجمہ کی عام شرائط سے لے کر ترجمہ القرآن کی خصوصی شرائط سے اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہی دینے کے ساتھ غیر معیاری تراجم کا انسداد چاہتے ہیں جو جہد المقل کے فریضہ سے مختلف نہیں ہے۔

ترجمہ کی تعریف کا ایک کمال:- حضرت امام قتال اور جلال الدین السیوطی سے ترجمہ کی جو

تعریف منقول ہوئی ہے اُس کی جامعیت اور مانعیت کے اس کمال کا راز بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ

أصول ترجمہ

سب کچھ اُس کی فصلِ قریب اور معیارِ ممیز کا کرشمہ ہے جو لفظ ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ والی صفت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کمال یہ بھی ہے کہ ترجمہ والے الفاظ اصل الفاظ کے قائم مقام ہوں یعنی اُن کی لغوی حیثیت سے لے کر مرادی حیثیت تک جملہ لسانی زاویوں کے مطابق ہونا ہی معیاری اور غیر معیاری ترجمہ کے مابین حدِ فاصل ہے کہ جس ترجمہ کے الفاظ، انداز اور محاورہ اصل کے مطابق ہو وہی معیاری کہلاتا ہے اُسی سے ترجمہ سے متعلق غرض و غایت حاصل ہو سکتی ہے ورنہ ترجمہ کے نام سے اصل کے الفاظ و انداز اور محاورہ سے خلاف لکھی گئی تحریرِ افادہ کے بجائے مغالطہ کا سبب بن سکتی ہے خاص کر قرآن شریف کے ترجمہ کے نام سے ایسی تحریریں طرح طرح کے قبائح پر منتج ہو سکتی ہیں۔ معیاری اور غیر معیاری ترجمہ کے مابین یہی حدِ فاصل یعنی ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ ترجمہ کی اُن تمام فطری شرائط کے لیے بھی اصل الاصول اور بنیاد ہیں جن کے بغیر کسی بھی کتاب کا معیاری ترجمہ وجود میں لانا ممکن نہیں ہے جس کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ والی صفت اجمال اور جملہ شرائط اس کی تفصیل ہیں۔ ایسے میں امام قفال اور محدث سیوطی جیسے اکابرین کو دادِ تحسین دیئے بغیر کون رہ سکتا ہے کہ انہوں نے ترجمہ کی تعریف میں صنعتِ استخدام کے انداز پر ایجاز و اختصار کا کمال کیا ہے، دریا کو کوزے میں بند کیا ہے اور ترجمہ کی شرائط کی طرف اشارہ کر کے اُس کی جامع و مانع تعریف کا حق ادا کیا ہے۔

خلاصۃ التحقیق بعد التفصیل :- مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کے متعارف مفہوم کی مذکورہ

تعریف ”إِبْدَالُ أَلْفَاظِ الْأَصْلِ بِالْفَاظِ اللَّسَانِ الْآخِرِ الَّتِي تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ دُنیا کی کسی بھی کتاب، کسی بھی فن اور کسی بھی صنعت و حرفت اور کسی بھی علم سے متعلق کتاب کے ترجمہ کو جامع ہونے کے ساتھ قرآن شریف کے ترجمہ کو بھی شامل ہو رہی ہے کہ کسی بھی کتاب اور کسی بھی تحریر کا ترجمہ اس سے خارج نہیں ہو رہا جو اس کی جامعیت کا کمال ہے۔ اسی طرح ایک زبان کی کسی بھی کتاب کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں تشریح کرنے، تفہیم کرنے، توضیح کرنے اور تفسیر

کرنے جیسی لفظی تبدیلی کی کوئی ایک صورت بھی ترجمہ کی حد میں داخل نہیں ہو رہی جو اس کی مانعیت کا کمال ہے جس کا اصل راز ”تَقْوُومُ مَقَامَهَا“ کی صفت میں پوشیدہ ہے کہ تفسیر کے الفاظ کا متن کے الفاظ کے قائم مقام ہونا ضروری ہے نہ تفہیم و توضیح والے الفاظ کا جبکہ ترجمہ والے الفاظ کو ترجمہ کہلانے کا استحقاق اس صفت کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہوتا حالاں کہ متن کے الفاظ کے مقابلہ میں دوسری زبان کے یہ تمام الفاظ بدل الفاظ کہلاتے ہیں چاہے تفسیر و تفہیم کی شکل میں ہو یا ترجمہ کی شکل میں۔ نیز متن پر متفرع اور اس کے تابع ہونے میں بھی سب یکساں ہیں ورنہ متن کے بغیر جیسے ترجمہ کا تصور نہیں ہے ویسے ہی تفسیر و تفہیم اور تشریح و توضیح کا تصور بھی نہیں ہے۔ ایسے میں ترجمہ کی اس تعریف کے کمال سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ترجمہ کی مذکورہ تعریف کا ایک اور کمال :- یہ ترجمہ کی دونوں قسموں کو یعنی شفاہی ترجمہ جسے کلامی ترجمہ بھی کہا جاسکتا ہے جو دو فریقوں کے مابین ترجمان کے واسطے سے ہوتا ہے اور وقتی چیز ہے اس کے مقابلہ میں کتابی ترجمہ ہے جسے تحریری ترجمہ بھی کہا جاسکتا ہے جو پہلے سے موجود کسی کتاب یا کسی بھی تحریر کو دوسری زبان کے الفاظ میں تحریر اور کتاباً منتقل کرنے سے عبارت ہے اور عرف عام میں متعارف بھی یہی ہے اور فن کی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہے۔ جو ایک زبان میں لکھے گئے علوم و معارف اور معلومات و انکشافات کو دوسری زبان والوں کو پہنچانے کا متعارف و معتاد اور مشہور طریقہ ہے ترجمہ کی مذکورہ تعریف کا امتیازی کمال اور اضافی حسن ہے کہ ترجمہ کی ان دونوں قسموں کو شامل ہو رہی ہے اگرچہ شمول کا انداز مختلف ہے کہ شفاہی ترجمہ کو شامل ہونا حقیقت لغوی کے انداز سے ہے کیوں کہ ترجمہ کی یہ قسم اس کے لغوی مفہوم میں شامل ہے جس میں اس کا استعمال اور اس پر لفظ ترجمہ کا اطلاق بھی مجاز اور کنایہ کے قبیل سے نہیں بلکہ حقیقت ہے جبکہ پہلے سے لکھی گئی کسی کتاب کے تحریر اور کتاباً دوسری زبان کے مناسب الفاظ میں بدلنے پر اس کا اطلاق حقیقت عرفیہ کے انداز پر ہے کیوں کہ عرف عام میں وہ اسی مفہوم کے لیے موضوع ہے اور اہل عرف

أصول ترجمہ

بھی یہی معنی مراد لیتے ہیں اور مشہور، معروف اور کثیر الاستعمال بھی یہی ہے۔ عام اس سے کہ اشتراک لفظی کے طور پر ہوا منقول عرفی کے طور پر متبادر اور غالب یہ ہے کہ منقول عرفی کے انداز پر ہو اور کسی بھی منقول لفظ کے استعمال کے تین طریقے ہیں؛

❶ خالص لغت کی زبان میں اس صورت میں اس سے مراد عرفی مفہوم نہیں لغوی مفہوم مراد ہوتا ہے جیسا آیت کریمہ ”وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ“ (۱) ظاہر ہے کہ یہاں پر لفظ صلوٰۃ دعا کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے جو صلوٰۃ کے عرفی مفہوم کے لیے منقول عنہ ہے اور لغوی مفہوم ہے جبکہ منقول الیہ یعنی عرفی مفہوم مراد ہونے کا یہاں پر تصور ہی نہیں ہے۔

❷ صرف منقول الیہ یعنی عرفی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے کیوں کہ اس کے ساتھ مخاطب اہل عرف ہوتے ہیں جو اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”أَقِمْو الصَّلَاةَ“ (۲) ظاہر ہے کہ یہاں پر صلوٰۃ سے مراد اس کے عرفی مفہوم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

❸ منقول عنہ و منقول الیہ یعنی لغوی اور عرفی دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۚ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيِّينَ“ (۳) اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر صلوٰۃ کے دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں۔

لغوی مفہوم ”نیاز مندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا“ مراد ہونے کی صورت میں یہ کہنے والوں کا مقصد ہوگا کہ وہ اپنے خالق و مالک ﷻ کی طرف نیاز مندی کے ساتھ توجہ کرنے والے خوش نصیبوں میں نہیں تھے جس وجہ سے جہنم جانا ہوا۔

عرفی مفہوم مراد ہونے کی صورت میں کہنے والوں کا مقصد یہ ہوگا کہ ”وہ نماز پڑھنے والوں کے زمرہ

(۱) التوبة: 103۔

(۲) البقرة: 43۔

(۳) المدثر: 43 تا 44۔

أصول ترجمہ

میں نہیں تھے“ جس وجہ سے جہنم جانا پڑا۔ یہاں پر لغوی مفہوم سے انکار کی گنجائش ہے نہ عرفی مفہوم مراد ہونے سے مجال بلکہ دونوں درست ہیں اور لفظِ صلوٰۃ کا استعمال دونوں میں حقیقت ہے۔ اول میں حقیقت لغوی کے طور پر دوسرے میں حقیقت عرفی کے طور پر۔ یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہے کہ صفائی اور پاکیزگی کے مفہوم میں حقیقت لغوی اور منقول عنہ ہے جبکہ مالِ حولی نصابی میں سے مخصوص حصہ اسلامی حکومت کو دینے کے مفہوم میں منقول الیہ ہے اور اس کا استعمال بھی دونوں پر حقیقت ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اقِمُْوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ“ (۱) یہاں پر جمہور مفسرین کے مطابق اس کا عرفی مفہوم مراد ہے۔ جبکہ دوسرے مقام ”قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا“ (۲) میں صرف لغوی مفہوم مراد ہے اور تیسرے مقام ”وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ“ (۳) میں دونوں کو شامل ہے کہ ایک سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

اسی طرح ترجمہ کی مذکورہ تعریف ”اصل متن کے الفاظ کو دوسری زبان کے اُن الفاظ میں بدلنا جو اصل کے الفاظ کے قائم مقام ہو سکیں“ بھی دونوں مفہوموں کو اُن کے اپنے اپنے انداز میں شامل ہو رہی ہے اور دونوں میں حقیقت ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عرفی مفہوم ”کسی کتاب یا کسی دستاویز و تحریر کے الفاظ کو دوسری زبان کے اُن الفاظ میں کتابت و تحریر ابدلنا جو اصل الفاظ کے قائم مقام ہو سکیں“ میں عبارت النص ہے کہ اُسی کے لیے اسے وجود میں لایا گیا ہے اور اس تصوراتی عبارت سے اصل مقصد اُسی کو بیان کرنا ہے جبکہ لغوی مفہوم یعنی شفاہی ترجمہ بواسطہ ترجمان اشارۃ النص کے طور پر ضمناً سمجھا جا رہا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ لفظِ ترجمہ کا غالب استعمال عرفی مفہوم کے لیے ہوتا ہے جبکہ لغوی مفہوم یعنی ترجمان کے ذریعہ شفاہی ترجمہ کا استعمال اگرچہ حقیقت ہے تاہم عرفی کے مقابلہ میں قلیل ہے۔

(۱) البقرة: 43۔

(۲) الشمس: 9۔

(۳) المومنون: 4۔

أصول ترجمہ

ترجمہ کی مذکورہ تعریف کے فوائد:- جامع و مانع ہونے کے مقاصد پر پورا ہونے کے ساتھ سب سے بڑا فائدہ اس کا یہ ہے کہ اس سے اُن تمام اعتراضات کا قلع قمع ہو جاتا ہے جو قرآن شریف کے کیے گئے غلط تراجم کی وجہ سے اسلام کے خلاف اُٹھائے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر؛ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 197 کے حصے ”وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ“ کا جو ترجمہ:

❶ اشرف علی تھانوی نے کیا ”اور جو نیک کام کرو گے خدائے تعالیٰ کو اُس کی اطلاع ہوتی ہے۔“

❷ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے کیا ”اور نیکی کا کوئی سا کام بھی کرو وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا۔“

❸ عاشق الہی میرٹھی نے کیا ”اور جو کچھ تم کرو گے نیکی اُس کو اللہ جان لے گا۔“

❹ وحید الزمان نے کیا ”اور نیک کام تم کرو گے اللہ کو معلوم ہو جائے گا۔“

❺ فتح محمد خان جالندھری نے کیا ”اور جو نیک کام تم کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا۔“

❻ عبد الماجد دریا آبادی نے کیا ”اور کوئی بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا۔“

ان میں سے اول الذکر اللہ تعالیٰ کے علم کو کسی اور سے مستفاد بتا رہا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ

میں اطلاع ہونا ذاتی علم اور اللہ تعالیٰ کے قدیم و ازیلی علم کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ غیر سے

مستفاد ہونے اور کسی اور کے بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اتنا واضح مسئلہ ہے کہ اُردو محاورہ

سے قدرے آگاہ ہر شخص اسے سمجھتا ہے جبکہ اس کے بعد والے پانچوں اللہ تعالیٰ کے علم کو حادث بتا

رہے ہیں کہ پہلے نہیں تھا اب جانے گا جیسا ان کے بالترتیب مذکورہ الفاظ ”وہ خدا کو اُسی وقت معلوم

ہو جائے گا، اُس کو اللہ جان لے گا، اللہ کو معلوم ہو جائے گا، وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا، اللہ کو اُس کا علم

ہو کر رہے گا“ سے صاف معلوم ہو رہا ہے۔ ایسے میں کوئی مستشرق یا کوئی بھی دشمن اسلام قرآن شریف

پر اعتراض اُٹھا سکتا ہے کہ مذہب اسلام اللہ تعالیٰ کے علم ازیلی و قدیم سے خلاف عقیدہ رکھتا ہے

اصول ترجمہ

اور جس مذہب میں اپنے خالق و مالک اور رب الناس کے بارے میں یہ عقیدہ ہو کہ وہ بندوں کے کاموں کو پہلے سے نہیں جانتا بلکہ بندوں کے ہاتھوں کام ہونے کے بعد اُسے علم ہوتا ہے یا اس کے بارے میں کوئی اور اُسے اطلاع دیتا ہے۔ ایسے مذہب کا سارا نظام اور پورا ڈھانچہ غلط ہوتا ہے کیوں کہ مذہبی نظام کی صحت، اس کے ایجاد اور آسمانی مذہب ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کے محیط وازلی اور قدیم علم اولین بنیاد ہے جب مذہب اسلام کی اولین بنیاد ہی غلط ہے تو پھر اُسے آسمانی مذہب کہنے کا کیا جواز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دشمنان اسلام کی طرف سے کسی وقت بھی اُٹھائے جانے والے اس متوقع اعتراض کا جواب یہ تمام مترجمین اور ان کے مقلدین مل کر بھی نہیں دے سکتے ہیں۔ انجام کار بغیر شرائط کے ترجمۃ القرآن لکھنے والے مجرموں کی سزا پوری اُمت کو ملے گی، معصوم اسلام کی بدنامی ہوگی اور تمام روئے زمین پر رہنے والے مسلمانوں کے لیے پریشانی و اضطراب کا سامان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے حضرت امام قفال اور جلال الدین السیوطی جیسے پیش رو ان اسلام کو کہ انہوں نے قرآن شریف کے غلط تراجم کی وجہ سے اسلام کے خلاف اعتراض کرنے والوں کو سر اُٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا کیوں کہ اس قسم کے غلط تراجم کو بنیاد بنا کر اعتراض کے لیے سر اُٹھانے والا شخص ترجمہ کی تعریف اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کی بھی کوشش کرے گا اور اس سلسلہ میں تعریف کی اس حقیقت کہ ”وہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکیں“ خود ہی سمجھ جائے گا کہ قرآن شریف کے ترجمہ کے نام سے لکھی گئی یہ تحریریں اور یہ اوراق ترجمہ کہلانے کے قابل ہی نہیں ہیں بلکہ ترجمۃ القرآن کے نام سے خود فریبی ہے اور قرآن شریف کے نادان دوستوں کی کارستانی ہے کیوں کہ ان میں متن قرآن کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں نہیں بدلا گیا ہے جو اصل کے مطابق اور ترجمہ کی شرائط پر منطبق ہوں جبکہ معیاری ترجمہ کے لیے ترجمہ کے الفاظ کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے جو تعریف کے الفاظ

أصول ترجمہ

”نَقُومُ مَقَامَهَا“ سے معلوم ہو رہا ہے جب ان تراجم میں یہ نہیں تو پھر ترجمہ کی حقیقت بھی نہیں ہے۔ ایسے میں اسلاف سے منقول اس تعریف کو عظیم الافادہ کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ (وَاللّٰهُ

الْهَادِي إِلَى سَبِيلِ الرُّشَادِ)

باقی رہی یہ بات کہ ان تراجم کے مذکورہ الفاظ قرآن شریف کے مذکورہ الفاظ کے قائم مقام اور ان کے مطابق کیوں نہیں اس لیے کہ متن کے لفظ ”يَعْلَمُهُ اللّٰهُ“ کی دلالت کسی اور کی طرف سے اطلاع ہونے پر نہیں، اسی طرح پہلے سے اُس کا علم نہ ہونے پر نہیں اور اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہونے پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو اُس کام سے متعلق ازلی وابدی اور قدیم و محیط علم کے ثبوت پر ہے جس کے قائم مقام ہونے کے قابل ترجمہ ”اللہ تعالیٰ اُسے جانتا ہے، اللہ کو اُس کا علم ہے، اللہ تعالیٰ پہلے سے اُسے جانتا ہے“ جیسے الفاظ میں کیا جاسکتا ہے جو ہر اعتبار سے اُس کے مطابق اور اُس کے قائم مقام ہونے کی بدولت معیاری ترجمہ کہلا سکتا ہے جسے چھوڑ کر مذکورہ غلط، بے ڈھنگا اور اصل کے مفہوم سے خلاف انداز کو ترجمہ کہنے کا پس منظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ حضرات ترجمہ کی حقیقت معلوم کیے بغیر ترجمہ لکھنے بیٹھ گئے ورنہ عام ترجمہ کی بنیادی شرائط کا ادراک رکھنے والا کوئی شخص بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ترجمہ القرآن کی اضافی شرائط اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہ شخص سے ایسی غلطی ہو جائے۔

خلاصۃ الخلاصہ:۔ کسی بھی کتاب یا کسی بھی تحریر کا ترجمہ کرنے والے کے لیے مندرجہ ذیل امور کی پہچان ضروری ہے:

① سب سے پہلے ترجمہ کے عمل کی نوعیت کو کہ یہ ایک فن ہے جو تعریف، غرض، موضوع رکھتا ہے، تعریف یہ کہ وہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ کے ساتھ بدلنا ہے جو ان کے قائم مقام ہو سکیں۔

② ترجمہ کی یہ تعریف ذہن میں آتے ہی اُس کے موضوع کا تصور آپ ہی حاصل ہو جاتا ہے

أصول ترجمہ

کہ وہ ترجمہ والے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۳ ترجمہ کرنے والے کے ذہن میں اس سے مقصود اور اس کی غرض و غایت کا تصور پہلے سے حاصل ہے کہ میرے اس عمل سے دوسری زبان والوں کو اصل کتاب کے مقاصد کا علم حاصل ہو جائے۔ گویا کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کے لیے اصل محرک افادہ کا یہی تصور ہے ورنہ جذبہ افادیت کا یہ عنصر اگر پہلے سے کارفرمانہ ہوتا تو ترجمہ نام کی کوئی تحریر وجود میں نہ آتی اور نہ کوئی شخص کسی کتاب کے مترجم کے طور پر پہچانا جاتا کیوں کہ اصول فطرت ”يَسْتَحِيلُ وُجُودُ الْمَعْلُولِ بِذَوْنِ عِلَّتِهِ“ سے خلاف ممکن نہیں ہے۔

۴ کسی بھی خاص وصف اور صفت خاص والے عمل سے اصل مقصد وہی وصف ہوتا ہے جیسے ”تکملہ عبدالغفور“ میں عبدالحکیم السیالکوٹی نے شیخ عبدالقادر جرجانی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: ”إِنَّ كُلَّ كَلَامٍ فِيهِ قَيْدٌ زَائِدٌ عَلَى النَّفْيِ وَالْإِثْبَاتِ يَكُونُ ذَلِكَ الْقَيْدُ مُحِطًا بِالْفَائِدَةِ“ (۱) اس مسلمہ اصول کے مطابق مترجم کی نظر بھی الفاظ ترجمہ کے مذکورہ وصف یعنی ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ پر مرکوز ہونا ناگزیر ہے کیوں کہ الفاظ مبدلہ یعنی ترجمہ کے الفاظ کی صفت اور ان کے لیے معیار ممیز ہونے کی بنا پر ترجمہ کو با مقصد بنانے والا جو ہر یہی ہے اسی وجہ سے ترجمہ کے ایک ایک لفظ میں اسے پیش نظر رکھنا ترجمہ کو با مقصد بنانے کی ضمانت ہے ورنہ متن کے ترجمہ کے الفاظ میں صرف ایک لفظ کا اس سے خلاف ہونے پر بھی متن کے اس حصے کا ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے جسے معیاری اور اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ ایک سے زیادہ الفاظ سے خلاف ہونے پر با مقصد ہو سکے۔

۵ ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے مترجم کی نظر ترجمہ کے ایک ایک لفظ کی صفت ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ پر مرکوز ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اصل کے الفاظ دوسری زبان کے الفاظ میں بدلنے سے قبل متن کے ایک ایک لفظ کو اصل کی زبان کی لغوی حیثیت سے لے کر محاورتی حیثیت

(۱) تکملہ عبدالغفور، ص: 495، مطبوعہ مجتہبائی قدیم۔

أصول ترجمہ

تک اور استعمالی حیثیت سے لے کر بلاغی حیثیت تک۔ الغرض اُس کی جملہ لسانی حیثیات کو پوری طرح سمجھ جائے ورنہ کسی ایک پہلو سے غفلت کی صورت میں بھی ترجمہ والی زبان میں اُس کے مطابق لفظ استعمال کرنا ممکن نہیں ہوگا کیوں کہ ترجمہ والے لفظ کا اُس کے مطابق ہونا اور وصف "تَقْوُمُ مَقَامَهَا" کے تقاضوں پر عمل ہونا اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب متن کے تمام الفاظ کی جملہ حیثیات سے مطمئن ہو ورنہ اصل سے ناواقف شخص سے یہ توقع کرنا کہ وہ ان کے مطابق الفاظ استعمال کر کے ترجمہ کو با مقصد بنائے گا "بیل سے دودھ ملنے" کی توقع کرنے سے مختلف نہیں ہوگا۔

① اصل کے جملہ الفاظ کے تمام لسانی اور محاورتی پہلوؤں کو پوری طرح سمجھنے کے بعد مترجم پر لازم ہے کہ ترجمہ والی زبان میں اُن کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرے تاکہ وصف "تَقْوُمُ مَقَامَهَا" پر عمل ہو سکے۔

② اصل اور فرع یعنی متن اور ترجمہ کے الفاظ کے مابین اس انفرادی حیثیت پر اطمینان پانے کے بعد مترجم کے لیے ضروری قرار پاتا ہے کہ ترجمہ کے الفاظ کی اجتماعی حیثیت پر بھی غور کرے کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن اور ناگزیر مجبوری کے بغیر اس کا حجم اصل کے حجم سے نہ بڑھے ورنہ ترجمہ کی اجتماعی حیثیت وصف "تَقْوُمُ مَقَامَهَا" سے خلاف ہوگی جبکہ ترجمہ کے معیاری ہونے کے لیے یہ بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا انفرادی حیثیت میں الفاظ کی موافقت ضروری ہے کیوں کہ ایجاز یا مساوات والے متن کا ترجمہ بھی بالترتیب ایجاز و مساوات میں ہونا ضروری ہے ورنہ اطناب و تطویل والے ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا۔

③ ایک مغالطہ کا ازالہ:- مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کی تعریف کہ وہ "اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اصل الفاظ کے قائم مقام ہو سکیں" کو دیکھ کر ممکن ہے کہ کسی کو اشتباہ ہو جائے کہ اصل کے ہر لفظ کو دوسری زبان کے لفظ میں بدلنا ضروری

اصول ترجمہ

ہے ورنہ ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوگا اس تصور کو مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ایسا کرنا ہر جگہ درست نہیں ہوتا۔ مثلاً متن کے متعدد الفاظ میں سے اگر کوئی لفظ ایسا ہے جو ترجمہ والی زبان میں بھی کثیر الاستعمال اور مشہور ہو اور زبان پر ثقیل بھی نہ ہو اور اُس کا مفہوم بھی دونوں زبانوں میں یکساں مشہور و متعارف ہو۔ ایسے مقامات پر اُس کی جگہ ترجمہ والی زبان کا لفظ استعمال کرنا غیر معقول اور نامناسب ہوگا کیوں کہ کسی ضرورت کے بغیر اصل کی جگہ فرع لانے کو معقول نہیں کہا جاسکتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متن کا کوئی لفظ ترجمہ والی زبان میں زیادہ مشہور و متعارف ہوتا ہے اور ترجمہ والی زبان کے الفاظ کے مقابلہ میں سہل اللسان ہونے کے ساتھ زیادہ مانوس الاستعمال بھی ہوتا ہے ایسے مواقع پر اُسے ترجمہ والی زبان کے اُس لفظ میں بدلنا نہ صرف نامناسب اور غیر معقول ہوتا ہے بلکہ ترجمہ کے مقصد سے بھی بعید ہوتا ہے اس لیے مذکورہ تصور کو اشتباہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا بلکہ ایسے ہر مقام پر ترجمہ میں اصل لفظ کا اعادہ کرنا ہی معقول ہے، مناسب بھی اور ترجمہ کے مقصد کے قریب بھی ہے۔

۹ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متن کے ایک مضمون، ایک جملہ یا ایک لفظ میں متکلم کے بنیادی مقصد کے علاوہ کچھ اضافی مقاصد اور اشارات بھی ہوتے ہیں ایسے مقامات کے ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے مترجم پر لازم ہے کہ ترجمہ والی زبان سے بھی اُس کے مطابق جامع لفظ استعمال کرے جس کے لیے ترجمہ والی زبان کے ذخیرۃ الفاظ اور اُس کے محاورات کا تجربہ ضروری ہے اور ترجمہ والی زبان میں ایسا جامع لفظ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں صرف وہی لفظ اور وہی انداز اختیار کرے جو متن کے بنیادی مقصد پر منطبق ہو سکے کیوں کہ ترجمہ والی زبان کی تنگی دامن اور اُس کی طرف سے مجبوری کی ہر صورت میں الاہم فالاہم کو ترجیح دینا مترجم کے فرائض میں سے ہے۔

۱۰ کلام کی ممکنہ اقسام صرف تین ہیں؛ حقیقت، مجاز، کنایہ۔

أصول ترجمہ

حقیقت:- ہر وہ کلام اور لفظ ہے جسے اُس کے اپنے ماضع لہ مفہوم میں استعمال کیا جائے۔
مجاز:- ہر وہ کلام اور لفظ ہے جسے غیر ماضع لہ میں استعمال کیا جائے اور اُس کا اپنا مفہوم متکلم کی مراد نہ ہونے پر قرینہ بھی موجود ہو۔
کنایہ:- ہر وہ کلام اور لفظ ہے جسے غیر ماضع لہ میں استعمال کیا جائے اور ماضع لہ مراد نہ ہونے پر کسی قسم کا قرینہ بھی موجود نہ ہو۔

مترجم کے لیے ضروری ہے کہ متن کے الفاظ کو ان اقسام کے تناظر میں دیکھے پھر اُس کے مطابق ترجمہ والی زبان سے الفاظ استعمال کرے ورنہ مجاز کا ترجمہ حقیقت اور کنایہ والے متن کا ترجمہ صریح میں کرنے سے ترجمہ کی افادیت رہے گی نہ اُسے اصل کے مطابق یعنی ”تَقْوُّمُ مَقَامِهَا“ کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ تصور بے حقیقت اور غلط ہے کہ کلام کی ان قسموں کا لحاظ رکھنا عربی زبان اور خاص کر قرآن شریف کے ترجمہ کے ساتھ خاص ہے جو کنایات کی لطافتوں اور مجاز و تشبیہات کی اُن حلاوتوں پر مشتمل ہے جو عجمی زبانوں میں نہیں پائی جاتی اس تصور کو ہم مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کیوں کہ کلام کی ان بنیادی قسموں کو عربی زبان کے ساتھ مختص کہنا دوسری زبانوں کے معروضی حالات سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے جبکہ کلام کی حقیقت یعنی الفاظ کے ذریعہ مافی الضمیر کو ظاہر کرنا اور افہام و تفہیم کرنے کے یہ طریقے عربی کی طرح تمام عجمی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں نہ صرف مشہور و متداول زبانوں میں بلکہ علاقائی اور چھوٹی چھوٹی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں نہ صرف اتنا بلکہ محدود علاقوں میں بولی جانے والی اُن بولیوں میں بھی مروج ہیں جن کا کوئی تحریری اور کتابی پس منظر ہی نہیں ہے یہ اتنی واضح بات ہے جو ان زبانوں کے بولنے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تو پھر انہیں عربی زبان کے ساتھ مختص کہنے کا کیا جواز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلام کی ان بنیادی قسموں پر مشتمل ہونے میں عربی و عجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے مگر

یہ کہ قرآن شریف کا معاملہ نہ صرف عجمی زبانوں سے مختلف ہے بلکہ خود عربی کی بھی تمام علاقائی زبانوں سے اعلیٰ و ارفع و ابلغ ہے جس میں پائے جانے والی ان تینوں قسموں اور قسم در قسم و شاخ در شاخ کی حلاوتوں اور لطافتوں کی نہ کوئی حد ہے نہ نہایت۔ جس کے متعلق حدیث شریف میں حضرت علی المرتضیٰ نور اللہ وجہہ الانور کی روایت سے آیا ہے:

”لَا تَنْقِضِي عَجَائِبَهُ“ (۱)

یعنی اس کے عجیب معارف و اسرار ختم ہونے کے نہیں ہیں۔

جب اس کے معارف عجیبہ بھی ہیں اور لا نہایت بھی تو پھر اس کے ترجمہ کا پورا حق کون ادا کر سکتا ہے۔ اسی فلسفہ کی بنیاد پر کل مکاتب فکر اہل اسلام کے سکا لرز اس بات پر متفق نظر آ رہے ہیں کہ قرآن شریف کا ایسا ترجمہ پیش کرنا دنیا کی کسی زبان میں بھی ممکن نہیں ہے جو اس کے تمام مقاصد و معارف پر مشتمل ہو سکے لیکن اس سے یہ مطلب سمجھنا غلط ہوگا کہ اس کے مفہوم اول اور بنیادی مقاصد پر مشتمل ترجمہ بھی ممکن نہیں ہے یہ تصور اس لیے غلط ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ سے مقصد ترجمہ والی زبان کے سمجھنے والوں کو اس کے جملہ معارف و اسرار سے نہیں بلکہ صرف بنیادی مقاصد سے آگاہ کرنا ہے جو ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اس کے الفاظ و انداز کی لسانی حیثیت پر منطبق کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے جس میں حقیقت، مجاز اور کنایہ کا بنیادی کردار ہے اور یہ تینوں جیسے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں ویسے عجمی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس حوالہ سے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے اعجاز اور اللہ تعالیٰ کے بے مثل کلام ہونے سے قطع نظر کلام کی ان تینوں بنیادی قسموں پر شامل ہونے میں عربی و عجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے اس لیے مترجم چاہے کسی عربی کتاب کا عجمی میں ترجمہ کرے یا اس سے برعکس یا ایک عجمی زبان میں لکھی گئی کتاب کا ترجمہ دوسری عجمی زبان میں کرے بہر صورت ترجمہ کی درستی کے لیے اس پر لازم ہے کہ اولاً ان تینوں کے حوالہ سے متن کی حیثیت معلوم کرے اس کے

(۱) التفسیر القرطبی، ج: 1، ص: 5، مطبوعہ دارالمعارف بیروت۔

أصول ترجمہ

بعد ترجمہ والی زبان سے اُس کے مطابق الفاظ اور انداز اختیار کرے یہ عام ترجمہ کے لیے بنیادی اصول ہے جسے اصل الاصول کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ دونوں زبانوں کے حوالہ سے عام ترجمہ کی ناگزیر شرائط کا تصور ان کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ سب کچھ ترجمہ کی تعریف میں مذکور لفظ ”تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ کے ناگزیر تقاضے ہیں جن کے بغیر ترجمہ کے نام سے لکھی گئی کسی تحریر کو بھی اصل کے مطابق اور معیاری ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔

❶ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متن کا کوئی لفظ دو مختلف معانی کا یکساں احتمال رکھتا ہے یعنی لفظ کو اُن میں سے ہر ایک پر محمول کرنا اور اُن میں سے کسی کو بھی مراد متکلم قرار دینا درست ہو یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اور کسی ایک کو واضح ترجیح بھی نہ ہو جبکہ ترجمہ والی زبان میں ہر معنی کے مطابق الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن ایسا جامع لفظ نہیں پایا جاتا جو متن کی طرح دونوں کو یکساں شامل ہو۔ ایسے میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اُن میں سے کسی ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں لے کر دوسرے کو بریکٹ میں کرے۔ اس کے سوا مترجم کے لیے کوئی اور محتاط سبیل موجود نہیں ہے کیوں کہ ایسا نہیں کرے گا تو دو ہی صورتیں ہیں؛ پہلی صورت:- ہر معنی کی ادائیگی کے لیے ترجمہ والی زبان سے جدا جدا الفاظ استعمال کرے گا۔ دوسری صورت:- صرف ایک کے مطابق ترجمہ کر کے دوسرے کو چھوڑ دے گا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ یہ دونوں ترجمہ کی تعریف ”ابْدَالُ الْفَظِ الْأَصْلِ بِالْفَظِ اللَّسَانِ الْآخِرِ الَّتِي تَقْوُمُ مَقَامَهَا“ کے منافی ہیں کہ اس میں مقابلۃ الجمع بالجمع ہے جو تقسیم الآحاد علی الآحاد چاہتی ہے جس کے مطابق متن کے ایک ایک لفظ کے بدلہ میں ترجمہ والی زبان سے بھی ایک ایک لفظ ہونا ضروری ہے یعنی ترجمہ کے جملہ الفاظ متن کے تمام الفاظ پر اس طرح تقسیم ہوتے ہیں کہ متن کے ہر لفظ کے بدلہ میں ترجمہ والی زبان سے بھی ایک ایک لفظ ہوتا ہے جنہیں الفاظ متن کے مطابق نپے ٹلے الفاظ کہتے ہیں۔ جس میں ایک لفظ کے کم و کاست کی بھی

أصول ترجمہ

گنجائش نہیں ہوتی۔ نیز اسی ترتیب سے ترجمہ والے الفاظ کا الفاظِ متن کے قائم مقام ہونا بھی ضروری ہے ورنہ کسی بھی جہت سے اُس کے خلاف ہونے سے ترجمہ کا معیار نہیں رہے گا۔

حقیقت کی اس روشنی میں دیکھا جائے تو پہلی صورت میں ترجمہ کا ایک لفظ متن سے زیادہ ہے جبکہ دوسری صورت میں عددی موافقت اگرچہ موجود ہے کہ متن کی طرح ترجمہ والی زبان کی طرف سے بھی لفظ ایک ہے لیکن اُس کے قائم مقام نہیں ہے کیوں کہ وہ مختلف معانی کو یکساں شامل تھا جبکہ یہ صرف ایک کو شامل ہے تو پھر اسے اُس کے مطابق کون کہے۔

۱۲ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ فصاحت کے حوالہ سے بھی متن کے جملہ الفاظ کا جائز لے اُس کے تمام الفاظ کے فصیح ہونے پر تسلی ہونے کے بعد ترجمہ کے جملہ الفاظ کو بھی اُن کے مطابق فصیح رکھے ورنہ فصیح متن کا ترجمہ غیر فصیح ہونے کی وجہ سے اسے اُس کا قائم مقام نہیں کہا جاسکتا اور اگر متن کے کسی فصیح لفظ کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں قائم مقام ہونے کے قابل فصیح لفظ دستیاب نہ ہو تو اُس سے مرادی معنی کے قریب الافادہ غیر فصیح اور غیر مانوس الاستعمال لفظ استعمال کرنے کے بعد بریکٹ میں اُس کی وضاحت کرنا ضروری ہے اور اگر ترجمہ والی زبان میں اُس کے قریب الافادہ غیر فصیح لفظ بھی دستیاب نہ ہونے کی صورت میں ترجمہ میں بھی اُسی کا اعادہ کرنا ضروری ہے اس صورت میں بریکٹ سسٹم کی قطعاً کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ترجمہ ہمیشہ اصل کے تابع اور اُس پر مفرع ہوتا ہے جس کے مطابق الفاظِ متن کی فصاحت پر تسلی کی صورت میں ترجمہ کے الفاظ کو اُن کے مطابق اور اُن کے قائم مقام کرنے کے بعد بلاغت کے حوالہ سے مترجم پر کوئی خاص ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کیوں کہ متن کی فصاحت سمیت ترجمہ کی جملہ شرائط کے مطابق کیے گئے ترجمہ کو بلاغت آپ ہی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ متن کی فرع اور اُس کے تابع ہونے کی وجہ سے اُس کے جملہ احکام اور معنوی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے مگر یہ کہ کوئی خارجی مانع موجود ہو جو عام ترجمہ میں نہیں ہوتا اور اہل علم جانتے ہیں کہ بلاغت کسی بھی کلام کے معنوی حُسن

اُصولِ ترجمہ

میں شامل ہے ایسے میں ترجمہ کی بلاغت وہی ہوتی ہے جو متن کی ہے۔ فصاحت و بلاغت کے حوالہ سے عام ترجمہ کے اس باب میں اتنی روشنی کافی ہے جبکہ اس پر مزید روشنی دوسرے باب یعنی ”خاص ترجمہ القرآن“ کے باب میں آنے والی تحقیق سے بھی پڑے گی مطالعہ جاری رکھتے ہوئے انتظار فرمائیے۔

۱۳ متن کے کسی لفظ کا ترجمہ میں اعادہ کرنے کی دو صورتیں ہیں اور بریکٹ سسٹم اختیار کرنے کی بھی صرف دو صورتیں ہیں جبکہ ان کے پس منظر یکساں نہیں ہیں کیوں کہ بریکٹ سسٹم کی ہر صورت ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کی بنا پر اختیار کی جاتی ہے کہ ایک صورت میں اصل کے مطابق فصیح اور مانوس الاستعمال لفظ ہی دستیاب نہیں ہے تو اصل کے قریب غیر مانوس الاستعمال لفظ استعمال کرنے کے بعد اُس کی وضاحت کے لیے اس سسٹم کو اپنایا جاتا ہے اور دوسری صورت میں اصل کی جامعیت کے مطابق لفظ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسے اختیار کیا جاتا ہے جبکہ متن کے کسی لفظ کا ترجمہ میں اعادہ کرنے کی ہر صورت کا پس منظر ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کا عارضہ نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک صورت ایسی ہے جس میں اصل کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں کوئی لفظ ہی موجود نہ ہو جبکہ دوسری وہ صورت جس میں ترجمہ والے الفاظ کے مقابلہ میں متن کا اپنا لفظ سہل اللسان، کثیر الاستعمال اور زیادہ مشہور ہوتا ہے ان میں اصل کا اعادہ کرنے کا پس منظر اُس کی اصلیت ہے کہ ترجمہ والی زبان میں بھی کثیر الاستعمال ہونے کے بعد اُسے ترجمہ والی زبان کے قلیل الاستعمال لفظ کے ساتھ بدلنا معقول و مناسب نہیں ہے۔

۱۴ کسی بھی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کے لیے ضروری ہے کہ ترتیب کے حوالہ سے دونوں زبانوں کا جائزہ لے جس کے مطابق ترجمہ والی زبان کی ترتیب متن کی ترتیب کے سو فیصد مطابق ہونے کی صورت میں ترجمہ کی ترتیب کو بھی اُس کے مطابق رکھنا ضروری ہے ورنہ ترتیب سے خلاف ہونے والا ترجمہ اصل کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہوتا لیکن

أصول ترجمہ

دو زبانوں کی ترتیب میں ہر اعتبار سے موافقت کا پایا جانا بہت کم ہوتا ہے جسے حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے تاہم فن ترجمہ کی وسیع دنیا میں اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہزاروں صفحات کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے میں صرف ایک مقام ایسا آجائے وہ بھی اصول ترجمہ کے ماتحت ہوتا ہے اس لیے اُسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جبکہ ترتیب کا اختلاف زبانوں کے اختلاف کو اگر لازم نہیں ہے تو مقتضائے فطرت ضرور ہے جس کے مطابق کسی نہ کسی حوالہ سے ترتیب کا اختلاف کثرت سے پایا جاتا ہے مثال کے طور پر فارسی دوسری زبانوں کی نسبت عربی کے زیادہ قریب ہے ان دونوں میں مضاف الیہ ہمیشہ موخر ہوتا ہے جبکہ جملہ فعلیہ میں فاعل کے حوالہ سے اختلاف ہوتا ہے کہ عربی میں موخر ہوتا ہے اور فارسی میں مقدم جیسا بالترتیب کہا جاتا ہے ”ذہب زید، زید درخت“ اور اگر ترجمہ والی زبان کی فطری ترتیب متن کی ترتیب سے خلاف ہے جو غالب اکثریت میں ایسا ہی ہوتا ہے تو پھر ترجمہ کی ترتیب کو مافیہ ترجمہ والی زبان کی ترتیب پر جاری رکھتے ہوئے اس کے محاورہ کو متن کے محاورہ کے مطابق کرنا ضروری ہے گویا اس کے محاورہ کو ترجمہ کی ترتیب کو متن کی ترتیب کے مطابق کرنے سے اجتناب ضروری ہے ورنہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہوگا اور اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ ایسا ہی غلط، بے محاورہ اور بے مقصد کہلاتا ہے جیسا متن کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ غلط، بے محاورہ اور بے مقصد ہوتا ہے کیوں کہ معیاری اور بامقصد ترجمہ کا دونوں محاورہ کے مطابق ہونا ضروری ہے یہ تب ہی ممکن ہوگا کہ ترجمہ کو مافیہ ترجمہ والی زبان کی فطری ترتیب پر رکھ کر اس کے محاورہ کو متن کے محاورہ پر منطبق کیا جائے۔ مثال کے طور پر فارسی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ”درفیش درخت و درفیت آمد“ کے ترجمہ میں ”اُس کا دوست گیا اور تیرا دوست آیا“ کہا جائے تب ترجمہ بامحاورہ کہلائے گا ورنہ ترجمہ کی ترتیب کو اصل کی ترتیب کے مطابق کر کے ”دوست اُس کا گیا اور دوست تیرا آیا“

أصول ترجمہ

کہنا اُردو کے عام محاورہ سے خلاف ہوگا۔ اسی طرح عربی سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ”جاء رفیقہ و ذہب رفیق زید، اُس کا ساتھی آیا اور زید کا ساتھی گیا“ کہا جائے جو ترتیب سے خلاف ہونے کے باوجود با محاورہ ہے یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہے اور ترجمہ کے سانچے میں فٹ اور معیاری ہے بخلاف اس کے کہ مافیہ الترجمہ والی زبان کے محاورہ سے صرف نظر کر کے ترجمہ کو اصل کی ترتیب کے مطابق رکھ کر کہا جائے ”آیا ساتھی اُس کا اور گیا ساتھی زید کا“ بے محاورہ کہلائے گا جبکہ بے محاورہ ترجمہ بامقصد نہیں ہوتا اور ترجمۃ الکلام نہیں بلکہ ترجمۃ الالفاظ کہلاتا ہے جو ترجمہ کے متعارف مفہوم سے جدا اور محدود چیز ہے۔

۱۵ ترجمہ کی مذکورہ تعریف ”إِبْدَالُ الْفَاطِ الْأَصْلِ بِالْفَاطِ اللَّسَانِ الْآخِرِ الَّتِي تَقُومُ مَقَامَهَا“ اگرچہ مقابلۃ الجمع بالجمع کے انداز پر ہے جس میں تقسیم الآحاد علی الآحاد ہوتی ہے تاہم ترجمہ کی اجتماعی کیفیت کا متن کی اجتماعی کیفیت کے قائم مقام ہونے کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ ترجمہ کے الفاظ کا اپنی انفرادی حیثیت میں الفاظ متن کی انفرادی حیثیت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہونے کی طرح ان کی اجتماعی حیثیت کا اُن کی اجتماعی حیثیت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے ورنہ مختلف ترتیب والی زبانوں کا معنوی توافق ظاہر نہیں ہوگا اور یہ سب کچھ ترجمہ کے حسن انداز کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے اس لیے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اس سے غافل نہ رہے۔

ایک مغالطہ کا ازالہ:- فصاحت و بلاغت کے حوالہ سے شاید کسی کو یہ مغالطہ ہو جائے کہ یہاں پر عام ترجمہ کے اُصول بیان ہو رہے ہیں جو دنیا کی کسی بھی زبان میں لکھی گئی کتاب کے ترجمہ کو شامل ہیں جبکہ فصاحت و بلاغت علمی اصطلاحات ہیں جو عربی زبان کے ساتھ مختص ہیں۔ ایسے میں اس بحث کو عام ترجمہ کے اُصول میں نہیں بلکہ عربی متن کا کسی عجمی زبان میں کیے جانے والے ترجمہ کی بحث میں اور خاص کر ترجمۃ القرآن کے باب میں کرنا چاہئے۔

اصول ترجمہ

اس کا جواب یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت کو علمی اصطلاحات کہنا غلط ہے کیوں کہ علمی اصطلاحات کسی فن کے اُن مخصوص الفاظ کو کہا جاتا ہے جو اُسی کے ماہرین یا اُس کا شغل رکھنے والوں کے مابین استعمال کیے جاتے ہیں جبکہ فصاحت و بلاغت خالصتاً لسانی الفاظ ہیں اصطلاحی نہیں جو عربی و عجمی دونوں میں یکساں استعمال ہوتے ہیں اور اُن حقائق سے عبارت ہیں جو دنیا کی ہر زبان میں معتبر ہیں۔ دنیا کی وہ کون سی زبان ہے جس میں مہذب اور غیر مہذب، مانوس الاستعمال اور غیر مانوس الاستعمال، سہل اللسان اور ثقیل علی اللسان الفاظ کی تفریق نہ کی جاتی ہو یا محل و موقع کے مناسب اور غیر مناسب کلام کی تمیز محسوس نہ کی جاتی ہو جبکہ فصاحت و بلاغت بھی ایسے ہی حقائق سے تعبیر ہیں جو بلا تخصیص دنیا بھر کی تمام زبانوں میں محسوس کی جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ دونوں اپنی اصلیت کے اعتبار سے عربی الوضع اور عربی اللغة ہیں جو فارسی و اردو جیسی کچھ عجمی زبانوں میں بھی کثیر الاستعمال ہیں جبکہ دوسری زبانوں میں ان کے مفہوم کے لیے دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن الفاظ کے بدلنے سے حقائق نہیں بدلتے۔ فنون لسانیہ کے حوالہ سے مترجمین کو لگنے والا صرف یہی ایک مغالطہ نہیں ہے بلکہ صرف ونحو، متن لغت، علم اشتقاق جیسے حقائق کے بارے میں بھی تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ عربی زبان کے ساتھ مختص ہیں جن کا دوسری زبانوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

حضرات کو لگنے والے اس مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کی تدوین و ایجاد عربی زبان میں ہوئی ہے کیوں کہ ان سے اصل مقصد قرآن فہمی تھی کہ لسان قرآنی کے ان گوشوں کو سمجھنے کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے مختلف زبان والے عجمیوں کو اسے سمجھنا آسان ہو جائے۔ نیز ان فنون کی کچھ مباحث عربی زبان کے ساتھ مختص ہیں جنہیں دیکھ کر سطحی ذہن والے ناپختہ حضرات ان پورے فنون کو اور ان کے جملہ حقائق کو دوسری زبانوں کے لیے شجرہ ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔ جو حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ جسے محسوس کرتے ہوئے بعض اسلاف نے اس پر واضح گفتگو کی ہے۔ مثلاً سعد الدین التفتازانی نے کتاب المطول میں علم المعانی کی تعریف میں مذکور لفظ ”عربی“ سے متعلق لکھا ہے:

أصول ترجمہ

”وتخصيص اللفظ بالعربی مجرد اصطلاح لان هذه الصناعة انما وضعت

لمعرفة احوال اللفظ العربی“ (۱)

امام تفتازانی کی اس تشریح کی مزید وضاحت کرتے ہوئے عبدالحکیم علی المطول نے لکھا ہے:

”مجرد اصطلاح ای لیس للاحتراز عن العجمی اذ يعرف بها احواله ایضاً“ (۲)

کچھ کمی وبیشی کے ساتھ یہی حال دوسرے لسانی فنون کا بھی ہے کہ اُن کے بعض مسائل

اگر عربی کے ساتھ خاص ہیں تو بعض دوسری زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً کلمہ وکلام کی

تفریق اور کلمہ کی تینوں اقسام اور کلام کی دونوں قسمیں یعنی کلام انشائی اور کلام خبری، پھر ان میں

سے ہر ایک کی مختلف اقسام جن کی تفصیل سے علم بلاغت اور علم نحو میں بحث کی جاتی ہے۔ اسی طرح

حقیقت و مجاز کی قسمیں اور کنایہ اور استعارہ و تشبیہ جن سے علم البیان میں بحث کی جاتی ہے اور فعل

معلوم و مجہول، فعل لازم و متعدی اور ماضی مضارع جن سے علم تصریف میں بحث کی جاتی ہے۔ اس

قسم کی سینکڑوں مباحث جو لسانی و لغت کے اختلاف کے ساتھ تمام زبانوں میں پائے جاتے ہیں

کیوں کہ یہ مستقل حقائق ہیں جو زبانوں کے بدلنے سے نہیں بدلتے۔ جیسا عربی زبان میں کلام خبری

کا ترجمہ کسی دوسری زبان کے کلام انشائی میں کرنا غلط ہے اسی طرح اس سے برعکس کرنا بھی غلط ہے

اسی طرح کسی بھی عجمی زبان میں مرکب ناقص یا مفرد کا ترجمہ دوسری عجمی زبان کے کلام میں یعنی

مرکب تام میں کرنا بھی غلط ہے جس میں عربی و عجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسی طرح عربی

زبان میں اسم کی جگہ فعل ذکر کرنا یا فعل معلوم کی جگہ فعل مجہول ذکر کرنا یا اس سے برعکس کرنا غلط ہے،

اسی طرح دوسری زبانوں میں بھی غلط ہے۔ یہی حال ترجمہ کا بھی ہے جیسا عربی زبان کے لفظ

(۱) المطول، ص: 35۔

(۲) حاشیہ السیالکوتی علی المطول، بحث تعریف علم المعانی، ص: 72، مطبوعہ

منشورات الرضی قم ایران۔

اُصولِ ترجمہ

”اولاء“ جو مشارالیه بعید کے لیے استعمال ہونے کی صورت میں اُس کا ترجمہ لفظ ”وہ“ میں کرنے کے بجائے لفظ ”یہ“ میں کرنا غلط ہوگا۔ اسی طرح ”ہا و لاء“ جو قریب کے ساتھ خاص ہے کا ترجمہ لفظ ”یہ“ میں کرنے کے بجائے لفظ ”وہ“ میں کرنا بھی غلط ہے۔ اسی طرح اُردو محاورہ میں ضمیر بعید یا بعید اشارہ کے لیے استعمال ہونے والا لفظ ”اُس“ کی جگہ لفظ ”اِس“ استعمال کرنا غلط ہے ویسا ہی ان کے تراجم کو بدل کے ”اُس“ کی جگہ ”اِس“ یا ”اِس“ کی جگہ ”اُس“ کہنا غلط ہے جس میں عجمی و عربی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہی حال ضمائر کا بھی ہے جیسا ضمائر بارزہ اور ضمائر مستترہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک کی جگہ دوسرے کا استعمال جائز نہیں ہے ویسا ہی ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنا بھی جائز نہیں ہے جس میں عربی و عجمی کی کوئی تفریق نہیں ہے، مذکر کی جگہ مؤنث یا اس سے برعکس استعمال جیسا عربی میں ناجائز ہے ویسا ہی عجمی میں بھی ناجائز ہے۔ یہی حال ان کے تراجم کا بھی ہے جیسا عربی میں مذکر متن کا ترجمہ مؤنث میں کرنا یا اس سے برعکس کرنا غلط ہے ویسا ہی عجمی میں بھی ناجائز ہے اور مرکب غیر تام کی جگہ مرکب تام استعمال کرنا یا اس سے برعکس کرنا قبیح و ممنوع اور حرام فی اللسان والمجاورہ کہلاتا ہے۔ یہی حال ان کے تراجم کا بھی ہے کہ مرکب غیر تام جو مفرد کہلاتا ہے کا ترجمہ مرکب تام جو کلام کہلاتا ہے میں کرنا یا اس سے برعکس کرنا بھی قبیح و مکروہ اور ترجمۃ الحرام کہلاتا ہے جس میں عجمی و عربی کا ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

الغرض صرف ونحو، علم المعانی، علم البیان جیسے جتنے بھی فنون مدون کیے گئے ہیں اُن کی تدوین اور انہیں پڑھنے پڑھانے سے اصل مقصد اگرچہ لسانِ قرآنی کی فہم ہے اور مقاصد و معارف قرآنی تک رسائی ہے، دوسرے مختص الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن فہمی میں آسانی ہے تاہم عجمی زبان کو ان کی روشنی سے محروم نہیں کہا جاسکتا بلکہ ان کے اکثر مباحث ایسے حقائق ہیں جو دُنیا کی تمام زبانوں کو محیط، سب میں پائی جاتی ہیں اور ہر زبان والے ان کا احساس رکھتے ہیں۔

حقائق کی اس روشنی میں ہم نے بھی اس بحث کو عام ترجمہ کے زیرِ اُصول کر دیا جس پر

أصول ترجمہ

مزید روشنی دوسرے باب یعنی ”ترجمۃ القرآن“ سے متعلق خاص باب میں بھی پڑے گی جس میں دنیا بھر کی تمام زبانوں میں یکساں پائے جانے والے اصول و حقائق کے علاوہ اُن اصول و حقائق سے بھی بحث کی جائے گی جو دوسری زبانوں میں نہیں بلکہ صرف عربی کے ساتھ مختص ہیں اس میں بھی سب یکساں نہیں بلکہ بعض عام عربی کے ساتھ مختص ہیں جیسا اسم اشارہ اور ضمیر خطاب کے مابین آنے والا حرف تبعید ”ل“ جس کی عملی شکلیں ”ذَالِکَ، ذَالِکُمَا، ذَالِکُمْ، ذَالِکَ، ذَالِکُمَا، ذَالِکُنَّ“ جیسے الفاظ میں دیکھی جاسکتی ہیں جبکہ بعض عام عربی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف لسانِ قرآنی کے خاص انداز و ایجاز کی جامعیت کے ساتھ مختص ہیں کسی عجمی زبان کی بات ہی کیا ہے جبکہ فصیح فصحاء العرب بھی اس کے سامنے عاجز ہیں۔ جسے منظوم کہا جاسکتا ہے نہ منشور اور تقریر کہا جاسکتا ہے نہ تحریر بلکہ برزخ بین النظم والنثر کے اعجاز پر فائز ہونے کے ساتھ برزخ بین الکتاب والخطاب کی بے مثلیت پر بھی فائز ہے۔ بے مثلیت کے اس کمال و اعجاز کے باوجود اُس کا ترجمہ فنِ ترجمہ کے عام اصولوں سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ ترجمۃ القرآن کے لیے آگے آنے والوں کو فنِ ترجمہ کے عمومی اصولوں اور عام شرائط کی پابندی کے ساتھ ترجمۃ القرآن کے لیے مخصوص شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے یعنی ”الاهتمام حسب المقام“۔

اس حوالہ سے خلاصۃ الکلام بعد التفصیل ترجمہ اپنے عرفی مفہوم میں ایک مستقل فن ہے جو دوسرے فنون کی طرح تعریف، غرض، موضوع رکھتا ہے، جس کتاب، تحریر اور دستاویز کا بھی ترجمہ کیا جائے چاہے وہ عرشی کتاب ہو یا فرشی، خالق ﷻ کی طرف سے ہو جیسا قرآن شریف یا کسی انسانی دل و دماغ کی ایجاد ہو اور دنیا کی کسی بھی زبان میں ہو اُس کا ترجمہ شروع کرنے والے کی نظر اُس کے افادہ پر ہوتی ہے کہ دوسری زبان والوں کو اس سے آگاہ کرنا ہے اگر یہ مقصد پیش نظر نہ ہو تو ترجمہ نام کی کوئی تحریر وجود میں نہیں آسکتی۔ اور اس مقصد کی برآوری کے لیے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ چند باتوں کی پابندی

أصول ترجمہ

کرے جو ترجمہ کے اصول و شرائط کہلاتی ہیں اس کے بعد اگر ترجمہ کسی انسانی کتاب کا کر رہا ہو بس اتنا ہی کافی ہے کہ فنِ ترجمہ کے اصول اور ترجمہ کی عمومی شرائط کہلانے والی ان چیزوں کی پابندی پر مشتمل ترجمہ ہمیشہ با مقصد ہوتا ہے اور اگر ترجمہ کسی انسانی کتاب کا نہیں بلکہ قرآن کریم کا کیا جا رہا ہے تو پھر فنِ ترجمہ کے ان تمام اصولوں اور ترجمہ کی عمومی شرائط کی من و عن پوری طرح پابندی کے علاوہ ترجمہ القرآن کے لیے اضافی اور مخصوص شرائط کی بھی پابندی ضروری ہے ورنہ کسی ایک سے خلاف ہونے پر بھی ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شرائط سے خلاف ہونے والے ترجمہ کو معیاری اور با مقصد کہا جاسکے جبکہ عام شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کی مختلف حیثیتیں جاننے کو اولیت حاصل ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو جب تک متن کے تمام لسانی پہلوؤں کا علم نہ ہو محض ترجمہ والی زبان کا ماہر ہونے سے وہ ترجمہ کا حق کبھی ادا نہیں کر سکتا کیوں کہ ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیتوں کو جاننا اگرچہ شرط ہے لیکن ثانوی درجہ میں ہے اور متن کے تابع اور اُس پر متفرع ہے جس میں عربی اور عجمی زبانوں کا قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ متن کی جملہ لسانی حیثیات کو جاننا بھی مستقل شرط ہے اسی طرح ترجمہ والی زبان میں مہارت بھی مستقل شرط ہے اور آپس میں یہ دونوں شرطیں اصل اور فرع کا ربط رکھتی ہیں یعنی اول الذکر متبوع کا درجہ رکھتا ہے جبکہ ثانی الذکر اُس پر متفرع اور اُس کے تابع کا درجہ رکھتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ متن کے جملہ پہلوؤں پر نظر رکھے بغیر ترجمہ کرنے والے سے اُس کے مطابق ترجمہ کی اُمید کرنا ”بیل سے دودھ ملنے“ کی اُمید کرنے سے مختلف نہیں ہوگا اگرچہ ترجمہ والی زبان کا ماہر ہی کیوں نہ ہو اسی طرح ترجمہ والی زبان میں مہارت کے بغیر کسی کتاب کا ترجمہ کرنے والے سے اُس کے مطابق ترجمہ کرنے کی اُمید کرنا بھی ”پتھر سے دودھ“ کی توقع کرنے سے مختلف نہیں ہوگا بلکہ بالترتیب دونوں کا ماہر ہونا ضروری ہے جبکہ مزید شرائط کا مرتبہ ان دونوں کے بعد ہے۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِي اِلٰی سَبِيْلِ الرُّشَادِ)

ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام کا فرق:-

عام ترجمہ سے متعلق ضروری مسائل کے سلسلہ میں اس بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام دو جدا جدا چیزیں ہیں جن کا ایک دوسرے پر حمل جائز نہیں ہے کیوں کہ ان کے مفہوم بھی جدا ہیں اور مصداق بھی اس لیے کہ ترجمۃ الالفاظ کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ مفردہ کا مفہوم دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیا جائے جسے ”تعبیر عن لغة بلغة أخرى“ کہا جاتا ہے یعنی ایک زبان کے کسی لفظ کے معنی کو دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کرنا جس میں اس کے مفہوم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کیوں مفرد یعنی کلام نہ ہونے کی وجہ سے فاعل، مفعول بہ یا مفعول بہ اور عامل و معمول اور فصاحت و بلاغت جیسے کسی پہلو کا وجود اس میں نہیں ہوتا کہ ترجمہ میں بھی اس کا لحاظ ضروری ہو اس کی مثال جیسا عربی زبان کے لفظ ”اسد“ کا ترجمہ شیر میں کیا جائے، یا رُحْمَن کا ترجمہ زیادہ مہربان میں اور رحیم کا بہت مہربان میں کیا جائے، علی ہذا القیاس۔ اور بعض کتابوں میں لکھے ہوئے مشکل یا نا آشنا الفاظ کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ بھی اس کی مثالوں میں شامل ہے جسے متعارف معنی میں نہیں بلکہ لغوی مفہوم میں ترجمہ کہا جاتا ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین کا کیا ہوا ترجمۃ القرآن بھی درحقیقت ترجمۃ القرآن نہیں بلکہ اسی قبیل سے ہے اور گوجرانوالہ کے مولانا محمد ظریف القادری کا کیا ہوا ترجمۃ القرآن بھی اسی قبیل سے ہے کیوں کہ قرآن شریف کلمہ نہیں بلکہ کلام ہے تو اس کا ترجمہ بھی ترجمۃ الکلام ہوگا جبکہ ان دونوں پر ترجمۃ الکلام کی تعریف نہیں بلکہ ترجمۃ الالفاظ القرآن صادق آتا ہے جسے ترجمۃ الکلام ہرگز نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ان کے مابین تقابل تضاد کی وجہ سے ایک دوسرے پر حمل ممکن نہیں ہے یعنی جو ترجمۃ الالفاظ ہوگا اسے ترجمۃ الکلام کہنا جائز نہیں ہے اسی طرح جو ترجمۃ الکلام ہوگا اسے ترجمۃ الالفاظ کہنا درست نہیں ان کے مابین تقابل تضاد کی ایسی مثال ہے جیسے مرکب ناقص اور مرکب تام کے مابین ہے یا جملہ اور غیر جملہ کے مابین ہے۔ نیز ترجمۃ الالفاظ کو ترجمہ کہنا لغت کی زبان ہے عرف کی نہیں جبکہ ترجمۃ الکلام کو ترجمہ کہنا حقیقت عرفیہ کے طور پر

أصول ترجمہ

ہے۔ ایسے میں ترجمہ الالفاظ کا مصداق ”الكلمة المفردة“ کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا بخلاف ترجمہ الکلام کہ وہ مرکب تام سے مقصد متکلم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے عبارت ہے جس میں فقط الكلمة المفردة کا نہیں بلکہ مرکب تام اور جملہ کے مدلول و مفہوم کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے جو اصل الفاظ کے قائم مقام ہو سکے یعنی اُن کی جملہ حیثیتوں کے مطابق ہو کہ وہ عامل ہے یہ بھی عامل، وہ معمول ہے یہ بھی معمول، وہ فاعل ہے یہ بھی فاعل، وہ مفعول بہ ہے یہ بھی مفعول بہ ہے۔ یہ بھی اُسی انداز پر ہو اور اس کا مصداق پورا فقرہ اور جملہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ترجمہ الالفاظ کی دو قسموں کی تفریق:-

ترجمہ الالفاظ کی ایک قسم وہ ہے جو کلمات مفردہ کے حوالہ سے ہوتی ہے کسی غیر مشہور اور غیر مانوس الاستعمال لفظ کے معنی کو کسی دوسری قابل فہم زبان کے الفاظ میں بیان کیا جائے جیسے عربی ”اسد“ اور ”غضنفر“ کا بالترتیب ترجمہ ”شیر اور ببر شیر“ میں کیا جائے اور فارسی کے ”نسمہ ہاء“ کا ترجمہ کھوار زبان کے ”چہاری“ میں کیا جائے، علی ہذا القیاس۔ جس مفرد لفظ کا بھی ترجمہ کیا جائے اُسے ترجمہ اللفظ ہی کہا جائے گا اور تفسیر و تشریح یا تفہیم کہنا بھی کافی حد تک درست ہوگا کہ جس زبان میں اُس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس زبان کے جاننے والوں کے لیے تفسیر بھی ہے تشریح و تفہیم بھی، گویا ترجمہ الالفاظ کا یہ انداز تعریف لفظی کی ایک جھلک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں اصل کے مفہوم کو دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے جبکہ تعریف لفظی میں دوسری زبان کے الفاظ میں ترجمہ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اصل کی زبان میں بھی ہو سکتی ہے جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ترجمہ الالفاظ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں الفاظ مفردہ کے نہیں بلکہ کسی مضمون اور مرکب تام و کلام کے مختلف حصہ الفاظ کے معانی دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں جس میں اُن کی ترکیبی حیثیت کو ظاہر کرنا مقصد نہیں ہوتا کہ وہ مسند ہے یا مسند الیہ، مضاف ہے یا

اصول ترجمہ

مضاف الیہ، موصول ہے یا موصوف، عامل ہے یا معمول وغیرہ۔ ترجمۃ الالفاظ کی اس قسم میں کبھی کبھی کلام کے الفاظ مفردہ کی ترکیبی حیثیت آپ ہی ظاہر ہو جاتی ہے جسے حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے اس کی عملی مثالوں کو سمجھنے کے لیے بھی حضرت شاہ رفیع الدین کا ترجمہ کافی ہے جس میں حسن اتفاق سے ترکیبی حیثیت ظاہر ہونے کی مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے اور ظاہر نہ ہونے کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ مثال کے طور پر ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ“ تک تینوں آیتوں کے ترجمۃ الالفاظ میں اسم جلال اور اُس کے بعد مذکور ہونے والے چاروں اوصاف ”الْعَلَمِينَ، الرَّحْمَنُ، الرَّحِيمُ، مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ“ کا ترکیبی ربط ظاہر نہیں ہو رہا کہ اسم جلال موصوف اور یہ چاروں اُس کی بالترتیب اوصاف ہیں کیوں کہ اردو محاورہ کے مطابق موصوف و صفت کا ارتباط کرنے کے لیے اُن کے مابین لفظ ”جو“ کا استعمال ضروری ہوتا ہے جو ترجمۃ الالفاظ میں نہیں بلکہ ترجمۃ الکلام میں ہوتا ہے جو یہاں پر موجود نہیں ہے جیسا ترجمہ کے الفاظ ”سب تعریف واسطے اللہ کے پروردگار عالموں کا بخشش کرنے والا مہربان خداوند جزا کا“ سے صاف ظاہر ہے کہ متن کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ اردو زبان میں ظاہر کیا گیا ہے جو درست اور اصل کے لغوی مفہوم کے مطابق ہے لیکن متن کی ترکیبی حیثیت ظاہر کرنے سے قاصر ہے جبکہ اس کے متصلاً بعد آیت نمبر 4 کے الفاظ کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اُس میں متن سے مقصد ظاہر ہونے کے ساتھ مسند و مسند الیہ کا ارتباط بھی ظاہر ہو رہا ہے جو ترجمہ کے الفاظ ”تجھ ہی کو عبادت کرتے ہیں ہم اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں“ سے آپ ہی واضح ہو رہا ہے۔

الغرض ترجمۃ الالفاظ کی پہلی قسم کی حقیقت تعریف لفظی سے مختلف نہیں ہے جو لفظی تشریح کہلانے کے زیادہ قابل ہے جس کے معنوں اور مُبدل منہ میں ہی کلام نہیں ہے تو پھر ترجمہ میں کہاں سے آئے گا۔ انجام کار اُس میں کلام کا تصور ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اسے کسی کتاب، کسی متن اور کسی مضمون کا ترجمہ کہنا درست ہو۔ اس کے مقابلہ میں دوسری قسم کے اجتماعی مفہوم سے حسن اتفاق

أصول ترجمہ

کے طور پر کبھی کلام بھی ظاہر ہوتا ہے اور متن والے کلام کا ترجمہ ہونا محسوس ہوتا ہے اس کے باوجود اسے ترجمہ کلام نہیں بلکہ ترجمہ الالفاظ کے نام سے موسوم کیا جائے کیوں کہ متعارف مفہوم میں ترجمہ کلام کا وجود اس کی علت غائی کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اصول فطرت ”یستحيل وجود المعلول بدون علته“ سے خلاف ہونے کو ممکن نہیں کہا جاسکتا۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ متعارف مفہوم میں ترجمہ کلام کی علت غائی اور اس سے مقصد متن والے کلام کی عبارة النص سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ترجمہ الالفاظ کی کسی قسم اور کسی بھی صورت سے مترجم کا مقصد افادۃ کلام اور افادۃ مقصد المتکلم نہیں بلکہ مفردات کلام کے افادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا یہ وہ نکتہ ہے جس سے غفلت کی بنا پر بعض اہل علم ترجمہ الالفاظ کی اس دوسری قسم کی تعبیر ترجمہ تحت اللفظ کے عنوان سے کرتے ہیں اور اسے ترجمہ کلام کی ایک مستقل قسم کہتے ہیں جو با محاورہ ترجمہ کے مقابلہ میں سمجھا جاتا ہے اس حوالہ سے ہندوپاک کے وہ علمی حلقے جو ترجمہ القرآن جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل کو آسان سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں ان کے پورے ماحول میں ترجمہ کلام کی یہی دو قسمیں مشہور ہیں یعنی تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ۔

انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تاثر سراسر غلط ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متعارف ترجمہ ہمیشہ تحت اللفظ ہوتا ہے۔ فن ترجمہ میں فوق اللفظ ترجمہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے کیوں کہ ہر ترجمہ کے متن کو فوقیت حاصل ہوتی ہے وہی اصل ہے جبکہ ترجمہ اس کے ماتحت اور اس کی فرع ہے اور اس کے تابع ہونے کی بنا پر ہمیشہ اس کے ماتحت، اس کے قائم مقام اور اس کے مطابق ہونا ضروری ہے تو پھر اس تقسیم کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ با مقصد ترجمہ کلام ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے اور ہندوپاک کے ان حلقوں میں با محاورہ ترجمہ کے بارے میں بھی وہ تصور نہیں ہے جو ہونا چاہئے کیوں کہ ترجمہ کلام کو تحت اللفظ اور با محاورہ کی طرف تقسیم کہنے والے ان حلقوں کے نزدیک با محاورہ کا معیار یہ ہے کہ وہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو آگے عام ہے چاہے متن والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز جملہ شرائط کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز متن کے

أصول ترجمہ

سياق و سباق کے مناسب ہو یا نہ ہو، جبکہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ترجمۃ الکلام کے سلسلہ میں با محاورہ ترجمہ کا ایسا تصور ممکن نہیں ہے جس میں اصل کو ترجمہ والی زبان پر قربان کیا جائے یا اصل کو فرع کے تابع کیا جائے بلکہ بامقصد ترجمۃ الکلام کی صرف ایک ہی قسم ہے جو با محاورہ ہے کیوں کہ کسی بھی کلام کا بامقصد اور معیاری ترجمہ بے محاورہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ بے محاورہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ متن کی لسانی حیثیت سے یا ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت سے یا دونوں سے خلاف ہے جبکہ ان سب میں شرط کی مخالفت ہے جو دونوں زبانوں کی لسانی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی بھی کلام کے بامقصد اور معیاری ترجمہ کو بے محاورہ کہنا یا با محاورہ کے مقابلہ میں ترجمہ تحت اللفظ کے عنوان سے شہرت دینے کو معقول کہا جاسکتا ہے نہ مناسب۔ نیز محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے اور علم تصریف کے مطابق باب ”مفاعلة“ کا مصدر ہے جو عربی کی طرح اردو زبان میں بھی کثیر الاستعمال ہے جس کا مفہوم ہے باہم گفتگو کرنا، کسی کلام کا تکرار کرنا اور ایک دوسرے سے مراجعت الکلام کرنا جیسا زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر عنترہ نے اپنے مد مقابل کو کلام کی سمجھ سے قاصر و نا اہل قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

لو کان یدری ما المحاورۃ اشتکی ولکان لو علم الکلام مکلمی

نیز محاورہ مصدر مجہول اور کبھی حاصل بالمصدر المجہول کے انداز پر اس کلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی زبان میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہو یعنی ”الکلام المردد“ کلام میں ان دونوں طریقوں سے اس کا استعمال عربی و عجمی دونوں میں ہوتا ہے جبکہ مفردات کے لیے مستعمل ہونے کی کوئی مثال اور کوئی محاورہ موجود نہیں ہے عربی میں نہ عجمی میں تو پھر ترجمۃ الالفاظ کے لیے اسے استعمال کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

خلاصۃ الکلام:۔ ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کے مفہوم بھی اور صدق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں ترجمۃ الالفاظ پر لفظ ترجمہ کا اطلاق کرنا حقیقت لغویہ کے

أصول ترجمہ

طور پر ہے جس میں عرف کا کوئی دخل نہیں ہے اس کے برعکس ترجمۃ الکلام پر لفظ ترجمہ کا اطلاق حقیقت عرفیہ کے طور پر ہے جو حقیقت لغویہ کے بھی منافی نہیں ہے، کسی بھی کلام کا با مقصد اور معیاری ترجمہ ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے شرائط کے مطابق ہوتا ہے اس میں لفظی ترجمہ یا تحت اللفظ ترجمہ جیسے الفاظ و تقسیمات جو سننے کو ملتی ہیں یہ بعض علمی حلقوں کی ناقص فکر ہے۔ اسلاف میں اس کا کوئی ثبوت ہے نہ مثال اور درایۃ اسے تسلیم کرتی ہے نہ روایت۔

ترجمہ کی عمومی شرائط:- ترجمہ کا فن تصنیف و تالیف، مضمون نویسی اور مقالہ نگاری جیسی کسی بھی صنف سے جدا اور مستقل فن ہے اس کے اصول و ضوابط اور شرائط بھی مستقل حیثیت کی حامل ہیں جس کے مطابق کوئی بھی کتاب چاہے آسمانی ہو یا زمینی اور جس زبان میں بھی ہو اس کے ترجمہ سے بنیادی مقصد اس کے مندرجات کے اصل مقاصد کو ترجمہ والی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے جس میں کامیاب ہونے کے لیے فطرت سلیمہ درج ذیل شرائط کی مقتضی ہے، جو کسی بھی کتاب کے ترجمہ کے لیے عمومی شرائط کہلاتی ہیں؛

① دونوں زبانوں کی لغت، حقیقت، مجاز، کنایہ اور اشارات و کنایات اور محاورات و لوازمات پر پوری طرح عبور و تجربہ ہو جو محض درسیات کی حد تک پڑھنے سے نہیں بلکہ عملی ممارست و تجربہ کا نتیجہ یا قدرت الہی کی توفیق و عطیہ ہوتا ہے۔

② مترجم اپنی پسند کو دخل نہ دے کہ متن کے حقیقی مفہوم کا رخ اپنی کسی ذہنی ترجیح کی طرف موڑ دے اس صورت میں ترجمہ معیاری ہونے کے بجائے اصل پر ظلم اور خیانت ہوگا۔

③ ترجمہ کے الفاظ اختصار و تطویل کے حوالہ سے اصل کے مطابق ہوں یعنی اصل کے الفاظ اگر مقصودی مفہوم سے مختصر ہوں تو اس کے مطابق ترجمہ کے الفاظ کا بھی مختصر ہونا ضروری ہے اور اس کے برابر ہو تو ترجمہ کے الفاظ کا بھی اس کے برابر ہونا ضروری ہے اور اگر وہ اصل مقصود سے زیادہ ہیں تو پھر ترجمہ کے الفاظ کا بھی اسی تناسب سے زیادہ ہونا ضروری ہے کلام کی

أصول ترجمہ

ان تین صورتوں کو دنیاۓ بلاغت کی زبان میں بالترتیب اختصار و مساوات اور اطباء و تطویل کہا جاتا ہے جس کے مطابق اختصار والے متن کا ترجمہ مساوات یا تطویل میں کیا جائے یا مساوات و تطویل والے متن کے کچھ حصوں کو نظر انداز کیا جائے تو ایسے ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ترجمہ اصل کا معنوی عکس ہوتا ہے جس میں اصل کے مقاصد کو ترجمہ والی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے جو اصل کے نپے ٹکے الفاظ کے مطابق ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۴ جہاں ترجمہ کے الفاظ و ترتیب کو متن کی ترتیب کے خلاف کرنے پر اُس کے مقاصد متاثر ہوتے ہوں یا ترجمہ فصاحت و بلاغت کے دائرہ سے نکلتا ہو وہاں پر ترجمہ کی ترتیب کو اصل کی ترتیب کے مطابق رکھنا بھی ضروری ہے کیوں کہ اصل سے مراد کے منافی ترجمہ اُس کے مطابق کہلانے کے قابل نہیں ہو سکتا اسی طرح اصل کی فصاحت و بلاغت کے منافی ترجمہ بھی اُس کے مطابق اور معیاری نہیں کہلاتا۔

۵ دو ایسے مختلف معانی کے لیے یکساں استعمال ہونے والے متن جن میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر ترجیح نہ ہو اور متن کو اُن میں سے ہر ایک پر محمول کرنا بھی درست ہو لیکن کتاب والے کی اصل مراد معلوم نہ ہو کہ اُن میں سے کون سا مفہوم مراد ہے۔

ایسے مقامات پر مترجم کے فرائض میں شامل ہے کہ ترجمہ والی زبان میں اُس کے مطابق یا اُس کے قریب لفظ تلاش کرنے میں حتی المقدور کوشش کرے مل گیا تو اُسے ترجمہ کے طور پر استعمال کرے اور نہ ملنے کی صورت میں اُن ہی میں سے کسی ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں رکھ کر دوسرے کو کلمہ یا کے ساتھ بریکٹ میں کرے یہ طریقہ معیاری ترجمہ کے لیے ضروری ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ کرے گا تو دو صورتوں سے خالی نہ ہوگا:

- (i) متن کے اُس لفظ کو دونوں پر محمول کر کے دونوں کے ترجموں کو تسلسل میں رکھے گا۔
- (ii) ایک کو ترک کر کے دوسرے ترجمہ پر اکتفا کرے گا۔ اول صورت میں ترجمہ ڈبل اور تطویل ہو کر اصل سے خلاف ہوگا۔

اصول ترجمہ

دوسری صورت میں ترجیح بلا مرجح ہو کر ممکن ہے کہ اصل کی مراد کے بھی خلاف ہو۔ ایسے میں مذکورہ انداز کے ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔

۶ جہاں پر متن کے کسی لفظ کے مصادیق و مظاہر متعدد ہوں اور اُن میں سے اکثر کی مراد متکلم میں شامل ہونا معلوم ہونے کے ساتھ بعض مراد نہ ہونا بھی معلوم ہو ایسے مقامات پر متن کے اُسی لفظ کو ترجمہ میں ذکر کرنا ضروری ہے کیوں کہ ایسا نہ کرے گا تو تین صورتوں سے خالی نہیں ہوگا؛

(i) غیر مرادی افراد کو منفی انداز میں اور مرادی افراد کو مثبت انداز میں ذکر کرے گا۔

(ii) صرف غیر مرادی افراد کو استثناء کے طور پر ذکر کرے گا۔

(iii) صرف مرادی افراد کی تفصیل بتائے گا جبکہ یہ تمام صورتیں متن کے اختصار کے منافی ہیں تو پھر انہیں معیاری اور اصل کے مطابق کون کہہ سکتا ہے ایسے میں مذکورہ انداز ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔

۷ جہاں متن کا کوئی لفظ ترجمہ والی زبان میں بھی مستعمل ہو، فصیح بھی ہو، کثیر الاستعمال اور سہل الفہم بھی ہو اور ترجمہ والی زبان میں اُس کے ترجمہ کے لیے موجود لفظ ان تینوں اوصاف میں اُس سے کم ہو۔ ایسے تمام مقامات پر ترجمہ کو اصل کے مطابق کرنے کے لیے ضروری شرط قرار پاتی ہے کہ ترجمہ میں متن والے لفظ کو ہی ذکر کرے ورنہ ترجمہ کا معیار قائم نہیں رہے گا۔

۸ متن کا کوئی لفظ ناقابل فہم ہونے کی صورت میں اپنی طرف سے ترجمہ کی خانہ پُری کرنے کے بجائے ترجمہ کے تسلسل میں اُسی کو ذکر کرنا ضروری ہے۔ ترجمہ کو اصل کے مطابق کرنے کے لیے ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ نا فہمی کی صورت میں اپنے اندازے کے مطابق خانہ پُری کرنے میں اصل کی مراد سے خلاف ہو سکتا ہے جو ترجمہ سے مقصد کے خلاف ہونے کے ساتھ امانتداری کے بھی خلاف ہے جب کہ مترجم کا امین ہونا ضروری ہے۔

۹ متن کے کسی لفظ کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں پائے جانے والا لفظ جب کثیر الاستعمال اور مشہور اور سہل الفہم نہ ہو اور متن کا یہ لفظ ترجمہ والی زبان میں بھی غیر مانوس اور غیر

أصول ترجمہ

مستعمل ہوا ایسے تمام مقامات پر اُس کے مفہوم کے مطابق یا اُس کے قریب جو لفظ پایا جاتا ہے اُسے ترجمہ کے طور پر ذکر کرنے کے بعد بریکٹ میں اُس کی تفہیم کے لیے مناسب وضاحت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو پھر تین صورتوں سے خالی نہ ہوگا؛

(i) اُس کے اصل ترجمہ کے ساتھ توضیحی الفاظ بھی ترجمہ کے تسلسل میں ذکر کرے گا۔

(ii) صرف توضیحی الفاظ کو ترجمہ کے طور پر ذکر کرے گا۔

(iii) صرف ترجمہ کے الفاظ پر اکتفا کرے گا۔

اول صورت میں ترجمہ بے ڈھنگا اور بے ربط ہونے کے ساتھ متن کے اختصار کے برعکس طویل ہوگا تو پھر اسے اصل کے مطابق کون کہے گا۔

دوسری صورت میں ترجمہ کہلانے کے ہی قابل نہیں رہے گا کیوں کہ ترجمہ کے الفاظ کا متن کے مفہوم کے عین مطابق یا اُس کے قریب ہونا ضروری ہے جبکہ یہ اُن میں سے ایک بھی نہیں ہے تو پھر ترجمہ کہلانے کا کیا مطلب؟

تیسری صورت میں ترجمہ بجائے خود اگرچہ درست ہوگا لیکن قابل فہم نہیں ہوگا جب قابل فہم ہی نہیں ہے تو پھر بے مقصد و بے فائدہ ہوگا حالانکہ ترجمہ سے غرض و غایت اصل سے مقاصد کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اُس کے جاننے والوں کو اصل سے مستفید کرنا ہے۔ ایسے میں مذکورہ انداز ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے

❶ متن کی پوری عبارت سے مجموعی مقصد پیش نظر رکھنے کے ساتھ اُس کے ایک ایک حصے کی لغوی اور فنی حیثیت سمجھنے کے بعد اُن کے مطابق انداز اور الفاظ استعمال کرنا بھی ضروری ہے، کیوں کہ متن کے اجتماعی مفاد سے مختلف انداز یا اُس کے مفردات کی لسانی یا فنی حیثیت کے منافی الفاظ پر مشتمل ترجمہ اصل کے مطابق کہلانے کے قابل نہیں ہوتا۔

علی العموم کسی بھی فصیح و بلیغ کتاب کے معیاری ترجمہ کے لیے ان دس شرائط کی مختصر تعبیر اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورات و لوازمات جاننے کے ساتھ اُس کے مطابق اصل

اصول ترجمہ

کے مقاصد کو بلا کم و کاست دوسری زبان میں منتقل کرنا۔ گویا علی العموم کسی بھی کتاب کے معیاری ترجمہ کے لیے اجمال کے درجہ میں یہی ایک شرط ہے جو تفصیل کے درجہ میں مذکورہ دس نکات پر منتج ہوتی ہے جبکہ قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے ان کے علاوہ مزید گیارہ شرائط اور بھی ہیں، جن کی پوری تفصیل دوسرے باب میں آئے گی۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں مذکورہ شرط یعنی متن کے جملہ پہلوؤں کو سب سے پہلے جاننا اور اُس پر پورا اطمینان حاصل ہونے کے بعد ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس کے مطابق رکھنے کی مختلف حیثیات میں سے ایک حیثیت اصل متکلم کی مراد یعنی ماسبق لہ الکلام کو جاننا بھی ہے جس سے خلاف کیے جانے والے تراجم کی پہلی مثال فتاویٰ رضویہ، ج 14، کے مترجم مولانا مفتی محمد خان قادری مہتمم جامعہ اسلامیہ لاہور کا کیا ہوا وہ ترجمہ ہے جس میں انہوں نے فقہاء کرام کی مشہور عبارت ”مجرد ايهام المعنى المحال كاف في المنع“ کا ترجمہ کیا ہے ”محض محال معنی کا وہم بھی ممانعت کے لیے کافی ہوتا ہے“ (۱) جو متن سے مراد اور جس مقصد کے لیے فقہاء کرام نے یہ کلام کیا ہے اُس سے خلاف ہے کیوں کہ ترجمہ کا یہ انداز کسی محال معنی کے وہم نا جائز ہونے پر دلالت کر رہا ہے جبکہ فقہاء کرام کی مراد اور اس کلام سے اُن کا مقصد وہم کی ممانعت ہرگز نہیں بلکہ ایسے کلام کو ممنوع فی الاسلام بتانا ہے جو کسی نا جائز معنی کے موہم ہو۔ اہل علم جانتے ہیں کہ کسی محال معنی کے موہم کلام کا ممنوع فی الاسلام ہونا اور محض محال معنی کے وہم کا ممنوع فی الاسلام ہونا دو الگ چیزیں ہیں؛

اول:- کلام خبری ہونے کی صورت میں تصدیق کے قبیل سے ہے۔

دوم:- تصور کی خاص قسم ہے جسے وہم کہا جاتا ہے۔

اور اہل علم جانتے ہیں کہ تصدیق کا ترجمہ تصور میں جائز نہیں ہے اور کلام انشائی ہونے کی صورت

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج 14، ص 650، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

أصول ترجمہ

میں تصور کی وہ قسم کہلاتی ہے جسے فلسفہ کی زبان میں تخیل یا تکذیب کہتے ہیں اور وہم کو تخیل کی جگہ استعمال کرنا جائز ہے نہ تکذیب کی جگہ تو پھر اُس کا ترجمہ وہم میں کرنے کا کیا جواز ہے اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اس عبارت سے فقہاء کرام کا واحد مقصد اور عبارت النص اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جائز معنی کے حامل ہونے کے باوجود کسی نا جائز معنی کا موہم بننے والے کلام کی اجازت اسلام میں نہیں دی جاسکتی بلکہ اُس سے منع کیا جائے گا یہ تب ہوتا ہے جب ایسا کلام کرنا ممکن ہو جبکہ کسی محال معنی کا وہمہ دل میں پیدا ہونا انسان کے اختیار میں ہی نہیں ہے تو پھر اُس سے منع کرنے کا مطلب ہی کیا ہے۔ لیکن مترجمین ہیں کہ کلام موہم المحال کا ترجمہ وہم المحال میں کر رہے ہیں جس کا پس منظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ان حضرات نے اصول ترجمہ اور اُس کی فطری شرائط کو پیش نظر نہیں رکھا۔ افسوس یہ کہ مذکورہ متن کا معیاری ترجمہ (نا جائز کا محض وہمہ دینے والی بات بھی منع کرنے میں کافی ہے، محال کا محض وہمہ دینے والا کلام بھی ممنوع ہونے میں کافی ہے، محال معنی کا صرف وہمہ دینے والا کلام بھی ممانعت میں کافی ہے، محال معنی کا موہم کلام بھی ممانعت میں کافی ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہونے کے باوجود ایسا ترجمہ کر ڈالا جو متن سے مقصد اور مراد متکلم سے خلاف ہے۔ (فیاللعجب لهذا العجب)

دوسری مثال:۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نور اللہ مرقدہ کے رسائل حصہ کتاب العجب سے درج ذیل اشعار:

فَمَائِمٌ إِلَّا اللَّهُ وَالْكَونُ حَادِثٌ	وَمَائِمٌ إِلَّا الْكَونُ وَاللَّهُ ظَاهِرٌ
مَا الْعِلْمُ إِلَّا الْجَهْلُ بِاللَّهِ فَاعْتَصِمْ	بِقَوْلِي فَإِنِّي عَنْ قَرِيبٍ أَسَافِرُ
وَمَالِي مَالٌ غَيْرُ عِلْمِي وَوَارِثٌ	سِوَى عَيْنِ أَوْلَادِي فَذَلِ الْمَالُ حَاضِرٌ

کا ترجمہ کرتے ہوئے ابرار احمد شاہی نے مترجم کی حیثیت سے اور سلطان عبدالعزیز المنصوب نے ناظر ثانی و صحیح کی حیثیت سے لکھا ہے:

”یہاں تو صرف اللہ ہی ہے یہ کائنات تو حادث ہے۔ یہاں تو صرف اللہ ہی ہے یہ کائنات تو ظاہر ہے۔ علم تو صرف اللہ سے لا علم ہونے کا نام ہے۔ میری یہ بات پہلے باندھ لے کیوں کہ میں بہت نزدیک سے سفر کر کے آیا ہوں۔ اور میرے پاس علم اور اپنی اولاد کی شکل میں وارث کے سوا کیا مال و متاع ہے؟ سو یہ مال بھی حاضر ہے۔ (۱)

ترجمہ کا یہ انداز نہ صرف متن سے مقصد متکلم کے خلاف ہے بلکہ اُس کے مختلف الفاظ سے مرادی معنی سے بھی برعکس ہے جو مذکورہ شرط سے غفلت کا نتیجہ ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ اولین شعر ”فَمَا تَمَّ إِلَّا اللَّهُ وَالْكُونُ حَادِثٌ..... وَمَا تَمَّ إِلَّا الْكُونُ وَاللَّهُ ظَاهِرٌ“ کے پہلے مصرع کے آغاز میں لفظ ”تَمَّ“ اپنے حقیقی معنی پر محمول ہے کیوں کہ یہ بعید کے لیے موضوع ہے قریب کے لیے نہیں اس لیے اس کے ترجمہ میں لفظ ”یہ“ کہنا غلط ہے جبکہ دوسرے مصرع کے آغاز میں حقیقت پر نہیں ہے بلکہ صنعتِ مشاکلت پر محمول ہے جیسا مشہور محاورہ ”اطبح حوالی جبهو قميصًا“ میں لفظ ”طبح“ اپنے سے سابق ”اقترح شيئا نجد لك طبعه“ کی مشاکلت کے لیے استعمال ہوا ہے لہذا اس کا ترجمہ لفظ ”یہ“ میں کرنا درست ہوگا۔ اور شعر کے پہلے مصرع سے اُس کے قائل کا مقصد یہ ہے کہ مرتبہ ازل میں اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہ لا شریک کے سوا کوئی شے موجود نہیں تھی کیوں کہ الکلون الجامع یعنی ذات الہی کے سوا پورا کون جسے عالم کبیر بھی کہا جاتا ہے حادث ہی حادث ہے جو ازل میں نہیں ہو سکتا اور دوسرے مصرع سے مقصد یہ ہے کہ عالم ناسوت یعنی اربعہ عناصر کے اس جہاں کی ہر شے اور اُس کے خالق وحدہ لا شریک کے مابین ظاہر و مظہر کا تعلق ہے کہ ذات الہی ان سب میں ظاہر اور یہ سب کے سب اُس کے مظاہر ہیں۔ اور یہ دونوں لفظ یعنی ظاہر و مظہر اپنے لغوی مفہوم پر محمول نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے میں ظاہر ہو جائے معقول و محسوس ہو جائے، مشموم و ملموس ہو جائے نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ ظاہر ایسا کہ کبھی ظاہر نہیں ہوتا، معقول و محسوس

(۱) کتاب الحُجُب رسائل ابن عربی، ص: 92, 93 مطبوعہ ابن عربی فائونڈیشن

أصول ترجمہ

نہیں ہوتا کہ اُس کی عظمتِ شان اس سے مانع و حاجب ہے اور کائنات کا اُس کے لیے مظہر ہونا اس طرح کہ یہ خود ظاہر ہیں، معقول و محسوس ہیں اور اُسی ایک وحدہ لا شریک کے جلوے ہیں، اُس کے بغیر ان کا ثبوت ہے نہ وجود۔ اشعار کے پس منظر کی اس روشنی میں ان کے پہلے شعر کا حقیقی ترجمہ ”پس وہیں پر نہیں ہے مگر اللہ اور کون حادث ہے اور یہاں پر نہیں ہے مگر کینونت اور اللہ تعالیٰ ظاہر ہے، پھر وہیں پر نہیں ہے مگر اللہ اور عالمِ ناسوت حادث ہے اور یہیں پر کینونت کے سوا کچھ نہیں اور اللہ ظاہر ہے“ جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن کے ایک ایک جزو پر منطبق ہونے کے ساتھ اصل مقصد کے بھی مطابق ہے۔ جسے پس پشت ڈال کر ترجمہ کے نام سے متن کی معنوی تحریف کرنے کا کیا جواز ہے ایسے میں ترجمہ کی مذکورہ شرط سے کون انکار کر سکتا ہے۔

اشعار کے دوسرے حصہ ”مَا الْعِلْمُ إِلَّا الْجَهْلُ بِاللَّهِ فَأَعْتَصِمْ..... بِقَوْلِي فَإِنِّي عَنْ قَرِيبٍ أَسَافِرُ“ سے تین مقاصد ہیں:

پہلا مقصد:۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جملہ کائنات میں ظاہر ہونے کے باوجود لا ظاہر اور لا معقول و لا محسوس اور ما وراء العقل والا دراک ہونے کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اُس کے کمالِ ظہور کی بداہت کا حجاب لاحق ہے جس کی وجہ سے اُس وحدہ لا شریک کی تحدید اور اُس کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے اُس کی ذات سے متعلق جس تصور کو بھی علم کہا جاتا ہے وہ درحقیقت حجاب کا علم ہے اُس کی ذات کا نہیں۔ اس باب میں قولِ فیصل یہ ہے کہ ”اِنَّهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی لَا یُعْلَمُ اِلَّا اَنَّهُ لَا یُعْلَمُ“۔

دوسرا مقصد:۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے ادراک اور عدمِ ادراک سے متعلق اس قولِ فیصل ”اِنَّهُ لَا یُعْلَمُ اِلَّا اَنَّهُ لَا یُعْلَمُ“ کی تفہیم کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اللہ کی توفیق سے میں بھی اُن میں شامل ہوں اور میں عنقریب دارِ آخرت کے سفر پر جانے والا ہوں اس لیے میری باتوں کو پلے باندھ کر ان سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ شعر کے اس پس منظر کے مطابق اُس کا حقیقی ترجمہ (اللہ تعالیٰ کی حقیقت سے متعلق علم نہیں ہے مگر جہل میری بات پلے سے باندھ کہ میں عن قریب

اصول ترجمہ

سفرِ آخرت پر جاؤں گا، حقیقۃً الحق کا علم نہیں ہے مگر جہل تو میری بات کو یاد رکھ میں عنقریب سفرِ آخرت پر جا رہا ہوں) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن سے مقصد پر بھی منطبق ہے اور دوسری تمام شرائط پر بھی برابر ہے۔

تیسرا مقصد: شعر کے تیسرے حصہ ”وَمَالِي مَالٌ غَيْرِ عِلْمِي وَوَارِثٌ..... سِوَى عَيْنِ أَوْلَادِي فَذَا الْمَالُ حَاضِرٌ“ سے مقصد یہ بتانا ہے کہ میں نے پوری عمر معارف کے درس میں گزاری، دُنیا اور اُس کی رعنائیوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا اور میری صُلحی اولاد بھی نہیں ہے انجامِ کار میرے ترکہ میں مال ہوگا نہ وارث ایسا بھی نہیں ہے کہ میرے بعد میرے فیض کا یہ سلسلہ منقطع ہوگا نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہ تمام حضرات میری روحانی اولاد ہیں جو میرے حلقہٴ درس سے معارف کا فیض پاتے ہیں۔ میرا فیض پھیلانے کے حوالہ سے یہ حضرات بمنزلہ شمع ہیں جو پیاسوں کو سیراب کرتا ہے اور میرے چشمہ فیض کا یہ مال سب کے لیے حاضر ہے۔ اس کے مطابق شعر کا معیاری ترجمہ ”علم کے سوا میرا کوئی مال ہے نہ وارث میری روحانی اولاد کے چشمہ علم کے ماسوا تو یہ مال حاضر ہے، میرے لیے مال نہیں ہے میرے علم کے سوا اور وارث نہیں ہے میری علمی اولاد کے چشمہ فیض کے سوا تو یہ مال حاضر ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا تھا جو ہر اعتبار سے بے غبار اور بامقصد ہے شرائط کی پابندی میں ترجمہ ناممکن کہنے والوں کو اس پر بار بار غور کرنا چاہئے کہ جو ترجمہ بھی شرائط کی پابندی کے بغیر ہو وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا پیش نظر اشعار کے ترجمہ میں ہوا ہے۔

عام ترجمہ کی مذکورہ شرط سے خلاف ہونے کی ترجمۃ القرآن سے پہلی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 214 کے حصہ ”وَلَمَّا يَأْتِكُم مِّثْلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ“ کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”حالاں کہ تم کو ہنوز اُن مسلمان لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں“ جو آیت کریمہ کی عبارت النص اور اُس کے نزول سے سراسر خلاف

أصول ترجمہ

ہے کیوں کہ آیت کریمہ سے مقصد اس کے سیاق و سباق اور قرآنی تفسیر کی روشنی میں یہ بتانا ہے کہ استطاعت کے باوجود حق کا تحفظ و دفاع نہ کرنے والوں کا دخول جنت کا اُمیدوار ہونا فضول ہے، نیز ایمان و لوازماتِ ایمان اور تقاضائے ایمان کے تحفظ و دفاع کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے اور اُن کے مقابلہ میں صبر و استقامت دکھانے کی اہمیت بتانا ہے کہ یہ ایمان کی کسوٹی ہے، جنت کا استحقاق پانے والوں کی پہچان ہے اور جنت میں داخلہ کے لیے شرط ہے جس پر اگلی اُمتوں کے انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اور اُن پر ایمان لانے والے سچے متبعین نے بھی عمل کیا ہے۔ الغرض آیت کریمہ سے مقصد حق کی خاطر قربانی دینے اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے کا جذبہ اور حسبِ ضرورت اس پر عمل کرنے کو جنت کا ثمن، اُس کی قیمت اور اُس میں داخلہ کے لیے ضروری شرط بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جس پر انبیاء سابقین اور اُن پر ایمان لانے والے سچے متبعین نے بھی عمل کیا ہے۔ آیت کریمہ کے مقصدِ نزول کے حوالہ سے حقیقت کی اس روشنی میں دیکھا جائے تو اُگلوں پر گزرنے والے عجیب واقعات کے پیش آنے کو جنت میں داخلہ کے لیے ضروری قرار دینے کی کیا تگ ہے، متن کی اس کے ساتھ کون سی مناسبت و ربط ہے اور آیت کریمہ کے مقصدِ نزول سے اس کا کیا تعلق ہے جبکہ اُس کے نزول سے مقصد کے مطابق ترجمہ ”جبکہ تم پر اگلوں جیسے حالات نہیں آئے، اور حال یہ ہے کہ تم پر ابھی اگلوں کی سی روداد نہیں آئی“ جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے۔

دوسری مثال:- سورۃ البقرہ، آیت نمبر 187 کے حصہ ”وَلَا تَبَايَسُوا هُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسْجِدِ“ کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ترجمہ ”اور اُن بیبیوں کے بدن سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں“ جو آیت کریمہ سے مرادِ الہی کے سراسر خلاف ہے کہ سیاق و سباق سے آیت کریمہ کے نزول سے جو مقصد مفہوم ہو رہا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آیت کریمہ سے مقصدِ نزول اعتکاف کی حالت میں شہوت کے ساتھ ہاتھ

أصول ترجمہ

لگانے کی تمام صورتوں سے اجتناب کا حکم ہے جس کی عملی صورتیں مس بالشہوت کے ادنیٰ فرد سے لے کر اعلیٰ فرد تک سب کو شامل ہیں جبکہ شہوت کے بغیر عورت کے بدن کا معتکف کے بدن کے ساتھ ملنے کی قطعاً کسی ایک صورت سے بھی منع نہیں ہے۔ آیت کریمہ کا یہ مفہوم اپنی جگہ قطعی ہونے کی بناء پر مجتہدین و مفسرین کے مابین بھی متفقہ اور غیر متنازعہ ہے جیسے تفسیر روح المعانی میں ہے:

”فَهُمَا أَمَّا مَبَاحٌ إِتْفَاقًا بَانَ يَكُونَا بِغَيْرِ شَهْوَةٍ وَأَمَّا حَرَامٌ بَانَ يَكُونَانِهَا“ (۱)

آیت کریمہ کے اس مفہوم کا قطعی ہونے کی بناء پر کل مکاتب فکر مجتہدین و مفسرین کا بھی اس پر اجماع ہے، نیز بخاری شریف میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا سے مروی ہے:

”قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ لِيَدْخُلَ عَلَيَّ رَأْسَهُ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ فَارْجُلُهُ“ (۲)

ان تمام حقائق سے برخلاف آیت کریمہ کے ترجمہ میں یہ کہنا ”اُن بیبیوں کے بدن سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں“ آیت کریمہ کی عبارت النص کے سراسر خلاف ہونے کے ساتھ اٹکل پچو کے سوا اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ کہلائے۔ حالاں کہ متن سے مقصد متکلم کے مطابق ترجمہ ”اور انہیں ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو، اور انہیں نہ چھوؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو“ جیسے کسی بھی انداز سے کیا جاسکتا ہے یعنی ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی مجبوری نہیں ہے۔

عام ترجمہ کی ایک ذیلی شاخ یہ بھی ہے کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے لسانی مجبوری لاحق ہوئے بغیر ترجمہ کے الفاظ کو متن کے الفاظ سے زیادہ نہ کرے ورنہ ترجمہ کی حد سے نکل جائے گا کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہے کہ ”اببدال الفاظ الاصل بالفاظ اللسان الاخر التي تقوم مقامها“ یعنی متن کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو متن کے الفاظ کے قائم مقام ہو

(۱) تفسیر روح المعانی، ج: ۲، ص: 68۔

(۲) بخاری شریف، باب الاعتکاف، ج: ۱، ص: 272۔

أصول ترجمہ

سکیں اور ظاہر ہے کہ ترجمہ کا کوئی لفظ جب اصل کے الفاظ سے زیادہ ہوگا تو اُس کے حوالہ سے ”اببدال“ کا تصور نہیں ہوگا کہ وہ کس سے بدل ہے۔ مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن اور ناگزیر مجبوری لاحق ہو جائے کہ اُس صورت میں مشہور اصولِ فطرت ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے جواز میں جائے گا۔

عام ترجمہ میں اس اصول سے خلاف ہونے والے ترجمہ کی پہلی مثال فتاویٰ رضویہ، جلد دوم سے متن ”قال فی المنیۃ بعد ما عرف المستعمل بماء اذیل به حدث او استعمل فی البدن علی وجهہ القربۃ مانصہ امرئۃ غسلت القدر او القصاع لا یصیر الماء مستعملاً“ کا ترجمہ میرے قابلِ احترام بھائی اللہ کا ولی مفتی سید شجاعت علی قادری جسٹس شرعی عدالت اسلام آباد رَحْمَةُ اللهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے اس انداز سے کیا ہے:

”منیہ میں ماء مستعمل کی تعریف میں کہا کہ وہ پانی جس سے کوئی حدث زائل کیا گیا ہو یا بدن پر قربۃ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو پھر فرمایا کہ اگر کسی عورت نے ہانڈی یا بڑا پیالہ دھویا تو پانی مستعمل نہ ہوگا۔“ (۱)

أصول ترجمہ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اس میں لفظ ”پھر فرمایا“ بے تکہ ہونے کے ساتھ لفظ ”فرمایا“ حشو و زوائد کے قبیل سے ہے اور متن کے الفاظ پر بلا ضرورت زیادہ جبکہ متن کے الفاظ کے مطابق الفاظ میں اُس کا ترجمہ (منیہ میں ماء مستعمل کی تعریف کرنے کے بعد کہ یہ وہ پانی ہے جس سے حدث زائل کیا گیا ہو یا ثواب کے طور پر بدن میں استعمال کیا گیا ہو) کہا ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ عورت نے ہانڈی یا بڑا پیالہ دھویا وہ پانی مستعمل نہیں ہوگا، منیہ میں ماء مستعمل کی یہ تعریف کہ وہ پانی جس سے حدث زائل کیا گیا ہو یا بدن میں علی وجهہ القربۃ استعمال کیا گیا ہو کرنے کے بعد کہا ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ عورت نے ہانڈی یا غان دھوئے وہ پانی مستعمل نہ

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: ۲، ص: ۵۱، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

أصول ترجمہ

ہوگا) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جس سے حضرت مرحوم نور اللہ مرقدہ الشریف نے بے توجہی فرما کر نہ صرف یہ کہ ترجمہ میں ایک لفظ زیادہ کیا بلکہ اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہ سے نامناسب کیا ہے لیکن اس مثال میں ہمارے پیش نظر الفاظ متن سے زیادہ کیے جانے والے لفظ کی نشان دہی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے لہذا ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اعتراف حقیقت:- حضرت ابن مسعود مفتی ابن مفتی سید شجاعت علی القادری نور اللہ

مرقدہ میرے ہم درس اور اُستاذ بھائی بھی تھے اور نہ صرف ہم عصر بلکہ ہم عمر اور جگری دوست بھی تھے۔ علم و عمل اور تقویٰ و پرہیزگاری میں اتنے ثقہ تھے کہ اُن کے اہل خاندان سے لے کر ہم درس ساتھیوں تک سب کو اُن پر اعتماد تھا اور اُن کی علمی ثقاہت سے متاثر ہو کر ارباب اختیار نے انہیں وفاقی شرعی عدالت کالج مقرر کیا تھا اُن کی متعدد مذہبی خدمات کے زمرہ میں فتاویٰ رضویہ، جلد دوم کی عربی عبارات کا ترجمہ بھی شامل ہے جو کافی حد تک درست ہونے کے باوجود کچھ مقامات پر شرائط سے متجاوز ہے اور پیش نظر مثال بھی اُن ہی میں سے ہے۔ حضرت موصوف و مرحوم کی علمی جلالت کے باوجود ترجمہ میں ایسی کمزوریوں کا صادر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ترجمہ کافن نہایت مشکل ہے، تصنیف و تالیف تعلیق و تحشیہ اور مضمون نویسی و مقالہ نویسی جیسی ہر تحریری صنف سے جداگانہ اور مستقل ہے اور اس کی تعریف و غرض و موضوع سے لے کر شرائط و اصول تک تمام لوازمات و تقاضے بھی جدا ہیں جن میں سے کسی ایک شرط سے بے توجہی کی وجہ سے بھی ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے چاہے مترجم بجائے خود جتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو۔

ہم اس باب میں ترجمہ کی عمومی شرائط سے منحرف بالترتیب عام ترجمہ اور خاص قرآن شریف کے ترجمہ سے دو دو مثالیں پیش کر رہے ہیں یہ اُن حضرات کی لکھی ہوئی ہیں جن کی علمی شہرت کے ساتھ حلقہ اثر بھی ہے اور کافی حد تک اہل علم بھی اُن سے متاثر ہیں یہاں تک کہ اُن کے حلقہ اثر کے لوگ اُن کی غلطیوں پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس سے قارئین یہ سبق لے سکتے

اُصولِ ترجمہ

ہیں کہ غیر معیاری حضرات اور لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونے والوں کی طرح دونوں زبانوں پر عبور کے بغیر ترجمہ کرنے والوں نے کیا کیا گل نہ کھلائے ہوں گے خاص کر ترجمہ قرآن کے نام سے معنوی تحریفات کی کیا کیا مثالیں قائم نہ کی ہوں گی، کسی انسانی کتاب اور اللہ تعالیٰ کی کتاب ”قرآن شریف“ کے خلاف شرط ہونے والے ترجمہ غلط اور غیر معیاری کہلانے میں مشترک ہونے کے علاوہ خاص فرق یہ ہے کہ کسی انسانی کتاب کا غلط ترجمہ کے نقصانات محدود ہوتے ہیں جبکہ قرآن کے غلط ترجمہ کے نقصانات لامحدود ہوتے ہیں۔ (اعاذنا اللہ منہ)

جملہ معترضہ کی ان سطور کے بعد عام ترجمہ کی مذکور شرط یعنی ترجمہ کے الفاظ کو متن کے

الفاظ سے زیادہ نہ کرنے سے خلاف ہونے والے ترجمہ کی دوسری مثال کے لیے فتاویٰ رضویہ کی عربی و فارسی عبارات کے مترجم مفتی محمد خان قادری کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے جو انہوں نے فتاویٰ رضویہ، جلد ہفتم میں مذکور حدیث ”انکم فی صلوٰۃ ما انتظرثم الصلوٰۃ“ کا کیا ہے ”بے شک تم نماز ہی میں ہو جب تک نماز کے انتظار میں ہو۔ (۱) جس میں لفظ ”ہی“ متن کے الفاظ سے زیادہ ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں لفظ ”ہی“ حصر کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ متن میں یہاں پر حصر کا کوئی لفظ موجود ہے نہ کوئی انداز تو پھر اسے کس کا بدل کہا جائے گا نہ صرف اتنا بلکہ مقتضائے مقام بھی نہیں ہے۔ ایسے میں اس کی حیثیت حشو و زائد کی قباحت سے خالی نہیں ہے جو کلام سے اصل مقصد کی فہم میں مغل ہو رہا ہے کیوں کہ اس کے مطابق نماز کا انتظار کرتے ہوئے تلاوت قرآن، تسبیح و تہلیل و عطا و نصیحت، درس و تدریس جیسے عمل کی بھی نفی ہو رہی ہے کہ انتظارِ صلوٰۃ کے اثناء میں اس قسم کے عمل کرنے والے بھی نماز ہی میں مصروف ہیں حالاں کہ حدیث سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے بلکہ اس سے مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ نماز کا انتظار کرنے والے کو نماز کا ثواب ملتا ہے چاہے اس اثناء میں نیکی کا جو عمل بھی کر رہا ہو۔ ایسے میں متن پر اس قسم کے

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج 7، ص 231، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

اُصولِ ترجمہ

اضافہ کو حشو و زوائد کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے یہاں پر کوئی ناگزیر مجبوری ہو بلکہ الفاظِ متن کے مطابق ترجمہ ”بے شک تم نماز میں ہو جب تک نماز کے انتظار میں ہو، بے شک تم نماز کے ثواب میں ہو جب تک نماز کے انتظار میں ہو جیسے کسی بھی سادہ انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن سے اصل مقصد کے مطابق ہونے کے ساتھ جملہ شرائط پر بھی منطبق ہے۔ اس سے دُنیاۓ علم کو اور خاص کر ترجمہ کتب کا افادہ و استفادہ کرنے والوں کو یہ سبق بھی مل رہا ہے کہ ترجمہ صنفِ تحریر میں کتنا مشکل کام ہے جس میں متن سے محض ایک لفظ کا فرق بھی اسے بے مقصد کر دیتا ہے نہ صرف بے مقصد بلکہ اصل مقصد کی فہم میں مغل بن کر دائرہِ بلاغت سے بھی نکال دیتا ہے جسے معنوی تحریف سے خالی نہیں کہا جاسکتا۔

عام ترجمہ کی پیش نظر شرط کے خلاف ہونے والے ترجمہ القرآن کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 160 کا اشرف علی تھانوی اور فتح محمد خان جالندھری کے کیے ہوئے تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے جو بالترتیب اس طرح ہیں؛

اشرف علی تھانوی:- ”مگر جو لوگ توبہ کریں اور اصلاح کر دیں اور اُن مضامین کو ظاہر کر دیں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ ہو جاتا ہوں اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کر لینا اور مہربانی فرمانا۔“

فتح محمد جالندھری:- ”ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے اور احکامِ الہی کو صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں اُن کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔“

جن میں اول الذکر نے متن کے حصہ ”وَبَيِّنُوا“ کے ترجمہ میں لفظ ”اُن مضامین“ کا اضافہ کیا ہے اور ثانی الذکر نے متن کے حصہ ”وَإِنَّا لَنُؤَاتِيكَمُ الرِّجِيمَ“ کے ترجمہ میں لفظ ”اور“ کو اضافہ کیا ہے جس کے نتیجہ میں اول متن سے مراد کے عموم اور مقصد سے خلاف ہو گیا کیوں کہ سیاق و

أصول ترجمہ

سباق کے مطابق یہاں پر جس چیز کو بیان کرنا مقصد ہے وہ عام ہے جو یہودیوں کے علماء سوا اور ان کے غیر معیاری مشائخ کے چھپائے گئے مضامین و احکام کو بھی شامل ہے اور عام احکام الہی کے حوالہ سے بھی کتمان حق سے بچ کر آسمانی کتاب کے احکام حسب ضرورت ظاہر کرنے کو بھی شامل ہے۔ آیت کریمہ کے اس لفظ ”بینوا“ کے ساتھ کسی خاص مفعول بہ کو ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اہل بلاغت جانتے ہیں کہ فعل متعدی کے ساتھ اُس کے مفعول بہ کو ذکر نہ کرنے سے بڑا مقصد عموم المراد ہوتا ہے۔ جیسا آیت کریمہ ”وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ“ (یونس: 25) کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے بھی لکھا ہے۔

حقیقت کی اس روشنی میں ترجمہ کا یہ اضافی لفظ متن سے عموم المراد کے منافی ہونے کے ساتھ حشو و زوائد کے زمرہ میں شامل ہو رہا ہے جبکہ دوسرے ترجمہ کا حال اس سے بھی بدتر ہے کیوں کہ آیت کریمہ ”وَاَنَا التَّوَابُ الرَّحِيْمُ“ میں لفظ ”التَّوَابُ، الرَّحِيْمُ“ خبر بعد الخبر ہیں ضمیر ”اَنَا“ سے جن کے درمیان حرف عطف کا آنا ممکن نہیں ہے جس کے برعکس ترجمہ میں لفظ ”اور“ لایا گیا ہے جو حرف عطف ”و“ کا ترجمہ ہے دونوں ترجموں کی یہ خرابیاں محض اس لیے دیکھنے کو مل رہی ہیں کہ مترجمین نے مذکورہ شرط سے لاپرواہی کی ہے جو عام ترجمہ کی صحت کے لیے عام سی شرط ہے جبکہ ترجمہ القرآن کے لیے مخصوص اضافی شرائط کا یہاں پر ذکر ہی نہیں ہے اُن کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اس قسم کے تراجم کو معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں مذکورہ شرط کی ایک شق یہ بھی ہے کہ متن کا لفظ اگر فعل ہے تو پھر فعل لازم اور متعدی ہونے کے حوالہ سے، اور مجہول ہونے کے حوالہ سے اُس کی حیثیت پر اطمینان کے بعد ترجمہ میں بھی اُس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ فعل لازم کا ترجمہ متعدی میں یا متعدی کا ترجمہ لازم میں کرنے سے ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے جس کی عام ترجمہ میں پہلی مثال فتاویٰ رضویہ میں مذکور درج ذیل فارسی اشعار ”ز دروست ماہ تابان آفریدند

أصول ترجمہ

.....زقذت سروبوستان آفریدند“ کا ترجمہ مفتی محمد خان قادری نے اس طرح کیا ہے:
”تیرے چہرہ اقدس سے روشن چاند پیدا ہوتے ہیں تیرے قد انور سے باغ کے سرو اُگتے
ہیں۔“ (۱)

جس میں متن کے فعل متعدی ”آفریدند“ کا ترجمہ دونوں جگہوں میں فعل لازم کے
الفاظ میں کیا گیا ہے کیوں کہ اردو محاورہ میں لفظ ”پیدا ہونا“ مفعول بہ کا محتاج نہیں ہے تو پھر اس کی
حیثیت فعل لازم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی حال لفظ ”اُگنا“ کا بھی ہے کہ اس سے اشتقاق پا کر
استعمال ہونے والے تمام الفاظ مثلاً ”اُگتے ہیں، اُگتا ہے، اُگتی ہے، اُگے گا، اُگیں گے“ جیسے جتنے
بھی ہیں وہ سب فاعل پر ہی تمام ہوتے ہیں یعنی فعل لازم ہی کہلاتے ہیں اور اہل علم سے پوشیدہ
نہیں ہے کہ فعل لازم اور متعدی میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرنا جائز نہیں ہے تو پھر اس
کے ترجمہ میں کیوں جائز ہو یہ بھی نہیں ہے کہ یہاں پر ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کا
عارضہ یا کوئی اور محاوراتی مجبوری لاحق ہے بلکہ مذکورہ اشعار کا ترجمہ (تیرے چہرہ سے روشن چاند
پیدا کیے..... تیرے قد سے باغ کے سرو پیدا کیے، تیرے چہرہ سے روشن چاند پیدا کر دیئے.....
تیرے قد سے سرو باغ پیدا کر دیئے) جیسے کسی بھی متعدی انداز میں ہو سکتا ہے جبکہ ترجمہ والی زبان
کی طرف سے کسی ناگزیر مجبوری کے بغیر متن کی نوعیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ کبھی با مقصد نہیں
ہو سکتا یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ متن سے مقصد کارکنان قضا و قدر کو فاعل اور روشن چاند اور سرو
باغ کو مفعول بہ قرار دینے کے ساتھ مدوح کے چہرہ کو ان دونوں کے لیے اصل ماخذ و بنیاد بتانا ہے
بین تفاوت را از کجا تا کجا است ایسے میں عام ترجمہ کی مذکورہ شرط سے انکار کیا
مجال ہے۔ (فاعتبروا ایہا المترجمون)

دوسری مثال:- فتاویٰ رضویہ، جلد اول کی عربی اور فارسی عبارات کے مترجم محمد احمد مصباحی نے

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: 14، ص: 649، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

اصول ترجمہ

متن ”ہذا کلمہ ماضیہ لی ولیحور“ کا ترجمہ یہ سب وہ ہے جو مجھ پر ظاہر ہوا اس پر خوب غور کیا جائے۔ جس میں نہ صرف یہ کہ متن لغت اور تحریر کے لغوی مفہوم سے خلاف کر کے ترجمہ کو بے مقصد بنایا گیا ہے جس پر افسوس کیے بغیر کوئی سامع رہ سکتا ہے نہ کوئی قاری بلکہ اس پر افسوس بالائے افسوس یہ کہ متعدی متن کا ترجمہ فعل لازم میں کیا گیا ہے کیوں کہ لفظ ”لیحور“ علم تصریف کے مطابق امر غائب مجہول کہلاتا ہے جو اپنے مصدر ”تحریر“ بمعنی لکھنے سے مشتق استعمال ہوتا ہے اور تحریر بمعنی کتابت فعل لازم نہیں ہے جو مکتوب کے بغیر صرف فاعل سے ہی وجود میں آسکے بلکہ متعدی ہے جس کا تصور مفعول بہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کے ترجمہ کے لیے جو الفاظ ”اس پر خوب غور کیا جائے“ استعمال کیے گئے ہیں متعدی نہیں بلکہ فعل لازم کے قبیل سے ہیں کیوں کہ غور کرنا مفعول بہ نہیں بلکہ مفعول فیہ یعنی مافیہ الغور والفکر کے مقتضی ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی ناگزیر مجبوری یا کوئی خاص محاورتی اور بلاغت مقتضا موجود نہ ہونے کی صورت میں متن کی نوعیت سے خلاف الفاظ استعمال کرنے سے ترجمہ بامقصد نہیں ہو سکتا جبکہ یہاں پر ایسی کوئی مجبوری یا مقتضائے مقام موجود نہیں ہے کیوں کہ اس کے ترجمہ میں (اور اسے لکھا جائے، اور اسے لکھ کر محفوظ کیا جائے، اور اسے کتابت میں لایا جائے) جیسے کوئی بھی الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

ایسے میں ترجمہ کی مذکورہ شرط کے ناگزیر ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے دانش جو مستفتی کے جواب میں اس تحریر سے ہمارا مقصد بھی متعدی ہے یعنی صرف دانش جو جیسے ایک سائل کی فہمائش اور ان کی رہنمائی تک محدود نہیں ہے بلکہ دانش جو حضرات کے ساتھ ان دانش وہ شیوخ و اساتذہ اور علم کی روشنی پھیلانے والے حضرات کو بھی خواب غفلت سے جھنجھوڑنا ہے کہ عمومی شرائط کی پابندی کے بغیر کسی بھی قابل ذکر کتاب کا ترجمہ کرنا بھی روا نہیں ہے چہ جائیکہ ترجمہ القرآن جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل جائز ہو سکے۔ اس تحریر سے ہمارے مقصد اس لیے بھی متعدی ہے کہ عمومی شرائط سے خلاف جن تراجم کو ہم مثال کے طور پر

أصول ترجمہ

ذکر کر رہے ہیں یہ دانش جو حضرات کے کیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ الہیات کے حوالہ سے حلقہ اثر رکھنے اور اپنے انداز پر علم پھیلانے والے دانش وہ حضرات کے کیے ہوئے تراجم ہیں یعنی ”چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی“ اللہ بہتر جانے لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونے والوں کی طرح بغیر شرائط کے مترجم بننے والے بے اثر حضرات کیا کیا تحریفات کر رہے ہوں گے۔

ترجمۃ القرآن میں مذکورہ عام شرط سے خلاف ہونے والے ترجموں کی مثال کے لیے محدث کچھوچھوی سید محمد اور عبدالرحمن گیلانی کے ترجموں کو دیکھا جاسکتا ہے جو انہوں نے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 108 کے حصہ ”وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ“ کا بالترتیب ترجمہ کیا ہے ”اور جو بدل کر لے کفر کو ایمان سے تو بے شک گم کر دیا اُس نے ہموار راستہ، اور جس نے ایمان کو کفر کی روش سے بدل دیا اُس نے صراطِ مستقیم کو گم کر دیا“ جس میں متن کے غیر متعدی فعل ”ضَلَّ“ کا ترجمہ متعدی میں کیا گیا ہے جو بالترتیب اُن کے الفاظ ”بے شک گم کر دیا اُس نے ہموار راستہ، اُس نے صراطِ مستقیم کو گم کر دیا“ سے آپ ہی معلوم ہو رہا ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے جس کی وجہ ترجمہ کی مذکورہ عام شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ورنہ آیت کریمہ کے اس حصہ کی لسانی حیثیت کہ یہ فعل لازم ہے اور اس کے متعدی ہونے کا کوئی محاورہ موجود نہیں ہے۔ نیز لسانِ قرآنی کے مطابق (ض، ل، ل) کے مادہ سے اشتقاق پا کر استعمال ہونے والے الفاظ میں ”ضلال“ اپنے وجود میں مفعول بہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ صرف فاعل پر ہی تمام ہوتا ہے جس وجہ سے اسے فعل لازم کہا جاتا ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں ”اضلال“ ہے جو اپنے وجود میں مفعول بہ کی طرف محتاج ہے جس وجہ سے اسے فعل متعدی کہا جاتا ہے جس کے مطابق آیت کریمہ کا درست ترجمہ ”اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ سے بہک گیا، اور جو ایمان کے بدلے میں کفر لے بے شک وہ سیدھی راہ سے بہک گیا، جو ایمان کے بدلے

أصول ترجمہ

کفر لے بے شک وہ صراطِ مستقیم سے بہک گیا“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو متن کی لسانی حیثیت کے مطابق ہونے کے ساتھ دونوں زبانوں کے محاورہ پر بھی منطبق ہے لیکن اس کی توفیق صرف انہیں نصیب ہو سکتی ہے جو ترجمہ کی شرائط کا التزام کریں۔ (واللہ الہادی الی سبیل الرشاد)

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں مذکور شرط کی ایک شق یہ بھی ہے کہ موصول یا مفصول ہونے کی حیثیت سے متن کی تمیز کرے اس حوالہ سے اُس کی حیثیت پر قلبی اطمینان پانے کے بعد ترجمہ والی زبان سے اُس کے مطابق الفاظ و انداز اختیار کرے ورنہ موصول متن کا ترجمہ مفصول میں اور مفصول کا ترجمہ موصول میں ہو کر ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے۔ موصول سے ہماری مراد علم نحو والا موصول نہیں ہے جو کبھی حرفی ہوتا ہے کبھی اسمی اور ہر صورت میں صلہ کا مقتضی ہوتا ہے کیوں کہ صلہ کے بغیر اُس کا تصور ممکن ہے نہ وجود بلکہ اس سے ہماری مراد وہ موصول ہے جو علم بلاغت میں مشہور و معروف ہے جسے عطف نسق بھی کہا جاتا ہے جس میں حرف عطف کے ذریعہ دو الفاظ یعنی معطوف و معطوف علیہ ایک دوسرے کے ساتھ موصول ہوتے ہیں اور ایک حکم میں شریک ہوتے ہیں جبکہ مفصول میں ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ اُس میں حرف عطف کے بغیر دو کلام یا دو لفظ مستقل انداز سے مذکور ہوتے ہیں جس وجہ سے انہیں ضدین کہا جاتا ہے کہ موصول کی جگہ الفاظ کو مفصول کرنا جائز ہے نہ اس کے برعکس ورنہ مقصد سے خلاف ہوگا اور بلاغت کے دائرہ سے نکل کر بے مقصد ہوگا کیوں کہ ان سے مقاصد مختلف ہوتے ہیں جب ان میں سے ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے تو پھر ترجمہ کیوں جائز ہوگا جبکہ ترجمہ اصل کی فرع اور اُس کے تابع ہے۔

اس کی خلاف ورزی پر مشتمل ترجموں کی پہچان کے لیے عام ترجمہ میں پہلی مثال فتاویٰ رضویہ، جلد ہفتم کے مترجم کا وہ ترجمہ ہے جس میں انہوں نے فتاویٰ رضویہ میں موجود فقہ کی مشہور عبارت ”لو وجد فرجة فی الاول لا الثانی له خرق الثانی لتقصیرهم“ کا ترجمہ اس انداز سے کیا ہے ”اگر کسی نے صف اول میں رخنہ پایا حالاں کہ دوسری میں نہ تھا تو اُس کے لیے

أصول ترجمہ

دوسری صف والوں کی کوتاہی کی وجہ سے دوسری صف کو چیرنا جائز ہوگا۔“ (۱)

جس میں متن کے حصہ ”لا الثانی“ پر آیا ہو حرف ”لا“ جو حرف عطف ہے جس کی وجہ سے اُس کے معطوف و معطوف علیہ یعنی پہلی صف میں خالی جگہ پانا اور دوسری صف میں نہ پانا یہ دونوں آپس میں موصول ہو کر اس بات کے لیے جواز بن رہے ہیں کہ بعد میں آنے والا دوسری صف کو چیز کر پہلی صف جاسکتا ہے اگر یہ دونوں آپس میں موصول نہ ہو یعنی ان کے مابین حرف واصل نہ ہو تو پھر اس پر مرتب ہونے والے حکم ”لہ خرق الثانی“ کا تصور ممکن نہیں ہوگا جبکہ متن کے آخری حصہ ”لتقصیرہم“ معطوف و معطوف علیہ کے اُس مجموعہ کی شرعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ پہلی صف میں خالی جگہ دیکھنے کے باوجود اُس میں کھڑے ہونے کے بجائے دوسری صف میں کھڑے ہو کر اُسے بھرنے والوں میں سے ہر ایک قصور وار ہے کہ اُس نے شریعت کے متفقہ حکم ”اتموا الصفوف الاول فالاول“ سے خلاف کیا ہے جس وجہ سے بعد میں آنے والے کے لیے جائز ہے کہ اُن میں سے جنہیں بھی چاہے سزا دے جو اُن کے بیچ میں سے گزر کر اگلی صف جانے میں پائی جاتی ہے۔ لیکن مترجم نے متن کی اس حیثیت کو پیش نظر رکھے بغیر اُسے من پسند کا تابع بنایا اور اُس کے حصہ ”لا الثانی“ کو جملہ حالیہ تصور کیا جبکہ حقیقت میں حال ذوالحال کی کیفیت کا یہاں پر تصور بھی نہیں ہے۔ ایسے میں ترجمہ کے با مقصد ہونے کا کیا تصور پیدا ہو سکتا ہے جبکہ اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق حقیقی ترجمہ (اگر صف اول میں خالی جگہ پائی دوسری میں نہیں اُس کے لیے دوسری کو چیرنا جائز ہے اُن کی کوتاہی کی وجہ سے، صف اول میں رخنہ پایا دوسری میں نہیں اُسے جائز ہے کہ دوسری صف کو چیرے اُن کے قصور کی وجہ سے) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن کی وصلی حیثیت کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہے لیکن یہ سہولت صرف انہیں میسر ہو سکتی ہے جو شرائط کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوں جس کے بغیر کلام کو ترجمہ کے

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج 7، ص 45، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

أصول ترجمہ

نام سے ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف منتقل کرنے والوں سے درست ترجمہ کی توقع کرنا اس سے مختلف نہیں ہوگا کہ ”بیل سے دودھ ملنے“ کی توقع کی جائے۔

دوسری مثال: فتاویٰ رضویہ میں منقول ”الحدیقة الندیة فی شرح الطریقة المحمدیة“ کی درج

ذیل عبارت ”قد سئل بعض العلماء عن هذه المقامات المنصوبة حول الكعبة التي يصلون فيها الآن بأربعة أئمة على مقتضا المذاهب الأربعة فأجاب بانها بدعة ولكنها بدعة حسنة لا سيئة لا تها تدخل بدليل السنة الصحيحة وتقریرها فی السنة الحسنة لا نها لم يحدث منها ضرر ولا حرج فی المسجد ولا فی المصلین من المسلمین لعامة اهل السنة والجماعة بل فیها عمیم النفع فی المطر والحر الشدید والبرد وفيها وسيلة للقرب من الامام فی الجمعة وغيرها فهي بدعة حسنة ويسمون بفعلهم للسنة الحسنة وان كانت بدعة اهل السنة لا اهل البدعة“

اس کا ترجمہ مفتی محمد خان قادری نے اس طرح کیا ہے ”بعض علماء سے کعبہ معظمہ کے ارد گرد مقامات مخصوصہ میں مذاہب اربعہ کی اقتداء میں نماز ادا کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اسے بدعت کہا لیکن یہ بدعت حسنہ ہے سیئہ نہیں کہ یہ سنت صحیحہ کی دلیل و تقریر پر سنت حسنہ میں داخل ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے کوئی ضرر نہیں ہوتا نہ مسجد میں کوئی تنگی ہے اور عام اہل سنت کے نمازیوں میں کوئی حرج ہے بلکہ اس میں بارش اور سخت گرمی و سردی میں فائدہ و آسانی ہے اور اس میں جمعہ وغیرہ میں امام کا قرب بھی حاصل رہتا ہے لہذا یہ بدعت حسنہ ہے اور فقہاء اپنے اس فعل کا نام سنت حسنہ رکھتے ہیں اگرچہ یہ اہل سنت کی بدعت ہے نہ کہ اہل بدعت کی۔“

جس میں متن کی متعدد لسانی حیثیات سے خلاف کر کے ترجمہ کو بے مقصد بنایا گیا ہے

جبکہ ہم یہاں پر صرف پیش نظر شرط کی خلاف ورزی کا پس منظر بتانا چاہتے ہیں کہ اس میں متن کی

أصول ترجمہ

عطف والی حیثیت سے بے اعتنائی کی گئی ہے جس کی وضاحت اس طرح ہے کہ یہاں پر متن کے حصہ ”فاجاب بانہا بدعة“ میں لفظ ”بدعة“ اور اس کے بعد والے الفاظ ”ولكنها بدعة حسنة لا سيئة“ آپس میں معطوفات ہیں کہ ”لكنها بدعة حسنة“ معطوف ہے ”بدعة“ پر جن کے مابین حرف عطف ”واو“ ہے اور لفظ ”سيئة“ معطوف ہے ”بدعة حسنة“ پر جن کے مابین حرف عطف لا ہے اور متن کے حصہ ”لم يحدث منها ضرر“ میں لفظ ”ضرر“ معطوف علیہ ہے جبکہ اس کے بعد والے الفاظ ”لا حرج“ اس پر عطف ہے جس میں ”واو“ حرف واصل اور لاتا کید نفی کی خاص صورت ہے اور حصہ ”فی المسجد فی المصلين“ بھی آپس میں معطوف و معطوف علیہ ہے جس کے بعد ”اهل السنة والجماعة“ تک بیان ہے ”مصلين“ کے لیے اور متن کا حصہ ”بل فيها عميم النفع“ معطوف ہے جملہ سابقہ ”لم يحدث منها ضرر“ پر جبکہ بعد میں مذکور ہونے والا جملہ ”وفيه اوسيلة للقرب من الامام“ اس پر معطوف ہے اور متن کا حصہ ”و يسمون بفعلهم“ سے لے کر آخر تک مستقل کلام ہے جو پیش آمدہ مسئلہ پر عمل کرنے والوں کو اہل بدعت نہ بلکہ اہل سنت کے نام سے یاد کرنے پر مستقل دلیل ہے جس میں لفظ ”يسمون“ علم تصریف کے مطابق باب ”تفعیل“ سے فعل مضارع مجہول ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے جس میں سے اول ضمیر مرفوع متصل بارز ”واو“ کی شکل میں قائم مقام فاعل ہے جبکہ دوسرا ”اهل السنة لا اهل البدعة“ ہے جو معطوف و معطوف علیہ سے مجموعہ ہے اور لفظ ”وان كانت بدعة“ میں مذکور لفظ ”ان“ کلمہ وصلیہ کہلاتا ہے جس کے بعد مذکور ہونے والے جملہ کا نقیض اولیٰ بالجزا ہوتا ہے اور اس کلام کے آغاز میں یعنی ”ويسمون“ میں مذکور حرف ”و“ عطف کے لیے نہیں بلکہ استینافہ ہے جس کے مابعد ہونے والا کلام جملہ مستانفہ کہلاتا ہے۔

حقائق کی اس روشنی میں پیش نظر متن کا معیاری ترجمہ ”بے شک بعض علماء سے پوچھا گیا کعبہ کے ارد گرد مقررہ اُن مقامات سے متعلق جن میں اب چاروں اماموں کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں چاروں مذاہب کے تقاضا کے مطابق تو اس نے جواب دیا کہ یہ بدعت ہے لیکن بدعت

أصول ترجمہ

حسنہ ہے نہ سیئہ کیوں کہ یہ داخل ہوتی ہے سنت صحیحہ کی دلیل اور اُس کی تقریر کی وجہ سے سنت حسنہ میں کیوں کہ اس سے کوئی ضرر اور نہ کوئی حرج پیدا ہوا مسجد میں نہ نمازیوں میں جو عام اہل سنت والجماعت مسلمانوں میں سے ہیں بلکہ اس میں نفع عام ہے بارش اور شدید گرمی اور ٹھنڈ میں اور اس میں امام کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے جمعہ وغیرہا میں تو یہ بدعت حسنہ ہے اور اچھا طریقہ پر عمل کرنے والے اپنے اس عمل کی وجہ سے اہل السنۃ کے نام سے یاد کئے جائیں گے اہل بدعت کے نام سے نہیں اگرچہ اُن کا یہ عمل ”لُغت“ کی زبان میں بدعت ہی کیوں نہ ہو، کعبہ کے ارد گرد مقررہ اُن مقامات سے متعلق بعض علماء سے پوچھا گیا جن میں اب چار اماموں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں چاروں مذاہب کے تقاضا سے تو اُس نے جواب دیا کہ یہ بدعت ہے اور اس سے مراد بدعت سیئہ نہیں بلکہ حسنہ ہے کیوں کہ سنت صحیحہ کی دلیل اور اُس کی تقریر کی بناء پر سنت حسنہ میں شامل ہوتا ہے کیوں کہ اس سے کوئی نقصان پیدا ہوا نہ حرج مسجد میں نہ نمازیوں میں جو عام اہل سنت مسلمانوں میں سے ہیں بلکہ اس میں عام نفع ہے بارش اور شدید گرمی اور ٹھنڈ میں اور اس میں امام کے قرب کا وسیلہ ہے جمعہ وغیرہا میں انجام کار یہ بدعت حسنہ ہے اور سنت حسنہ پر عمل کرنے والے اُس کے سبب اہل سنت سے موسوم ہوں گے اہل بدعت سے نہیں“ اس جیسے کسی بھی انداز سے کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف متن کی پیش نظر حیثیت پر منطبق ہے بلکہ اس کے علاوہ متعدد حیثیات کے بھی مطابق اور جملہ شرائط کے بھی موافق ہے لیکن اس کی توفیق اُن ہی کو نصیب ہوتی ہے جو ترجمہ کرتے وقت خود کو شرائط کے پابند سمجھتے ہیں۔ یہ اتنا عام مسئلہ ہے کہ کسی اہل علم سے پوشیدہ ہے نہ کسی فن کار سے کیوں کہ دُنیا کے کسی بھی فن کی حقیقت، اُس کے لوازمات اور شرائط کو سمجھے بغیر اُس میں کودنے والے سے اصلاح کی اُمید نہیں کی جاسکتی جبکہ ترجمہ کا فن دُنیا کے تحریر کی جملہ اصناف و فنون سے مختلف اور مشکل ترین فن ہے کثیرالشرائط اور مقتضی احتیاط ہے کہ صرف ایک شرط سے خلاف ہونے پر بھی ساری محنت ضائع ہو سکتی ہے لیکن افسوس اس بات پر کہ لوگ اسے آسان سمجھ کر ترجمہ کے نام سے کچھ

أصول ترجمہ

عجیب و غریب تحریریں شائع کر رہے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ترجمہ پڑھنے والوں کی غالب اکثریت صحیح و سقیم کی تمیز کرنے سے عاری ہے بلکہ ترجمہ کے نام سے جو کچھ بھی سامنے آتا ہے اُسے اصل کی جگہ قبول کرتی ہے دراصل غلط تراجم کے مروج ہونے میں بھی حضرات کی اس روش کو بڑا دخل ہے ورنہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ پڑھنے والوں میں %10 اہل تمیز ہوں تب بھی اس اُفتاد کا انسداد ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ دوسری وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ خاص کر قرآن و سنت اور ان کی فہم کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون کو مسلم آبادیوں میں سیاسی مقتدرہ کی سرپرستی حاصل نہیں ہے ثانوی درجہ میں ہونے کی وجہ سے تعلیم و تعلم اور افہام و تفہیم کے حوالہ سے ان کی موثر نگرانی بھی نہیں ہے جس کے سایہ عاطفت و تحفظ میں ان کی اشاعت ہوتی اور ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک زبان سے دوسری زبانوں کو منتقل کرنے میں بے اعتدالی سے تحفظ ہوتا۔ نیز مذہبی مقتدرہ جو خود کو اس کا امین و مسئول سمجھتا ہے ایک راہ پر نہیں ہے فرقہ در فرقہ، تقسیم در تقسیم کے نتیجہ میں فرمان الہی ”کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ“ (۱) کا منظر پیش کر رہا ہے، ہر فریق اپنے اکابرین کی بے اعتدالیوں کو چھپا کر دوسروں کی جائز تفہیمات کو بھی ناجائز قرار دینے میں کوشاں ہے، کسی فریق کو بھی جماعت بندی کی عصبیت سے آزاد ہو کر صحیح و سقیم کی تمیز کرنے کی توفیق نہیں ہے۔ ایسے میں قرآن و سنت کی تشریح و ترجمانی میں عصبیت کی رسہ کشی ہونے کی طرح قرآن شریف کا ترجمہ بھی محفوظ نہیں ہے، سچ فرمایا رب کریم ﷺ و عم نوالہ نے ”لَا يَمْسُهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ (۲) ”اُسے چھو نہیں سکتے مگر پاک ذہن والے۔“ سے پاک و صاف ہو۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ جنوبی ایشیائی خطہ میں اور خاص کر پاک و ہند کے مذہبی مدارس

(۱) المومنون: 53۔

(۲) الواقعة: 79۔

اُصولِ ترجمہ

میں قرآن و سنت کو کلام اللہ اور کلام الرسول کی حیثیت سے سمجھنے کی بجائے اپنے مخصوص نظریہ کے رنگ میں دیکھا جاتا ہے اور معلمین و متعلمین کی پوری عمریں اُسے اپنے نظریہ پر منطبق کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اپنے مخصوص نظریہ کے حق میں قرآن و سنت کی غلط تشریح، بے حقیقت تعبیر اور غیر معیاری ترجمہ دیکھ کر بھی اُسے تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ اپنی مخصوص ذہنی ترجیح سے خلاف حقیقی تشریح و تعبیر اور ترجمانی و ترجمہ کو مسترد کیا جاتا ہے۔ الہیات کے حوالہ سے معروضی حالات کے ایسے دل خراش ماحول میں غلط تراجم کو رواج پانے کا موقع مل رہا ہے اور غیر معیاری مترجمین کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے کیوں کہ سیاسی مقتدرہ کی طرف سے مذہبی اقتدار کی ان دھڑہ بندیوں کی گرفت نہیں ہے اور قرآن و سنت کے تحفظ کا اہتمام نہیں ہے اور قرآن کی روشنی کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے فطری شرائط کا احساس نہیں ہے۔ مترجمین کے ہاتھوں اُصولِ ترجمہ کا ضیاع دیکھ کر افسردگی کے عالم میں قلم نہ روک سکا بات لمبی ہو گئی میں نے اس مقام پر عمومی شرائط کی مذکورہ شق یعنی متن کی لسانی حیثیات میں سے وصل اور فصل کی تمیز سے خلاف ہونے والے ترجمہ القرآن کی مثالیں پیش کرنی تھیں۔

جس کی ایک مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 43 ”وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ“ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس کا ترجمہ کیا ہے ”اور نماز پڑھو زکوٰۃ دیا کرو“ جس میں متن کے حرف واصل ”و“ کے ترجمہ سے بے اعتنائی کر کے موصول متن کو مفصول کر دیا گیا ہے جبکہ اُس کا حقیقی ترجمہ ”اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو“ جیسی کسی بھی وصلی صورت میں ہو سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ترجمہ کی عمومی شرائط سے نا آشنا حضرات ایسی بے اعتدالیوں کو محض ایک حرف کا فرق کہہ کر ٹال دیں گے جو اُن کی ماحولیاتی مجبوری ہے کہ انہیں اس سے معنوی طور پر اُٹھنے والے قبائح کا علم نہیں ہے اور بلاغت پر پڑنے والے برے اثرات کا ادراک نہیں ہے جبکہ حقیقت میں یہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس کی اہمیت سے متعلق تلخیص المفتاح میں کہا ہے؛

”ومقام الفصل یباین مقام الوصل“ (۱)

(۱) تلخیص المفتاح فی البلاغۃ بحث تعریف بلاغت الکلام۔

أصول ترجمہ

دوسری مثال:- جو مذکور الصدر سے برعکس ہے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 199 کے حصہ ”ان اللہ غفور رحیم“ کا تھانوی اور فتح محمد جالندھری کے کیے ہوئے تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے جو بالترتیب اس طرح ہیں ”یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے اور مہربانی فرمائیں گے، بے شک خدا بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے“ جن میں لفظ ”اور“ نہ صرف بے محل ہے متن پر بے مصرف اضافہ اور اُس کی بلاغت کے منافی ہے بلکہ اُس کی لسانی حیثیت کو بدلنے کے مترادف ہے کیوں کہ نحوی اور بلاغی اصولوں کے مطابق اُس کے دونوں لفظ ”غفور، رحیم“ بالترتیب خبر بعد الخبر ہیں لفظ ”ان“ کے لیے جبکہ خبر بعد الخبر آپس میں موصول نہیں بلکہ مفصول ہوتے ہیں یعنی معطوف و معطوف علیہ نہیں بلکہ مستقل حیثیت کے حامل ہوتے ہیں جس کے مطابق یہاں پر لفظ ”رحیم“ اپنے سے ماقبل یعنی ”غفور“ کے تابع ہوئے بغیر مستقل طور پر ”ان“ کے لیے خبر اور اُس کا معمول ہے جیسا ”غفور“ کسی کے تابع ہوئے بغیر بلا واسطہ اور مستقل خبر و معمول ہے جبکہ ان کے مابین حرف عطف آنے کی صورت میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ آپس میں ضدین ہونے کی وجہ سے ”غفور رحیم“ کی جگہ غفور و رحیم ”کہنا جائز ہے نہ اس سے برعکس تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کا کیا جواز ہے؟ (واللہ الہادی الی سبیل الرشاد)

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کی پہچان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ متن میں استعمال ہونے والے اسم ضمیر کی نوعیت کہ ضمیر بارز ہے یا مستتر اور مذکر ہے یا مؤنث اور حاضر ہے یا غائب اس پر اطمینان پانے کے بعد ترجمہ والی زبان سے اس کے مطابق لفظ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ ضمیر مستتر کا ترجمہ بارز میں یا اس سے برعکس اسی طرح غائب کا ترجمہ حاضر میں یا اس سے برعکس کرنے سے ترجمہ کا مقصد فوت ہو سکتا ہے چہ جائیکہ ظاہر کا ترجمہ ضمیر میں اور ضمیر کا ترجمہ ظاہر میں کرنے کو جائز کہا جائے۔

شرط کی اس شق کی خلاف ورزی پر مشتمل ترجموں کی ایک مثال شرح جامی کے آغاز ”الحمد لولہ“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”ہر قسم کی حمد لائق حمد کے لیے ہے“ یہ ترجمہ لطائف المعانی فی تسہیل شرح

اُصولِ ترجمہ

ملا جامی کے مصنف پیر عبداللطیف مرحوم نے کیا ہے جس میں ضمیر مجرور جو ولی کے لیے مضاف الیہ ہے کا ترجمہ اسم ظاہر میں کیا گیا ہے جیسا مذکورہ الفاظ ”لائق حمد کے لیے ہے“ سے صاف ظاہر ہے جو متن کے ایجاز و اختصار کے منافی ہونے کے ساتھ اُس کی بلاغت سے بھی خلاف ہے جبکہ اصل سے مراد کے مطابق ترجمہ ”حمد علی الاطلاق اُس کے متصرف کے لیے خاص ہے، حمد اُس کے متصرف کے لیے ہے“ جیسے انداز میں کیا جاسکتا ہے جو لغت کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی جملہ لسانی حیثیات پر بھی منطبق ہے یہ الگ بات ہے کہ ترجمہ سے قطع نظر تشریح یا تفہیم کے طور پر بہت کچھ جائز ہوتا ہے شرح جامی کے جملہ حمد یہ کے ترجمہ کے نام سے یہ الفاظ ”ہر قسم کی حمد لائق حمد کے لیے ہے“ بھی تشریح و تفہیم کے طور پر یقیناً جائز اور درست ہیں لیکن ترجمہ کے طور پر ہرگز نہیں کیوں کہ ترجمہ کے ایک ایک لفظ کا متن کے ایک ایک لفظ کا بدل اور اُس کے قائم مقام ہونا ضروری ہے جبکہ اسم ظاہر اور اسم ضمیر آپس میں ضدین ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بدل ہو سکتے ہیں نہ قائم مقام۔

دوسری مثال:- فتاویٰ رضویہ میں مذکور فواتح الرحموت کی عبارت ”علیٰ ہذا ینبغی ان یقرء ہافی التراویح بالجہر مرة ولا تتأدئی سنة الختم دونہا“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”یعنی اس بنا پر چاہئے کہ بسم اللہ شریف تراویح میں جہر سے ایک بار پڑھی جائے بے اس کے سنت ختم ادا نہ ہوگی“ (۱)۔ اس میں ”یقرء ہا“ کے ضمیر منصوب متصل کا ترجمہ اسم ظاہر ”بسم اللہ شریف“ میں کیا گیا ہے جو اُس کی لسانی حیثیت سے خلاف ہے۔ نیز جب یہ پوری عبارت مع سیاق و سباق بسم اللہ شریف سے متعلق ہے نہ صرف فتاویٰ رضویہ کے محولہ مقام پر بلکہ اُس کے اصل یعنی فواتح الرحموت میں بھی اس پورے مضمون کا محور بسم اللہ شریف کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کے مطابق متن کی مذکورہ عبارت میں بھی ضمیر استعمال کیا گیا ہے جو عین مقتضاء المقام ہے تو پھر ترجمہ کے اس بے ڈھنگے انداز کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس بے اعتدالی کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: 7، ص: 661، مطبوعہ رضا فائونڈیشن لاہور۔

أصول ترجمہ

سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ اس کا معیاری ترجمہ ”اس بنا پر مناسب ہوگا کہ اُسے تراویح میں ایک بار جہر سے پڑھا جائے جس کے بغیر سنت ختم ادا نہ ہوگی، اس کے مطابق چاہئے کہ تراویح میں ایک بار اسے جہر سے پڑھے جس کے بغیر ختم کی سنت ادا نہ ہوگی“ جیسے کسی انداز میں کیا جاسکتا ہے لیکن یہ توفیق انہیں نصیب ہو سکتی ہے جو شرائط کی پابندی کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کچھ شرط نا آشنا حضرات کے کیے ہوئے کچھ تراجم بھی درست دکھائی دیتے ہیں جسے حسن اتفاق یا مشہور ضرب المثل ”رمیۃ من غیر رام“ سے مختلف نہیں کہا جاسکتا اُس کی مثال ایسی ہے جیسے صرف ونحو کے قواعد سے نا آشنا کچھ حضرات عربی کتابوں کی درست عبارت پڑھ لیتے ہیں خاص کر حافظ قرآن حضرات میں یہ کمال مشہور ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عالم اسباب میں کوئی فن، کوئی کسب اور کوئی بھی قابل ذکر عمل شرائط کے بغیر نا تمام و نا مراد ہونے کی طرح ترجمہ کا عمل بھی شرائط کی پابندی کے بغیر با مقصد نہیں ہو سکتا۔

ترجمۃ القرآن میں پیش نظر شرط کی خلاف ورزی کی پہلی مثال سورۃ البقرہ، آیت

نمبر 5 ”وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ“ کا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ”اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب“ جس میں ظاہری صورت ضمیر ”ہم“ سے بے اعتنائی کی گئی ہے حالاں کہ مسند الیہ کی تاکید اور مسند کی مسند الیہ کے ساتھ تخصیص پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی اہمیت ہے جس کے مطابق آیت کریمہ کا درست ترجمہ ”اور یہ ہی مراد کو پہنچنے والے ہیں، اور وہی فلاح پانے والے ہیں“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو نہ صرف لفظ ”ہم“ کے مرجع کی تاکید اور فلاح کا اُن کے ساتھ خاص ہونے پر دلالت کر رہا ہے جو آیت کریمہ کے نزول سے مقصد اور اُس کی عبارت النص بھی ہے بلکہ جملہ شرائط پر بھی منطبق ہے۔ اس کے برعکس قابل اعتراض ترجمہ کے مذکورہ انداز میں نہ صرف اس ایک لفظ ”ہم“ سے بے اعتنائی کی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ لفظ ”ہم“ کے مرجع کو اور تخصیص و تاکید والے مفاد کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے گویا بظاہر ایک غلطی دکھائی دینے والے اس انداز میں تین

غلطیاں ہیں، جس کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط کو پامال کرنا ہے۔ ایسے میں شرائط کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

دوسری مثال:- سورۃ البقرہ، آیت نمبر 95 ”وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمْتُ اَيْدِيْهِمْ“ کا ترجمہ ثناء اللہ امرتسری نے اس انداز سے کیا ہے ”اور اپنے کیے ہوئے کی وجہ ہرگز موت کی خواہش نہ کریں گے“ جس میں ضمیر منصوب متصل جو آیت کریمہ کے حصہ ”وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ“ میں ہے کا ترجمہ اسم ظاہر ”موت“ میں کیا گیا ہے جو اُس کی بلاغت سے خلاف ہے کیوں کہ اس سے موصول قبل موت کا ذکر آچکا ہے جس کے بعد ایجاز و اختصار اور لسانی حلاوت کا مقتضا یہی ہے کہ اعادہ کرنے کے بجائے اُس کی طرف ضمیر راجع کیا جائے آیت کریمہ میں بھی ایسا ہی ہے لیکن افسوس کہ ترجمہ میں یہ سب کچھ نظر انداز ہوا جو باعث افسوس ضرور ہے لیکن باعث تعجب نہیں ہے کیوں کہ جو عمل بھی اُس کی واجب شرائط کے بغیر کیا جائے اُس کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے جبکہ متن کی لسانی حیثیت کے حوالہ سے پیش نظر شرط کے مطابق ترجمہ ”اور ہرگز اُس کی آرزو نہ کریں گے اُن بد عملیوں کے سبب جو آگے کر چکے، اور وہ ہرگز اُس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ہاتھوں آگے کیے ہوئے بُرے اعمال کے سبب“ جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف اس ایک شرط پر بلکہ جملہ شرائط پر منطبق ہے۔

عام ترجمہ کی شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کی ایک شق یہ بھی ہے کہ متن کے اسم موصول اور اسم موصوف کے مابین تمیز کر کے ترجمہ والی زبان سے اُس کے مطابق الفاظ استعمال کیے جائیں ورنہ متن کے اسم موصول کا ترجمہ موصوف میں کرنے یا اس سے برعکس کرنے سے ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے۔ جس سے خلاف ہونے والے تراجم کی پہلی مثال فتاویٰ رضویہ میں قنوت نازلہ پڑھنے والے امام کے پیچھے مقتدی کے پڑھنے یا نہ پڑھنے سے متعلق شامی سے منقولہ عبارت ”الذی یظهر لی ان المقتدی یتابع امامه“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”میرے نزدیک ظاہری بات یہ ہے کہ مقتدی بھی امام کی پیروی میں پڑھے“ (۱)۔ جس میں اُس کی لسانی حیثیت من حیث الصلہ

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: 7، ص: 537، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن لاہور۔

أصول ترجمہ

والموصول سے خلاف کیا گیا ہے کیوں کہ لسانی قواعد کے مطابق لفظ ”الذی“ اسم موصول اور ”یظہر لی“ کا جملہ فعلیہ اُس کے لیے صلہ ہے اور صلہ و موصول کا یہ مجموعہ یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہے جبکہ اُس کے بعد والی عبارت لسانی قواعد کے مطابق اس کے لیے خبر ہے جبکہ ترجمہ میں اسے صلہ و موصول کے بجائے صفت و موصوف ظاہر کیا گیا ہے جیسا اس کے مذکورہ الفاظ ”میرے نزدیک ظاہری بات یہ ہے“ سے صاف ظاہر ہے حالاں کہ یہاں پر ترجمہ والی زبان کی طرف سے قطعاً کوئی رکاوٹ اور مجبوری نہیں ہے بلکہ شرط کے مطابق درست ترجمہ ”وہ جو مجھ پر ظاہر ہو رہا ہے یہ کہ بے شک مقتدی اپنے امام کی متابعت کرے گا، وہ جو مجھے ظاہر ہو رہا ہے یہ ہے کہ بے شک مقتدی اپنے امام کی متابعت کرے گا“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو نہ صرف مذکورہ شرط پر بلکہ دونوں زبانوں کے محاوروں پر بھی منطبق ہے۔

دوسری مثال: فتاویٰ رضویہ میں مرقاة شرح مشکوٰۃ سے ”یسن القنوت فی اخیرة سائر المكتوبات للنازلة التي تنزل بالمسلمين عامة كوباء قحط وطاعون او خاصة بضعهم كاسر العالم او الشجاع ممن تعدى نفعه“ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے اس وقت تمام فرائض کی آخری رکعت میں قنوت نازلہ پڑھنا سنت ہے جو عام مصیبت مسلمانوں پر مثلاً کسی عالم یا بہادر جس کے نفع کثیر ہو کا مقید ہو جانا“ (۱)

اس ترجمہ میں متن کے اسم موصول ”التي“ کا ترجمہ صفت و موصوف اور ظرف کے مابین مبہم کر دیا گیا ہے ممکن ہے کہ ترجمہ کے نام سے یہ لکھتے وقت مترجم نے لفظ ”جب“ کو اُس کا ترجمہ قرار دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ ”عام مصیبت مسلمانوں پر نازل ہو“ کو اُس کا منطوق تصور کیا ہو بہر حال متن کے اسم موصول ”التي“ کا ترجمہ اسے نہیں کہا جاسکتا ہے کیوں کہ ترجمہ والے لفظ کے لیے ضروری ہے کہ اصل کے قائم مقام ہو یعنی اُس کی لغوی، محاورتی اور لسانی حیثیت کے قائم مقام ہو سکے جو اس ترجمہ میں مفقود ہے تو پھر اسے اصل کے مطابق کہنے کا کیا جواز ہے جبکہ شرط کے مطابق

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: 7، ص: 494، مطبوعہ رضا فائونڈیشن لاہور۔

أصول ترجمہ

درست ترجمہ (قوت نازلہ پڑھنا سنت ہوگا تمام فرائض کی آخری رکعت میں اُس عام حادثہ کے لیے جو مسلمانوں پر نازل ہوتا ہے جیسا قحط اور طاعون کی وباء یا اُن میں بعض کے ساتھ خاص ہو جیسا عالم یا بہادر کمانڈر جیسے کسی ایسے شخص کا گرفتار ہونا جس کا نفع عام ہوتا ہے۔ قوت پڑھنا سنت ہوگا تمام فرائض کی آخری رکعت میں اُس عام افتاد کی وجہ سے جو مسلمانوں پر نازل ہوتی ہے جیسا قحط اور طاعون کی وباء یا بعض مسلمانوں کے ساتھ خاص ہو جیسا عالم اور بہادر جیسے کسی ایسے شخص کا گرفتار ہونا جس کا فائدہ متعدی ہوتا ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو کسی بھی اعتبار سے متن کے مطابق اور شرائط پر منطبق ہے۔ ایسے میں پیش نظر شرط کی اہمیت سے انکار کی کس کو مجال ہے۔

ترجمہ القرآن میں پیش نظر شرط سے خلاف کی پہلی مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 29

”هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا“ کا ترجمہ تھانوی نے کیا ہے ”وہ ذاتِ پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لیے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب“ جس میں متن کے اسم موصول ”الَّذِي“ کا ترجمہ اسم موصوف میں کیا ہے کیوں کہ اردو محارہ میں لفظ ”ایسا، ایسے“ دو حال سے خالی نہیں ہوتے، تشبیہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں یا صفت کے لیے جبکہ تشبیہ کا تصور یہاں پر نہیں ہے تو پھر توصیف والا مفہوم ہی متعین ہو جاتا ہے جسے قبول کرنے کے لیے متن تیار نہیں ہے کیوں کہ لفظ ”الَّذِي“ کے بعد مذکور ہونے والا جملہ ہمیشہ اُس کے لیے صلہ ہوتا ہے جس میں صفت کا تصور ہی نہیں ہے تو پھر آنکھیں بند کر کے اس کا ترجمہ ”توصیف“ میں کرنے کا کیا جواز ہے جسے قبول کرنے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ بلغاء اور عبد الرحمن جامی اسے سننا گوارا کرتا ہے نہ سعد الدین تفتازانی اور سیبویہ اسے دیکھنا پسند کرتا ہے نہ عبد القاہر جرجانی ایسے میں ترجمہ کے اس انداز کو آیت کریمہ کی معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جس کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ شرط کے مطابق ترجمہ ”وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے، وہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا وہ تمام چیزیں جو زمین میں ہیں“

جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف اس ایک شرط پر منطبق ہے بلکہ ترجمہ کی جملہ شرائط سے لے کر ترجمہ القرآن کی مخصوص شرائط تک سب پر منطبق اور معیاری ہے لیکن ایسی توفیق صرف انہیں نصیب ہو سکتی ہے جو شرائط کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِي اِلَى سَبِيلِ الرُّشَادِ)

دوسری مثال:۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 275 ”الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ“ کا ترجمہ سید ریاض حسین شاہ نے کیا ہے ”ایسے لوگ جو سود کھائیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر اُس شخص کے کھڑے ہونے کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے باؤلا بنا دیا ہو“ اس میں مذکور شرط سے خلاف ہونے کے علاوہ اور بھی کئی وجوہ سے متن سے خلاف کیا گیا ہے لیکن ہم یہاں پر صرف پیش نظر شرط سے خلاف ہونے کا ماتم کر رہے ہیں۔ ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے مذکورہ شرط یعنی متن کی لسانی حیثیت کی ممکنہ جہات پر بصیرت حاصل ہونے کی ایک شق یہ بھی ہے کہ من حیث اللسان اُس کی ہیئت کذا سیہ کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس پر منطبق کیا جائے ورنہ ترجمہ غلط اور بے مقصد ہو سکتا ہے۔

اس سے خلاف ہونے والے تراجم کی پہلی مثال فتاویٰ رضویہ کی عربی عبارت ”أَفِظْنَ بِهِ أَنَّهُ لَمْ يُذَرِكْ مَا أَذَرَ كُوفًا عَتَمَدَ شَيْئًا اسْقَطُوهُ لِضَعْفِهِ فَيَا لِلْإِنْصَافِ أَيُّ الظَّنِّ أَبْعَدُ“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”کیا ہم اُن کے بارے میں یہ گمان کر لیں کہ جو ان مشائخ نے معلوم کیا کہ وہ امام کو معلوم نہ ہو سکا اور جس پر امام نے اعتماد کیا اُس کو انہوں نے ساقط کر دیا کیوں کہ وہ ضعیف تھا تو خدا را انصاف کیجئے کہ یہ کیسا گمان ہے“ (فتاویٰ رضویہ، ج: 1، ص: 121، رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔ جو کئی وجوہ سے متن کی ہیئت ترکیبی سے خلاف ہے جس کا پس منظر اُس کی لسانی حیثیت کی ہیئت کذا سیہ والے پہلو سے غفلت ہے ورنہ اُس کی ترکیبی حیثیت کو پیش نظر رکھنے والوں سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہو سکتی وہ اس طرح ہے کہ متن کے اولین حصہ ”أَفِظْنَ بِهِ“ میں فعل ظن معلوم نہیں بلکہ مجہول ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے مفعول اول جو فاعل کا قائم مقام ہو رہا ہے معین و مشخص نہیں

أصول ترجمہ

ہے بلکہ کوئی بھی واقف حال اور سیاق کلام میں مذکور دو گمانوں سے آگاہ ہر شخص ہو سکتا ہے جبکہ اُس کے بعد ”انہ لم يدرك ما ادر كوا فاعتمد شيئا اسقطوه لضعفه“ لسانی قواعد کے مطابق مصدر منسلخ اور محلا منصوب ہونے کے بعد اُس کے لیے دوسرا مفعول بہ ہے۔ اسی طرح متن کے آخری حصہ ”فَيَا لَانْصَافِ اَي الظنن ابعء“ میں حرف ”ف“ عطف الجملہ علی الجملہ کے لیے ہے اور لفظ ”انصاف“ مستفات لہ ہے اور ”ای الظنن“ میں لفظ ”ظنن“ سے مراد مذکور المصدر دو گمان ہیں:

اول:- مشائخ کے بارے میں یہ گمان کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ کی دلیل کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اُن کے قول سے عدول کیا ہے۔

دوم:- امام ابو حنیفہ کے بارے میں یہ گمان کہ وہ اُس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے جس کا ادراک انہوں نے کیا تو اُس نے اسی چیز پر اعتماد کیا ہے جس کو اُس کے ضعف کی وجہ سے ان حضرات نے ساقط کر دیا اور لفظ ”ابعء“ تفصیل پر نہیں بلکہ بغیر تفصیل کے استعمال ہونے کی مشہور مثال ”عدة المتوفا عنها زوجه ابعء الاجلین“ کے قبیل سے ہے اور اس سے مراد انصاف سے بعید ہونا ہے۔

متن کی ترکیبی ہیئت کذائیہ کے حوالہ سے ان حقائق کی روشنی میں اُس کا حقیقی ترجمہ (پھر اُن کے بارے میں کیا یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ جس حقیقت کو انہوں نے پایا ہے وہ اُسے نہ پاسکے تو ایسی چیز پر اعتماد کیا جسے اُس کے ضعف کی وجہ سے انہوں نے ساقط کر دیا تو اے علماء متوجہ ہو جاؤ انصاف کے لیے کہ ان دو گمانوں میں سے کون انصاف سے بعید ہے، تو کیا اُن کی بابت یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ جس حقیقت کا ادراک انہوں نے کیا ہے وہ اُسے نہ پاسکے تو ایسی چیز پر اعتماد کیا جسے انہوں نے اُس کے ضعف کی وجہ سے ساقط کر دیا تو اے اہل علم سوچو کہ ان گمانوں میں سے کون سا بعید ہے) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن کی ہیئت کذائیہ کے مطابق ہونے کے ساتھ

اُصولِ ترجمہ

دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق اور بے غبار ہے۔

دوسری مثال:- حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب الاسفار کی عبارت؛

وَقَالُوا الْعِذَارُ جَنَاحُ الْهَوَىٰ إِذَا مَا اسْتَوَىٰ طَارَعَن وَكَرِهَ

هَذَا الْبَيْتَ أَنشَدَنِيهِ قَائِلُهُ وَهُوَ الْكَاتِبُ الْأَدِيبُ أَبُو عَمْرٍو بْنِ مَهْيَبٍ بِأَشْبِيلِيهِ، عَمَلُهُ
فِي حَمُوبِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ بْنِ أَبِي بَكْرٍ الْمِيرْغِي، وَكَانَ أَجْمَلَ أَهْلِ زَمَانِهِ، رَأَاهُ عِنْدَنَا
زَائِرًا وَقَدْ خَطَّ عِذَارُهُ، فَقُلْتُ لَهُ: يَا أَبَا عَمْرٍو! مَا تَرَىٰ إِلَىٰ هَذَا الْحَسَنِ الْوَجْهَ؟ فَعَمِلَ
الْأَبْيَاتُ فِي ذَلِكَ وَهِيَ:!

إِذَا مَا اسْتَوَىٰ طَارَعَن وَكَرِهَ

وَقَالُوا الْعِذَارُ جَنَاحُ الْهَوَىٰ

قِيَامًا بِعِذْرِي أَوْ عِذْرِهِ

وَلَيْسَ كَذَلِكَ فَخَبَّرَهُمْ

فَخَاتَمَهُ وَبِكَ مِنْ شَعْرِهِ

إِذَا كَمُلَ الْحُسْنُ فِي وَجْنَةٍ

کا ترجمہ کیا گیا ہے:

انہوں نے کہا؛ داڑھی کے بال محبت کے پر ہیں۔

جب یہ بڑھتے ہیں تو (محبت) اپنے گھر چھوڑ جاتی ہے۔

یہ مجھے اس کے کہنے والے نے خود سنایا، آپ ابو عمر بن مہیب اشبیلیہ والے لکھاری اور ادیب
ہیں۔ آپ نے یہ شعر حموب بن ابراہیم بن ابی بکر الذنجی کے بارے میں لکھا جو کہ اپنے زمانے کے خوب
صورت ترین نوجوانوں میں سے تھے۔ آپ کو ہمارے ہاں ایک زائر نے دیکھا جبکہ آپ کے
چہرے پر چند بال نمودار ہو چکے تھے، میں نے ان سے کہا؛ ”ابو عمرو! کیا آپ اس حسین چہرے کی
طرف نہیں دیکھتے؟ آپ نے اسی وقت یہ اشعار کہہ ڈالے۔

داڑھی کے بال محبت کے پر ہیں،

جب یہ بڑھتے ہیں تو (محبت) اپنے گھر چھوڑ جاتی ہے۔

ان سے کہہ دو ایسی بات نہیں،

أصول ترجمہ

چاہے میرے یا اس کے رُخساروں پر نکلیں۔

جب رُخساروں میں حُسن مکمل ہو جائے،

تو اس کا انجام اس کے بالوں سے تجھے لگا رہتا ہے۔ (۱)

جو متعدد وجوہ سے غلط ہے جس کی واحد وجہ متن کی ترکیبی اور لغوی ہیئت کذا یہ سے ہے تو جہی ہے

ورنہ اُس کے اس پہلو کو پیش نظر رکھنے والے ایسی غلطی نہیں کر سکتے ہیں۔ جس کی تفصیل اس طرح

ہے کہ متن کے لفظ ”رآه عندنا زائراً“ ضمیر فاعل ابو عمرو ابن مہیب کی طرف راجع ہے یعنی دیکھنے

والا وہ ہے جبکہ ضمیر منصوب متصل ”ہ“ سے مراد حموا بن ابراہیم ہے اور لفظ ”زائراً“ حال ہے۔ اول

سے یا دوسرے سے ضمیر اول سے حال ہونے کی صورت میں زائر کا مظہر یعنی زیارت کرنے والا

ابو عمرو ابن مہیب ہوگا اور دوسرے ضمیر سے حال ہونے کی صورت میں اس کا مظہر حموا بن ابراہیم

ہوگا کہ زیارت کرنے والا وہ تھا اور متن کے حصہ ”الی هذا الحسن الوجهہ“ میں لسانی قواعد

کے مطابق لفظ ”الحسن الوجهہ“ صفت مشبہ ہونے کی بنا پر صفت ہے اپنے موصوف کے لیے

جس سے اصل مقصد اُس کی ذات نہیں بلکہ یہی صفت ہے اور متن میں مذکور لفظ ”عذار“ عربی

لُغت کے مطابق دو چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے؛

① انسانی چہرے کا وہ حصہ جو کان کے ساتھ متصل بالوں سے خالی جگہ اور رُخسار کے مابین

واقع ہے جس کا اوپر والا حصہ سر کے بالوں کے ساتھ لگتا ہے اور نچلا حصہ جڑے کے ساتھ

لگتا ہے۔

② اس حصے پر اُگنے والے بالوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ اول میں

حقیقت اور دوسرے میں مجاز و مرسل کے انداز پر ہے جسے تسمیۃ الحال باسم المحل کہا جاسکتا ہے۔

یہاں پر متن کے پیش نظر اشعار میں یہ لفظ اپنے دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے

کیوں کہ اولین مصرع ”العذار جناح الهوی“ میں یہ پہلے معنی نہیں بلکہ دوسرے معنی محمول ہے

(۱) کتاب الاسفار عن نتائج الاسفار، ص: 156, 157، ابن العربی فاؤنڈیشن۔

أصول ترجمہ

اور اس کے بعد دونوں جگہوں میں یعنی ”بعذری او عذرہ“ میں پہلے والے معنی پر محمول ہے۔

متن کی لسانی حیثیت کی ہیئت ترکیبی کے حوالہ سے ان حقائق کی روشنی میں اُس کا معیاری ترجمہ (کہنے والوں نے کہا کہ عذر محبت کے پر ہیں جب وہ بڑھتے ہیں یہ اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتی ہے یہ بیت اُس کے قائل نے بمقام اشبیلیہ میں مجھے سنائی وہ لکھاری ادیب ابو عمر ابن مہیب ہیں اُس نے یہ بنائے حموا بن ابراہیم ابن ابی بکر المیرعی کے بارے میں یہ کہے اور وہ اپنے وقت کے حسینوں سے زیادہ حسین تھا اُسے ہمارے ہاں زیارت کرتے ہوئے دیکھا جبکہ اُس کے عذر کے خط آئے تھے تو میں نے اُسے کہا اے ابو عمرو! کیا تو اس حسین چہرے والے کی طرف نہیں دیکھ رہے تو اُس نے اُس کے متعلق جوابیات کہے یہ ہیں ”کہنے والوں نے کہا کہ عذر محبت کے پر ہیں جب وہ بڑھتے ہیں یہ اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتی ہے حالاں کہ بات ایسی نہیں ہے تو انہیں بتا دے کہ وہ قائم رہتی ہے میرے عذر یا اُس کے عذر کے ساتھ جب رُخسار پر حسن کامل ہو جائے تو اُس کا خاتمہ اُس کے بالوں سے ہے تیری خرابی“، لوگوں نے کہا کہ عذر محبت کے پر ہیں جب وہ غالب ہوتے ہیں یہ اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتی ہے یہ بیت اشبیلیہ میں اُس کے قائل نے مجھے سنائی اور وہ لکھاری ادیب ابو عمر ابن مہیب ہیں اُس نے یہ بنائی حموا بن ابراہیم ابن ابی بکر المیرعی کی بابت اور وہ اپنے ہم عصروں سے زیادہ جمیل تھا انہوں نے اُسے ہمارے پاس زیارت کرتے دیکھا درانحالیکہ اُس کے خط عذر نمایاں تھے میں نے اُسے کہا اے ابو عمرو! کیا تو اس حسین چہرے والے کی طرف نہیں دیکھتا تو اُس نے اُسی وقت بیت بنائے اور وہ یہ ہیں ”جبکہ بات ایسی نہیں ہے تو انہیں بتا کہ وہ قائم رہتی ہے چاہے میرے عذر یا اُس کے عذر کے ساتھ وہ جانے کی چیز نہیں ہے بلکہ کسی ناکسی عذر میں قائم رہتی ہے تو تیری خرابی کہ اُس کا خاتمہ اُس کے بالوں سے ہے“ (جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہے جس میں نہ کوئی اشکال ہے نہ کوئی قباحت بلکہ مذکورہ شرط پر برابر ہونے کے ساتھ عام ترجمہ کی دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہو رہا ہے۔

اُصولِ ترجمہ

حاشیتی اضافہ:- شرائط سے غفلت پر مبنی ترجمہ کا غلط ہونا بھی باعثِ تعجب نہیں ہے اور

شرائط کے مطابق ترجمہ کا درست ہونا بھی مشکل نہیں ہے کیوں کہ نہ صرف فنِ ترجمہ بلکہ کسی بھی فن میں کارکردگی کا یہی حال ہے کہ جو شخص اُس کے اُصول و ضوابط اور شرائط و تقاضوں سے آگاہ ہو اور اُس کی روشنی میں کام کرے اُس کے لیے پورا فن آسان ہوتا ہے، کارکردگی تسلی بخش و معیاری ہوتی ہے اور ناظرین و سامعین اُس کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے برعکس وہ حضرات جو اُصول و شرائط اپنائے بغیر فنِ کاری دکھانا چاہتے ہیں یعنی لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونا چاہتے ہیں، پورا فن اُن کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، اُن کی راست روی کے بجائے کجروی زیادہ ہوتی ہے اور تعمیر کی نسبت تخریب زیادہ ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر کام کو اُس کے اُصولوں کے مطابق کرنے سے متعلق ارشاد فرمایا:

”وَاتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا“ (۱)

قرآنی معارف سے آگاہ حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ ارشادِ الہی کا یہ انداز صرف گھروں میں اُن کے دروازوں کے رستوں سے آنے تک محدود نہیں ہے بلکہ دُنیا کے کسی بھی فن، کسی بھی ہنر اور کسی بھی جگہ داخلہ کے لیے اُس کے اُصولوں کے مطابق قدم اٹھانے کی بھی رہنمائی کرتا ہے۔ ایسے میں اناڑیوں کے ہاتھوں فن کی بگاڑ دیکھ کر افسوس ضرور ہوگا لیکن تعجب نہیں ہے۔ اسی طرح حقیقی فن کار کی حسنِ کارکردگی پر بھی تعجب نہیں ہے ہم ترجمہ کی عمومی شرائط کے اس باب میں ہر شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کے ساتھ شرائط کے مطابق تراجم کی بھی دو دو مثالیں جو پیش کر رہے ہیں۔ اس کا فلسفہ بھی یہی کچھ ہے کہ ترجمہ کے اُصول و شرائط سے آگاہ اور اُس کے تقاضوں سے واقف حضرات کے لیے کسی بھی متن کا معیاری ترجمہ کرنا آسان ہے نہ صرف ایک رنگ میں بلکہ متعدد انداز میں ترجمہ کا حق ادا کیا جاسکتا ہے جبکہ اُصول و شرائط سے عاری شخص بگاڑ کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔

(۱) البقرة: 189۔

أصول ترجمہ

ترجمہ القرآن میں پیش نظر شرط کی خلاف ورزی کی پہلی مثال سورۃ البقرہ، 275

”الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ“ کا ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی نے کیا ہے ”سود خور لوگ نہ کھڑے ہوں گے مگر اسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے۔“ جو آیت کریمہ کی ہیئت ترکیبی کے مطابق ہرگز نہیں بلکہ اس کا پہلا حصہ یعنی ”سود خور لوگ نہ کھڑے ہوں گے“، ”يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ“ جیسی ہیئت کذائیہ کا ترجمہ ہے جبکہ دوسرا حصہ دو تشبیہوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کسی بھی عربی متن کا ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہے چہ جائیکہ آیت کریمہ کا ترجمہ ہو۔ اس کی وجہ پیش نظر شرط سے بے توجہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ اس کے مطابق ترجمہ ”وہ جو سود کھاتے ہیں کھڑے نہ ہوں گے مگر اس کے کھڑے ہونے کی طرح جسے شیطان نے چھو کر بدحواس کیا ہو، وہ جو سود کھاتے ہیں نہیں اٹھتے مگر اس کے اٹھنے کی طرح جسے شیطان چھو کر پاگل کر دیتا ہے“ جیسی کسی بھی شکل میں ہو سکتا ہے۔

دوسری مثال: - سورۃ البقرہ، آیت نمبر 199 کے آخری حصہ ”إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ کا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ”یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے“ جو آیت کریمہ کی لسانی ہیئت کذائیہ سے سراسر خلاف ہے۔

اولاً:- اس میں حرف عطف ”اور“ لا کر ترجمہ کو معطوف و معطوف علیہ بنا دیا گیا ہے جبکہ آیت کریمہ کی ہیئت ترکیبی میں عطف نہیں ہے۔ گویا ترجمہ کو متن سے برعکس کیا گیا ہے اس لیے عطف اور بغیر عطف الفاظ آپس میں ضدین ہوتے ہیں، مقاصد مختلف ہوتے ہیں، تلخیص المفتاح میں ہے: ”ومقام الفصل یباین مقام الوصل“ (۱)

یعنی عطف کا مقام بغیر عطف کی ضد ہوتا ہے۔

ثانیاً:- یہاں پر متن کے دونوں لفظ یعنی ”غفور“ بھی اور ”رحیم“ بھی غیر کلام ہیں یعنی جملہ نہیں ہیں کیوں کہ یہ صفت مشبہ ہیں اور صفت مشبہ اپنے فاعل سے مل کر جملہ نہیں بلکہ شبہ جملہ ہوتا ہے

(۱) تلخیص المفتاح، ص: 5۔

اُصولِ ترجمہ

جبکہ ترجمہ مرکب تام اور جملہ کے انداز میں کیا گیا ہے جیسا اُس کے مذکورہ الفاظ ”معاف کر دیں گے اور مہربانی فرماویں گے“ سے صاف ظاہر ہے جسے سننے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ بلغاء اور سیبویہ! اسے دیکھنا گوارا کرتا ہے نہ تفتازانی حالاں کہ شرط کے مطابق ترجمہ (یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے) جیسی کسی بھی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ جس سے مانع کوئی لسانی مجبوری ہے نہ کوئی رُکاوٹ متن کے مطابق درست ترجمہ کے بجائے اُس کی لسانی حیثیت سے خلاف اس کج روی کا پس منظر مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے ورنہ اُس کی لسانی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والے سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہو سکتی۔

یہاں پر بھی ترجمہ کی شرائط سے نا آشنا اور نا اڑی حضرات یہی کہہ کر ٹال دیں گے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور بعض ایسے بھی ہوں گے جو ”غفور“ کے ترجمہ میں ”بخشنے والا اور معاف کر دیں گے“ کو ایک شے تصور کر کے ٹال دیں گے۔ جو متن کی لسانی حیثیت سے بے خبر ہونے کی دلیل ہے جبکہ حقیقت میں ان کے مابین کلمہ و کلام کا فرق ہے اور لسانیات سے قدرے واقف ہر شخص سمجھتا ہے کہ کلمہ و کلام میں نکتہ تفریق مرکب تام ہونا ہے کہ مرکب تام ہونے کی صورت میں کلام اور جملہ کہلاتا ہے ورنہ مفرد اور کلمہ کہلاتا ہے جس میں عربی و عجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کلمہ کی جگہ کلام استعمال کرنا جائز ہے نہ کلام کی جگہ کلمہ ورنہ گفتگو بے مقصد ہو سکتی ہے تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کا کیا جواز ہے۔ یہ سب کچھ عام ترجمہ سے متعلق ہیں جو ترجمہ القرآن کی نسبت آسان ہے جب بے اُصول و بے شرط مترجمین اس میں ناکام ہیں تو پھر ان سے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ ہونے کی توقع ہی فضول ہے۔ ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کے حوالہ سے جو کچھ ہم نے پیش کیا اسے تفصیل اور احاطہ نہ سمجھا جائے بلکہ یہ اُس کی چند شقیں ہیں۔ جنہیں سمجھنے کے بعد باقی تمام شقوں کی اہمیت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے جن میں فاعل کے طور پر مذکور ہونے والے متن کا ترجمہ بھی فاعل کے انداز میں اور اضافت کے طور پر

أصول ترجمہ

مستعمل ہونے والے کا ترجمہ بھی اضافت کے انداز میں، جملہ اسمیہ متن کا ترجمہ اسمیہ کے انداز میں اور جملہ فعلیہ کا ترجمہ بھی فعلیہ کے انداز میں، متن جملہ فعلیہ کے جس انداز پر ہو ترجمہ بھی اسی انداز میں اسی طرح فعل مضارع حال و مستقبل کے حوالہ سے جس انداز پر ہو ترجمہ بھی اسی انداز میں اور متن کے ایک جملہ کا ترجمہ بھی صرف ایک جملہ میں کرنے جیسے کثیر الجہات گوشے شامل ہیں جن سے خلاف ہونے والا ترجمہ بے مقصد اور غلط ہوتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت:- عام ترجمہ کی شرائط کے سلسلہ میں یہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں یہ سب کے سب صرف پہلی شرط یعنی متن کی لسانی حیثیت کو سمجھنے کے مختلف گوشے ہیں جن پر دوسری شرط یعنی ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیات اور اس کی اقسام و اصناف اور محاورہ متفرع ہو سکتا ہے کیوں کہ ترجمہ کو متن کے مطابق کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ دونوں زبانوں کی جملہ حیثیات کو اسی ترتیب سے سمجھا جائے۔ اس سے درج ذیل حقائق کا افادہ ہو رہا ہے:

- ❶ ترجمہ کو اصل کے مطابق کرنے کے لیے دونوں زبانوں میں مہارت ضروری ہے۔
- ❷ متن کی لسانی حیثیت کا احاطہ بنیادی شرط کے درجہ میں ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کا احاطہ ثانوی درجہ میں ہے جبکہ عملی صورت میں معیت ہے یعنی ترجمہ کرتے وقت بالترتیب دونوں کی جملہ حیثیات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جس میں تقدم و تاخر زمانی کا تصور ممکن نہیں ہے۔

- ❸ متن کی لسانی حیثیت متبوع اور ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت اس کی تابع ہے۔
- ❹ رتبہ تقدم و تاخر اور تابع و متبوع کے اس فرق کے علاوہ دونوں کی شرط ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے جس کے مطابق اجمال کے درجہ میں دونوں کو ملا کر کہا جاسکتا ہے کہ دونوں زبانوں میں مہارت اولین شرط ہے جبکہ تفصیل کے درجہ میں ہر ایک مستقل شرط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ متن کی لسانی حیثیت کے کسی پہلو سے خلاف ہونے والا ترجمہ غیر معیاری

اور بے مقصد ہونے کی طرح ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کے کسی پہلو اور محاورہ سے خلاف

أصول ترجمہ

ہونے والا ترجمہ بھی معیاری نہیں کہلاتا جس کی عام ترجمہ میں پہلی مثال فتاویٰ رضویہ کی عربی عبارت ”کما بسطہ المولیٰ عبدالغنی النابلسی قدس سرہ القدسی فی الحدیقة الندیہ وغیرہ فی غیرہا“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”جیسا کہ اس پر تفصیلی بحث علامہ عبدالغنی نابلسی قدس سرہ القدسی نے حدیقہ ندیہ اور دیگر علماء نے اپنی کتب میں کی ہیں“ (۱) جو ترجمہ والی زبان یعنی اردو محاورہ سے خلاف ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہاں پر ترجمہ کو با محاورہ کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ موجود ہو نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق معیاری ترجمہ (جیسا کہ مولیٰ عبدالغنی النابلسی قدس سرہ القدسی نے الحدیقہ الندیہ میں اور اُس کے غیروں نے اس کے غیر میں تفصیل کی ہیں، جیسا مولیٰ عبدالغنی النابلسی قدس سرہ القدسی نے الحدیقہ الندیہ میں اور اُس کے غیر (دوسرے علماء نے) اس کی غیر میں (اپنی کتابوں میں) اس کی تفصیل کی ہیں) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی لسانی حیثیت اور اُس کے محاورہ پر بھی منطبق ہے۔

دوسری مثال:- شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی کی کتاب الحُجُب کی عبارت ”فسبحان من لا یعلم الا بانہ لا یعلم“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”پاک ہے وہ جو صرف اسی بات سے جانا جاسکتا ہے کہ وہ نہیں جانا جاسکتا“ (۲) اردو محاورہ سے قدرے شناسائی رکھنے والوں سے بھی اس کا بے ڈھنگا پن پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو ترجمہ والی زبان کی تنگی دامن کی وجہ سے نہیں بلکہ اس میں مترجم کی کمزوری یا غفلت کی وجہ سے ہے کیوں کہ اردو محاورہ کے مطابق پیش نظر متن کا معیاری ترجمہ (توپا کی ہے اُسے جسے نہیں جانا جاتا مگر اتنا کہ اُسے نہیں جانا جاسکتا، توپا کی ہے اُسے جسے اس کے سوا نہیں جانا جاتا

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: 7، ص: 465، رضافاؤنڈیشن لاہور۔

(۲) کتاب الحُجُب، ص: 54، مترجم ابرار احمد شاہی تصحیح و نظر ثانی سلطان

عبدالعزیز المنصوب، مطبوعہ ابن عربی فاؤنڈیشن لاہور۔

اصول ترجمہ

سکتا کہ وہ نہیں جانتا) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو ایجاز و اختصار کے سوا باقی ہر حیثیت سے متن کے مطابق اور ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کے حوالہ سے بھی بے غبار ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کا یہاں پر صرف ایک عارضہ ہے جو ایجاز و اختصار کے حوالہ سے ہے کہ اردو محاورہ میں اُس کے ساتھ توافق ممکن نہیں ہے جسے متن کا لسانی اعجاز یا اُس کے متکلم یعنی حضرت شیخ اکبر کی سخن دانی کا اعجاز کہا جاسکتا ہے۔ ایسے کسی بھی مؤجر و مختصر متن کے ترجمہ میں اطناب و تطویل کو ترجمہ والی زبان کی طرف سے مجبوری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا جس میں مترجم پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

ترجمہ القرآن میں پیش نظر شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کی مشتبہ نمونہ از خروارے پہلی مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 32 ”قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا بِالْمَاعِلْمَتَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ“ کا ترجمہ اشرف علی تھانوی نے کیا ہے ”فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہم کو کوئی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا بے شک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں کہ جس قدر جس کے لیے مصلحت جانا اُسی قدر فہم و علم عطا فرمایا“ جسے اردو محاورہ کے مطابق ہرگز نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ آپ استعمال کیا جاتا ہے نہ جمع کے الفاظ اور نہ ہی شان الہی کی تعظیم و آداب کو انسانوں کی تعظیم و آداب پر قیاس کرنے کی کوئی مثال موجود ہے جبکہ اس ترجمہ میں ان تینوں انوکھے استعمالات کو جمع کیا گیا ہے جو اسے پڑھنے والوں سے پوشیدہ ہے نہ دیکھنے والوں سے اور کوئی بھی واقف حال شخص بدعت فی اللسان کے اس غیر مانوس ترجمہ پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہاں ترجمہ کی شرائط و اصول سے نا آشنا حضرات کی دُنیا ہی جدا ہے کہ اُن کے سامنے ترجمہ کے نام سے جو تحریر بھی آجائے، یہ اُسے تسلیم کرتے ہیں چاہے متن کے محاورہ سے خلاف ہو یا ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے یا دونوں سے اور ترجمہ پڑھنے والوں کی غالب اکثریت بھی ایسے حضرات کی ہے اور غیر معیاری تراجم کے مروج ہونے کے ذمہ دار بھی یہی لوگ ہیں ورنہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ سے استفادہ کرنے والوں میں اگر 10%

أصول ترجمہ

بھی اہل تمیز ہوں جو صحیح و سقیم کی تفریق کر سکیں تب بھی کافی حد تک اصلاح احوال ہو سکتی ہے۔
دوسری مثال:- سورۃ آل عمران، آیت نمبر 29 ”قُلْ إِنْ تُخَفُّوْا مَافِيْ صُدُوْرِكُمْ أَوْ تُبْذَرُوْهُ يَعْلَمُهُ اللّٰهُ“ کا حافظ نذیر احمد دہلوی اور عاشق الہی میرٹھی نے بالترتیب ترجمہ کیا ہے (اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے چھپاؤ یا اُسے ظاہر کرو وہ بہر حال اللہ کو تو فی الوقت معلوم ہو ہی جائے گا، اے محمد! کہہ دے کہ اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اُسے ظاہر کرو بہر حال اللہ تو اُس کو جان ہی لے گا) جو اُردو محاورہ سے خلاف ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق یہ کہنا کہ ”وہ فی الوقت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو ہی جائے گا، یا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اُسے جان ہی لے گا) غیر مانوس ہے جس سے اُردو بولنے والوں کے کان آشنا ہیں نہ زبان بلکہ اُردو محاورہ کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ (کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے، کہہ دیجئے اگر تم اپنے جی کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اُسے جانتا ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو نہ صرف ترجمہ والی زبان کے مطابق ہے بلکہ متن کی لسانی حیثیت پر منطبق ہونے کے ساتھ جملہ اعتراضات سے بھی پاک و صاف ہے اور شانِ الہی سے متعلق اسلامی عقیدہ کا مظہر ہونے کے ساتھ علمِ الہی کی ازلیت وابدیت کا بھی اظہار ہے۔ ترجمۃ القرآن کے نام سے شانِ الہی میں غلط عقیدہ کا موجب بننے والے ایسے تراجم کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو پھر شرائط کی اہمیت سے انکار کی کیا گنجائش ہے۔

عمومی شرائط کے مدارج:-

عام ترجمہ یعنی کسی بھی کتاب کے معیاری ترجمہ کے لیے شرائط کے سلسلہ میں دونوں زبانوں میں مہارت کو اولیت حاصل ہے کیوں کہ متن کی لسانی حیثیت سے نا آشنا شخص سے یہ توقع کرنا فضول ہے کہ وہ ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس کے مطابق کر سکے چاہے ترجمہ والی زبان کا بڑے سے بڑا ماہر کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت سے نا آشنا شخص سے بھی

أصول ترجمہ

یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس کے مطابق کر سکے چاہے متن کی زبان کا ماہر ہی کیوں نہ ہو۔ اس شرط کا ترجمہ کی باقی تمام شرائط سے مقدم اور سب سے اہم ہونے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ یہ سب کی بنیاد ہے کہ اس کے بغیر دوسری شرائط کا تصور ہی نہیں ہے۔ نیز اس کے گوشے اور حیثیات بھی سب سے زیادہ ہیں اور ہر حیثیت اپنی جگہ مستقل شرط کی مانند ہے کہ کسی بھی مستقل شرط سے بے اعتنائی کی صورت میں ترجمہ غلط ہونے کی طرح کسی بھی لسانی حیثیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی بے مقصد ہوتا ہے جن کی کچھ مثالیں گزشتہ سطور میں ہم بیان کر آئے ہیں، ایسے میں ترجمہ کی کسی شرط سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ مترجم مَن پسند اور ذہنی ترجیح کو دخل نہ دے چاہے ترجیح کا یہ انداز مذہب کے حوالہ سے ہو یا تشریح و تعبیر کے حوالہ سے یا واقعہ کے اعتبار سے ورنہ کلام ترجمہ کی حد سے نکل کر تفہیم یا ترجمانی کی حدود میں شمار ہوگا۔ عام ترجمہ میں اس کی پہلی مثال فتاویٰ رضویہ، جلد پنجم کے مترجم قاضی عبدالدائم مدظلہ العالیہ نے ”رسالہ منیر العین فی حکم تقبیل الابیہامین“ کا ترجمہ کیا ہے ”انگوٹھے چومنے کے سبب آنکھوں کا روشن ہونا“ (۱) جو اُس کا ترجمہ کہلانے کے قابل ہر گز نہیں ہے جس کی واحد وجہ یہی ہے کہ ترجمہ کو شرائط کے مطابق رکھنے کے بجائے مترجم نے ”تقبیل ابہامین“ کے جواز اور اُس سے فائدے کو ذہنی ترجیح بنایا اور اُسی کی فہمائش کے تصور سے مغلوب ہو کر ترجمہ کے نام سے یہ لکھ دیا جسے اس پس منظر کے حوالہ سے تفہیم کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن تفہیم کا درست ہونا ترجمہ کی درستی کو مستلزم نہیں ہے کیوں کہ ان کی حقیقتیں مختلف ہیں کہ ترجمہ میں اصل کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ سے بدلا جاتا ہے جو اصل کے قائم مقام اور اُس کی جملہ حیثیات کے حامل ہو سکیں جبکہ تفہیم میں اصل کے مفہوم کی فہمائش کی جاتی ہے اور بس۔ ایسے میں ایک کی جگہ دوسرا استعمال کرنے یا ایک کے نام سے سے دوسرا پیش کرنے کو معقول کہا جاسکتا ہے نہ مناسب۔

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: 5، ص: 429، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

شرائط کی اہمیت اور مقام عبرت :-

قاضی عبدالدائم جیسی علمی شخصیت اور ہمہ صفت موصوف ہستی کے ترجمہ کی اس بے اعتدالی سے دنیا کو یہ سبق مل رہا ہے کہ فنِ ترجمہ نہایت مشکل فن ہے، کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے کہ صرف ایک شرط سے بے توجہی کے نتیجہ میں کلام ترجمہ کی حد سے نکل جاتا ہے اور قاضی عبدالدائم دائم جیسے عالم و فاضل جو سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلہ میں تمنغہ یافتہ ادیب و مصنف ہیں۔ جنہوں نے ”سیدالوری“ نام کے عظیم شاہکار سے علم و فضل کی شہرت پائی ہے جو ہر اعتبار سے قابل تحسین ہے۔ ایسے مسلم سخن دان سے بھی لغزش ہو سکتی ہے تو پھر علم و عرفان سے نا آشنا حضرات کے لیے کتنا مشکل ہوگا اس میں ان حضرات کے لیے عبرت ہے جو ”لہو لگا کر شہیدوں“ میں شمار ہونے والوں کی طرح ترجمہ کی شرائط و اصول سے نا آشنا ہوتے ہوئے بھی یہ شوق پورا کرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ دیکھنے کو مل رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے اردو زبان میں کے گئے اکثر تراجم غلط ہیں جس وجہ سے التباس الحق بالباطل ہو رہا ہے اور علوم و فنون کے ضروری مسائل متنازعہ بن رہے ہیں یا ناقابل فہم معممہ خاص کر ترجمہ القرآن کے نام سے کلام اللہ پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، انجانے میں معنوی تحریفات کی مثالیں قائم کی جا رہی ہیں اور شرمناک حد تک غلطیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہے جن کے دل خراش مواقع کی تفصیل ہم نے اپنی دوسری کتاب ”تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن“ کی تینوں جلدوں میں کی ہے۔ فتاویٰ رضویہ کی جلد پنجم کے فاضل مترجم سے اگر یہ بے اعتدالی نہ ہوئی ہوتی تو باقی تمام عربی عبارات کا جو ترجمہ انہوں نے کیا ہے اُسے معیاری اور فتاویٰ رضویہ کے شایانِ شان کہا جاسکتا ہے۔

بے اعتدالی کی یہ مثال صرف اس ایک مقام پر نہیں بلکہ اس کی دوسری مثال رسالہ ایذان الاجرفی اذان القبر کے ترجمہ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جو اس طرح کیا گیا ہے ”فن کے بعد قبر پر اذان کہنے کے جواز پر مبارک فتویٰ“ (۱) اُس کے مطابق نہ ہونا اس کا پہلے کی طرح ہی ظاہر ہے کہ

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج: 5، ص: 653، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

أصول ترجمہ

ترجمہ کی حد سے ہی خارج ہے اس کی بھی وہی وجہ ہے کہ اسے ترجمہ کی شرائط و حدود میں رکھنے کے بجائے بعد الدفن اذان علی القبر کے جواز کو ذہنی ترجیح بنایا گیا ہے اور اسی کی تفہیم کی گئی ہے حالاں کہ ان دونوں مقامات یعنی دونوں رسائل کے ناموں کا معیاری ترجمہ بالترتیب اس طرح کیا جاسکتا ہے (تقبیل ابہامین کے حکم میں آنکھ روشن کرنے والی تحریر، تقبیل ابہامین کی شرعی حیثیت میں آنکھ روشن کرنے والا فتویٰ، اذان قبر میں اجر سے آگاہی، اذان قبر میں اعلامِ اجر) جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہے جبکہ فتاویٰ رضویہ، جلد پنجم کے مترجم جیسے صاحب علم و عرفان اس سے بھی بہتر انداز میں کر سکتے تھے۔ کاش مذکورہ شرط سے بے توجہی نہ کرتے تو ان کی صلاحیتوں کی روشنی میں یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب کچھ درست کرتے۔

ترجمۃ القرآن میں مذکورہ شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کی پہلی مثال سورۃ

البقرہ، آیت نمبر 69 ”قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ“ کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ”آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو“ عربی زبان سے قدرے مناسبت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ ”بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ“ کا معنی ”زرد رنگ کی گائے“ کے سوا اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ اُس کا ترجمہ ”زرد رنگ کے بیل“ میں کرنا جائز ہو کیوں کہ لفظ ”صَفْرَاءُ“ پر آیا ہوا الف نفس کلمہ سے زائد ہے جو علامت تانیث ہے اور یہ جہاں پر بھی آتا ہے اُس کا مونث ہونا لازم ہوتا ہے یہ اتنا واضح مسئلہ ہے کہ عربی زبان اور علم نحو سے ذرہ برابر واقفیت رکھنے والے مبتدیوں سے بھی پوشیدہ نہیں ہے تو پھر اس کا ترجمہ ”بیل“ میں کرنے کی مثال ایسی ہی غلط و مضحکہ خیز ہے۔ جیسا ”کلب صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ کے کتے“ میں کیا جائے یا ”بکری“ کا ترجمہ ”بکرا“ میں کیا جائے۔ اس غلطی میں تھانوی کے ساتھ کچھ اور مترجمین بھی کھاتہ شریک ہیں جنہیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ مترجمین کی اس بے اعتدالی کی واحد وجہ مذکورہ شرط سے خلاف ورزی کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہو رہی کہ ہندوستان کے کچھ گاؤں شالوں اور مندروں میں نصب بیل کے نقشوں

أصول ترجمہ

کو دیکھ کر مصر کے گاؤ پرستوں کو اُن پر قیاس کیا اور عقیدہ جمایا کہ بیل پرست مصریوں کے ماحول میں رہ کر بنی اسرائیل بھی بیل کی پرستش سے مانوس تھے اس لیے قاتل معلوم کرنے کے لیے بھی انہیں بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ پیش نظر آیت کریمہ کا ترجمہ کرتے وقت مترجمین کی ذہنی ترجیح کے اس تصور نے سب کچھ بگاڑ دیا جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

ترجمہ القرآن میں اس کی خلاف ورزی کی دوسری مثال سورۃ آل عمران، 26 ”قُلْ

اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعْزِزُ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ کا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے

”اے محمد ﷺ! آپ اللہ تعالیٰ سے یوں کہتے کہ اے اللہ مالک تم ملک کے آپ ملک جس کو چاہیں

دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور

جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر

پوری قدرت رکھنے والے ہیں“ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو لفظ آپ کے

ساتھ خطاب کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کو لفظ آپ کے ساتھ خطاب کرنا اور اللہ

تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لا شریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال

کرنا، یہ تینوں انداز ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہیں کیوں کہ اُردو محاورہ میں رسول

اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”آپ“ کہہ کر مخاطب کرنے کی کوئی مثال موجود ہے نہ کسی بھی

انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کو آپ کہہ کر مخاطب کرنے کا کوئی محاورہ استعمال پایا جاتا ہے اور نہ ہی

اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لا شریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال

کرنے کی کوئی مثال موجود ہے جب ترجمہ والی زبان کی پوری تاریخ میں اس کا کوئی محاورہ و مثال

نہیں ملتی اور متعارف اور مانوس نہیں ہے تو پھر اس کی حیثیت بدعتہ فی الترجمة ہونے کے ساتھ غیر

مانوس فی المحاورہ سے خالی نہیں ہے، ایسے میں وہ کون سا واقف حال ہو سکتا ہے جو اسے آیت کریمہ

أصول ترجمہ

کے مطابق اور اُس کا معیاری ترجمہ کہہ سکے۔ یہاں پر بھی اس غلطی کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے خلاف ورزی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مترجم نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے مابین مخاطب کو انسانوں کے باہمی مخاطب پر قیاس کر کے مذکورہ انداز کو ذہنی ترجیح بنایا اور آیت کریمہ سے مراد الہی کو اُس پر متفرع کیا نتیجتاً ترجمہ کو اپنی مَن پسند کا تابع بنا کر بگاڑ دیا کیوں کہ درست ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ متن کے محاورہ سے خلاف ترجمہ غلط ہونے کی طرح ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی ناقابل قبول اور غیر معیاری ہوتا ہے۔

حقائق کی اس روشنی میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے انکار کی کیا مجال ہو سکتی ہے جس کے مطابق ترجمہ آیت کریمہ کا اس طرح ہو سکتا ہے (یوں عرض کر اے اللہ! ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے بے شک تو سب کچھ کر سکتا ہے، یوں التجا کر اے اللہ! مالک الملک تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے ملک لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے تیرے ہاتھ میں ہی خیر ہے بے شک تو ہر شے پر پوری قدرت رکھتا ہے“ جو شرائط کے مطابق ہونے کی بدولت جملہ اعتراضات سے بھی پاک و صاف ہے اور حشو و زوائد سے بھی محفوظ۔ (واللہ الہادی الی سبیل الرشاد)

عام ترجمہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ترجمہ کے الفاظ اور اُس کا حجم متن کے مطابق ہو ورنہ ایجاز و اختصار والا متن کا ترجمہ اطناب اور تطویل میں کرنے سے نہ صرف یہ کہ اُس کا معنوی حسن متاثر ہوگا، بلاغت کے منافی اور بے ڈھنگا ہوگا بلکہ ترجمہ کی حد سے ہی نکل جائے گا کیوں کہ ترجمہ کے ہر لفظ کا متن کے کسی نہ کسی لفظ کا عوض ہونا ضروری ہے جسے قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اُن کے مطابق نپے ٹلے الفاظ استعمال کیے جائیں مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کے کچھ الفاظ یا انداز ایسا ہو جو تعداد میں کم ہونے کے باوجود متن کے جملہ الفاظ کے قائم مقام ہو سکے۔ لسانیات کی اس وسیع

أصول ترجمہ

دُنیا میں ایسی زبانوں کی بھی کمی نہیں ہے جس میں عربی کو ضرب المثل کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اُردو زبان کے مندرجہ ذیل متن ”انسان پر لازم ہے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے“ کا ترجمہ عربی میں کیا جائے تو اس کے نصف سے بھی زیادہ نہیں ہوگا مثلاً ”علی الانسان اکرام ضیفہ، علی الانسان ان یکرم ضیفہ“ جو حجم میں اگرچہ اُس سے کم ہے تاہم ترجمہ کی حد سے نہیں نکلتا کیوں کہ اس کی ساخت اور ہیئت اجتماعی ایسی ہے کہ متن کے تمام الفاظ کے قائم مقام ہو کر اُن سب کے مفاد پر دلالت کر رہی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عربی زبان کی ہر صنف اور ہر جملہ ایسا ہی ہوتا ہے، نہیں ایجاب کلی ہرگز نہیں بلکہ فی الجملہ کچھ زبانوں کی بعض صورتوں میں ایسا ہوتا ہے جس میں عربی کو شہرت حاصل ہے۔ جبکہ قرآن شریف کا معاملہ عام عربی سے اعلیٰ ہے جس کے مطابق اس حوالہ سے اُسے ایجاب کلی کا درجہ حاصل ہے یعنی اُس کا ہر جملہ بے مثال ایجاز و اختصار کی شکل میں بے شمار وسعتوں کو شامل ہے، معنوی وسعتوں کا حامل ہوتے ہوئے ایجاز و اختصار کے اس کمال کو اُس کے اعجاز میں بڑا دخل ہے اور اسی وجہ سے اس کا ترجمہ کرنا بھی پُل صراط عبور کرنے سے کم نہیں ہے جیسا وہ عبور کرنے کے لیے واجبی شرائط کے حاملین کے لیے آسان ہے ویسا یہ بھی آسان، اور جیسا وہ بے شرائط کے لیے معممہ ویسا یہ بھی معممہ ہے۔ الغرض قرآن شریف کے ایجاز و اختصار اور بعض زبانوں اور کلام کی کچھ صورتوں کے مخصوص احکام سے قطع نظر ترجمہ کے حجم کو متن کے حجم کے برابر رکھنا یعنی اُس سے طویل نہ ہونے دینا ترجمہ کے معیاری ہونے کے لیے شرط ہے مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی ناگزیر رکاوٹ ہو، تنگی دامن کا عارضہ ہو اور لسانی مجبوری ہو جو بہت کم ہوتا ہے ایسے مواقع کے لیے الگ اصول ہیں جن کی کچھ تفصیل ہم بیان کر آئے ہیں اور کچھ آئندہ چل کر بیان کریں گے۔ اس شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت:- متن کے مفرد لفظ کا ترجمہ جملہ میں کیا جائے جیسا سورۃ البقرہ، آیت نمبر 199

کے حصہ ”إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“ کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ”یقیناً اللہ تعالیٰ معاف

فرمادیں گے اور مہربانی فرمائیں گے“ جس میں لفظ ”غفور“ اور ”رحیم“ کا ترجمہ جملہ فعلیہ میں

أصول ترجمہ

کرنے کی وجہ سے ترجمہ کا حجم متن سے دوچند ہو گیا ہے حالاں کہ متن کے یہ دونوں الفاظ صفت مشبہ ہیں جو اپنے فاعل سے مل کر بھی جملہ نہیں ہوتے بلکہ مفرد ہی رہتے ہیں جنہیں غیر جملہ اور غیر کلام بھی کہا جاتا ہے جس میں نحاۃ کی دورائے ہیں نہ بلغاء کی تو پھر ان کا ترجمہ جملہ میں کرنے کو ترجمہ بالغیب کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا جس کے متعدد قبائح و نقصانات میں سے ترجمہ کا طویل ہونا بھی ہے جو مذکورہ شرط سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے انکار کی مجال کسے ہو سکتی ہے جس کے مطابق بڑی آسانی کے ساتھ معیاری ترجمہ (بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ خوب بخشنے والا خوب مہربان ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے۔ اس کے حجم میں بھی متن کی نسبت قدرے اضافہ پایا جاتا ہے جو ترجمہ والی زبان کی تنگی دامن کی وجہ سے ہونے کی بنا پر معیوب نہیں ہے جبکہ صفت مشبہ کا ترجمہ جملہ میں کرنے کے لیے کسی قسم کی بھی مجبوری نہیں ہے بلکہ اس کا پس منظر مذکورہ شرط سے غفلت یا متن کی لسانی حیثیت سے نا آشنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ (بِالْعُلَمَاءِ لِهَذَا الْعَكْسِ)

دوسری صورت:- متن کے ایک جملہ کا ترجمہ ایک سے زیادہ جملوں میں کیا جائے جس کی مثال سورۃ البقرہ، 102 ”يَعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ“ کا ترجمہ تھانوی نے کیا ہے ”اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی اس سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے“ ڈبل ترجمہ کے اس بے ڈھنگے پن میں ترجمہ کا حجم متن سے کئی گنا زیادہ ہوا ہے جس کا پس منظر نہ صرف پیش نظر شرط سے بے اعتنائی بلکہ اس کے ساتھ تفہیم و ترجمہ میں عدم تفریق بھی ہے کہ ترجمہ کے نام سے یہ سب کچھ لکھتے وقت ان میں تمیز نہیں کی گئی ہے۔

تیسری صورت:- ترجمہ میں غیر ضروری الفاظ شامل کیے جائیں جو ترجمہ کی حقیقت اور اس کی تعریف سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی مثال سورۃ البقرہ، 214 ”أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ“ کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ”دوسری بات سنو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں بے مشقت جا داخل ہوں گے“ جس کی پوری ساخت اور ہیئت ترکیبی حشو و زوائد

اُصولِ ترجمہ

ہے ترجمہ کے نام سے یہ لکھتے وقت اگر مترجم ترجمہ کی حقیقت اور اس کی تعریف کا احساس کرتا کہ وہ متن کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکے تو بے مصرف تطویل کی یہ مثال کبھی قائم نہ کرتا۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے زمرہ میں یہ بھی ہے کہ ترجمہ کو متن کی ترتیب کے مطابق رکھنا اگر ممکن ہو یعنی ترجمہ والی زبان کی ترتیب متن کی ترتیب کے مطابق ہونے کی ممکنہ صورتوں میں اُس سے خلاف نہ کرے ورنہ خلاف الاصل ہونے کے ساتھ بے مقصد ہونے کا بھی امکان ہے یہ عام ترجمہ میں ہے چاہے جس کتاب کا بھی ہو جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اس کا نقصان ہر یقینی ہے۔ اس کی ایک مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 55 ”وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرٰى اللّٰهَ جَهْرَةً“ کے ترجمہ میں فتح محمد جالندھری اور نذیر احمد دہلوی نے بالترتیب لکھا ہے (اور جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ موسیٰ جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے، اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے یعنی تمہارے بڑوں نے موسیٰ سے کہا تھا اے موسیٰ جب تک ہم خدا کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے ہیں نہیں کہ خدا ہی تم سے کلام کر رہا ہے) ہم سمجھتے ہیں کہ ترجمہ کی شرائط اور اُصول سے غافل حضرات اسے معمولی سمجھ کر ٹال دیں گے جبکہ حقیقت میں یہ دو غلطیوں پر مشتمل ہے؛

پہلی غلطی:- آیت کریمہ میں ”حَتّٰى نَرٰى اللّٰهَ جَهْرَةً“ آخری غایت کے طور پر مذکور ہوا ہے کہ ایمان نہ لانے کی مدت اُس پر منتہی ہوگی جبکہ آخری غایت ہر شے کی اُس سے موخر ہی ہوتی ہے گویا لفظ ”حَتّٰى نَرٰى اللّٰهَ جَهْرَةً“ کا آیت کریمہ کے اول حصہ ”لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ“ سے موخر ہونا عین مقتضائے فطرت ہے۔ ترجمہ کو اُس کی ترتیب سے خلاف کر کے مقتضائے فطرت سے خلاف کیا گیا ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔

دوسری غلطی:- ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کی ترتیب سے خلاف کرنا غیر معقول اور نامناسب ہے کیوں کہ جب ترجمہ والی زبان میں متن کی ترتیب کے مطابق ترجمہ

أصول ترجمہ

(اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں، اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تم پر یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ خود آ منے سامنے خدا کو دیکھ لیں) جیسے کسی بھی انداز سے ہو سکتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورے کے مطابق ہونے کے ساتھ جملہ اعتراضات سے بھی پاک و صاف ہے۔ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر اصل کی ترتیب سے خلاف کرنے کے اس بے ڈھنگا پن کا جواز ہی کیا ہے۔

حقائق کی اس روشنی میں مذکورہ شرط کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس کی اہمیت سے بے اعتنائی کی کیا مجال ہے ورنہ نتیجہ ایسا ہی ہوگا جو ان تراجم کا ہوا ہے۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِي إِلَى سَبِيلِ الرَّشَادِ)

ترجمہ کی شرائط کے زمرہ میں یہ بھی ہے کہ متن کے جس لفظ کے دو مفہوم ہوں اور دونوں کا احتمال یکساں جائز ہو یعنی کسی ایک سے بھی انکار کی گنجائش نہ ہو اور خارجی دلائل و شواہد سے کسی ایک کو واضح ترجیح بھی نہ ہو اور ترجمہ والی زبان میں ہر دو کے علیحدہ ترجمہ کے لیے الفاظ دستیاب ہوں لیکن دونوں کو یکساں شامل ہونے والا لفظ موجود نہیں ہے جو متن کا بدل ہو سکے، ایسی تمام صورتوں میں ایک مفہوم کو ترجمہ کے تسلسل میں رکھ کر دوسرے کو بریکٹ میں کیا جائے۔ باقی رہا یہ تصور کہ کس کو تسلسل میں رکھے اور کس کو بریکٹ میں کیا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر مترجم کو مکمل اختیار ہے کہ جیسا چاہے ویسا کرے اس کی ایسی مثال ہے جیسا کہا جاتا ہے ”جالس الحسن اور ابن سیرین“ یعنی تجھے اختیار ہے چاہے حسن بصری کے ساتھ مجالست اختیار کرے یا ابن سیرین کے ساتھ یعنی ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر واضح ترجیح نہیں ہے تو پھر ہر صورت درست ہے۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے ایسا نہ کرے گا تو تین صورتوں سے خالی نہیں ہوگا؛

① بغیر ترجمہ کے چھوڑ دے گا۔

② ترجمہ کے نام سے دونوں مفہوموں کا جدا جدا اظہار کرے گا۔

③ صرف ایک کا اظہار کرے گا۔

أصول ترجمہ

یہ تینوں صورتیں غلط ہیں کیوں کہ ان سب میں ترجمہ کی حد سے ہی نکلتا ہے کیوں کہ:

پہلی صورت میں چھوڑے ہوئے لفظ کے عوض جب کوئی لفظ ہی نہیں لایا گیا تو پھر ترجمہ کا تصور ہی ختم ہو گیا کیوں کہ وہ اس بات سے عبارت ہے کہ متن کے جملہ الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو ان کے قائم مقام ہو سکے۔

دوسری صورت میں یہ ڈبل ترجمہ ہے یعنی متن کے ایک لفظ کے عوض ترجمہ والی زبان سے دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو ترجمہ کی حقیقت سے خلاف ہے کہ اُس میں متن کے ایک لفظ کے مقابلہ میں ترجمہ والی زبان کا بھی ایک لفظ ہوتا ہے تو پھر ڈبل ترجمہ کے اس بے ڈھنگے پن کو اُس کے مطابق یا اُس کا ترجمہ کون کہہ سکتا ہے۔

تیسری صورت میں ترجیح بلا مرجح ہے جس سے حقیقی ترجمہ کا خالی ہونا ضروری ہے۔

حقائق کی اس روشنی میں مذکورہ اصول سے انحراف کی مجال کسے ہو سکتی ہے۔ عام ترجمہ کی شرائط کے سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ متن کے کسی لفظ کے متعدد معانی ہوں اور تفسیر کے طور پر اسے اُن سب پر محمول کرنا درست ہو یعنی کسی ایک سے بھی انکار جائز نہ ہو اور کسی ایک کو بھی واضح ترجیح نہ ہو جبکہ ترجمہ والی زبان میں اُن سب کے جدا جدا ترجمہ کے لیے مستقل الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن ایسا جامع لفظ دستیاب نہیں ہے جو اصل کی طرح سب کو یکساں شامل ہو سکے ایسی تمام صورتوں میں متن کے اُسی لفظ کو ترجمہ میں ذکر کرنا ضروری ہے کیوں کہ ایسا نہ کرے گا تو چار صورتوں سے خالی نہیں ہوگا:

① اُسے ترک کرے گا۔

② اُس کے ہر مدلول اور ہر احتمال کے لیے دستیاب الفاظ کو ذکر کرے گا کہ ہر معنی کے مطابق ترجمہ والی زبان سے الفاظ لائے گا۔

③ کسی ایک معنی کے مطابق ترجمہ کر کے باقی کو ترک کرے گا۔

④ ایک کا ترجمہ تسلسل میں رکھ کر باقی سب کو بریکٹ میں کرے گا۔ جبکہ یہ سب کے سب غلط

اُصولِ ترجمہ

ہیں کیوں کہ:

پہلی دو صورتوں میں ترجمہ کی حد سے نکل جائے گا یعنی ترجمہ کہلانے کے قابل ہی نہیں رہے گا جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو ترجمہ کی حقیقت سے آگاہ ہے۔
تیسری صورت میں ترجیح بلامرجح ہوگی جس سے ترجمہ کا خالی ہونا اور محفوظ ہونا ضروری ہے۔
چوتھی صورت غیر مہذب اور غیر معقول ہے کیوں کہ بریکٹ سسٹم مجبوری کی پیداوار ہونے کی وجہ سے زیادہ طویل عبارت اور متعدد چیزوں کا متحمل نہیں ہو سکتا اُس کا مصرف صرف ایک لفظ، ایک جملہ، ایک مضمون کی تفہیم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ترجمہ کے اُصول و شرائط میں یہ بھی ہے کہ متن کا کوئی لفظ دو سے زیادہ یعنی متعدد معانی کا یکساں احتمال رکھتا ہو اور ترجمہ والی زبان میں ایسا لفظ پایا جاتا ہو جو ایک کے سوا باقی سب کو شامل ہو سکے ایسی تمام صورتوں میں اُسے متن کے ترجمہ کے طور پر تسلسل میں رکھے اور اُس ایک معنی کو کلمہ ”یا“ کے ساتھ بریکٹ میں کرے یہ اس لیے ضروری ہے کہ اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر چار صورتوں سے خالی نہیں ہوگا:

- ① متن کو ترجمہ کے بغیر چھوڑ دے گا۔
 - ② ہر احتمال کے اظہار کے لیے دستیاب الفاظ کو ترجمہ کے طور پر ذکر کرے گا۔
 - ③ کسی ایک احتمال کے اظہار کے لیے دستیاب لفظ کو ترجمہ کے طور پر ذکر کرے گا۔
 - ④ ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں رکھ کر باقی سب کو بریکٹ میں کرے گا۔
- پہلی دو صورتوں میں ترجمہ کی حد سے نکل جائے گا جیسا اس سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔
تیسری صورت میں ترجیح بلامرجح ہے۔

چوتھی صورت میں غیر معقول اور بریکٹ سسٹم سے خلاف ہے جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔

حقائق کی اس روشنی میں مذکورہ صورت ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ ترجمہ

القرآن میں اس کی مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 49 ”وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ“

أصول ترجمہ

میں لفظ ”بلاء“ ہے۔ جمہور مفسرین کے مطابق اس کے معنی میں متعدد احتمالات ہیں۔ مثال کے طور پر السید محمود البغدادی الالوسی الحنفی المتوفی 1280ھ نے اسی آیت کریمہ کے تحت لکھا ہے:

”إشارة الى التذبيح والاستحياء أو الانجاء“

اس کے بعد لکھا ہے: ”ويعوز ان يشار بذالك الى الجملة“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے فرمان ”وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ“ میں اسم اشارہ سے ہو سکتا ہے کہ ”يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ“ کی طرف اشارہ ہو یا ہو سکتا ہے کہ ”وَإِذْ نَجَّيْنَكُمْ“ کی طرف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں کی خصوصیت سے قطع نظر نفس واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے: ”فان حملت الاشارة على المعنى الاول فالمراد بالبلاء المحنة وان على الثانى فالمراد به النعمة وان على الثالث فالمراد به القدر المشترك كالامتحان الشائع بينهما“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسم اشارہ ”وَفِي ذَلِكُمْ“ اگر پہلے معنی پر محمول ہو تو ”بَلَاءٌ“ سے مراد محنت و مشقت ہوگی اور اگر دوسرے معنی کی طرف عائد ہو تو اس سے مراد انعام و نعمت ہوگی اور اگر تیسرے معنی پر محمول ہو تو اس سے مراد قدر مشترک ہوگی یعنی مطلق امتحان و آزمائش جو امتحان بالחסنات اور امتحان بالسيئات کے مابین قدر مشترک ہے۔

قاضی ناصر الدین البیضاوی الشافعی المتوفی 685ھ نے لکھا ہے:

”محنة ان اشير بذالك الى صنيعهم ونعمة ان اشير به الى الانجاء“

اس کے دو سطر بعد لکھا ہے: ”ويعوز ان يشار بذالك الى الجملة ويراد به

الامتحان الشائع بينهما“ (۲)

(۱) تفسیر روح المعانی، ج: 1، ص: 54۔

(۲) تفسیر بیضاوی مع شیخ زادہ، ج: 1، ص: 300۔

أصول ترجمہ

اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو حنفی المذہب مفسر کی عبارت کا ابھی بیان ہوا ہے۔

جار اللہ الزمخشری المعزلی المتوفی 538ھ نے لکھا ہے: ”والبلاء“ المحنة ان اشیر بدالکم

الی صنیع فرعون والنعمة ان اشیر به الی الانجاء“

الامام الشوکانی من اہل الحدیث المتوفی ۱۲۵۰ھ نے لکھا ہے:

”الی جملة الامر والبلاء يطلق تارة على الخير وتارة على الشر فان ارید به

هنا الشر كانت الاشارة بقوله وفي ذلكم بلاء الى ما حل بهم من النعمة بالذبح

ونحوه وان ارید به الخير كانت الاشارة الى النعمة التي انعم الله عليهم

بالانجاء“ (۱)

مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

”وَسُمِّيَ الْغَمُّ بَلَاءً مِنْ حَيْثُ اَنَّهُ يُبْلَى الْجَسْمُ“

ایک جگہ پر احکام شرعیہ تکلیفیہ کو اور انسان کی منجانب اللہ مکلفیت کو ”بلاء“ کہنے کی توجیہ کرتے

ہوئے لکھا ہے: ”وَالثَّالِثُ اَنَّ اخْتِبَارَ اللَّهِ تَعَالَى لِلْعِبَادِ تَارَةً بِالْمَسَارِ لِيشْكُرُوا وَتَارَةً

بِالْمُضَارِ لِيصْبِرُوا فَصَارَتِ الْمِحْنَةُ وَالْمِنْحَةُ جَمِيعًا بَلَاءً“

اور تیسرے مقام پر بالخصوص سورة البقرة کی اسی آیت میں واقع لفظ ”بلاء“ سے مراد الہی کی

نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وَقَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ وَفِي ذَلِكَم بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ رَاجِعٌ

إِلَى الْأَمْرَيْنِ إِلَى الْمِحْنَةِ الَّتِي فِي قَوْلِهِ عَزَّوَجَلَّ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ

نِسَاءَكُمْ وَإِلَى الْمِنْحَةِ الَّتِي أَنْجَاهُمْ“ (۲)

ان سب سے حاصل مقصد یہ کہ یہاں پر لفظ ”بلاء“ میں پانچ احتمالات ہیں۔

پہلا احتمال:- اس سے مراد غم و صدمہ ہے جو فرعونوں کے مظالم کی وجہ سے بنی اسرائیل کو پہنچتا

(۱) تفسیر فتح القدیر، ج: 1، ص: 83۔

(۲) مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی، ص: 61، 60، مادہ (بلاء)۔

أصول ترجمہ

تھا جس کے مطابق آیت کا مفہوم ہوگا کہ ”تمہارے رب کی طرف سے کائنات میں جاری نظام تکوین کے تحت فرعونیوں کے ہاتھوں تمہیں پہنچنے والا عذاب جو تمہارے لئے بڑا غم و صدمہ تھا جس سے ہم نے تم کو نجات بخشی“

دوسرا احتمال:- اس سے مراد زحمتِ تکلیف بالחסنات ہو، جس کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا ”فرعونیوں کے مظالم سے نجات دینے کے احسان میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی زحمت تکلیف تھی“۔

تیسرا احتمال:- اس سے مراد زحمتِ تکلیف بالسیات ہو، جس کے مطابق آیت کریمہ کا مفہوم یوں ہوگا ”فرعونیوں کے مظالم و استحصال میں رکھنے میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی زحمتِ تکلیف تھی“۔ ان دونوں کی تائید و تصدیق اُس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے جہاں پر ”وَبَلَوْنَهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ“ (۱) فرمایا ہے، یعنی ”ہم نے بنی اسرائیل کو کبھی راحتوں اور کبھی تکلیفوں کے ساتھ آزمایا“۔

چوتھا احتمال:- اس سے مراد مطلق امتحان و آزمائش ہو جو آیت کریمہ ”وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ“ سے لے کر آخر تک کے مجموعہ سے مستفاد ہے۔

پانچواں مفہوم بمعنی احسان و انعام ہے اس معنی کے مطابق پیش نظر آیت کریمہ کا مفہوم ہوگا ”فرعونیوں کے مظالم سے تمہیں نجات بخشنے میں تمہارے رب کی طرف سے تم پر بڑا احسان و انعام تھا“۔

اہل فہم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ان پانچوں احتمالات میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ یقینی امر ہے متعدد آیات قرآنی کے مدلول ہیں اور بلا تخصیص سب کو معلوم ہے کہ فرعونیوں کے مظالم بنی اسرائیل کے لیے بڑے غم تھے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے نظام تکوین اور سرالقدر کے ماتحت ہو رہا

أصول ترجمہ

تھا اور ابتلاء ”بِالْحَسَنِ وَالسَّيِّئَاتِ“ کی زحمت بڑا امتحان ہے اور ان مظالم سے نجات بخشنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر بڑا احسان و انعام تھا۔

مترجم چاہے کسی انسانی کتاب کا ترجمہ کر رہا ہو یا قرآن شریف کا بہر حال ایسے مقامات کا معیاری ترجمہ پیش کرنا اُس کے لیے امتحان سے کم نہیں ہے جس کے لیے دونوں زبانوں کے جملہ گوشوں سے آگاہی کے ساتھ مذکورہ تمام اصول و شرائط پر بھی عمیق نظر درکار ہے جس کے مطابق ترجمہ والی زبان میں یہاں پر لفظ ”بلاء“ کے سابق الذکر چاروں معانی کو شامل ہونے والے دو لفظ دستیاب ہیں۔ ایک لفظ امتحان، دوسرا لفظ بلا۔ اُردو میں کثیر الاستعمال ہونے والے یہ دونوں لفظ عربی سے آئے ہیں ان میں بڑا فرق یہ ہے کہ اُردو میں استعمال ہونے والا امتحان عربی کے امتحان کا ہم معنی ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ لفظ ”بلا“ کی اصل بھی بلاء ہے فرق صرف ہیئت کذائیہ اور ساخت کا ہے۔ نیز اُردو میں استعمال ہونے والے ان دونوں لفظوں کا یہاں پر لفظ ”بلاء“ کے اول الذکر چاروں معانی کو شامل ہونا صرف اس اعتبار سے ہے کہ اُن میں امتحان کی کلفت پائی جاتی ہے چاہے جس انداز سے بھی ہو اور پانچویں معنی کو شامل نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُس میں امتحان نہیں ہے بلکہ محض احسان و انعام ہے۔

دوسری وجہ:- اُردو محاورہ میں امتحان کو تکلیف لازم ہے چاہے جس انداز سے بھی ہو تو پھر محض احسان و انعام کو شامل ہونے کا تصور ہی کیا ہے۔

تیسرا فرق:- جو عربی کے ”بلاء“ اور اُردو کے ”بلا“ کے مابین ہے وہ یہ ہے کہ عربی کا لفظ ”بلاء“ یہاں پر آیت کریمہ میں مذکورہ پانچوں معانی کو شامل ہے جبکہ اُردو کی ”بلا“ پانچویں معنی کو شامل نہیں ہے۔ اُردو لغت کی مستند کتاب فرہنگ آصفیہ، ج 1، ص 407، مادہ (ب، ل، ا) میں اس کے سات مختلف معانی بتانے کے بعد ہر ایک تحت مزید ذیلی معانی اور استعمالات بتائے ہیں جن میں محض احسان یا محض انعام و اکرام کے لیے اس کے استعمال ہونے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔

أصول ترجمہ

عام ترجمہ کے پیش نظر اصول کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ (اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا یا) (بڑا احسان)، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا ”بڑا انعام“ جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر متن کے لفظ ”بلا“ کا ترجمہ ترک کیا جائے گا یا ترجمہ کے نام سے اُس کے پانچوں معانی کا جدا جدا اظہار کیا جائے گا یا کسی ایک کے مطابق ترجمہ کر کے باقی سب سے صرف نظر کیا جائے گا۔

یا پانچویں معنی کے مطابق ترجمہ کر کے باقی سب کو بریکٹ میں کیا جائے گا جبکہ یہ چاروں صورتیں غلط ہیں جس کی وجوہات گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ حقائق کی اس روشنی میں مذکورہ اصول آپ ہی ناگزیر قرار پاتا ہے جس کے مطابق ترجمہ معیاری ہونے کے ساتھ بریکٹ سسٹم بھی معقول ہوتا ہے۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِي اِلٰى سَبِيْلِ الرَّشَادِ)

ترجمہ کی صحت کے لیے جہاں دوسری شرائط و اصول کی پابندی ضروری ہے وہاں متن کے لغوی مفہوم کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ متن کے لغوی مفہوم سے خلاف ہونے والا ترجمہ غلط ہوگا۔ ترجمہ القرآن میں اس کی مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 285 میں حصہ متن ”يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ“ کا ترجمہ سید محمد وجیہ السیماعرفانی نے کیا ہے ”الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ناواقف لوگ انہیں مالدار سمجھتے ہیں“ جو کہا گیا ہے یہ لفظ ”تعفف“ کا مفہوم الگ تھلگ رہنے سمجھنے پر مبنی ہے جو غلط ہے کیوں کہ لسان قرآنی میں لفظ ”تعفف“ الگ تھلگ رہنے کے لیے موضوع ہے نہ اس میں استعمال ہونے کا کوئی ثبوت موجود ہے۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

”العفة حصول حالة للنفس تمتنع بها عن غلبة الشهوة والمتعفف المتعاطي

لذالك بضرب من الممارسة والقهر“

”عفة“ نفس انسانی کے لیے اُس حال کے حصول سے عبارت ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ

نفسانی خواہشات کے غلبہ سے محفوظ ہو جاتا ہے جبکہ ”مُعَفِّف“ اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے نفس

أصول ترجمہ

امارہ پر کنٹرول کرنے کی بدولت اس حالت پر فائز ہو۔

المجد میں ہے: ”عَفَّ عَفَاً وَعَفَاً وَعَفَاً كَفَّ وَامْتَنَعَ عَمَّا لَا يَحِلُّ أَوْ لَا يَجْمَلُ“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے چاروں مصادر یعنی (عَفَا، عَفَّةً، عَفَاً اور عَفَاً) میں ہر اس چیز سے بچنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جو جائز نہیں یا کم از کم انسانی زینت کے منافی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے: ”تَعَفَّفَ عَنْ كَذَا امْتَنَعَ“

الغرض یہ لفظ مجرد استعمال ہو یا مزید فیہ یعنی باب تفعّل سے بہر حال اس کا مفہوم کسی معیوب چیز سے اجتناب و امتناع کے بغیر نہیں ہوتا چہ جائیکہ لوگوں سے الگ تھلگ رہنے جیسے مفہوم میں ہو۔ ترجمہ کی اس غلطی کی وجہ مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ مذکورہ شرط کے ساتھ دوسری شرائط کو پیش نظر رکھ کر آیت کریمہ کا حقیقی ترجمہ ”نادان انہیں تو انگر سمجھے بچنے کے سبب، ناواقف انہیں مال دار سمجھے بچنے کے سبب، ناواقف حال انہیں غنی سمجھے سوال سے بچنے کے سبب“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے تو پھر شرط کی راہ سے ہٹ کر ترجمہ کرنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوگا، جو اس کا ہوا ہے۔

دوسری مثال:- سورۃ آل عمران، آیت نمبر 185 ”وَإِنَّمَا تُوَفُّونَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ“

کا ترجمہ اشرف علی تھانوی نے کیا ہے ”اور تم کو پوری پاداش تمہاری قیامت ہی کے روز ملے گی“ جس میں متن کے لفظ ”اُجُور“ کا ترجمہ ”پاداش“ میں کیا گیا ہے جو اس کی لغوی حیثیت بلکہ متن لغت کی حیثیت سے بھی خلاف ہے کیوں کہ لسان قرآنی کے مطابق اُجور جمع ہے اجر کی اور اجر کارِ خیر کے بدل کے ساتھ مختص ہے جبکہ لفظ پاداش اُردو محاورہ میں کارِ خیر کے بدل کے لیے استعمال نہیں ہوتا لگتا یوں ہے کہ مترجمین کو یہ لکھتے وقت اجر اور جزاء کے مابین فرق کا ادراک نہیں تھا ورنہ جزاء کے ترجمہ کے ساتھ قدرے مناسب رکھنے والے اس لفظ کو ”اُجُور“ کے ترجمہ کے لیے کبھی استعمال نہ کرتے

أصول ترجمہ

کاش یہ حضرات اور نہ سہی کم از کم مفردات لغات القرآن سے ہی روشنی لینے کی کوشش کرتے پھر بھی اس لغزش سے تحفظ پاتے۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں لفظ ”اجر اور جزاء“ کے مابین فرق بتاتے ہوئے کہا ہے:

”الاجر والاجرۃ ما يعود من ثواب العمل دنیویا کان أو أخری یا نحو قوله تعالیٰ ان اجرى الا على الله، واتیاه اجره فی الدنيا وانه فی الآخرة لمن الصالحین، ولا جر الآخرة خیر للذین امنوا والاجرۃ فی الثواب اللدنیوی وجمع الاجر أجور“
اس کے بعد کچھ فاصلہ پر لکھا ہے: ”والاجر والاجرۃ یقال فیما کان عن عقد وما یرجرى مجرى العقد ولا یقال الا فی النفع دون الضر“
اس کے بعد لفظ جزاء کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”والجزاء یقال فیما کان عن عقد و غیر عقد و یقال فی النافع والضرار“ (۱)

لغت سے ملنے والی اس روشنی کے مطابق ان کے مابین عام و خاص کا فرق ہے کہ اجر کارِ خیر کے بدل کے ساتھ خاص ہے جس میں ضرر و نقصان نہیں بلکہ خیر ہی خیر اور نفع ہی نفع ہوتا ہے جبکہ لفظ ”جزاء“ نفع و نقصان دونوں کو عام ہے جس وجہ سے اُمورِ شر سے متعلق استعمال ہونے کی صورت میں اس کے ترجمہ کے طور پر لفظ ”پاداش“ استعمال کرنے کو غلط نہیں کہا جاسکتا اور اُمورِ خیر سے متعلق استعمال ہونے کی صورت میں اس کے ترجمہ کے لیے اسے استعمال کرنے کی قطعاً کوئی ٹک نہیں ہوتی جبکہ لفظ ”اجر اور أجور“ کے ترجمہ کے لیے اسے استعمال کرنے کا قطعاً کوئی جواز ہی نہیں ہے ایسے میں اس ترجمہ کے غلط ہونے کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔



(۱) مفردات لغات القرآن، امام الراغب الاصفہانی، مادہ (ا، ج، ر)۔

دوسرا باب:-

باب ثانی خاص ترجمۃ القرآن سے متعلق ہے جس میں درج ذیل موضوعات سے بحث کی جائے گی:

❶ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض و موضوع۔

❷ جن اسلاف نے قرآن شریف کے ترجمہ کو ناممکن یا ناجائز کہا ہے اُس کا مصرف اور تقاضائے انصاف۔

❸ ترجمۃ القرآن کی تاریخ اور ضرورت اور اس پر گزرنے والے مراحل۔

❹ ترجمۃ القرآن کے لیے ناگزیر شرائط و اصول اور احتیاطی تقاضے۔

❺ ترجمۃ القرآن کی شرعی حیثیت۔

ترجمۃ القرآن کی نسبت عام ترجمہ کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسا خاص کی نسبت عام سے ہوتی ہے کیوں کہ عام ترجمہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے جنس ہے جس کے ماتحت دو متبائن نوع ہیں۔ ایک عرشی کتاب کا ترجمہ اور دوسرا فرشی کتاب کا ترجمہ کہلاتا ہے، اور فرشی کتاب کے ترجمہ کے ماتحت بے شمار اصناف ہیں جبکہ عرشی کتاب یعنی قرآن شریف کے ترجمہ کے تحت جزئیات ہیں جنہیں آیات قرآنیہ کا ترجمہ کہا جاتا ہے جن کے بغیر ترجمۃ القرآن کے خارجی وجود کی تمیز ممکن ہے نہ صحیح و سقیم کی پہچان۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے انداز سے بھی ترجمۃ القرآن کی نسبت عام ترجمہ سے پہچانی جاسکتی ہے کہ عام ترجمہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے کہ وہ اصل کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے اُن الفاظ سے بدلنا ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکیں، جنس ہے اور ترجمۃ القرآن سے لے کر انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے جتنے بھی تراجم دُنیا میں پائے جاسکتے ہیں یہ سب کے سب اُس کے ماتحت متبائن انواع ہیں بہر حال ترجمۃ القرآن عام ترجمہ کے ماتحت خاص قسم ہے اس

أصول ترجمہ

کے مبادیات ثلاثہ یعنی تعریف، غرض، موضوع کی اگرچہ قدرے پہچان مطلق ترجمہ کی تعریف، غرض و موضوع کے بیان سے ہو چکی ہے تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں پر تصریح بما علم ضمناً کے طور پر انہیں صراحتاً بیان کرنا بھی ضروری ہے۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف:-

قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں اور قائم مقام ہونے سے مطلب یہ ہے کہ اُن کی جملہ حیثیات کے مطابق ہوں مثلاً اُس کا جو مفہوم ہے اس کا بھی وہی ہو اور اُس کی جو لسانی حیثیت ہے اس کی بھی وہی حیثیت ہو یعنی وہ مبتداء ہے یہ بھی مبتداء ہو اور وہ خبر ہے یہ بھی خبر ہو، وہ متعدی ہے یہ بھی متعدی اور وہ لازم ہے یہ بھی لازم اور وہ فعل معلوم ہے یہ بھی فعل معلوم ہو اور وہ مجہول ہے یہ بھی مجہول ہو، وہ مذکر یا مونث ہے یہ بھی اُس کے مطابق ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ورنہ اُس کی حیثیت سے خلاف ہونے والا لفظ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ ترجمہ کے الفاظ جو اصل سے بدل کہلاتے ہیں کمیت و کیفیت دونوں کے حوالہ سے اصل کے مطابق ہونا اگرچہ دونوں ترجموں میں ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر ترجمہ کا تصور ہی نہیں ہے تاہم ترجمۃ القرآن میں اس کی اہمیت عام ترجمہ کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے کیوں کہ عام ترجمہ میں بعض حیثیات کے حوالہ سے مطابق نہ ہونے کا نقصان کم ہے جبکہ ترجمۃ القرآن میں عدم مطابقت کے نقصانات نہ صرف زیادہ بلکہ خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی انسانی کتاب کی عبارت ”اذبحوا بقرۃ“ سے اُس کی مراد ”گائے ذبح کرنا ہو“ اور ترجمہ اُس کا ”بیل ذبح کرو“ میں کیا جائے کیوں کہ بیل گائے کا قائم مقام نہیں ہے لیکن غلطی کی یہ نوعیت آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً“ (۱) میں ”بقرۃ“ کا ترجمہ بیل میں کرنے سے کم ہے کیوں کہ اس میں انسان کی مراد ظاہر کرنے میں غلطی ہے جبکہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول

(۱) البقرۃ: 67۔

اصول ترجمہ

کی مراد ظاہر کرنے میں غلطی ہے جن کی نوعیت اور گناہ میں بڑا فرق ہے۔ نیز یہاں پر اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے مترجم کہہ سکتا ہے کہ لفظ ”بقرة“ اسم جنس ہونے کی وجہ سے گائے اور بیل دونوں کو شامل ہے اور گائے مراد ہونے پر کلام میں کوئی خارجی دلیل موجود نہیں تھی جس وجہ سے مراد کی تعیین و تشخیص کرنے میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہے جبکہ آیت کریمہ میں اس قسم عذر خواہی اور بہانہ جوئی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کیوں کہ اس مقام پر بیل مراد نہ ہونے کے لیے سیاق و سباق کی دلیل موجود ہے کہ لفظ ”بقرة“ کی طرف راجع ہونے والے تمام ضمائر مونث ہیں جو مذکر کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے۔

نیز آیت کریمہ کا حصہ ”إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ“ (۱) اس کے مونث ہونے پر یعنی گائے ہونے پر مستقل دلیل ہے کیوں کہ یہ الف تانیث کی ایسی علامت ہے جس کا مذکر پر داخل ہونا ممکن ہی نہیں ہے بلکہ یہ جس اسم پر بھی آئے وہ ہمیشہ مونث ہی ہوتا ہے یہ اتنا واضح مسئلہ ہے کہ عربی زبان سے اور خاص کر علم نحو سے قدرے روشنی پانے والوں سے بھی مخفی نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کی جرات کر کے آگے آنے والے اس سے جاہل رہ سکے۔ ایسے میں لفظ ”بقرة“ کے مذکورہ دونوں ترجموں کی غلطی کو یکساں کون کہہ سکتا ہے اس کے علاوہ عواقب و نتائج کے حوالہ سے بھی مندرجہ ذیل فرق ہے:

● انسانی کتاب کے ترجمہ میں اس غلطی کی نسبت انسان کی طرف ہو رہی ہے کہ وہ بیل ذبح کرنے کا حکم دے رہا ہے جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جارہی ہے کہ وہ بیل ذبح کرنے کا حکم دے رہا ہے یہ دونوں نسبتیں اگرچہ خلاف حقیقت اور جھوٹ ہیں تاہم اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ نسبت کرنے کا گناہ کسی انسان کی طرف نسبت کرنے کے برابر نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) البقرة: 69۔

”إِنَّ الدِّينَ يَفْتَرُونُ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ“ (۱)

۲ انسانی کتاب کے ترجمہ میں اسے غلطی اور بے اعتدالی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اس قسم کی غلطیوں کو محض بے اعتدالی کہنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ معنوی تحریف بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ قرآن شریف صرف الفاظ یا محض معانی کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ و معانی کے مجموعہ مرکب کا نام ہے الفاظ اس حیثیت سے کہ معانی و مقاصد پر دلالت کرتے ہیں اور معانی اس حیثیت سے کہ الفاظ کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں یعنی دال و مدلول ہونے کی حیثیت سے دونوں کے مجموعہ مرکب کو کلام اللہ کہا جاتا ہے جس کے مطابق اس کے کسی لفظ کی تغیر کو تحریف لفظی اور لفظ کے کسی مدلول کے بدلنے کو تحریف معنوی کہا جاتا ہے۔

۳ انسانی کتاب کے ترجمہ میں اسے غلطی و بے اعتدالی کہنے کے بعد گناہ کی تعیین و تشخیص کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اسے گناہ کبیرہ قرار دیئے بغیر نہیں رہا جاتا کیوں کہ تحریف ہے اور کتاب اللہ کی ہر تحریف گناہ کبیرہ ہے۔

حاصل کلام :- ترجمہ القرآن کی حقیقت کہ وہ قرآنی آیات کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو ان کے قائم مقام ہو سکیں یعنی ان سے مرادی معنی کے مطابق ہونے کے ساتھ ان کی جملہ فنی و لسانی حیثیات کے بھی حامل ہوں۔ اس کی اہمیت عام ترجمہ کی اہمیت سے کئی گنا زیادہ ہے اس کی شرائط بھی عام ترجمہ سے زیادہ اور اس کے احتیاطی تقاضے بھی عام ترجمہ کے احتیاطی تقاضوں سے زیادہ ہونے کے علاوہ یہ نہایت پرخطر بھی ہے کہ کسی ایک احتیاطی تقاضے سے بے توجہی یا کسی ایک شرط سے بے اعتنائی کی صورت میں بھی تحریف لازم آ سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف یا اس کے رسول ﷺ کی طرف نادانستہ طور پر جھوٹ نسبت کرنے کا گناہ ہو سکتا ہے۔ اس کی کثرت اہتمام کی ان وجوہات کی بنا پر اس باب میں ہم اس کے امور ثلاثہ یعنی تعریف، غرض، موضوع پر مستقل بحث کرنا چاہتے ہیں ورنہ پہلے باب میں ان پر بھی کافی حد تک روشنی پڑ چکی

اصول ترجمہ

ہے۔ بزرگانِ دین سے منقول ترجمۃ القرآن کی اس تعریف کہ وہ ”ابداً بالفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ ہے یعنی قرآنی آیات کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں، اس کے مطابق متنِ قرآن کے الفاظ مبدل منہ کہلاتے ہیں جبکہ ترجمہ کے الفاظ اُن سے بدل کہلاتے ہیں اور بدل و مبدل منہ۔ یہاں پر اپنے لغوی مفہوم پر محمول ہیں یعنی عوض اور معوض عنہ، یہ تصریح ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ کسی قاری و سامع کا ذہن اس سے نحوی اصطلاح کی طرف نہ جائے۔

ترجمۃ القرآن کی اس تعریف میں ترجمہ کے الفاظ کا متن کے الفاظ کے قائم مقام ہونے سے مقصد بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اُن کے ساتھ مختص احوال کے مابوا جملہ احوال میں اُن کے مطابق اور اُن کی لسانی حیثیات کے حامل ہو۔ مثلاً وہ جس مراد الہی پر دلالت کر رہے ہیں یہ بھی اُسی پر دلالت کریں اور صرف نحو، بلاغت وغیرہ کے حوالہ سے وہ جس حیثیت کے حامل ہیں یہ بھی اُسی حیثیت کے حامل ہوں ورنہ اُس کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہوں گے جب اصل کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہ ہوگا تو پھر ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل بھی نہ ہوگا کیوں کہ ترجمۃ القرآن کے لیے یہ فصل مقوم ہے جس کے بغیر اُس کا وجود ہی ممکن نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ناطق کے بغیر انسان کا وجود متصور نہیں ہے۔ باقی رہے متنِ قرآن کے وہ احوال جو اُسی کے ساتھ مختص ہیں یا الفاظ کی وہ خصوصیات جو ترجمہ والی زبان میں متصور نہیں ہیں جیسا معرب و مبنی ہونا اور مخصوص مخارج سے ادا ہونا اور فصاحت و بلاغت میں بے مثل ہونا اور مخصوص ترتیب و اعجاز اور کمال اختصار و ایجاز میں بے مثال ہونا اور کسی بھی حوالہ سے عام انسانوں کی فہم سے ماوراء علوم و معارف پر مشتمل ہونا جو کسی بھی ترجمہ والی زبان میں متصور نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کے الفاظ کا ان کے مطابق ہونا بھی ضروری نہیں ہے کیوں کہ ایسا کرنا مترجم کے لیے ممکن ہی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ (۱) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں کرتا مگر اُس کی

(۱) البقرة: 286۔

اُصولِ ترجمہ

استطاعت کے مطابق۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن شریف کی ان خصوصیات کو دلیل بنا کر اُس کے ترجمہ کو بھی ناممکن کہا جائے جیسا بعض حضرات نے کہا ہے یا عدمِ مطابقت کے اس جواز کو بہانہ بنا کر ترجمۃ القرآن کے فصلِ مقوم سے ہی صرف نظر کیا جائے جیسا قرآن شریف کے اکثر تراجم میں ہوا ہے۔

جنوبی ایشیاء (برصغیر پاک و ہند) کے مشاہیر مسالک کے درجنوں اُردو تراجم قرآن اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی غالب اکثریت اس غلطی پر مشتمل ہے کسی میں ترجمہ کے الفاظ قرآنی الفاظ کے لغوی مفہوم سے خلاف ہیں، کسی میں مرادی معنی سے خلاف ہیں اور کسی میں اُس کی صُرفی حیثیت سے خلاف ہے تو کسی میں نحوی حیثیت کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ اسی طرح کسی میں ایک وجہ سے خلاف کیا گیا ہے اور بعض میں اصل سے اختلاف کی متعدد وجوہ جمع کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرہ، آیت 35 کے حصہ ”وَلَا تَقْرَبْ هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”اور مت قریب جانا تم دونوں اس درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالموں سے“ یہ ترجمہ اہل حدیث علماء کی ایک جماعت نے کیا ہے جس میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبدالجبار کے اسماء نمایاں ہیں جبکہ اشاعتی ادارہ (دارالسلام الریاض) کے مہتمم عبدالجبار مجاہد سمیت کچھ پاکستانی اور کچھ سعودیہ عربیہ میں رہنے والے اہل حدیث علماء کا تعاون بھی انہیں شامل ہے اور اس کے شروع میں حرفِ اول کے نام سے پروفیسر عبدالجبار شا کر بیت الحکمۃ لاہور کی لکھی ہوئی ”اور کچھ ترجمہ قرآن کے بارے میں“ کے عنوان سے حافظ صلاح الدین یوسف کی لکھی ہوئی جو تحریریں شائع ہوئیں ہیں انہیں دیکھنے اور پڑھنے والے یہ تاثر قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جید علماء کرام کے اشتراکِ عمل سے وجود میں آنے والا یہ ترجمہ ضرور معیاری ہوگا اور دوسرے تراجم پر اٹھنے والے جملہ اعتراضات سے پاک اور محفوظ ہوگا لیکن ترجمۃ القرآن کی فطری شرائط کی روشنی میں اس کے مندرجات کو دیکھنے کے بعد دوسرے تراجم سے بھی زیادہ مایوسی ہوتی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس ٹیم کو فنِ ترجمہ کے بنیادی اُصول کا ہی ادراک نہیں تھا چہ جائیکہ ترجمۃ القرآن کی خصوصی

اُصولِ ترجمہ

شرائط کا احساس ہو۔ اس آیت کریمہ کے ترجمہ میں اکٹھی چار غلطیاں کی گئی ہیں:

❶ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو مسخ کیا گیا ہے جیسا اُس کے الفاظ و انداز ”اور مت قریب جانا تم دونوں اس درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالموں سے“ کے سننے اور پڑھنے والوں سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں کسی بھی فعل کے لیے فاعل کے طور پر استعمال ہونے والے تشبیہ اور جمع یکساں استعمال کیے جاتے ہیں جس کے مطابق آیت کریمہ کا ترجمہ ”اور قریب مت جاؤ اس درخت کے کہ پھر ظلم کرنے والوں میں ہو جاؤ گے، اور اس درخت کے نزدیک نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے“ اس جیسے کسی بھی انداز سے ہو سکتا ہے جو متن کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے بھی مطابق ہے۔

❷ متن کی لغوی حیثیت سے بھی خلاف ہے کیوں کہ لسانِ قرآنی کی ایک لغوی حیثیت یہ بھی ہے کہ امر، نہی، استفہام، تمنی، ترجی جیسے چند عوامل کے جواب میں واقع ہونے والے ”فا“ اور ”واو“ کے بعد مذکور ہونے والا فعل جو منصوب ہوتا ہے اپنے عامل یعنی ”اَن“ مقدرہ کے ساتھ مل کر مصدرِ منسلخ ہونے کے بعد معطوف علیہ والے حصہ کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے یہ خالصتاً لغت کا مسئلہ ہے جو لسانِ قرآنی کی لغت کے ساتھ مختص ہے جس کے مطابق پیش نظر آیت کریمہ کی تفہیم یا ترجمانی اس طرح ہوگی ”لَا تَجْمَعُ بَيْنَ قِرْبَانِ الشَّجَرَةِ وَالظُّلْمِ“ یعنی ایسا نہ ہونے پائے کہ شجرہ کے پاس جانے کی وجہ سے ظالم قرار پاؤ لیکن تفہیم یا ترجمانی کے درست ہونے سے ترجمہ کا درست ہونا لازم نہیں آتا کیوں کہ ان کی حقیقتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں کہ تفہیم و ترجمانی میں متن کے الفاظ سے زیادہ الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے جبکہ ترجمہ میں زیادہ نہ کرنا ضروری ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ کسی آیت کریمہ کے مفہوم سے یا اُس کی ترجمانی سے ترجمہ کے لیے روشنی لی جاسکتی ہے جس کے مطابق پیش نظر آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ ”اور قریب مت جاؤ اس درخت کے کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے“ جیسے کسی بھی معقول انداز میں کرنا ممکن ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی لسانی حیثیت کے

أصول ترجمہ

بھی مطابق ہے بخلاف اس قابل اعتراض ترجمہ کے کہ اس میں لفظ ”ورنہ“ استعمال کر کے متن کی اجتماعیت والی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے کیوں کہ اردو محاورہ میں لفظ ”ورنہ“ کا مابعد اس کے ماقبل کے ساتھ جمع نہیں ہوتا لیکن مترجمین کی ٹیم پر افسوس کہ یہ سب کچھ لکھتے وقت انہوں نے آیت کریمہ کی لسانی حیثیت کا خیال رکھا نہ لغوی مفہوم کا اور مرادِ الہی کا ادراک کیا نہ فنی اور لسانی حیثیت کے اس باریک گوشے کا جس کے نتیجہ میں ان دو خرابیوں کے ساتھ۔

۳ مرادِ الہی سے بھی خلاف ہو رہا ہے کیوں کہ آیت کریمہ کے اس حصے سے مقصد بالترتیب دونوں سے بچنا ہے اس طرح سے کہ شجرہ کے قریب جانا سبب ہے ظلم کے لیے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ شجرہ کے قریب جائے اور ظالم نہ ہو۔ اسی فلسفہ کے مطابق پہلے ”قربان شجرہ“ سے منع کرنے کے مصلحا بعد ظالم ہونے کا ذکر ہوا ہے کہ ان میں انفرادیت اور جدائی نہیں بلکہ وجودی ارتباط ہے کہ شجرہ کے قریب جانا ملزوم اور ظالم ہونا اُسے لازم ہے ایسے میں مترجمین کے مذکورہ انداز ”اور مت قریب جانا تم دونوں اس درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالموں سے“ کو آیت کریمہ کا لغوی مفہوم کہا جاسکتا ہے نہ مرادِ الہی کے مطابق بلکہ غلط محض کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۴ ان تینوں ناہمواریوں کے ساتھ چوتھی بے اعتدالی یہ ہے کہ یہ نحوی اصول سے بھی خلاف ہے جسے سننے کے لیے سیبویہ تیار ہے نہ نور الدین جامی نہ صرف اتنا بلکہ علم نحو کے ابتدائی درسیات میں مشہور مثال ”لا تأکل السمكة وتشرب اللبن“ کی نحوی ترکیب سمجھ کر پڑھنے والے مبتدی بھی اس پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔

اس بے اعتدالی میں مترجمین کی مذکورہ ٹیم منفرد نہیں ہے بلکہ اُن کے ساتھ اشرف علی تھانوی، عبدالماجد دریا آبادی، فتح محمد خان جالندھری، محمد جونا گڑھی، ڈاکٹر طاہر القادری، ثناء اللہ امرتسری اور مفتی مظہر اللہ جیسے بڑے بڑے شامل ہیں جیسا بالترتیب اُن کے کیے ہوئے تراجم کے مندرجہ ذیل الفاظ و انداز سے (اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی اُن ہی میں شمار ہو جاؤ

أصول ترجمہ

گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں، اور اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم گناہ گاروں میں سے ہو جاؤ گے، لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے، لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ حد سے بڑھنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا نہیں تو ظالم ٹھہرو گے، مگر اس درخت کے نزدیک نہ جانا اگر تم اس کے قریب گئے تو حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے) سے صاف ظاہر ہے کہ باہمی اختلاف الفاظ کے باوجود ظالم ہونے کو حرف نفی ”لا“ کے مدخول اور ”قربان شجرہ“ پر معطوف ہونے سے خلاف پر سب متفق ہیں جس وجہ سے یہ سب کے سب متن کی لسانی حیثیت کے خلاف ہونے کے ساتھ اس کی فنی حیثیت سے بھی خلاف اور لغوی مفہوم سے برعکس ہونے کے ساتھ مراد الہی سے بھی خلاف ہیں مترجمین سے اتنی کثیر تعداد میں غلطیوں کا صادر ہونا باعث افسوس ضرور ہے مگر باعث تعجب نہیں ہے۔ افسوس اس لیے کہ جب قرآن شریف کے ترجمہ کا حق نبھانے کی استطاعت نہیں تھی تو پھر ”لہو لگا کر خود کو شہیدوں“ میں شامل ہونے کی کیا ضرورت تھی جس میں نادانستہ طور پر تحریف کی مثالیں ثبت کی جا رہی ہیں، ترجمہ کو قرآنی آیات کے تابع کرنے کے بجائے آیات قرآنی کو اپنی من پسند کا تابع کیا جا رہا ہے، شرائط کی رعایت کے بغیر ترجمہ کے نام سے وہ کچھ لکھا جا رہا ہے جو معنوی قرآن کہلانے کے قابل نہیں ہے اور ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اس کی حقیقت کو بنیاد بنا کر ترجمہ کے الفاظ کو اس کے مطابق کرنے کے بجائے اس سے برعکس کیا جا رہا ہے تو پھر اس پر نہ صرف ایک بار بلکہ سو بار افسوس ہے اس کے باوجود قابل تعجب اس لیے نہیں ہے کہ نہ صرف ترجمۃ القرآن بلکہ ہر فن اور ہر کمال کا یہی حال ہے کہ اس کی حقیقت سے نا آشنا اور شرائط سے ناواقف کو اس کے قریب نہیں جانا چاہئے ورنہ تعمیری بجائے تخریب کرے گا، بنانے کی بجائے بگاڑے گا اور داد و تحسین پانے کے بجائے طعن و تشنیع و ملامت سنے گا۔ مترجمین کی ان تمام غلطیوں کا نکتہ آغاز ایک ہے، سب میں مشترک ہے جو ترجمۃ القرآن کی تعریف ”ہو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ یعنی قرآن شریف کے الفاظ کو

أصول ترجمہ

دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں، سے غفلت ہے ورنہ ترجمۃ القرآن کی اس تعریف کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والے سے غلطی نہیں ہو سکتی بشرطیکہ اُس کی شرائط و اصول کی بھی پابندی کرے۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف کا تجزیہ:-

قرآن شریف کی پیشروان اسلام سے منقول اس تعریف کو علمی زبان میں حدِ تام کہا جا سکتا ہے جس کے مطابق ترجمۃ القرآن مطلق ترجمہ کے عرفی مفہوم کے ماتحت ایک مستقل نوع ہے جس کی تحدید و تعریف جنس قریب اور فصل قریب کے مجموعہ سے کی گئی ہے کیوں کہ قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے الفاظ میں بدلنا اس نوع کی نسبت بمنزلہ جنس قریب ہے جبکہ ترجمہ کے الفاظ کا آیات قرآنی کے الفاظ کے قائم مقام ہونا یعنی اُن کی جملہ حیثیات کے مطابق ہونا بمنزلہ فصل قریب ہے جس کے مطابق ترجمۃ القرآن کی یہ تعریف جامع و مانع ہونے کی اعلیٰ مثال ہے جسے پیش نظر رکھ کر قرآن شریف کا ترجمہ کرنے والا کبھی غلطی نہیں کر سکتا کیوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے میں غلطی کی جو راہیں ہو سکتی ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جن راہوں سے غلطی کا تصور ہو سکتا ہے اس تعریف میں اُن سب کی نشان دہی موجود ہے کہ بنیادی طور پر وہ صرف تین راہیں ہیں:

پہلی راہ:- ترجمہ کے الفاظ قرآنی الفاظ کے قائم مقام ہونے کے قابل نہ ہوں یعنی لغوی معنی سے لے کر مرادی معنی تک اور صرفی یا نحوی یا بلاغی یا کسی بھی فنی حیثیت سے لے کر لسانی پہلو تک اُس کی جو حیثیت ہے یہ بھی اُسی حیثیت کی حامل ہوں ورنہ کسی ایک حیثیت میں اُس سے خلاف ہونے پر بھی ترجمہ غلط اور بے مقصد ہو سکتا ہے

غلطی کی اس راہ کو اگر لامحدود کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ قرآن شریف کے الفاظ اور ان کی ترتیب اور اُن کے تقاضے جیسی حیثیات کی کوئی نہایت نہیں ہے تو پھر ترجمہ کے الفاظ کی اُن کے ساتھ موافقت

أصول ترجمہ

اور اُن کے قائم مقام ہونے کی کیا حد ہو سکتی ہے یہاں پر دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

اول:- آیاتِ قرآنیہ کے الفاظ اور اُن کی ترتیب و تقاضے اگرچہ لاناہایت ہیں تاہم ترجمہ کے الفاظ و ترتیب اور تقاضوں کا 100% اُن کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے کیوں کہ اُن کے دو حصے ہیں:

ایک کا تعلق ایسے رموز و معارف کے ساتھ ہے جو عام انسانوں کی فہم سے بلکہ عام اہل علم کے ادراک سے بھی ماوراء ہیں۔

دوسرے کا تعلق عام فہم مسائل اور سہل الفہم احکام کے ساتھ ہے کہ ہر اہل لسان انہیں سمجھ سکتا ہے جبکہ غیر اہل لسان اُن علوم و فنون کی مدد سے اُن کا ادراک کر سکتے ہیں جو قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ اور موقوف علیہ کہلاتے ہیں مثلاً علم اللغة، علم الاشتقاق، علم تصریف، علم نحو، علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع جیسے جتنے بھی لسانی علوم و فنون ہیں یہ سب کے سب قرآنی مقاصد کو سمجھنے کے لیے بمنزلہ آلہ ہیں جس وجہ سے انہیں علومِ الیہ کہا جاتا ہے اور آیاتِ قرآنیہ کے الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت اور اُن کے باہم ارتباط کی پہچان کے لیے ذرائع ہیں جس وجہ سے انہیں موقوف علیہ بھی کہا جاتا ہے کہ غیر اہل لسان یعنی اہل عجم ان کے بغیر قرآن شریف کے عام فہم مسائل کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں اور قرآن شریف کے ترجمہ کا تعلق اُس کے رموز و اسرار کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اس سے مقصد قرآن شریف کے عام معانی اور عوام کے لیے قابل فہم مفاہیم سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرانا ہوتا ہے جس کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ ترجمہ کے الفاظ، الفاظِ متن کے اُن تقاضوں کے مطابق ہوں جو ان علومِ الیہ کے حوالہ سے ہوتے ہیں اور ایسا کرنا مترجم کے لیے ممکن ہے، تحت القدرة ہے اور دونوں زبانوں کے ماہر کے لیے آسان ہے گویا ترجمۃ القرآن کی مذکورہ تعریف ”هو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ اس میں لفظ ”تقوم مقامها“ سے مقصد الفاظِ قرآنی کے صرف اُن تقاضوں کے مطابق ہونا ہے جو ان علومِ الیہ کے حوالہ سے ہیں اور یہ قرآن شریف کے معارف

أصول ترجمہ

اور اُس کے رُموز و اسرار کے مقابلہ میں اگرچہ محدود ہیں تاہم بجائے خود کثیر ہیں کہ کسی فن اور کسی بھی لسانی حیثیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ غلط ہوتا ہے جبکہ الفاظِ قرآنی کی لسانی حیثیات اپنی محدودیت میں بھی لا محدود و بے شمار ہیں۔ اس طریقے سے ترجمۃ القرآن میں غلطی کی اس راہ کی جملہ شاخوں کو سمجھنے کے لیے علومِ آلیہ اور قرآنِ فہمی کے لیے موقوف علیہ فنون کی جملہ شاخوں کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ اسی فلسفہ کے تحت قرآن شریف کے ترجمہ کی درستی کے لیے جو فطری شرائط ہیں اُن کی فہرست میں آیاتِ قرآنیہ کی معادل لسانی اور اُن کی جملہ فنی حیثیات کا ادراک سب سے مقدم ہے جس کے بعد ترجمہ والی زبان کی جملہ لسانی حیثیات کے ادراک کا مرتبہ ہے۔ جس کے مطابق دو زبانوں میں سے کسی ایک کی لسانی حیثیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی بے مقصد اور غلط قرار پاتا ہے۔ ایسے میں ترجمۃ القرآن میں غلطی کی اس راہ کی وسعت اور اس کے جزئیات کی کثرت میں کس کو شک ہو سکتا ہے بخلاف دوسری اور تیسری غلط راہ کے کیوں کہ اُن کی واقعی صورتیں ایک ایک سے زیادہ نہیں ہیں، جو درج ذیل ہیں:

دوسری راہ:- کسی لفظ کو ترجمہ کیے بغیر چھوڑ دیا جائے کہ اس صورت میں ترجمہ کی حقیقت ہی متاثر ہوگی کیوں کہ جب ترجمہ میں اُس سے بدل کوئی لفظ اور کوئی جملہ ہی نہیں ہے تو پھر ”اببدال لفظہ بلفظہ“ کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔

تیسری راہ:- ترجمہ میں کوئی ایسا لفظ یا کوئی ایسا جملہ استعمال کیا جائے جس کے بدل کے طور پر متن میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔

ترجمۃ القرآن کی اس تعریف کہ ”هو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ اس کی جامعیت و مانعیت کے حوالہ سے **الحاصل والمحصل** مندرجہ ذیل امور ہیں:

❶ ترجمہ کے ایک ایک لفظ کا متنِ قرآن کے ایک ایک لفظ کا ایسا بدل ہونا ضروری ہے کہ اُس کے قائم مقام ہو سکے یعنی اُس سے جو معنی و مراد ہے اُس کے مطابق ہونے سے لے کر اُس کی

تمام قابل فہم لسانی حیثیات کے مطابق ہو۔

۲ ترجمہ کے الفاظ کا متن قرآن کے الفاظ کے مطابق ہونے میں وہ علوم و فنون معتبر ہیں جو قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ اور موقوف علیہ کا درجہ رکھتے ہیں مثلاً علم اللغة، علم الاشتقاق، علم تصریف، علم نحو، علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع جیسے تمام علوم و فنون کیوں کہ قرآن شریف ان سب پر محیط ہے۔

۳ ان علوم و فنون کے حوالہ سے ترجمہ کے الفاظ کا متن قرآن کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کی تمیز صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو ان تمام فنون میں مکمل دسترس رکھتے ہوں ورنہ کسی ایک میں ناتواں و بے استعداد شخص کے لیے بھی قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کی جرات کرنا بے مصرف، خیانت اور ناجائز ہوگا چہ جائیکہ ایک سے زیادہ میں ناتواں کے لیے جائز ہو سکے کیوں کہ کل مکاتب فکر اہل اسلام کے اسلاف اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ ان تمام علوم و فنون میں مہارت حاصل کیے بغیر قرآن شریف کی تفسیر کرنا حرام ہے، حدیث نبوی ”من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبو مقعده من النار“ (ابوداؤد) کا مظہر اور گناہ ہے تر پھر ترجمہ القرآن کیوں جائز ہو جبکہ تفسیر کی نسبت ترجمہ کا معاملہ زیادہ سخت ہے، کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے، نیز ترجمہ القرآن کی حقیقت اگرچہ تفسیر سے جدا مستقل چیز ہے تاہم لغوی مفہوم کے اعتبار سے تفسیر کی ایک جھلک ترجمہ میں بھی پائی جاتی ہے کیوں کہ لغت کے مطابق تفسیر فسر سے (ف، س، ر) کی اسی ترتیب سے اشتقاق پا کر وجود میں آئی ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو ظاہر کرنا جبکہ ترجمہ والی زبان میں بھی قرآن شریف کے معانی اُس زبان کے جاننے والوں پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کا جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو اُس زبان کے عرف

میں اُسے معنوی قرآن سمجھا جاتا ہے گویا تفسیر و ترجمہ ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا فن

أصول ترجمہ

ہوتے ہوئے بھی باہمی مربوط ہیں کہ ترجمۃ القرآن میں تفسیر کا لغوی مفہوم پایا جاتا ہے جبکہ تفسیر اپنی صحت میں ترجمہ کی درستی پر موقوف ہے ورنہ غلط ترجمہ پر پناہ ہونے والی تفسیر کبھی درست نہیں ہو سکتی، نیز ترجمہ اگرچہ تفسیر سے جدا مستقل چیز ہے مفسرین کے اقوال و آراء پر موقوف ہونے کے بجائے صرف اپنی شرائط پر استوار ہوتا ہے تاہم تفسیر سے ترجمہ کو روشنی ضرور ملتی ہے اور نہ ہی مترجم کو سہولت کاری ملنے سے انکار نہیں کیا جاسکتا خاص کر ان آیات قرآنیہ کا ترجمہ کرنے میں جو کسی بھی فن کے حوالہ سے معرکہ آراء ہیں ایسے تمام مقامات پر مترجم کو مفسرین سے روشنی لینی ہوتی ہے۔ تفسیر و ترجمہ کے باہمی ارتباط کے یہ معارف ناقابل انکار حقائق ہونے کی طرح ترجمۃ القرآن کا تفسیر سے مشکل ہونا بھی واضح حقیقت ہے کیوں کہ تفسیر کرنے یا لکھنے میں جواز کے دائرہ میں رہتے ہوئے مفسر کو بہت کچھ کہنا اور لکھنا جائز ہوتا ہے جو مترجم کے لیے جائز نہیں ہے، تفسیر کے الفاظ کا قرآن شریف کے الفاظ سے زیادہ ہونا ضروری ہے ورنہ تفسیر کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا جبکہ ترجمہ میں متن قرآن کے الفاظ سے زیادہ الفاظ استعمال نہ کرنا ضروری ہے بلکہ اس کے لیے متن کے الفاظ کے مطابق نئے نئے الفاظ استعمال کرنا ہوتا ہے جیسا ترجمۃ القرآن کی تعریف ”هو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الاخر التي تقوم مقامها“ سے معلوم ہو رہا ہے مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کا عارضہ ہو جو اصول فطرت ”الضرورات تبیح المحظورات“ کی طرف لے جاتا ہے۔

۲ ترجمہ کے الفاظ کا متن قرآن کے الفاظ کے قائم مقام ہونا اور ان کی متعارف حیثیات کا حامل ہونا جو ضروری ہے اس میں ایک قابل فہم اور ضروری بات یہ بھی ہے کہ الفاظ قرآنی کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:- جو مذکور فی الکلام ہوتے ہیں جیسا عام حالات میں ہوتا ہے کہ لکھے، دیکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

أصول ترجمہ

دوسری قسم:- جو مذکور فی الکلام نہیں ہوتے، لکھے اور پڑھے بھی نہیں جاتے لیکن کلام کی نوعیت کے مقتضا ہوتے ہیں جنہیں مقدر فی الکلام بھی کہا جاسکتا ہے اور مذکور حکمی بھی۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ ”وَكَلَامُ مِنْهَا رَعْدًا حَيْثُ شِئْتُمْ وَلَا تَقْرَبْ هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ“ (۱) جس میں جانب معطوف یعنی ”لَا تَقْرَبْ هَذِهِ الشَّجَرَةَ“ بمنزله استثناء ہے ماقبل کے عموم سے یعنی ”وَكَلَامُ مِنْهَا رَعْدًا حَيْثُ شِئْتُمْ“ سے کیوں کہ اگر امتناعی حکم کی یہ صورت نہ ہوتی تو وہ اپنے کمال عموم و شمول کی بنا پر اس کے نقیض یعنی ”اَكْلُ شَجَرِهِ“ کو بھی شامل ہوتا تو پھر اسے بمنزله استثناء کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ اسی فلسفہ کے تحت امام جلال الدین السیوطی نے اس قسم اشتباہ و نظائر سے متعلق مستقل عنوان قائم کیا ہے جسے الموصول لفظاً والمفصول معنأ کہا جاتا ہے۔ (۲)

اسے وصل اور فصل جیسے متضاد اوصاف سے یاد کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ حرف عطف ”و“ ماقبل کے ساتھ وصل چاہتا ہے جبکہ استثنائی صورت فصل چاہتی ہے۔ جس منادی سے حرف نداء محذوف ہو جیسا ”يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا“ (۳) جیسے مقامات میں ہے وہ بھی اور مجاز بالحذف جیسا ”وَسُئِلَ الْقَرْيَةَ“ (۴) میں ہے یہ بھی اسی قبیل سے ہیں جس کے مطابق ان کے تراجم میں بالترتیب لفظ ”مگر، اے، اہل“ جیسے الفاظ کا اضافہ حقیقت میں الفاظ متن سے اضافہ نہیں ہے، کہ ترجمۃ القرآن کی حد سے نکلنے کا تصور ہو سکے بلکہ اُن میں حکماً موجود الفاظ کے عوض کہلاتے ہیں۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:- ترجمۃ القرآن کے سلسلہ میں ہماری اس توضیح سے اُن حضرات کو مغالطہ لگ سکتا ہے جو الفاظ مقدرہ اور الفاظ منویہ کے مابین تمیز کرنے سے قاصر ہیں ہمارا تجربہ

(۱) البقرة: 35۔

(۲) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 1، ص: 92۔

(۳) يوسف: 29۔

(۴) يوسف: 82۔

أصول ترجمہ

ہے کہ درسِ نظامی کی گودامی تعلیم سے فارغ تحصیل علماء کرام کی غالب اکثریت مقدر فی الکلام اور منوی فی الکلام کے مابین تفریق نہیں کرتے ہیں جو علم البیان کی رو سے غلط ہے کیوں کہ امامانِ بلاغت اور سخن شناس دنیا کے نزدیک اُن میں نفی و اثبات کا فرق ہے جسے تقابل ایجاب و سلب بھی کہا جاسکتا ہے بلکہ متناقضین بھی اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ کلام میں جو چیز مقدر ہوتی ہے چاہے اُس کی تقدیر کا پس منظر و فلسفہ جو بھی ہو۔ بہر حال وہ ملفوظ کے حکم میں ہوتی ہے اور ترجمہ میں اُس کے عوض لفظ استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ منوی فی الکلام مذکور کے حکم میں نہیں ہوتا ورنہ اُسے منوی کون کہے۔ اس لیے ترجمہ میں اُس کے عوض لفظ استعمال کرنے کا تصور ہی نہیں رہتا کیوں کہ ترجمہ کا ہر لفظ عام حالات میں متن کے کسی لفظ سے بدل ہی ہوتا ہے جیسا اُس کی تعریف سے ظاہر ہو رہا ہے۔ جس کی واقعی صورتیں صرف دو ہیں، ایک ملفوظ اور دوسری مقدر، جبکہ منوی کی دنیا ہی جدا ہے، حقیقتاً مذکور ہے نہ حکماً بلکہ متکلم کے ذہن یا اُس کے دل کے سوا اس کے وجود کے لیے ظرف اور محل ہی نہیں ہے تو پھر ترجمہ میں اُس کے عوض لفظ لانے کا کیا جواز باقی رہتا ہے۔

علم البیان اور بلاغت کے اس اصول کے مطابق تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم جس میں مشبہ نہ حقیقتاً مذکور فی الکلام ہوتا ہے نہ تقدیراً بلکہ صرف متکلم کے دل و دماغ میں ہوتا ہے جیسا آیت کریمہ ”صُمُّ بُكْمٌ عُمِّي فُهِمٌ لَا يُرْجَعُونَ“ (۱) میں ہے یہ بھی منوی فی الکلام کے قبیل سے ہے ترجمہ کے حوالہ سے ان کی بالترتیب مثالیں اس طرح ہوں گی ”يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا“ (۲) اے یوسف! سے چھوڑ۔ جس میں لفظ ”اے“ مقدر فی الکلام ”یا“ سے عوض بن رہا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ ”وَسُئِلَ الْقُرَيْةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا“ (۳) کے ترجمہ ”اور اُس بستی والوں سے پوچھ لے جس میں ہم

(۱) البقرة: 18۔

(۲) يوسف: 29۔

(۳) يوسف: 82۔

أصول ترجمہ

تھے۔“ میں لفظ ”والوں“ متن کے الفاظ سے زیادہ نہیں بلکہ اُس میں مقدر لفظ ”اہل“ سے عوض بن رہا ہے اس کے برعکس اگر آیت کریمہ ”صُمُّ بُكْمٌ عُمَىٰ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ“ (۱) کے ترجمہ کو ان پر قیاس کر کے ”وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں“ کہا جائے غلط ہوگا، اُس کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ متن سے زیادہ اور بے مصرف ہوگا کیوں کہ یہاں پر لفظ ”وہ“ سے متعلق یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ یہ متن کے کسی لفظ سے عوض ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے معوض عنہ کہلانے کے قابل کوئی لفظ موجود نہیں حقیقتاً نہ حکماً کیوں کہ جمہور مفسرین کے مطابق آیت کریمہ کا یہ حصہ تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم کے قبیل سے ہے جس میں مشبہ جو یہاں پر کفار و مشرکین کے حواس ہیں نہ حقیقتاً مذکور ہیں نہ تقدیراً بلکہ منوی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ جس کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا ”بہرے، گونگے، اندھے ہیں“ اس کی ترتیب اس طرح ہے کہ ”بہرے، گونگے، اندھے“ بالترتیب آیت کریمہ میں حقیقتاً مذکور تینوں الفاظ کے ترجمے ہیں جبکہ لفظ ”ہیں“ حکم کا اظہار ہونے کے ساتھ مبتداء مقدر سے بھی عوض ہے جو کفار و مشرکین کی ذات سے عبارت ہے جس کی تعبیر مفسرین نے ”هُمْ صُمُّ بُكْمٌ عُمَىٰ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ“ جیسے انداز سے کی ہے کیوں کہ مفسر ہونے کی حیثیت سے کچھ توضیح و تفہیم کرنی ضروری ہوتی ہے ورنہ تفسیر کا مطلب ہی کیا ہے لیکن تفسیر کا درست ہونا ترجمہ کے درست ہونے کو مستلزم نہیں ہے کیوں کہ ان کی حقیقتیں اور لوازمات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تعریف و غرض اور موضوع جدا ہیں، شرعی احکام اور عرفی پہچان مختلف ہیں۔

حقائق کی اس روشنی میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ جن مترجمین نے آیت کریمہ ”صُمُّ بُكْمٌ عُمَىٰ“ کے ترجمہ میں ”وہ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں“ جسے انداز اختیار کیا ہے اُن سب نے صرف تفسیروں پر انحصار کیا ہے، تفسیر کو ترجمہ کے لیے معیار بنایا ہے اور ترجمہ کو اُس کی شرائط پر استوار کرنے کے بجائے تفسیر پر بنا کیا ہے جسے استحسان کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا کیوں کہ ترجمہ تفسیر سے مختلف حقیقت ہے اور مستقل فن ہے جو مستقل شرائط و لوازمات پر مبنی ہے اُس کی

أصول ترجمہ

بہتری کے لیے تفسیروں سے روشنی لینا اگرچہ مناسب اور مُمد ہے لیکن شرائط اور متن کی لسانی حیثیات سے صرف نظر کر کے محض تفسیر پر ہنا کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے مترجمین کو لگنے والے اس مغالطہ سے ترجمۃ القرآن کی اہمیت پر مزید روشنی پڑ رہی ہے کہ یہ عام ترجمہ کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کا حق ادا کرنے کے لیے ہمہ جہت نظر و فکر کرنی ہوتی ہے، متنِ قرآن کی جملہ لسانی حیثیات کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے اور قرآن فہمی کے لیے تمام موقوف علیہ علوم و فنون سے روشنی لینی ہوتی ہے جن کی ایک جھلک علم البیان کے حوالہ سے مقدّر فی الکلام اور منویٰ فی الکلام کے مابین تفریق بھی ہے جس سے غفلت کی بنا پر مترجمین نے قرآن شریف کے منویٰ فی الکلام مقامات کا ترجمہ مقدّر فی الکلام کے انداز پر کرنے کی غلطی کی ہے شاید علم بلاغت کی ان باریکیوں سے غافل مترجمین و مفسرین کو تنبیہ کرتے ہوئے امامانِ بلاغت نے فرمایا ہے:

”ان الواقف علی تمام مراد الحکیم تعالیٰ وتقّدر من کلامه مفتقر الی ہذین العلمین کل الافتقار فالویل کل الویل لمن تعاطی التفسیر وهو فیہما راجل“ (۱)
یعنی حکیم سبحانہ و تعالیٰ کے کلام سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے درپے شخص علم المعانی اور علم البیان کی طرف ہر طرح محتاج ہے پھر پوری طرح خرابی ہے اُس شخص کے لیے جو ان کے بغیر کتاب اللہ کی تفسیر کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

امام الراغب الاصفہانی نے فرمایا: ”ولاحظ فی معرفتہ لمن لم یتوفرنصیہ من البلاغة“ (۲)

اس کی معرفت میں اُس کا حصہ نہیں ہے جسے بلاغت سے پورا حصہ نہیں ملا۔

جاء اللہ الزمخشری نے قرآن فہمی کے لیے علم بلاغت کی اہمیت کے سلسلہ میں کافی تفصیل لکھنے کے

(۱) مفتاح العلوم، حصہ علم البلاغت، ص: 70، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت۔

(۲) مقدمة التفسیر امام الراغب الاصفہانی المطبوع مع مفردات القرآن، ص: 585،

مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی۔

أصول ترجمہ

بعد کہا ہے: ”ولا يغوص على شيء من تلك الحقائق الا رجل قد برع في علمين

مختصين بالقرآن وهما علم المعاني وعلم البيان“ (۱)

یعنی قرآنی معارف کے سمندر میں غوطہ زنی کر کے ان حقائق کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا مگر وہی شخص جو قرآن شریف کے ساتھ مختص دو علموں میں سربرآوردہ ہو اور وہ دو علم المعانی اور علم البيان ہیں۔

ایک متوقع اشتباہ کا ازالہ:- قرآن فہمی کے سلسلہ میں امامانِ بلاغت کی طرف

سے علم المعانی اور علم البيان کو سب کچھ کہنے اور اس کے بغیر قرآن شریف کی سمجھ ناممکن قرار دینے سے ممکن ہے کسی کو یہ مغالطہ ہو جائے کہ اس کے بعد کسی دوسرے فن کی ضرورت نہیں رہتی خاص کر مفتاح میں یوسف السکاکی کی مذکورہ عبارت سے اس اشتباہ کو مزید تقویت ملتی ہے کہ انہوں نے دوسرے لسانی علوم (صرف، نحو، متن لغت اور علم اشتقاق وغیرہ) سے بھی بحث کی ہے لیکن کسی ایک سے متعلق بھی یہ نہیں لکھا کہ اس کے بغیر قرآن شریف کی فہم ناممکن ہے جیسا بلاغت سے متعلق لکھا ہے جبکہ حقیقت میں ان تمام علوم و فنون کی ضرورت ہے کہ ان کے بغیر قرآن شریف کی فہم ممکن ہے نہ ترجمہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امامانِ بلاغت کی مذکورہ عبارات سے مقصد دوسرے لسانی علوم و فنون سے استغناء بتانا ہرگز نہیں بلکہ اس سے واحد مقصد قرآن فہمی ان دونوں کی پوری فہم پر موقوف بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ان دونوں سے ناواقف اور بے کمال شخص قرآن شریف کی فہم میں کمال پیدا نہیں کر سکتا جو عین حقیقت ہے اور واقعہ کی عکاسی ہے کیوں کہ یہ دونوں علم بلاغت کہلاتے ہیں اور بلاغت کی حقیقت ”مطابقة الكلام لمقتضى الحال مع فصاحته“ سے عبارت ہے کہ کلام کے تمام ترکیبی اجزاء فصیح ہونے کے ساتھ وہ مقتضائے حال کے بھی مطابق ہو اور ظاہر ہے کہ فصاحت کی پہچان صرف، نحو، اشتقاق اور متن لغت جیسے لسانی علوم کے رموز کو پہچانے بغیر ممکن نہیں

(۱) مقدمة الكشاف المطبوعه مع ج: 1، ص: 16، مطبوعه دارالمعرفه بيروت۔

أصول ترجمہ

ہے یہ اتنا آسان مسئلہ ہے کہ علم بلاغت کی ابتدائی اور درسی کتابیں پڑھنے والوں سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ حقیقت کی اس روشنی میں امامانِ بلاغت کی مذکورہ عبارات کی جامعیت کو دادِ تحسین دیئے بغیر کون رہ سکتا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے علم المعانی اور علم البیان کی اہمیت بتانے کے ضمن میں ان تمام علوم و فنون کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو فہم قرآن کے لیے بمنزلہ آلہ اور موقوف علیہ ہیں۔ (فَجَزَاهُمْ اللَّهُ اللَّهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ)

ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ: قرآن شریف کا اندازِ بیان اگرچہ برزخ بین الخطاب والکتاب ہے اور علی الاطلاق نظم ہے نہ نثر بلکہ ہر ایک کا رنگ لیا ہوا برزخ بین القسمین ہے اور ہر لحاظ سے انسانی کلام کی جملہ اصناف سے ماوراء و بے مثل ہونے کے باوجود تینوں بنیادی قسموں کی جھلک پر مشتمل ہے یعنی حقیقت، مجاز و کنایہ جیسا انسانی کلام ان تینوں سے خالی نہیں ہوتا ویسا قرآن کے خطاب و تفہیم کو مخاطبین پر آسان کرنے کیلئے ان سے ماوراء اور کسی غیر مانوس انداز پر نہیں رکھا ہے۔

حقیقت: ہر وہ لفظ یا کلام ہے جسے اُس کے اپنے ماؤضع لہ میں استعمال کیا جائے۔

مجاز: وہ لفظ یا وہ کلام ہے جسے اُس کے ماؤضع لہ کے غیر کسی دوسرے معنی و مفہوم میں استعمال کیا جائے اور ماؤضع لہ مراد نہ ہونے پر قرینہ موجود ہو۔

کنایہ: ہر وہ لفظ اور وہ کلام ہے جسے اُس کے ماؤضع لہ میں استعمال نہ کیا جائے اور ماؤضع لہ مراد نہ ہونے پر کسی قسم کا قرینہ بھی موجود نہ ہو۔

قرآن شریف ان سب پر مشتمل ہے اور سب کی فہم بھی آسان ہے مگر یہ کہ مجاز کی خاص قسم ”تشبیہ“ اپنی کثرت تنوع اور تلون کی لطافتوں کی بنا پر قابلِ توجہ ہے خاص کر استعارہ اور تشبیہ بلیغ کی وہ قسم جس میں مشبہ نہ حقیقتاً مذکور فی الکلام ہوتا ہے نہ حکماً یعنی محذوف بھی نہیں ہوتا بلکہ صرف اور صرف متکلم کی نیت میں ہوتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر استعارہ اور تشبیہ بلیغ کے مابین تفریق کرنا سامع و قاری دونوں کے لیے امتحان سے کم نہیں ہوتا جیسا انسانی کلام میں ان کے مابین تمیز کرنا

أصول ترجمہ

مشکل ہے ویسا قرآن شریف میں بھی ہوتا ہے کیوں کہ قرآن کریم کے بہت سے مقامات بھی ایسے ہی معرکہ الآراء ہیں۔ جن مفسرین نے بلاغت کے حوالہ سے قرآن شریف کی تفسیر کی ہے انہوں نے بھی سب سے زیادہ اسی کو موضوع بحث بنایا ہے خاص کر جارا اللہ الزمخشری نے لیکن تفسیر کشاف کے بعض مقامات پر اس حوالہ سے کچھ ابہام پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر اس فن میں کم استعداد رکھنے والے حضرات کو مغالطہ بھی لگا ہے ان میں سے ایک مقام سورۃ البقرہ، آیت 18 ”صُمُّ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ“ بھی ہے جسے عندا محققین تشبیہ بلیغ کے قبیل سے شمارنے کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ اس میں مشبہ مذکور ہے جو منافقین سے عبارت ہے، کشاف کی عبارت یوں ہے؛

”فان قلت هل يُسمَّى ما في الآية استعارة قلت مختلف فيه المحققون على تسميته تشبيهاً بليغاً لاستعارة لان المستعار له مذکور وهم المنافقون و الاستعارة انما تطلق حيث يطوى ذكر المستعار له ويجعل الكلام خلوا عنه صالحاً لان يراد به المنقول عنه والمنقول اليه لولا دلالة اوفحوى الكلام“ (۱)

اور ظاہر ہے کہ مستعار له یعنی مشبہ یہاں پر مذکور ہونے کی ظاہری صورت یہی ہے کہ منافقین کی طرف راجع ہونے والی ضمیر ”ہم“ محذوف ہے اور محذوف مذکور کے حکم میں ہوتا ہے جس کے مطابق تقدیر عبارت ”ہم صُمُّ بُكْمٌ عُمْیٌ“ ہوگی جو تشبیہ بلیغ کی تین قسموں میں سے کس کی فہرست میں شامل ہے واضح ہونے کے بجائے مزید ابہام و اشتباہ میں پڑ رہی ہے جبکہ تشبیہ بلیغ کی اعلیٰ قسم وہ ہے جس میں مشبہ حقیقتاً مذکور ہو نہ حکماً یعنی عملاً ملفوظ بھی نہ ہو اور محذوف بھی نہ بلکہ صرف اور صرف نیا ہو اور عندا تحقیق آیت کریمہ بھی اسی پر محمول ہے جسے سمجھنے کے لیے ذخیرہ تفسیر پر انحصار کرنے کا نتیجہ بے سود ہوگا کہ اس سے اشتباہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کیوں کہ مفسر کو بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش ہوتی ہے جو مترجم کے لیے ممکن نہیں۔ نیز مترجم اور مفسر کے پیش نظر مقاصد اور غرض و غایت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ اس دلدل سے نکل

(۱) تفسیر کشاف، ج: 1، ص: 204، تحت الآية المذكورة۔

أصول ترجمہ

کر حدیث نبوی ”دع ما یریک الی ما لا یریک“ کی راہ اختیار کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اصل فن اور بلاغت کے مسلمہ اماموں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جنہوں نے تشبیہ کی اس معرکتہ الآراء قسم میں اطمینان بخش فرق بتایا ہے کہ جس مقام پر مشبہ بہ جسے مستعار منہ اور منقول عنہ جیسے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے اپنے حقیقی معنی پر محمول نہ ہو بلکہ مشبہ کے معنی پر محمول ہو وہ استعارہ ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس ہونے کی صورت میں تشبیہ بلیغ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ”رئیت اسدا“ جس میں اداة تشبیہ مذکور ہے نہ وجہ تشبیہ اسی طرح مشبہ بھی مذکور نہیں ہے نہ حقیقتاً نہ حکماً کہ محذوف ہونے سے مذکور تقدیری بھی کہا جاسکتا ہے یہاں پر لفظ ”اسد“ اگر اپنے حقیقی معنی پر کہ حیوان مفترس ہے نہیں بلکہ معنی مجازی یعنی مشبہ کے معنی پر محمول ہے کہ اس کی جگہ اُسے استعمال کر کے ”رئیت رجلا شجاعا“ کہنا درست ہو تو اس صورت میں تشبیہ بلیغ نہیں بلکہ استعارہ متعین ہوگا اور اگر لفظ ”اسد“ اپنے حقیقی معنی پر محمول ہو کہ اُس کی جگہ ”رئیت رجلا شجاعا“ کہنا درست نہ ہو تشبیہ بلیغ متعین ہوگا جو تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم کہلاتی ہے جس میں مشبہ یعنی ”رجل شجاع“ حقیقتاً مذکور ہے نہ حکماً بلکہ متکلم کی نیت کے سوا اور کہیں نہیں ہے جیسے متکلم نے اپنے ذہن میں عین ”اسد“ ہونے کا تصور کیا ہے۔

استعارہ اور تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم کے مابین تفریق کے اس نکتے کو سمجھنے کے لیے مطول

کی مندرجہ ذیل عبارت ”من باب التشبيه المطوی فیہ ذکر المشبه کما فی الاستعارة و هو مشکل لان المشبه فیہ لیس بمذکور ولا مقدور و یمكن التفصی عن هذا الاشکال بان الاستعارة تجب ان تكون مستعملة فی غیر ما وضع له و علامته ان یصح وقوع اسم المشبه موقعه ولا یفوت الا المبالغة فی التشبيه فیصح فی نحو رئیت اسدا ان یقال رئیت رجلا شجاعا و هذا لیس كذلك علی ما یظهر بالتأمل و کذا لا یصح ان یراد بالبحرین الموصوفین المؤمن و الکافر لان قوله تعالیٰ ”ومن کل ناکلون لحما طریا و تستخرجون حلیة تلبسونها“ ینبئ عن انه تعالیٰ قصد التشبيه

أصول ترجمہ

لا الاستعارة و اراد تفضيل البحر الاجاج على الكافر بانه قد يشارك العذب في المنافع والكافر خلوع عن المنفعة فهو في طريقة قوله تعالى ”فهى كالحجارة او اشد قسوة وان من الحجارة لما يتفجر منه الانهار“ ولخفاء ذلك ذهب كثير من الناس الى ان الآيتين من قبيل الاستعارة وان صاحب الكشف اوردهما مثالين للاستعارة و لا يخفى ضعفه على من تامل لفظ الكشف “كوديكهنى كى ضرورت هے جس ميں دودھ كا دودھ پانى كا پانى كر ديا گيا هے اس كى تائيد و تصديق اور تحسين كرتے ہوئے ميرسيد السند كى مندرجہ ذيل توضيح بهى اپنى مثال آپ هے:

”هذا الكلام جيد فان المدار في الفرق بين الاستعارة والتشبيه اذا تردد بينهما ان اسم المشبه به ان كان مستعملا في معنى المشبه كان استعارة وان كان مستعملا في معناه الحقيقي كان تشبيها و علامة كونه مستعملا في معنى المشبه اى ومن لوازم استعماله فيه ان يصح وقوع اسم المشبه موقعه فاذا انتفى هذه العلامت كما فى الآيتين بشهادة الفطرة السليمة بعد التامل فيهما انتفى كونه استعارة و كان تشبيها سواء كان المشبه مذكورا بالفعل او مقدرا فى نظم الكلام اولا يكون مذكورا ولا مقدرا نعم يجب كون المشبه مرادافى معنى الكلام وان لم يمكن تقديره فى نظمه على وجه لا يختل نظامه“

جبکہ مطول کے شارح چلپی نے بھی اس کی تصدیق کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے؛

”ان معيار الفرق بين الاستعارة والتشبيه هو انه ان صح حذف المشبه به و

اقامة المشبه مقامه بحيث لا يفوت الا المبالغة فاستعارة والافتشبيه“

اور عبد الحکیم السیالکوٹی علی المطول نے ان سب کی تصدیق و توثیق کرنے کے ساتھ اس فن کے ساتھ شغف رکھنے والوں کو جو روشنی دی ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

”ليس المراد بالمقدر خلاف المذكر اى المحذوف فان المحذوف عندهم

أصول ترجمہ

كالمذكور فهو داخل في قوله المذكور ابل المراد به ان لا يكون مراداً منوياً
ايضاً فان الاستعارة المتفق عليها ما يكون المشبه فيها معرضاً عنه بالكلية بان لا
يكون المذكور اولاً محذوفاً لاتمام الكلام ولا منوياً مراداً بان يكون اسم المشبه
به مستعملاً في معنى المشبه بحيث لو اقيم لفظ المشبه مقامه لاستقام الكلام
الا انه يفوت المبالغة المستفادها من الاستعارة وفي التشبيه يكون مستعملاً
في معناه الحقيقي فلا يستقيم اقامت اسم المشبه مقامه وبذلك يعرف كون
اسم المشبه مراداً في التشبيه دون الاستعارة“

اہل فن کی طرف سے کی گئی تحقیق کی اس روشنی میں سورۃ البقرہ، آیت 18 صُمْ بُكُمْ عُمًی“ کا
تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم ہونے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے جس میں منافقین کے تینوں مشاعر
یعنی کان، آنکھ اور عقل مشبہ ہونے کی حیثیت سے حقیقتاً مذکور ہیں نہ حکماً بلکہ منوی کے سوا اور کچھ نہیں
ہیں تو اس کے ترجمہ میں ”وہ بہرے، گونگے ہیں اندھے ہیں“ کہنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں رہتا کیوں
کہ ترجمہ کا ہر لفظ متن کے کسی لفظ کا عوض ہوتا ہے اور معوض عنہ مذکور حقیقی یا مذکور حکمی سے خالی نہیں
ہوتا جبکہ ان دونوں کے مقابلہ میں آنے والا مذکور منوی معوض عنہ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔
ایسے میں آیت کریمہ کے معیاری ترجمہ میں ”بہرے، گونگے اندھے ہیں“ جیسے انداز کے سوا کچھ
اور ممکن نہیں ہے لیکن مترجمین کی غالب اکثریت پر افسوس کہ انہوں نے آیت کریمہ کو فن بلاغت
کے مذکورہ انداز میں دیکھنے کے بجائے تفسیروں سے دھوکہ کھا گئے۔ (فیاللعجب لهذا العجب)
ترجمۃ القرآن کی مذکورہ تعریف کا ایک مقتضاء یہ بھی ہے کہ ترجمہ کے الفاظ کو متن قرآن کے مطابق
کرنے کے لیے آیات قرآنیہ کے مفہوم اول اور مفہوم ثانی کے مابین فرق کو
سمجھا جائے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ قرآن شریف کتاب مبین ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
”بَلِّغْ آيَاتِ الْكِتَابِ وَكِتُبْ مُبِينٌ“ (۱) یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔

(۱) النمل: 1۔

اُصول ترجمہ

نیز فرمایا: ”تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ“ (۱)

یہ آیتیں ہیں قرآن اور روشن کتاب کی۔

نیز فرمایا: ”تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ“ (۲)

یہ آیتیں ہیں کتاب اور روشن قرآن کی۔

نیز فرمایا: ”وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ“ (۳)

قرآن شریف کی صفت ہونے کی حیثیت سے لفظ ”مُبِينٌ“ متعدی بھی ہو سکتا ہے اور لازم

بھی اول صورت میں اس کے معنی ہوں گے کہ وہ اپنے مضامین و احکام اور مرادِ الہی کو اپنے سامعین و قارئین پر واضح کرنے والی کتاب و قرآن ہے۔

دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے مضامین و احکام اور مرادِ الہی کے حوالہ سے واضح ہے، ظاہر اور سہل الفہم ہے اور سننے اور پڑھنے والے کسی خفا و تکلیف کے بغیر، اُسے سمجھ سکتے ہیں۔

جبکہ اہل علم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن شریف کی بعض آیات مثلاً کنایات و تشابہات کا معاملہ اس سے مختلف ہے ورنہ انہیں کنایہ و تشابہ اور مجمل و خفی جیسی صفات سے یاد کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔ نیز ظاہری احکام اور واضح مضامین کے علاوہ آیاتِ قرآنیہ کچھ ایسے رموز و معارف پر بھی مشتمل ہیں کہ عام قاری و سامع کی فہم سے ماوراء ہیں جن کی فہم و ادراک سے خواص اہل اللہ ہی مستفیض ہوتے ہیں۔

اس کے جواب میں اختلافِ جہات کا قول کیا جاتا ہے جو قابلِ فہم بھی ہے اور معقول بھی کہ مبین والی صفت اُس کی ذات کے اعتبار سے ہے کہ کسی تخصیص کے بغیر اُس کی ایک ایک آیت اُصول

(۱) یوسف: 1۔

(۲) الحجر: 1۔

(۳) یونس: 61۔

أصول ترجمہ

فطرت کے مطابق مبین ہے جس میں کسی قسم کا تشابہ ہے نہ خفا جبکہ عدم مبین ہونا چاہیے جس انداز سے بھی ہو مخاطبین و سامعین کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور وقت کے حوالہ سے بھی یعنی تمام سامعین و مخاطبین کی فہم ایک جیسی نہیں ہوتی مثلاً اہل لسان جتنا غیر اہل لسان نہیں سمجھ سکتے ہیں پھر اہل لسان میں بھی قرآن شریف کے نازل ہونے کے زمانہ میں موجود اہل لسان جتنا بعد والے اہل لسان نہیں سمجھ سکتے مَرور زمانہ کے ساتھ دوسری زبانوں میں فرق آنے کی طرح قرآن شریف کی زبان یعنی عربی میں بھی تبدیلی آئی ہے اگرچہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کم سہی پھر بھی تبدیلی سے انکار نہیں کیا جاسکتا جبکہ جمہور اہل عجم کی قرآن فہمی عرب کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح مجتہدین و عرفاء اپنی بصیرت ایمانی و حدس و جدانی کی بدولت جتنا ادراک کر سکتے ہیں عام علماء کو وہ نصیب نہیں ہے علی ہذا القیاس قرآن شریف کے تمام مخاطبین کی فہم یکساں نہیں ہوتی جبکہ اُس سے پہچانے جانے والے احکام و مفہومات کی بنیادی طور پر صرف دو قسمیں ہیں۔

مفہومات قرآنیہ کی ایک اہم تقسیم:-

اول:- جسے مفہوم اول کہا جاتا ہے۔ دوم:- جسے مفہوم ثانی کہا جاتا ہے۔

مفہوم اول وہ ہیں جس کے ساتھ جملہ مخاطبین مکلف بھی ہیں اور اُس پر عمل کرنے کے ذمہ دار بھی یہ قرآن شریف سے پہچانے جانے والے وہ مفہومات ہیں جنہیں عام اہل لسان محض سننے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں جس میں اہل علم اور غیر اہل علم کی کوئی تفریق نہیں ہے جبکہ غیر اہل لسان یعنی عجمی لوگوں میں وہ حضرات بھی انہیں آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون مثلاً صرف، نحو، بلاغت وغیرہ سے واقف ہوں۔

مفہوم ثانی سے مراد وہ رُموز و اسرار اور علوم و معارف ہیں جن کا ادراک عوام الناس نہ بلکہ خواص اہل اللہ، مخصوص علماء اور نور بصیرت سے معمور سینے والے اولیاء اللہ ہی کر سکتے ہیں۔

قرآن شریف کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے غرض و غایت کا تعلق پہلے مفہوم

أصول ترجمہ

کے ساتھ ہے دوسرے سے نہیں یعنی ترجمہ کرنے سے جو مقصد پیش نظر ہونا ضروری ہے وہ آیات قرآنیہ کے مفہوم اول سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اُن تمام علوم آلیہ کو پیش نظر رکھا جائے جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ ہیں۔ ترجمۃ القرآن کے اصول و شرائط کے سلسلہ میں یہ نکتہ ضبط تحریر میں لانے سے واحد مقصد ہمارا اُن حضرات کے پھیلانے ہوئے مغالطہ کا ازالہ کرنا ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ قرآن شریف کے معارف اور رموز و اسرار لانہایت ہونے کی بنا پر اُس کا ایسا ترجمہ ناممکن ہے جو جامع ہو۔ ان حضرات کا یہ کلام ترجمۃ القرآن کو ناممکن اور ناجائز کہنے والوں کے لیے نکتہ آغاز ہے۔ آنکھیں بند کر کے اسے تسلیم کرنے والے کچھ حضرات نے اس پر حرام کی بھی دفعہ لگائی ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہوگا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ان حضرات کو اگر قرآن شریف کے مفہوم اول اور مفہوم ثانی کی تمیز ہوتی یا ترجمۃ القرآن سے بنیادی مقصد اور غرض و غایت کا احساس ہوتا تو ایسی بات کبھی نہ کہتے یا نظم قرآن کے پردہ میں پوشیدہ لانہایت معارف کا جمہور الناس اور عام مخاطبین سے ماوراء ہونے کا تصور ہوتا تو ترجمۃ القرآن جیسی اہم تبلیغ اسلام پر حرام کی دفعہ کبھی نہ لگاتے۔ (فَالِی اللّٰہِ الْمُشْتٰکِی)

خلاصۃ الکلام: قرآن شریف کا ترجمہ کرنا اصل میں اُس کی تبلیغ ہے جس کا تعلق اُس کے مفہوم اول کے ساتھ ہے۔ مفہوم ثانی کا تعلق ترجمۃ القرآن سے ہے نہ تبلیغ قرآن سے اور قرآن شریف کے ترجمہ کو اُس کے مطابق اور با مقصد بنانے کے لیے مستقل شرائط ہیں جن کی توفیق میسر ہونے کے بعد ترجمہ بالیقین با مقصد و معیاری ہو جاتا ہے۔ (وَاللّٰہُ الْہَادِیْ اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ)

ترجمۃ القرآن کی تعریف کا ایک اور مقتضاء:-

قرآن شریف کے ترجمہ کی مذکورہ تعریف ”هو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ

اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ کا ایک اہم مقتضایہ بھی ہے کہ اس کے جملہ الفاظ مع ہیئت

أصول ترجمہ

کذا یہ متن قرآن کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے بھی مطابق ہوں۔ جسے بامحاورہ ترجمہ کہتے ہیں ورنہ ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ لغت کی زبان میں ترجمہ کی دو قسمیں ہیں؛

① ترجمۃ الالفاظ۔ ② ترجمۃ الکلام

اس مناسبت سے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمۃ الالفاظ قرآن اور ترجمۃ القرآن کیوں کہ قرآن شریف کلام اللہ ہے جو نفس الالفاظ نہیں بلکہ الفاظ و معانی کے مجموعہ مرکب کا نام ہے۔

اول قسم:- ترجمۃ الالفاظ قرآن حقیقی قرآن کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف الفاظ کی تبدیلی ہے کیوں کہ حقیقی قرآن محض الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ دالہ اور معانی مدلولہ کے مجموعہ کا نام ہے جیسا اصول فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا سب کو معلوم ہے کہ ”هُوَ اسْمٌ لِلنِّظْمِ وَالْمَعْنَى جَمِيعًا“ (۱) یعنی قرآن شریف الفاظ و معنی کے مجموعہ کا نام ہے۔

دوم قسم:- ترجمۃ القرآن حقیقی قرآن کا ترجمہ ہے یعنی قرآن شریف کے الفاظ دالہ اور معانی مدلولہ کے مجموعہ مرکب کا جس میں ترجمہ والے الفاظ اصل کے الفاظ کے قائم مقام کہلانے کے قابل ہیں کہ ان سے اُن کی لسانی، فنی اور مرادی حیثیت پہچانی جا رہی ہے اور ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو حقیقی قرآن کے محاورہ کے تابع اور اُس کے مطابق کر کے مراد الہی کی حتی المقدور فہمائش کی جا رہی ہے یہ ہے بامحاورہ ترجمہ کا حقیقی مفہوم جس کے مطابق ہر معیاری ترجمہ بامحاورہ ہوتا ہے اور ہر بامحاورہ ترجمہ شرائط کے مطابق ہوتا ہے، معنوی قرآن ہوتا ہے یہی متعارف فی الاسلام ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں ترجمۃ الالفاظ قرآن صرف اور صرف نا پختہ بچوں کی فہمائش کے لیے ہوتا ہے کہ قرآنی الفاظ اور صرف الفاظ کے فقط لغوی مفہوم کی کچھ فہمائش ہو جائے جس کے بعد ترجمۃ القرآن کی طرف قدم بڑھانا آسان ہو جائے۔

عرف عام میں ترجمۃ القرآن کی قطعاً کوئی تقسیم نہیں ہے بلکہ یہی ایک حقیقت ہے جسے بامحاورہ

(۱) حسامی، بحث کتاب اللہ۔

أصول ترجمہ

ترجمہ بھی کہا جاسکتا ہے، معیاری بھی اور شرائط کے مطابق بھی جس میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو قرآن شریف کے محاورہ کے تابع، اُس کی فرع اور اُس کے مطابق کر کے ترجمہ القرآن کو قابلِ فہم کیا جاتا ہے اور بس۔ باقی با محاورہ ترجمہ سے متعلق یہ تصور کہ قرآن شریف کے محاورہ اور اُس کی لسانی اور فنی حیثیت کو ترجمہ والی زبان پر قربان کیا جائے یا یہ تصور کہ ترجمہ کی شرائط کو پامال کر کے بھی متن کو ترجمہ والی زبان کا تابع بنایا جائے تو اس کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے اور اس کے قبائح و خطرات نہایت بھیا نک ہیں۔ (اعاذنا اللہ منہ)

لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ غلط تراجم کو تحفظ دینے کے لیے با محاورہ ترجمہ کا بہانہ ڈھونڈنے والوں کی غالب اکثریت اس ”ظلمت بعضہا فوق بعض“ میں مبتلا ہے۔ البتہ لغت کے اعتبار سے ترجمہ الالفاظ اور ترجمہ القرآن کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ترجمہ الالفاظ کی دو قسموں کی تفریق:-

پہلی قسم:- جو کلمات مفردہ کے حوالہ سے ہوتی ہے کسی غیر مشہور اور غیر مانوس الاستعمال لفظ کے معنی کو کسی دوسری قابلِ فہم زبان کے الفاظ میں بیان کیا جائے جیسے عربی ”اسد“ اور ”غضنفر“ کا بالترتیب ترجمہ ”شیر اور ببر شیر“ میں کیا جائے اور فارسی کے ”تسمہ پاء“ کا ترجمہ کھوار زبان کے ”چہاری“ میں کیا جائے، علی ہذا القیاس۔ جس مفرد لفظ کا بھی کیا جائے اُسے ترجمہ اللفظ ہی کہا جائے گا اور تفسیر و تشریح یا تفہیم کہنا بھی کافی حد تک درست ہوگا کہ جس زبان میں اُس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس زبان کے جاننے والوں کے لیے تفسیر بھی ہے تشریح و تفہیم بھی، گویا ترجمہ الالفاظ کا یہ انداز تعریفِ لفظی کی ایک جھلک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں اصل کے مفہوم کو دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے جبکہ تعریفِ لفظی میں دوسری زبان کے الفاظ میں کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اصل کی زبان میں بھی ہو سکتی ہے جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دوسری قسم:- جس میں الفاظ مفردہ کے نہیں بلکہ کسی مضمون اور مرکب تام و کلام کے مختلف حصہ

أصول ترجمہ

الفاظ کے لغوی معانی دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں جس میں اُن کی ترکیبی حیثیت اور مرادی مفہوم کو ظاہر کرنا مقصد نہیں ہوتا کہ وہ مسند ہے یا مسند الیہ، مضاف ہے یا مضاف الیہ، موصول ہے یا موصوف، عامل ہے یا معمول وغیرہ۔ ترجمۃ الالفاظ کی اس قسم میں کبھی کبھی کلام کے الفاظ مفردہ کی ترکیبی حیثیت آپ ہی ظاہر ہو جاتی ہے جسے حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے اس کی عملی مثالوں کو سمجھنے کے لیے بھی حضرت شاہ رفیع الدین کا ترجمہ کافی ہے جس میں حسن اتفاق سے ترکیبی حیثیت ظاہر ہونے کی مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے اور ظاہر نہ ہونے کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ مثال کے طور پر ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ تک تینوں آیتوں کے ترجمۃ الالفاظ میں اسم جلالیت اور اُس کے بعد مذکور ہونے والے چاروں اوصاف ”الْعَلَمِينَ، الرَّحْمَنُ، الرَّحِيمُ، مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ کا ترکیبی ربط ظاہر نہیں ہو رہا کہ اسم جلالیت موصوف اور یہ چاروں اُس کی بالترتیب اوصاف ہیں کیوں کہ اُردو محاورہ کے مطابق موصوف و صفت کے ارتباط کے لیے اُن کے مابین لفظ ”جو“ کا استعمال ضروری ہوتا ہے جو ترجمۃ الالفاظ میں نہیں بلکہ ترجمۃ الکلام میں ہوتا ہے جو یہاں پر موجود نہیں ہے جیسا ترجمہ کے الفاظ ”سب تعریف واسطے اللہ کے پروردگار عالموں کا بخشش کرنے والا مہربان خداوند دن جزا کا“ سے صاف ظاہر ہے کہ متن کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ اُردو زبان میں ظاہر کیا گیا ہے جو درست اور اصل کے لغوی مفہوم کے مطابق ہے لیکن متن کی ترکیبی حیثیت اور اُس سے مرادی مفہوم ظاہر کرنے سے قاصر ہے جبکہ اس کے متصلاً بعد آیت نمبر 4 کے الفاظ کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اُس میں متن سے مرادی مفہوم ظاہر ہونے کے ساتھ مسند و مسند الیہ کا ارتباط بھی ظاہر ہو رہا ہے جو ترجمہ کے الفاظ ”تجھ ہی کی عبادت کرتے ہیں ہم اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں“ سے آپ ہی واضح ہو رہا ہے۔

الغرض ترجمۃ الالفاظ کی پہلی قسم کی حقیقت تعریف لفظی سے مختلف نہیں ہے جو لفظی تشریح

کہلانے کے زیادہ قابل ہے جس کے معنوں اور مُبدل منہ میں ہی کلام تام و جملہ نہیں ہے تو پھر

أصول ترجمہ

ترجمہ میں کہاں سے آئے گا۔ انجام کار اُس میں کلام کا تصور ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اسے کسی کتاب، کسی متن اور کسی مضمون کا ترجمہ کہنا درست ہو۔ اس کے مقابلہ میں دوسری قسم کے اجتماعی مفہوم سے حسن اتفاق کے طور پر کبھی کلام بھی ظاہر ہوتا ہے اور متن والے کلام کا ترجمہ ہونا محسوس ہوتا ہے اس کے باوجود اسے ترجمۃ الکلام نہیں بلکہ ترجمۃ الالفاظ کے نام سے موسوم کیا جائے کیوں کہ متعارف مفہوم میں ترجمۃ الکلام کا وجود اُس کی علت غائی کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اصول فطرت ”یستحیل وجود المعلول بدون علته“ سے خلاف ہونے کو ممکن نہیں کہا جاسکتا۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ متعارف مفہوم میں ترجمۃ الکلام کی علت غائی اور اس سے مقصد متن والے کلام کی عبارت النص سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ترجمۃ الالفاظ کی کسی قسم اور کسی بھی صورت سے مترجم کا مقصد افادۃ الکلام اور افادۃ مقصد المتکلم نہیں بلکہ مفردات الکلام کے افادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا یہ وہ نکتہ ہے جس سے غفلت کی بنا پر بعض اہل علم ترجمۃ الالفاظ کی اس دوسری قسم کی تعبیر ترجمہ تحت اللفظ کے عنوان سے کرتے ہیں اور اسے ترجمۃ الکلام کی ایک مستقل قسم کہتے ہیں جو با محاورہ ترجمہ کے مقابلہ میں سمجھا جاتا ہے اس حوالہ سے ہندوپاک کے وہ علمی حلقے جو ترجمۃ القرآن جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل کو آسان سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں اُن کے پورے ماحول میں ترجمۃ الکلام کی یہی دو قسمیں مشہور ہیں یعنی تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ۔

انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تاثر سراسر غلط ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متعارف ترجمہ ہمیشہ تحت اللفظ ہوتا ہے۔ فن ترجمہ میں فوق اللفظ ترجمہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے کیوں کہ ہر ترجمہ کے متن کو فوقیت حاصل ہوتی ہے وہی اصل ہے جبکہ ترجمہ اُس کے ماتحت اور اُس کی فرع ہے اور اُس کے تابع ہونے کی بنا پر ہمیشہ اُس کے ماتحت، اُس کے قائم مقام اور اُس کے مطابق ہونا ضروری ہے تو پھر اس تقسیم کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ با مقصد ترجمۃ الکلام ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے اور ہندوپاک کے ان حلقوں میں با محاورہ ترجمہ کے بارے میں بھی وہ تصور نہیں ہے جو ہونا چاہئے کیوں کہ ترجمۃ الکلام کو تحت اللفظ اور با محاورہ کی طرف تقسیم کہنے والے ان حلقوں کے نزدیک با محاورہ

أصول ترجمہ

کا معیار یہ ہے کہ وہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو آگے عام ہے چاہے متن والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز جملہ شرائط کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز متن کے سیاق و سباق کے مناسب ہو یا نہ ہو، جبکہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ترجمۃ الکلام کے سلسلہ میں با محاورہ ترجمہ کا ایسا تصور ممکن نہیں ہے جس میں اصل کو ترجمہ والی زبان پر قربان کیا جائے یا اصل کو فرع کے تابع کیا جائے بلکہ بامقصد ترجمۃ الکلام کی صرف ایک ہی قسم ہے جو با محاورہ ہے اس لیے کہ کسی بھی کلام کا بامقصد اور معیاری ترجمہ بے محاورہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ بے محاورہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ متن کی لسانی حیثیت سے یا ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت سے یا دونوں سے خلاف ہے جبکہ ان سب میں شرط کی مخالفت ہے جو دونوں زبانوں کی لسانی حیثیت کے مطابق ہونا ہے۔ ایسے میں کسی بھی کلام کے بامقصد اور معیاری ترجمہ کو بے محاورہ کہنا یا با محاورہ کے مقابلہ میں ترجمۃ تحت اللفظ کے عنوان سے شہرت دینے کو معقول کہا جاسکتا ہے نہ مناسب۔ نیز محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے اور علم تصریف کے مطابق باب ”مُفَاعَلَه“ کا مصدر ہے جو عربی کی طرح اردو زبان میں بھی کثیر الاستعمال ہے جس کا مفہوم ہے باہم گفتگو کرنا، کسی کلام کا تکرار کرنا اور ایک دوسرے سے مراجعۃ الکلام کرنا جیسا زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر عنترہ نے اپنے مد مقابل کو کلام کی سمجھ سے قاصر و نا اہل قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

لو کان یدری ما المحاورۃ اشتکی ولکان لو علم الکلام مکلمی (۱)

یعنی وہ اگر گفتگو کے سلیقہ کو جانتا میں اُس کی شکایت کرتا اور وہ گلہ و شکوہ کرنے کا مستحق بھی ہوتا کاش میرے ساتھ ہم کلامی کرنے والا یہ جانتا۔

نیز محاورہ مصدر مجہول اور کبھی حاصل بالمصدر المجہول کے انداز پر اُس کلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی زبان میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہو یعنی ”الکلام المرَدَّد“ کلام میں ان دونوں طریقوں سے اس کا استعمال عربی و عجمی دونوں میں ہوتا ہے جبکہ مفردات کے لیے مستعمل ہونے کی کوئی مثال

(۱) مجمع البیان، ج: 10، ص: 370۔

أصول ترجمہ

اور کوئی محاورہ موجود نہیں ہے عربی میں نہ عجمی میں تو پھر ترجمہ الالفاظ کے لیے اسے استعمال کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

خلاصۃ الکلام:- ترجمہ الالفاظ اور ترجمہ الکلام دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کے مفہوم بھی اور مصداق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں ترجمہ الالفاظ پر لفظ ترجمہ کا اطلاق کرنا حقیقت لغویہ کے طور پر ہے جس میں عرف کا کوئی دخل نہیں ہے اس کے برعکس ترجمہ الکلام پر لفظ ترجمہ کا اطلاق حقیقت عرفیہ کے طور پر ہے جو حقیقت لغویہ کے بھی منافی نہیں ہے، کسی بھی کلام کا با مقصد اور معیاری ترجمہ ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے شرائط کے مطابق ہوتا ہے اس میں لفظی ترجمہ یا تحت اللفظ ترجمہ جیسے الفاظ و تقسیمات جو سننے کو ملتی ہیں یہ بعض علمی حلقوں کی ناقص فکر ہے۔ اسلاف میں اس کا کوئی ثبوت ہے نہ مثال اور درایت اسے تسلیم کرتی ہے نہ روایت۔

با محاورہ اور بے محاورہ ترجمہ کی قسمیں:-

با محاورہ ترجمہ اور بے محاورہ ترجمہ آپس میں ضدین ہیں کہ ایک کا وجود دوسرے کے عدم کی دلیل اور ایک کا عدم دوسرے کے وجود کی دلیل ہے۔ نیز با محاورہ ترجمہ کی صرف ایک صورت ہے کہ اس میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو قرآن شریف کے محاورہ کے تابع اور متن کی فرع اور اس کے مطابق رکھ کر ترجمہ القرآن کو قابل فہم بنایا جاتا ہے یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب دونوں زبانوں کی لسانی حیثیت سے لے کر ان کی فنی حیثیات تک تمام لوازمات و تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہو ورنہ کسی ایک چیز میں عدم مطابقت کی صورت میں بھی ترجمہ با محاورہ کے دائرہ سے نکل کر بے محاورہ کے خانہ میں داخل ہو سکتا ہے جبکہ بے محاورہ ترجمہ کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت:- ترجمہ والی زبان کے مطابق اور متن والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہو۔ جیسا ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کے مندرجہ ذیل تراجم:

”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔“

اُصولِ ترجمہ

”شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔“

”اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان رحم کرنے والا ہے۔“

یہ سب ترجمہ والی زبان یعنی اُردو محاورہ کے مطابق ہیں کیوں کہ اُردو کے محاورہ میں صفت و موصوف کے مجموعہ مرکب کی تعبیر مرکب تام کے انداز میں کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا جبکہ متن کے محاورہ سے خلاف ہے کیوں کہ یہاں پر اسمِ جلالت یعنی لفظ ”اللہ“ موصوف ہے اور ”الرحمن، الرحیم“ بالترتیب اُس کی صفات ہیں جبکہ موصوف و صفت کا مجموعہ مرکب جو ترکیبِ توصیفی کہلاتا ہے مرکب تام و جملہ نہیں ہوتا جس وجہ سے ان میں لفظ ”ہے“ کہنا لسانِ قرآنی سے خلاف، عربی محاورہ کے منافی اور غلط ہے کیوں کہ یہ مرکب غیر تام کو جملہ کہنے سے مختلف نہیں ہے جسے سننے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ ہلغاء اور لسانِ قرآنی میں اس کی کوئی مثال موجود ہے نہ محاورہ عرب میں تو پھر اسے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا با محاورہ ترجمہ کہنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا کیوں کہ با محاورہ ترجمہ کہلانے کے قابل وہی ہوتا ہے جس میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو متن کے محاورہ اور اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق بنا کر اصل مقصد کی فہمائش کی جائے۔ جس کے مطابق بسم اللہ شریف کا با محاورہ ترجمہ (اللہ کے نام سے شروع جو مہربان رحمت والا، اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمت والا مہربان) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ شرائط کے بھی مطابق ہے۔

دوسری صورت:- اول الذکر سے برعکس ہے یعنی ترجمہ متن کے محاورہ کے مطابق اور ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہوتا ہے جیسا آیت کریمہ ”قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ“ کا کیا گیا ترجمہ:

”فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہم کو کوئی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا بے شک آپ بڑے علم والے حکمت والے ہیں۔“

جس میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ”آپ“ استعمال کیا گیا ہے جو اُردو محاورہ سے خلاف ہے کیوں

أصول ترجمہ

کہ اُردو محاورہ میں لفظ ”آپ“ انسانوں کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے لیے مخاطب کا یہ انداز مانوس ہے نہ یہ لفظ تو پھر ترجمہ کے اس انداز کو اُردو محاورہ سے خلاف نہ کہیں تو اور کیا کہیں لیکن متن کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ لفظ ”آپ“ نفس مخاطب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس اعتبار سے یہاں پر اسے متن کے ضمیر مخاطب ”اَنْتَ، اَنْتِ“ کے مطابق ترجمہ کہا جاسکتا ہے بشرطیکہ لفظ ”آپ“ سے مراد یہاں پر مخاطب مع التعظیم نہ ہو ورنہ ان کے مصداق کی تعظیم و آداب کو انسانوں کی تعظیم و آداب پر قیاس کر کے لفظ ”آپ“ استعمال کرنے کی صورت میں ترجمہ بے محاورہ کی دوسری قسم سے نکل کر تیسری قسم میں شامل ہو جائے گا جو متن کے محاورہ سے بھی خلاف ہے اور ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے بھی۔

تیسری صورت :- جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے بھی اور متن کے محاورہ سے بھی خلاف ہو جیسا ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا کیا گیا ترجمہ ”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔“ جسے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق کہا جاسکتا ہے نہ متن کے کیوں کہ اُردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنا مانوس نہیں ہے تو پھر ترجمہ کے اس انداز کو اُس کے محاورہ کے مطابق کون کہے اور متن کے محاورہ سے خلاف اس لیے کہ اُس کی لسانی حیثیت سے منافی ہے جبکہ علم بلاغت اور نحوی اصولوں کے مطابق یہاں پر متن کے اسم جلال ”اللہ“ موصوف اور ”الرَّحْمٰنِ، الرَّحِیْمِ“ بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور موصوف و صفت سے مجموع مرکب جملہ نہیں بلکہ مرکب توصیفی کہلاتا ہے جو جملہ کے مقابلہ میں مفرد اور مرکب غیر تام ہے جس کے برعکس اس ترجمہ میں لفظ ”ہے“ لگا کر اُسے جملہ ظاہر کیا گیا ہے کیوں کہ لفظ ”ہے“ مفرد پر اور لفظ ”ہیں“ جمع پر حکم لگانے کے لیے مختص ہیں جو مرکب تام اور جملہ کے بغیر استعمال نہیں کیے جاتے۔ ایسے میں ترجمہ کے اس انداز کو متن کے حوالہ سے بامحاورہ کہا جاسکتا ہے نہ ترجمہ والی زبان کے حوالہ سے۔

خلاصۃ الکلام بعد التفصیل:- قرآن شریف کا معیاری ترجمہ جو معنوی قرآن کہلانے کے قابل ہوتا ہے ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے اور با محاورہ سے مراد یہ ہے کہ متن کی لسانی حیثیت کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کے بھی مطابق ہو ورنہ کسی ایک سے خلاف ہونے کی صورت میں بھی با محاورہ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ دوسری شرائط اپنی جگہ ضروری ہیں جن کی پابندی کیے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ معیاری نہیں ہو سکتا۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف سے متعلق مباحث کے سلسلہ میں چوتھے نمبر کی یہ بحث قدرے لمبی ہو گئی جو بے مصرف نہیں ہے کیوں کہ اس کے بغیر ترجمۃ القرآن کی حقیقت واضح ہوتی ہے نہ اس کی افادیت۔

۵ قرآن شریف کے متن کا کوئی لفظ یا کوئی جملہ حصہ ترجمہ کے بغیر نہ رہے اسی طرح متن قرآن کے الفاظ سے کوئی لفظ ترجمہ میں زیادہ نہ ہونے پائے ورنہ ترجمۃ القرآن کا ثبوت ہی ممکن نہیں ہوگا کیوں کہ اس سلسلہ میں معوض عنہ اور معوض یعنی متن قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کے الفاظ میں بدلنے والا عمل اس کے ثبوت کے لیے بمنزلہ رکن ہے جس کے بغیر ترجمہ کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اسی ایسی مثال ہے جیسے رکوع، سجود کے بغیر نماز کا ثبوت ممکن نہیں ہے جبکہ ترجمہ کے الفاظ کا متن کے الفاظ کے قائم مقام ہونا اور ان کی جملہ لسانی حیثیات کا حامل ہونا اس کی صحت کے لیے معیارِ میز ہے کہ اس کے بغیر ترجمہ کی صحت ممکن نہیں ہے مقصد اور افادیت نہیں ہے۔ ترجمۃ القرآن کی بزرگانِ دین سے منقول مذکورہ تعریف کی جامعیت و مانعیت کی اس توضیح سے غرض اور موضوع بحث کی بھی کچھ پہچان ہو چکی ہے تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ مستقل طور پر بیان کیے جائیں۔ قرآن شریف کا ترجمہ کرنا جو فنِ ترجمہ کی اعلیٰ مثال اور عبادت ہی عبادت ہے، اسلام کی تبلیغ کا آغاز ہے اس سے **غرض و غایت** قرآن شریف کے معانی و مقاصد اور اس کے مفہومِ اول سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہے جو ان کے حوالہ سے قرآن شریف کی تبلیغ کا آغاز ہے اور ان کے لیے تفسیر و تفہیم کی بنیاد ہے کیوں کہ کسی بھی زبان میں آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر ہو یا تفہیم اس کے ترجمہ کو ذہن میں مستحضر کیے

أصول ترجمہ

بغیر ممکن نہیں ہے۔ نیز تفہیم قرآن ہو یا تفسیر یا تاویل اُس کی صحت میں ترجمۃ القرآن کی صحت کو سب سے بڑا دخل ہے جس کے مطابق ترجمۃ القرآن کو تخم اور تفسیر و تفہیم اور تشریح و تاویل کو اُس سے پیدا ہونے والی پیداوار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نماز میں قرأت القرآن سے عاجز شخص کے لیے قرأت کی جگہ ترجمۃ القرآن پڑھنے کے جواز اور تفسیر القرآن پڑھنے کے عدم جواز کی جو تفریق کتابوں میں پائی جاتی ہے اُس کا اصل فلسفہ بھی یہی کچھ ہے کہ ترجمۃ القرآن جس زبان میں بھی ہو اُس کے عرف میں اُسے معنوی قرآن سمجھا جاتا ہے جو تفسیر و تاویل اور تفہیم و تشریح جیسے عوامل کے لیے اصل الاصول ہے یہ شرف تفسیر کو حاصل ہے نہ تفہیم کو اور تشریح کو حاصل ہے نہ تاویل کو، کسی بھی تفسیر و تاویل یا تفہیم القرآن کے عنوان سے کسی بھی تعبیر و تشریح میں غلطی کے پس منظر کو دیکھا جائے تو غالب اکثریت کے ساتھ اُس کا نکتہ آغاز اور بنیاد و منشاء ترجمہ کی غلطی کی صورت میں نظر آتا ہے یعنی جیسا تخم ویسی پیداوار۔ حقائق کی اس روشنی میں اس کے پرخطر ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِي إِلَى سَبِيلِ الرَّشَادِ)

ترجمۃ القرآن کا موضوع:-

متن قرآن کے الفاظ کے عوض ترجمہ والی زبان سے استعمال ہونے والے الفاظ ہیں اور مسلمہ اصول ہے کہ کسی فن کے موضوع کی ذات سے بحث کی جاتی ہے نہ اُس کی ذاتیات سے یہاں پر بھی ایسا ہے کہ متن قرآن کے الفاظ سے عوض کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کی ذات اور ان کی ذاتیات یعنی اُن کی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ متن کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے اس طرح بحث کی جاتی ہے کہ ترجمہ کے تمام الفاظ آیت کریمہ کے مفہوم اول پر دلالت کرنے کے حوالہ سے اصل الفاظ کی جملہ حیثیات کے مطابق ہو، اُسے درست ترجمہ کہا جاتا ہے جبکہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اس پورے عمل کو غلط کہا جاتا ہے اور ترجمہ کو غیر معیاری و بے مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ بحث کی نوعیت کے اس انداز کے مطابق معیاری اور بامقصد ترجمہ کی صرف ایک صورت ہے جس میں ترجمہ کے تمام الفاظ سے لے کر اُن کی ہیئت ترکیبی تک اصل کے مطابق ہو۔ مثال کے طور

اُصول ترجمہ

پر متن قرآن میں جو لفظ فاعل کے طور پر مذکور ہے ترجمہ کا لفظ بھی فاعل کے طور پر ہو، وہ مفعول بہ کے طور پر مذکور ہے یہ بھی مفعول بہ کے طور پر اور وہ مضاف یا مضاف الیہ کے طور پر ہو یہ بھی ویسا ہی ہو اور مذکور ہے تو یہ بھی مذکور ہو اور مونث ہے یہ بھی مونث ہو، علی ہذا القیاس۔ پوری آیت کریمہ کا ترجمہ ہو یا اُس کے کسی حصے کا بہر حال ترجمہ کے تمام الفاظ اصل کے الفاظ کے مطابق ہوتے ہیں اسی طرح اصل کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت اگر مرکب تام ہے تو ترجمہ کے جملہ الفاظ کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت بھی مرکب تام ہوتی ہے اور وہ مرکب غیر تام اور غیر جملہ ہونے کی صورت میں ترجمہ کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت بھی مرکب غیر تام ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ترجمہ کے جملہ الفاظ کی عرفی حیثیت متن کی عرفی حیثیت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے کہ ترجمہ با محاورہ کہلانے کے قابل ہو کیوں کہ ہر معیاری ترجمہ با محاورہ ہوتا ہے جس پر اس سے پہلے بھی کچھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

بے مقصد اور غیر معیاری ترجمہ کی تین قسمیں:-

پہلی قسم:- جس میں ترجمہ کے بعض الفاظ چاہے ایک ہی کیوں نہ ہو اصل سے خلاف ہو چاہے مخالفت کا یہ انداز جس حوالہ سے بھی ہو جس کے مطابق ترجمہ کی بے مقصدیت کی اس قسم میں بے شمار قسمیں پائی جاتی ہیں اس کی بھی ایک جھلک اول باب میں معلوم ہو چکی ہے۔

دوسری قسم:- جس میں ترجمہ کے تمام الفاظ اصل الفاظ کی جملہ حیثیات کے مطابق ہوتے ہیں لیکن اُن کے مجموعہ کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت اصل کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت سے خلاف ہوتی ہے۔

تیسری قسم:- جس میں یہ دونوں بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں۔

ترجمہ القرآن سے بحث اور کسی قسم کی بھی گفتگو ان چاروں قسموں میں منحصر ہے، نیز بامقصد اور معیاری ترجمہ کو دادِ تحسین دینے کی جو صورت بھی ہو اُس کا محور اصل کے ساتھ ترجمہ کی مطابقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح بے مقصد و غیر معیاری ترجمہ کی مذمت کے سلسلہ میں کوئی گفتگو اور کوئی بحث بھی اصل کے ساتھ ترجمہ کی عدم مطابقت کی مذکورہ تین قسموں سے خارج

أصول ترجمہ

نہیں ہے ان کی مثالوں کو بالترتیب سمجھنے کے لیے آیت کریمہ کے حصہ ”قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّظْرَيْنِ“ (۱) کا اشرف علی تھانوی اور فتح محمد جالندھری کا کیا ہوا ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اول الذکر نے اس کے ترجمہ کے طور پر لکھا ہے:

”آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو۔“

اور ثانی الذکر نے لکھا ہے ”موسیٰ نے کہا پروردگار فرماتا ہے کہ اُس کا رنگ گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں کے دل کو خوش کر دیتا ہو۔“

یہ دونوں ترجمے اپنی ہیئت اجتماعی کی نوعیت کے اعتبار سے انشاء ان دونوں کی ہیئت اجتماعی کا انداز جملہ انشائیہ کا جیسا اول الذکر میں لفظ (زرد رنگ کا بیل ہو، تیز زرد ہو، فرحت بخش ہو) سے اور ثانی الذکر کے لفظ (گہرا زرد ہو، دیکھنے والوں کے دل کو خوش کر دیتا ہو) سے صاف ظاہر ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں لفظ ہو کسی واقعہ سے خبر دینے کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ طلب کے لیے ہوتا ہے جو ہمیشہ جملہ انشائیہ ہوتا ہے اس اعتبار سے یہ دونوں غیر معیاری ترجمہ کی دوسری قسم میں شامل ہوتے اور اُس کی مثال قرار پاتے ہیں بشرطیکہ انفرادی حیثیت سے ان کے الفاظ کی متن کے الفاظ کے مطابق نہ ہونے کا اعتبار نہ کیا جائے اس کے برعکس اگر ان کے الفاظ کی فقط انفرادی حیثیت سے الفاظ متن کی انفرادی حیثیت سے خلاف ہونے کا اعتبار کیا جائے کہ اول الذکر میں ”بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ“ کے بیل میں کیا گیا ہے اور ثانی الذکر میں متن ”تَسُرُّ“ کے مؤنث لفظ کا ترجمہ ”خوش کر دیتا ہو“ میں کیا گیا ہے جو اُردو محاورہ میں مذکر کے ساتھ خاص ہے جس سے مترجم کی مراد ”بیل“ کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس صورت میں یہ دونوں غلط ترجمہ کی اول قسم میں شامل ہوں گے اور اُس کی مثال قرار پائیں گے اور ان دونوں صورتوں کی انفرادیت سے برعکس اگر دونوں کا اعتبار کیا جائے کہ ان کے الفاظ انفرادی حیثیت سے بھی آیت کریمہ کے انفرادی الفاظ کے معنی سے

أصول ترجمہ

خلاف ہیں اور ہیئت اجتماعی کی نوعیت بھی اُس کی ہیئت اجتماعی سے خلاف ہے تو پھر غلط ترجمہ کی تیسری قسم میں شامل ہوں گے اور اُس کی مثال قرار پائیں گے۔ باقی رہا یہ تصور کہ ان کے انفرادی الفاظ اُس کے انفرادی الفاظ کے مطابق نہیں ہیں یہ اس لیے کہ اُس میں لفظ ”بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ“، ”گائے“ کے ساتھ مختص ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو لسانِ قرآنی سے قدرے شغف اور نحوی قواعد سے کچھ واقفیت رکھتا ہو جس کے مطابق اُس سے مراد بیل لینا ہرگز جائز نہیں ہے چہ جائیکہ ترجمہ جائز ہو۔ اسی طرح آیت کریمہ میں لفظ ”تُسْرُ“ بھی مؤنث کا صیغہ ہے جس میں مستتر ضمیر مرفوع متصل سے مراد آیت کریمہ میں مذکور ہونے والی گائے کے سوا اور کچھ نہیں اور ان ترجموں کی ہیئت اجتماعی کی نوعیت اُس کی ہیئت اجتماعی کی نوعیت سے خلاف اس لیے ہے کہ یہ طلب و انشاء کے انداز پر ہیں جبکہ وہ جملہ خبریہ ہے تو پھر مطابقت اور اُس کے قائم مقام ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔

تراجم کی دُنیا میں سب سے بڑا ظلم:-

ایک آیت اور اُس کے بھی صرف ایک حصہ کے ترجمہ میں غلطیوں کی ان تین قسموں کو جمع کرنے جیسی سنگین بے اعتدالیوں میں مذکور دو مترجم یعنی اشرف علی تھانوی اور فتح محمد خان جالندھری منفرد نہیں ہیں بلکہ ماتم کرنے کے قابل ایسی بے اعتدالیوں میں مترجمین کی غالب اکثریت مبتلا ہے جس کی سینکڑوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا اشرف علی تھانوی اور محمود الحسن کے کیے ہوئے بالترتیب یہ تراجم (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے) جن میں ہیئت ترکیبی کی نوعیت متن کی ہیئت نوعیہ سے خلاف ہے کیوں کہ ان میں لفظ ”ہے“ لگا کر مرکب غیر تام متن کے ترجمہ کو مرکب تام بنا دیا گیا ہے متن مرکب غیر تام اس لیے ہے کہ صفت و موصوف سے مجموع مرکب ہے کہ اسمِ جلالت ”اللہ“ موصوف اور ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ بالترتیب یکے بعد دیگرے اُس کی صفات ہیں جسے علمی زبان میں مرکب

اصول ترجمہ

توصیفی کہا جاتا ہے جو جملہ کے مقابلہ میں مفرد اور مرکب غیر تام کہلاتا ہے جبکہ لفظ ”ہے“ اور ”ہیں“ اردو محاورہ میں مرکب تام اور جملہ کے ساتھ مختص ہیں کیوں کہ ان میں حکم اور نسبت تامہ کا اظہار ہے جو مرکب غیر تام میں نہیں ہوتا یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ لسانِ قرآنی یعنی عربی زبان سے قدرے مناسبت رکھنے والوں سے بھی پوشیدہ رہ سکے بلکہ عربی قواعد کی ابتدائی کتابیں پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں کہ صفت و موصوف سے مجموع مرکب کلام تام نہیں بلکہ مرکب تام کے مقابلہ میں مفرد اور غیر جملہ کہلاتا ہے۔

اس غلطی میں دو مختلف انداز کے مذکورہ تراجم شریک ہونے کے علاوہ اول الذکر میں ہیئت ترکیبی کو ایک اور وجہ سے بھی اصل کی ہیئت ترکیبی سے خلاف کیا گیا ہے کہ لفظ ”ہیں“ کہہ کر شانِ الہی کی تعظیم کو انسانوں کی باہمی تعظیم و ادب پر قیاس کر کے اُس وحدہ لاشریک کے لیے جمع کا انداز اختیار کیا گیا ہے جو نہ صرف متن کی ہیئت ترکیبی کے خلاف ہے بلکہ ترجمہ سے قطع نظر کر کے اپنی جگہ بھی ناجائز ہے کیوں کہ تعظیم شانِ الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنے کا تصور اسلام میں نہیں ہے۔ یہ انداز شرعی اصولوں کے خلاف ہونے کے ساتھ اردو محاورہ کے بھی خلاف ہے کیوں کہ اردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم و ادب کے لیے مقام کی مناسبت سے اُس وحدہ لاشریک کی کسی صفت کو ذکر کیا جاتا ہے۔ اُس کی تعظیم انسانوں کی باہمی تعظیم کے انداز پر قیاس کر کے اُس واحد، احد، یکتا و صمد ﷻ و عموماً نوالہ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنے کی مثال قرآن و سنت میں پائی جاتی ہے نہ اردو محاورہ میں تو پھر ترجمہ کے اس انداز کو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کی ہیئت ترکیبی کے مطابق کون کہہ سکتا ہے ان دونوں سے بھی زیادہ قابلِ افسوس ترجمہ وہ ہے جس میں صفت ”الرَّحْمٰنِ“ اور ”الرَّحِیْمِ“ دونوں کو مرکب تام ظاہر کیا گیا ہے، یعنی ”یک نہ شد دوشد“ جیسا مفتی تقی عثمانی کا کیا ہوا ترجمہ ”شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربانی ہے، بہت مہربان ہے“ جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہر شخص مانتا ہے اور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب پر مہربان ہے اور بہت مہربان ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں ہے لیکن کسی بات کا اپنی جگہ درست ہونا ترجمہ کے درست

أصول ترجمہ

ہونے کو تسلیم نہیں ہے جبکہ یہاں پر ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے ترجمہ میں ان دو لفظوں ”الرَّحْمٰنِ، الرَّحِیْمِ“ کے ترجمہ کے طور پر ایسا لکھا گیا ہے جو غلط فہم کے سوا اور کچھ نہیں ہے جسے ماہرین لسانیات سننا گوارا کرتے ہیں نہ ماہرین لغت، نحو شناس! سے پسند کرتے ہیں نہ امامانِ بلاغت اور عبدالرحمن جامی و سیبویہ! سے مستحسن سمجھتے ہیں نہ تفتازانی و عبدالقادر جرجانی۔

ترجمۃ القرآن کے موضوع یعنی ترجمہ کے الفاظ و ہیئت ترکیبی کی نوعیت کا اصل سے خلاف ہونے کی یہ مثال صرف دوسری قسم تک محدود نہیں ہے بلکہ تیسری قسم کی بھی ایک جھلک ہے کیوں کہ مرکب تو صغیٰ یعنی اسمِ جلالت مع دونوں صفات ”الرَّحْمٰنِ، الرَّحِیْمِ“ کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت جملہ نہیں ہے جبکہ اس کا ترجمہ نہ صرف ایک جملہ بلکہ دو جملوں میں کیا گیا ہے اور اس اعتبار سے دوسری قسم کی مثال قرار پاتی ہے اور ان صفات یعنی ”الرَّحْمٰنِ، الرَّحِیْمِ“ کا ترجمہ بھی جملہ اور مرکب تام میں کیا گیا ہے جیسا اُس کے مذکورہ الفاظ ”جو سب پر مہربانی بہت مہربان ہے“ سے صاف ظاہر ہے اس اعتبار سے دوسری قسم کی مثال بھی قرار پاتی ہے اور ایسے میں تیسری قسم کی مثال ہونا آپ ہی واضح ہو جاتا ہے کیوں کہ جس ترجمہ کے الفاظ بھی الفاظ متن کی نوعیت سے خلاف ہوں اور ہیئت اجتماعی کی نوعیت بھی اصل کی اجتماعی نوعیت سے خلاف ہو وہی غیر معیاری ترجمہ کی تیسری قسم کہلاتا ہے جو پہلی اور دوسری قسم کی نسبت بمنزلہ کل ہے اور یہ دونوں اُس کے لیے بمنزلہ جز و ترجمۃ القرآن کے نام سے معنوی تحریفات کی ایسی بہتات کا مشاہدہ محرک و باعث بن رہا ہے کہ ہم شرائط و اصول ترجمہ دُنیا کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ علم کی دُنیا میں آکر صحیح و سقیم کی تمیز کرنے کی صلاحیت کے بعد میرے نصف صدی پر محیط تجربہ نے مجھے یقین دلایا کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرنا محال و ناممکن اگرچہ نہیں ہے تاہم دُنیا کے عرفان کی مشکل ترین صنف ہے جو رب کریم ﷺ کی خصوصی توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس توفیق کی ارزانی اُسے نصیب ہوتی ہے جسے عام ترجمہ کے اصول و شرائط پر عبور ہونے کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی اضافی شرائط و اصول اور لوازمات و تقاضوں کا بھی احاطہ ہو۔ ہزاروں صفحات میں تفسیر لکھنا آسان ہے اور آیاتِ قرآنیہ سے

أصول ترجمہ

متعلق تفہیم و تشریح کرنا بھی مشکل نہیں ہے جبکہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرنے کی توفیق پانا سب سے مشکل ہے، سب سے اہم، سب سے مقدم اور سب سے زیادہ کثیر الشرائط ہے ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے جس کے بغیر ترجمہ کے نام سے محض قرآنی الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں بدلنے اور محض لغوی معنی کو اپنی سمجھ کے مطابق دوسری زبان کا لباس پہنانے یا اُس کی فنی حیثیت اور محاورہ کو ترجمہ والی زبان کے محاورہ کا تابع کرنے کا انجام ایسا ہی ہوگا جو ان تراجم کی شکل میں دیکھنے کو مل رہا ہے جسے محض غلط اور انجانے میں معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

قرآن شریف کے آغاز ”بسم اللہ“ شریف کے ترجمہ میں آیت کریمہ سے خلاف ہونے کی ان بنیادی تینوں قسموں کی یہ مثالیں محض مشتے نمونہ از خروارے ہے جس میں اہل علم کو دعوتِ فکر ہے کہ پورے قرآن شریف کے ترجمہ میں غیر معیاری مترجمین نے کیا کیا کُل نہ کھلائے ہوں گے، کیا بے اعتدالیاں نہ کی ہوں گی اور نادان دوست بن کر انجانے میں کیا کیا تحریفات کی ہوں گی، جس سے قرآن کو بچانے کے جذبہ کے تحت ہم اصولِ ترجمہ کا یہ تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ اس اُمید سے کہ بغیر شرائط کے قرآن شریف کا ترجمہ لکھنے کی جسارت نہ کی جائے، غیر معیاری حضرات اس پر خطر صنف میں طبع آزمائی نہ کریں اور ترجمۃ القرآن کے نام سے بازار میں فروخت ہونے والی ہر تحریر کو معنوی قرآن سمجھنے کی غلطی نہ کریں بلکہ اس کی صحت و جواز کے لیے واجبی شرائط کی روشنی میں معیاری و غیر معیاری کی تفریق کریں اس میں غلطی کسی انسانی کتاب کے ترجمہ میں غلطی کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کا سیدھا اثر آیت کریمہ کے معنی پر ہوتا ہے، مرادِ الہی سے خلاف ہوتا ہے اور آیت کریمہ کی فنی حیثیت کے منافی ہوتا ہے۔ (اعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ) اور اس دلخراش داستانِ غم کا حجم بہت وسیع ہے ہمارے وجدان کے مطابق غلط تراجم کی شکل میں جتنا ظلم قرآن شریف پر کیا گیا ہے اور ہو رہا ہے اتنا شاید کسی دنیوی کتاب پر نہ کیا گیا ہو اپنے وجدان کی تصدیق و تائید کے سلسلہ میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نکتۂ آغازِ قرآن اور دیباچہ الکتاب یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کے کیے گئے غلط تراجم کی ایک جھلک سے پردہ اٹھادیں:

أصول ترجمہ

- 1 اشرف علی تھانوی ”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔“
- 2 فتح محمد جالندھری ”شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“
- 3 مفتی تقی عثمانی ”شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے بہت مہربان ہے۔“
- 4 عبدالماجد دریا آبادی ”شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔“
- 5 علامہ وحید الزمان ”شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا۔“
- 6 عاشق الہی میرٹھی ”شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔“
- 7 حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا عبدالجبار ”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربانی بہت رحم کرنے والا ہے۔“
- 8 سید محمد کچھوچھوی ”نام سے اللہ کے بڑا مہربان بخشے والا۔“
- 9 مفتی شاہ مظہر اللہ دہلوی ”اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بخشش کرنے والا مہربان ہے۔“
- 10 مولانا ثناء اللہ امرتسری ”شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“
- 11 ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری ”کہو اللہ بے حد مہربان بہت رحم کرنے والے کے نام سے ہی میرا شروع کرنا ہے۔“
- 12 مولانا محمد نعمت علی چشتی نظامی ”اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے۔“
- 13 ڈاکٹر محمد طاہر القادری ”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“
- 14 سید محمد وجیہہ السیماعرفانی ”میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں بہت رحم کرنے والا بڑی رحمتوں والا ہے۔“
- 15 سید فرمان علی ”خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان رحم والا ہے۔“
- 16 مولانا محمد جونا گڑھی ”شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“
- 17 مولانا عبدالرحمن گیلانی ”اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“
- 18 مفتی عزیز احمد قادری ”اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔“

أصول ترجمہ

- 19 شیخ محمود الحسن ”شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔“
- 20 شاہ رفیع الدین ”شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے۔“
- 21 حافظ نذیر احمد ”شروع اللہ کے نام سے جو نہایت رحم والا مہربان ہے۔“
- 22 مولانا عبدالحق دہلوی ”شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“
- 23 شیخ الحدیث مولانا غلام رسول سعیدی ”اللہ ہی کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے۔“
- 24 پیر کرم شاہ الازہری ”اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

اس وقت ہمارے مطالعے میں موجود یہ وہ تراجم ہیں جو مختلف مکاتب فکر کے مشاہیر نے کیے ہیں غلط تراجم کی مذکورہ تین بنیادی قسموں کے حوالہ سے ان کا تجزیہ و تشخیص اس طرح ہے کہ نمبر (4، 8، 20) غلط تراجم کی پہلی فہرست میں شامل ہیں جس میں ترجمہ کے الفاظ آیت کریمہ کے الفاظ کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہوتے ان میں بھی ایسا ہی ہے اس تفصیل سے کہ ترجمہ نمبر 4 ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے لفظ ”الرَّحِیْمِ“ کا ترجمہ بار بار رحم کرنے والے میں کیا گیا ہے جو اُس کی فنی اور صرفی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ وہ صفت مشبہ ہے جس میں انقطاع نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ موصوف ذات جب تک موجود ہے اُس وقت تک اس کے ساتھ اُس کا متصف ہونا بھی دائم و مستمر ہوتا ہے جس کے مطابق یہاں پر ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ میں بھی ذات الہی کا ان دونوں صفتوں کے ساتھ متصف دائم و مستمر ہے جس میں توقف و انقطاع نہیں ہے جبکہ بار بار کرنے میں توقف و انقطاع ہوتا ہے جو نہ صرف صفت رحمت بلکہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت کے بھی مناسب نہیں ہے کیوں کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق وہ بھی اپنے موصوف وحدہ لا شریک کے مطابق ازلی، ابدی، سرمدی اور دائم و مستمر ہیں۔ ایسے میں ترجمہ کے اس لفظ کو آیت کریمہ کے لفظ ”الرَّحِیْمِ“ کے مطابق اور اُس کے قائم مقام کون کہہ سکتا ہے ہاں ترجمہ

أصول ترجمہ

القرآن کی حقیقت اور اُس کی تعریف، غرض و موضوع سے نا آشنا اور اُس کے لوازمات و شرائط سے بے خبر حضرات کی دنیا ہی جدا ہے کہ ترجمۃ القرآن کے نام سے جو تحریر بھی اُن کے سامنے آ جائے اُسے معنوی قرآن سمجھنے پر مجبور ہیں جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

ترجمہ نمبر 8 کا بھی یہی حال ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ترجمہ کے الفاظ متن کی فنی حیثیت سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں تھے جبکہ اُس میں ترجمہ کے الفاظ متن کے لغوی مفہوم سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہیں کیوں کہ ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ میں مذکور لفظ ”الرَّحِیْمِ“ کا لغوی مفہوم بخشنے والے ہرگز نہیں ہے تو پھر ترجمہ نمبر 8 کے مذکورہ الفاظ کو اُس کے مطابق اور اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل کون کہہ سکتا ہے۔

یہی حال ترجمہ نمبر 20 کا بھی ہے کہ اس میں متن کے لفظ ”الرَّحْمٰنِ“ کا ترجمہ لفظ ”بخشنش کرنے والے“ کیا گیا ہے جو اُس کے لغوی مفہوم سے خلاف ہے تو پھر اُس کے قائم مقام ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔ نیز اس میں جار و مجرور یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ“ کے لیے عامل کے طور پر جملہ فعلیہ ”شروع کرتا ہوں“ کہنے کے بعد لفظ ”میں“ کا جو اضافہ کیا گیا ہے یہ اُردو محاورہ کے مطابق یہاں پر بے مصرف و بے محل ہے اور حشو و زوائد کے قبیل سے ہونے کی وجہ سے متن کے کسی لفظ کا قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہے۔

ترجمہ نمبر 1، 2، 3، 5، 6، 7، 9، 10، 12، 13، 15، 16، 17، 18، 19، 21، 22، 23،

24 غلط تراجم کی دوسری فہرست میں شامل ہیں جس میں ترجمہ کے الفاظ کی ہیئت اجتماعی کی نوعیت الفاظ متن کی اجتماعی نوعیت سے خلاف ہوتی ہے جس وجہ سے یہ اُس کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہوتی یہ تمام تراجم بھی ایسے ہی ہیں کہ ان میں اظہار حکم والا لفظ ”ہے“ نے ترجمہ کو مرکب تام بنادیا جبکہ متن مرکب تام نہیں ہے بلکہ صفت و موصوف کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے مرکب تام کہلانے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہے جسے علم نحو اور علم بلاغت سے کچھ مناسبت رکھنے والے بھی سمجھ سکتے ہیں

أصول ترجمہ

کہ یہاں پر لفظ ”اللہ موصوف ہے اور اُس کے بعد لفظ ”الرحمن، الرحیم“ بالترتیب اُس کی صفات ہیں جن کے مابین حکم و خبر اور حکایت کوئی شے نہیں ہے تو پھر اس کے ترجمہ میں لفظ ”ہے“ کہنے کا کیا جواز ہے جس میں حکم کا اظہار ہوتا ہے اور ہمیشہ مرکب تام و جملہ کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے ایسے میں تراجم کی یہ تمام شکلیں آپ ہی غیر معیاری ترجمہ کی دوسری قسم میں شامل ہوتی ہیں جو نہایت قابل افسوس ہے۔ اور 11، 14 غلط تراجم کی تیسری فہرست میں شامل ہیں جس میں ترجمہ کے الفاظ بھی الفاظِ متن کی کسی حیثیت سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہوتے اور ان کی اجتماعی نوعیت بھی اُس کی اجتماعی نوعیت سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہوتی یعنی متن کے ساتھ ترجمہ کی عدم مطابقت کی پہلی اور دوسری صورتوں کی انفرادیت نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے کہ عدم مطابقت کی دونوں صورتیں اکٹھی پائی جاتی ہیں ان ترجموں میں بھی ایسا ہی ہے۔

اس تفصیل کے ساتھ کہ ترجمہ نمبر 11 کے شروع میں لفظ ”کہو“ جو لکھا گیا ہے یہ ترجمہ کے اصولوں پر نہیں بلکہ تفسیروں میں بیان شدہ ایک احتمال پر مبنی ہے جسے حرف جار یعنی بسم اللہ کے ”ب“ کے لیے عامل کے طور پر مقدر سمجھا گیا ہے جس کی حیثیت محض احتمال اور درجہ امکان سے زیادہ نہیں ہے جس وجہ سے جمہور مفسرین نے اس پر توجہ ہی نہیں دی ہے جبکہ ترجمہ کسی خاص احتمال یا کسی مفسر کے قول پر بنا ہونے کے بجائے مستقل اصول و شرائط رکھتا ہے اور اس کے تمام الفاظ متن کے متیقن الفاظ کے تابع اور اُن پر متفرع ہوتے ہیں جبکہ یہاں پر ایسا نہیں ہے۔ نیز حرف جار ”ب“ کے لیے عامل کے طور پر اسے ترجمہ کا حصہ بنانے کے بعد دوسرا عامل ”میرا شروع کرنا ہے“ جو لکھا گیا ہے اس کا مصرف نہیں رہتا۔ نیز حرف جار کے لیے عامل کے طور پر فعل امر ”کہو“ اُس سے مقدم ذکر کرنے کے بعد حصر کے انداز میں ”بہت رحم کرنے والے کے نام سے ہی میرا شروع کرنا ہے“ جو لکھا گیا ہے یہ بھی بے مصرف ہے تو پھر ترجمہ کے ان الفاظ کو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے الفاظ کے مطابق اور اُن کے قائم مقام کون کہہ سکتا ہے عدم مطابقت کے اس

أصول ترجمہ

اعتبار سے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کا یہ پورا ترجمہ ”کہو اللہ بے حد مہربان بہت رحم کرنے والے کے نام سے ہی میرا شروع کرنا ہے“ آپ ہی غلط ترجموں کی پہلی قسم میں شامل ہو رہا ہے جبکہ لفظ ”ہے“ کا حکم اسے دوسری قسم میں شامل کر رہا ہے اور یہ دونوں قسمیں اکٹھی پائی جا رہی ہیں اس اعتبار سے یہ غلط ترجموں کی تیسری قسم میں بھی شمار ہو رہا ہے یعنی ”یک نہ شد و شد“۔

ترجمہ نمبر 14 بھی ایسا ہی بے ڈھنگا ہے کہ اس ”میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں“ کہنے میں لفظ ”میں“ بے مصرف ہے جو آیت کریمہ کے کسی لفظ سے بدل ہی نہیں ہے تو پھر اس کے مطابق اور قائم مقام ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے بلکہ اس کی حیثیت حشو و زوائد کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس اعتبار سے ”ہے“ جو لکھا گیا ہے یہ اسے دوسری قسم میں شامل کر رہا ہے اور یہ دونوں قسمیں ایک ہی متن کے ترجمہ میں جمع ہوئی ہیں اس اعتبار سے غلط تراجم کی تیسری قسم میں بھی شامل ہو رہا ہے۔

ترجمہ القرآن میں غلطیوں کی یہ بہتات اور بے اعتدالیوں کی یہ دلخراش مثالیں اس لیے بھی قابل افسوس ہیں کہ یہ کسی گمنام و بے اثر شخصیت اور علاقائی یا مقامی زبانوں میں لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ مملکت پاکستان کی قومی اور ہمہ گیر زبان ”اردو“ میں اُن مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم ہیں جو مختلف مسالک میں پیشوائیت رکھتے ہیں، علم و عرفان سے پہچانے جاتے ہیں اور علمی شہرت رکھتے ہیں یعنی

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمان

ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف کی مظلومیت اس حد تک محدود نہیں بلکہ علم و عرفان کے حوالہ سے گمنام و بے اثر حضرات نے بھی اس میدان کی مختلف زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے جو ترجمہ القرآن کے نام سے ہی سینکڑوں میں دستیاب ہیں، مشاہیر کے ان کارناموں سے اُن کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُن میں کیا کچھ نہ کیا گیا ہوگا۔ قرآن شریف کے نادان دوستوں کی اس کارستانی کو روکنے اور غلط سے بچا کر معیاری ترجمہ کی اہمیت اُجاگر کرنے کی غرض سے ہم ترجمہ کے اصول و شرائط کے نام سے یہ تحریر دنیا کے سامنے لا رہے ہیں تاکہ ترجمہ القرآن جیسے پُر خطر اور کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل کو آسان نہ سمجھا جائے، اسے بازیچہ اطفال نہ بنایا جائے، اس میں قدم

أصول ترجمہ

رکھنے سے پہلے عواقب و انجام کو پیش نظر رکھا جائے اور اس کی جملہ شرائط پر بالتفصیل نظر ڈال کر خود کو پرکھا جائے کہ اس کا حق پورا کرنے کا اہل بھی ہوں یا نہیں۔ تراجم قرآن میں غلطیوں کی یہ بہتات دیکھ کر مایوسی کے عالم میں اُمید کی کچھ کرن بھی نظر آ رہی ہے جسے ”ظَلُمْتُ بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ“ کی گھٹا ٹوپ اندھیرویوں میں اُجالا کہا جاسکتا ہے جو درج ذیل ہیں؛

❶ شاہ عبدالقادر دہلوی ”شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا۔“

❷ امام احمد رضا بریلوی ”اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا۔“

❸ مولانا امین احسن اصلاحی ”شروع خدائے رحمن رحیم کے نام سے۔“

❹ سید احمد سعید کاظمی ”اللہ نہایت رحمت والے بے حد رحم فرمانے والے کے نام سے۔“

غلط تراجم کی مذکورہ بہتات کے مقابلہ میں ان کی تعداد اگرچہ کم ہے بلکہ آٹے میں مقدار نمک سے بھی زیادہ نہیں ہے تاہم ان کا اعتدال نمک کے اعتدال کی طرح خوش کن ہے کہ ان میں ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے مفردات کا ترجمہ اُس کے مفردات کے مطابق اور ان کے قائم مقام ہو رہا ہے کہ ترجمہ کے کسی لفظ کو متن سے خلاف نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح ان کی اجتماعی نوعیت کو بھی اُس کی اجتماعی نوعیت سے خلاف کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے بلکہ ہر اعتبار سے ان پر ترجمہ کی تعریف بھی صادق آ رہی ہے اور موضوع کے کسی حال کو بھی غلط نہیں کہا جاسکتا اور ترجمہ القرآن کے غرض و غایت کے حوالہ سے بھی مفید و با مقصد ہیں جسے ہم قرآن شریف کی حفاظت کے لیے وعدہ الہی کا مظہر کہے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ ان سے ترجمہ القرآن کا ریکارڈ درست ہو رہا ہے۔ (فَجَزَاهُمْ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ)

نادان دوست کا کردار:- کچھ حضرات نے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ ”موضح القرآن“ کی اصلاح و تفصیل کے نام سے اور بعض نے امام احمد رضا کے ترجمہ ”کنز الایمان“ کی تسہیل کے نام سے خدمات انجام دینے کی جو کوششیں کی ہیں۔ حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ نادان دوست کے کردار سے مختلف نہیں ہے۔ اُن میں:

أصول ترجمہ

پہلا ترجمہ:- مولانا محمود الحسن کا موضح الفرقان ہے جس میں اُن کے اپنے الفاظ دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے اُس کے متعلق جو مقدمہ لکھا ہے اس میں تصریح ہے کہ یہ مستقل ترجمہ نہیں ہے بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن کے جو الفاظ متروک ہو چکے ہیں اُن کی جگہ رائج الوقت اور آسان الفاظ استعمال کیے جائیں گے یا جو مقامات حضرت شاہ صاحب کے اجمال کی وجہ سے ناقابل فہم تھے انہیں قابل فہم بنانے کے سوا کچھ اور اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اپنے ترجمہ سے متعلق یہ وضاحت کرنے کے بعد انہوں نے موضح الفرقان میں اپنے عمل کو حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کے مقابلے میں یعنی موضح الفرقان کو موضح القرآن کے ساتھ ایسی تشبیہ دی ہے جیسے دو سالہ میں کبیل کا رَفُو کیا جائے۔ کاش موضح الفرقان کے مصنف کو اس پاکیزہ عزم کی تکمیل کی توفیق میسر ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ مولانا محمود الحسن صاحب نے موضح القرآن کے جن جن الفاظ کو بدلا ہے یا جس جس اجمال کی تفصیل پیش کی ہے وہ جاہل بڑھیا کے ہاتھوں شاہین پر ہونے والی مہربانی سے مختلف نہیں ہے۔ جس کو مخمل میں ٹاٹ کی پیوند کاری کی نا انصافی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی افسوس ناک مثالوں کی ایک جھلک ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے ترجمہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا محمود الحسن کی رَفُو گری سے پہلے (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا) جو اصل کے مطابق اور معیاری ہے۔

مولانا محمود الحسن کی رَفُو گری کے بعد (شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے) جس میں لفظ ”ہے“ کا حکم لگا کر انجانے میں مرکب غیر تام کا ترجمہ مرکب تام میں کیا جس کی وجہ سے غیر معیاری اور اصل سے خلاف قرار پا رہا ہے۔

دوسرا ترجمہ:- مولانا مفتی عزیز احمد بدایونی کا ہے جس کے زیادہ سے زیادہ پندرہ فیصد الفاظ ان کے اپنے ہیں جبکہ باقی سب کچھ کنز الایمان کے ہیں کیوں کہ انہوں نے بھی پیش لفظ میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ کنز الایمان کے مشکل اور متروک الفاظ کے متبادل آسان اور رائج

أصول ترجمہ

الوقت الفاظ استعمال کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کروں گا لیکن مولانا بدایونی بھی مولانا محمود الحسن کی طرح اپنے اس پاکیزہ عزم میں فائز المرام نظر نہیں آتے ہیں کیونکہ کنزالایمان کے جن جن مقامات پر انہوں نے کچھ کمی بیشی کی ہے وہ نقصان سے خالی نہیں ہیں جن کی مثالوں سے مشتمل نمونہ از خروارے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے درج ذیل ترجمے دیکھے جاسکتے ہیں:

کنزالایمان والا ترجمہ مفتی عزیز احمد بدایونی کی تسہیل سے پہلے (اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا) جو معیاری ہے اور جملہ اعتراضات سے پاک و محفوظ ہے۔

کنزالایمان والا ترجمہ مفتی عزیز احمد بدایونی کی تسہیل کے بعد (اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے) جس میں ہے کا حکم لگا کر انجانے میں مرکبِ تام کا ترجمہ جملہ و کلام میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔

قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کی فطری شرائط سے آگاہ حضرات بالترتیب محمود الحسن کی رفوگری اور مفتی عزیز احمد بدایونی کی تسہیل پر غور کریں گے تو ان حضرات کے اس کردار کو بڑھیا کے ہاتھوں شاہین پر ڈھائے جانے والے مظالم سے مختلف نہیں پائیں گے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس بات کا ہے کہ بڑھیا نے شاہین پر اس کے ناخن، چونچ اور پر کاٹ کر ظلم کیا تھا جبکہ ان حضرات نے شاہ عبدالقادر اور امام احمد رضا خان کے معیاری ترجمہ کے آخر میں لفظ ”ہے“ کا حکم لگا کر انجانے میں مرکبِ غیر تام کا ترجمہ مرکبِ تام میں کر ڈالا جس کو سننے کے لیے لسانِ قرآنی کے اہل لغت تیار ہیں نہ اہل بلاغت اور سیبویہ اُسے گوارا کرتا ہے نہ تفتازانی کیونکہ مرکبِ تام اور غیر تام کے احکام ہر لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں تو پھر یہ حضرات اپنے مذکورہ پاک عزائم میں کس حد تک فائز المرام ہوئے ہیں اور کس حد تک حضرت شاہ عبدالقادر اور امام احمد رضا خان کی روح کو رنجیدہ کیا ہے اس کا فیصلہ وہی اہل فہم کر سکتے ہیں جو آیت کریمہ کی لغوی، نحوی اور بلاغی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان تراجم کا جائزہ لیں۔

مرکبِ غیر تام آیت کا ترجمہ لفظ ”ہے“ کا حکم لگا کر کلام و جملہ میں کرنے کی اس غلطی کا

أصول ترجمہ

پس منظر ہماری فہم کے مطابق دو وجہ سے خالی نہیں ہے:

پہلی وجہ:- یہ لکھتے وقت مترجمین نے مرکب تام اور مرکب غیر تام کی تمیز نہیں کی اور ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کی ترکیبی حیثیت کہ لفظ اللہ موصوف اور اس کے بعد لفظ ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور صفت و موصوف سے مجموع مرکب جملہ ہوتا ہے نہ کلام بلکہ وہ جملہ کے مقابلہ میں ہمیشہ مفرد ہوتا ہے جسے مرکب ناقص بھی کہا جاتا ہے اور اُس کا ترجمہ بھی ہمیشہ مفرد کے انداز میں ہوتا ہے ورنہ معیاری ترجمہ کہلائے گا نہ اصل کے مطابق بلکہ غلط محض کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا ظاہر ہے کہ متن کی حقیقت جاننے کے بغیر ترجمہ کرنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے جو ان تراجم کا ہوا ہے۔

دوسری وجہ:- یہ بھی ممکن ہے کہ مترجمین کو یہاں پر متن کے مرکب غیر تام ہونے کا احساس تھا یعنی وہ اس بات کو جانتے تھے کہ لفظ ”اللہ“ یہاں پر موصوف اور ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ بالترتیب اُس کی صفات ہیں لیکن احساس کے باوجود ترجمہ والی زبان کو آیت کریمہ کی لسانی حیثیت پر ترجیح دی اور اصل کو فرع کی تابع کرنے کی معکوس العملی کا ارتکاب کیا جو نہایت نامعقول و نامسموع ہے۔

الغرض ترجمہ کی حیثیت سے یہاں پر لفظ ”ہے“ کہنے کا جواز ہے نہ لکھنے کا تو ضیح بعد التوضیح یہ کہ نہ صرف ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ بلکہ قرآن شریف کی ہر آیت کے ترجمہ کی درستی اور اُسے با مقصد بنانے کے لیے ناگزیر ہے کہ ترجمہ کی تعریف، غرض، موضوع کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ جملہ شرائط کی بھی پابندی کی جائے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس آیت کا ترجمہ کرنا ہو اُس کے نزول سے مقصد کو سمجھا جائے ورنہ ترجمہ با مقصد نہیں ہو سکتا جس کے مطابق یہاں پر ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے نزول سے مقصد سلف صالحین کی روشنی میں دو طرح ہے:

پہلا مقصد:- اس سے جملہ خلایق کے وجود و آغاز بتانا ہے کہ دُنیا کی ہر شے کا وجود اور آغاز و شروع اللہ تعالیٰ کے کسی نہ کسی اسم سے مربوط ہے، اُس کا اثر ہے اور اُس کے بغیر لاشے و ہچ ہے

أصول ترجمہ

حضرت شیخ اکبر محمد بن عبد بن عربی نے اس کے مطابق لکھا ہے:

”ان الاسماء الالهية سبب وجود العالم وانها المسطرة عليه والموشرة لذلك كان ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ عندنا خبر، ابتداء مضمرة وهو ابتداء العالم وظهوره كانه يقول ظهور العالم ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ ای ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ ظهر العالم“ (۱)

بزرگان دین کی یہ تصریح خصوصیت مقام سے قطع نظر مطلق ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کے بارے میں ہے جس کے مطابق قرآن شریف کی سورتوں کے شروع میں مذکور ہونے والے ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ سے مقصد سورتوں کے مندرجات اور خطابات و احکام سے متعلق یہ بتانا ہے کہ یہ سب کچھ اسماء اللہ سے مربوط اور ان کے اثرات و تقاضے ہیں اور ہر حکم و مضمون کا اربعہ عناصر کے اس عالم ناسوت میں ظاہر ہونا، موجود ہونا اور انسانوں کو پہنچنے تک جملہ عوامل کا آغاز و شروع اسماء اللہ کے اثر سے ہے۔ ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کے نزول سے اس مقصد کا تعلق اسماء اللہ کی جامعیت سے ہے اس کے مطابق علم نحو اور بلاغت کی روشنی میں اس کی دو ترکیبیں ہو سکتی ہیں؛

پہلی ترکیب:- یہ خبر ہے مبتداء محذوف کے لیے تقدیر عبارت یوں ہوگی ”ابتداء العالم ثابت بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ اس صورت میں پوری ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ میں صرف ایک جملہ ہوگا جو حرف ”با“ سے مستفاد ہے جبکہ اسم جلالت اپنی دونوں صفات یعنی ”الرَّحْمَنِ، الرَّحِيمِ“ سے مل کر اسم کے لیے مضاف الیہ ہونے کے سوا کوئی اور ترکیبی حیثیت نہیں رکھتا چہ جائیکہ جملہ ہو۔

دوسری ترکیب:- اس میں ایک جملہ بھی نہیں ہے بلکہ حرف ”با“ کا تعلق شروع کے ساتھ ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی ”الابتداء بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ ظاہر ہے کہ ابتداء مصدر ہے

(۱) الفتوحات المکیہ، ج: ۱، ص: ۱۰۲، مطبوعہ دار صادر بیروت۔

أصول ترجمہ

جو فعل والا عمل تو کرتا ہے لیکن اپنے فاعل یا قائم مقام فاعل سے مل کر شبہ جملہ بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ جملہ ہو جو کسی نحو شناس سے پوشیدہ ہے نہ بلاغت شناس سے اس صورت میں اس کا معیاری ترجمہ (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بڑی رحمت والا، اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان نہایت رحمت والا) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جس میں ترجمہ کے الفاظ بھی متن کے الفاظ کے مطابق اور ان کے قائم مقام ہو رہے ہیں اور الفاظ ترجمہ کی اجتماعی نوعیت بھی اُس کی اجتماعی نوعیت کے مطابق اور اُس کے قائم مقام ہے کہ یہ بھی اُس کی طرح غیر جملہ ہے۔

دوسرا مقصد:- ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے نزول سے ایک مقصد انسانوں کو یہ تعلیم دینا بھی ہے کہ ہر جائز کام کی ابتدا اسی سے کریں اور کام اللہ تعالیٰ کے جس اسم کے زیر اثر ہو اُسی کی وساطت سے استعانت و برکت اور حسن انجام کی طلب ہو اس اعتبار سے یہ معنوی طور پر انشاء و دعا ہے اور علم نحو و بلاغت کے حوالہ سے اس میں بھی دو ترکیبیں ہو سکتی ہیں؛

پہلی ترکیب:- اس کے حرف ”با“ کا تعلق فعل سے ہوگا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی ”اَبْتَدِءُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ اس کے مطابق پوری ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ میں صرف ایک جملہ ہے جس کا معیاری ترجمہ (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان رحمت والا، شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا) جیسے کسی بھی جملہ فعلیہ کے انداز پر کیا جاسکتا ہے۔

دوسری ترکیب:- حرف جار ”با“ کا تعلق ابتداء سے ہوگا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی ”الابتداء بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ اس کا معیاری ترجمہ (شروع خدائے رحمان رحیم کے نام سے، اللہ نہایت رحمت والے بے حد رحم فرمانے والے کے نام سے، اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا، شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا) جیسے کسی بھی انداز

أصول ترجمہ

سے ہو سکتا ہے جس کے الفاظ مفردہ بھی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے مفرد الفاظ کے مطابق اور اُن کے قائم مقام ہو رہے ہیں اور ہیئت اجتماعی کی نوعیت بھی۔

جمہور مفسرین کی روشنی میں مذکورہ چاروں احتمالات کے مطابق ترجمہ کے یہ چاروں انداز بھی جملہ اعتراضات سے پاک و محفوظ ہیں مقصد نزول پر منطبق ہونے کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی تعریف پر بھی منطبق ہیں اور ترجمہ کی جملہ شرائط کے مطابق ہونے کے ساتھ با مقصد و معیاری ہونا ان سب میں قدر مشترک ہے کہ کسی ایک کو بھی غلط نہیں کہا جاسکتا۔ باقی رہا یہ تصور کہ ان میں سے رائج و مرجوح کا کیا تناسب ہے اور افضل و مفضل کی تفریق کیسی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہاں پر افضل و مفضل اور رائج و مرجوح کی تفصیل بیان کرنے کے درپے نہیں ہیں بلکہ ہمارا مقصد صحیح و سقیم کی تمیز بتانے کے ساتھ غلط ترجمہ کی راہوں کی نشان دہی اور صحیح ترجمہ کی صراط مستقیم بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کے مطابق ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے مترجمین کی غالب اکثریت کی اس اندھیرنگری میں رب الناس ﷺ نے اپنے کچھ بندوں کو صحیح ترجمہ کرنے کی بھی توفیق بخشی ہے جو درجنوں غلط تراجم سے برعکس مذکورہ چار انداز میں پائے جاتے ہیں۔ (فَلِلّٰهِ الْحَمْد)

دیباچہ الکتاب اور آغاز قرآن کی اس آیت کریمہ ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے غلط تراجم کی بہتات کے مقابلہ میں صرف مذکورہ چار کی صحت کا یہ نقشہ اور یہ تفصیل پورے قرآن شریف کے تراجم کے لیے مشتے نمونہ از خردارے ہے یہاں پر پھر بھی غنیمت ہے کہ غلط تراجم کی گھٹا ٹوپ اندھیروں میں چار کا اُجالا مل رہا ہے جبکہ آگے چل کر بعض مقامات کے تراجم میں ایک یا دو سے زیادہ صحیح و معیاری ترجمہ نہیں ملتے جو تمام شرائط پر پورے اُترتے ہو اور ترجمۃ القرآن کی تعریف اُن پر صادق آتی ہو نہ صرف اتنا بلکہ بعض مقامات کا ترجمہ اتنے خطرناک انداز سے کیا گیا ہے کہ صراحۃً معنوی تحریف ہیں۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کی بحث میں اور خاص کر موضوع کے احوال سے بحث کے حوالہ سے کلام قدرے طویل ہو گیا ہے جو

اصول ترجمہ

مقتضائے مقام ہے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کے موضوع یعنی آیات قرآنیہ کے کیے جانے والے ترجمہ کے الفاظ کی من حیث المطابقت وعدم مطابقت احوال کی مذکورہ تقسیم اور ہر قسم کی مذکورہ تفصیل اور ان کی عملی صورتوں کی جدا جدا مثالیں پیش کرنا ناگزیر تھا کیوں کہ ان کے بغیر بحث کا حق ادا ہونا ممکن نہیں تھا۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِيْ اِلٰى سَبِيْلِ الرَّشَادِ)

دوسری بحث:- ترجمۃ القرآن کے جواز اور عدم جواز سے متعلق ہے جو اس طرح ہے کہ کسی زمانہ میں قرآن شریف کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کے جواز وعدم جواز کی بحث چل گئی تھی اگرچہ مختلف بلدان و امصار کے علماء حق نے عدم جواز کے قول کو مسترد کر کے عملی طور پر کسی نہ کسی صورت میں ترجمہ قرآن کے عمل کو جاری رکھا تاہم کچھ کتابوں سے یہ آواز بازگشت اب بھی سنی جاتی ہے اس سلسلہ میں بے مقصد قیل و قال کی تطویل میں پڑنے یا علماء ہند کے عمل کو یا جامع از ہریا کسی بھی مکتبہ فکر کے عمل کو جواز کے لیے شرعی دلیل بنانے کی بے معنویت میں پڑنے سے بہتر یہ ہے کہ اس قصہ پارینہ کو نزاع لفظی پر محمول سمجھ کر عدم جواز کے قول کو مندرجہ ذیل کسی تاویل سے مؤل کیا جائے:

① انہوں نے متن اور قرآنی الفاظ کے بغیر محض اُن کے ترجمہ کو قرآن شریف کے طور پر متعارف کرانے کو ناجائز قرار دیا ہوگا۔

② انہوں نے معیاری ترجمہ کے لیے ناگزیر شرائط کی پابندی کیے بغیر ترجمہ کرنے کو ناجائز کہا ہوگا۔

③ اُن کی مراد غیر معیاری ترجمہ کرنا ہوگی جس کے عدم جواز میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے۔

④ اُن کے کلام میں ”لَا يَجُوزُ تَرْجُمَةُ الْقُرْآنِ“ سے مراد جواز فقہی نہیں بلکہ جواز عقلی ہے یعنی عدم امکان اور قرآن شریف کا ترجمہ ناممکن ہونے سے اُن کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ آیات قرآنی کے اندر موجود جملہ علوم و اسرار، اور تمام معارف و کمالات کا اظہار کرنا بشکل ترجمہ ممکن نہیں ہے تو اس میں بھی کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ جب عدم جواز ترجمہ کا قول کرنے والوں سے حُسن ظن رکھنے کے

أصول ترجمہ

اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے اُن کے قول کو اس قسم مصارف پر حمل کیا جاسکتا ہے تو پھر اس کا خیر سے مانع ہونے کے سوظن پر اصرار کرنے کا کیا جواز ہے جبکہ قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کا نہ صرف جواز بلکہ عام حالات میں اس کا فرض کفایہ ہونا اور مخصوص حالات میں فرض عین ہونا بجائے خود ناقابل انکار حقیقت ہے، یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ مقدس کتاب نہ صرف عرب کے لیے بلکہ جملہ اقوام عالم کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لِيَكُونَ لِلْعَلَمِينَ نَذِيرًا“ (الفرقان: 1) کہ سارے جہان کو ڈرسانے والا ہو۔

نیز فرمایا: ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا“ (۱)

اور اے محبوب! ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے خوشخبری دیتا اور ڈر سنا تا۔

نیز فرمایا: ”هَذَا بَلَّغُ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا“ (۲)

یہ لوگوں کو حکم پہنچانا ہے اور اس لیے کہ وہ اس سے ڈرائے جائیں۔

نیز فرمایا: ”وَأَوْحَىٰ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ“ (۳)

اور میری طرف اس قرآن کی وحی ہوئی ہے کہ میں اس سے تمہیں ڈراؤں اور جن جن کو پہنچے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے معیار تعلیم و نصاب تبلیغ کے طور پر تمام اقوام عالم کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے اور عرب کے علاوہ دوسری اقوام کی اس سے ہدایت پانے کی امکانی صورت اُن کی زبانوں میں اس کا ترجمہ، تشریح، تفسیر و تفہیم، ترجمانی و تاویل کرنے کے سوا کوئی اور نہیں ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن شریف کی تشریح، تفسیر اور تاویل و تفہیم اور ترجمانی میں سے ہر ایک ترجمہ کی نسبت آسان ہونے کے باوجود الفاظ قرآنی کے ترجمہ کی فہم پر موقوف ہے کہ جب تک آیات

(۱) السباء: 28۔

(۲) ابراہیم: 52۔

(۳) الانعام: 19۔

أصول ترجمہ

قرآنی کے مفردات سے لے کر مرکبات تک کی دوسری زبان میں فہم نہیں ہوگی اُس وقت تک تفسیر درست ہو سکتی ہے نہ تشریح اور تفہیم ممکن ہو سکتی ہے نہ تاویل، نہ ترجمانی گویا آیات قرآنی کے معیاری ترجمہ کی فہم ان سب کے لیے اصل الاصول ہے، عرب کے علاوہ جملہ اقوام عالم کی تعلیم و تبلیغ کے لیے بنیاد ہے اور مقصد نزول قرآن کی تکمیل ہے۔ ایسے میں اسے ناجائز کہنے کا کوئی تصور ہی نہیں رہتا البتہ معیاری و غیر معیاری کی تمیز بھی فرض لازم ہے جس کے ذمہ دار و مسئول علماء کرام کے سوا کوئی اور نہیں ہیں۔

ہماری طرف سے تاویل اور حسن ظن کا یہ انداز ان حضرات کے بارے میں ہے جنہوں نے ”لا یجوز“ اور ”لا یمکن“ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں جبکہ کچھ متاخرین حضرات نے صریح الفاظ میں اسے حرام قرار دیا ہے جسے معقول کہا جاسکتا ہے نہ جائز۔ مثال کے طور پر السعودیہ العربیہ کے شہر ریاض میں قضاء کے لیے جو درس گاہ بنام المعهد العالی للقضاء ہے اُس کے مدیر عالی جناب مناع القطان نے مباحث فی علوم القرآن کے نام سے کتاب لکھی ہے جس کے صفحہ 285 تا 290 میں ترجمۃ القرآن سے بحث کی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے، لکھا ہے؛

”لا یجد المرء ادنی شبهة فی حُرْمَةِ تَرْجُمَةِ الْقُرْآنِ تَرْجُمَةً حَرْفِیَّةً فَالْقُرْآنُ کَلَامُ اللَّهِ الْمَنْزُولِ عَلَى رَسُولِهِ الْمُعْجِزُ بِالْفَاطِظِ وَمَعَانِیْهِ الْمُتَعَبَّدُ بِتَلَاوْتِهِ وَلَا یَقُولُ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ انَ الْکَلِمَةُ مِنَ الْقُرْآنِ إِذَا تَرْجُمَتْ یَقَالُ فِیْهَا نَهَامٌ کَلَامُ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ یَتَکَلَّمْ إِلَّا بِمَا نَتَلُوهُ بِالْعَرَبِیَّةِ وَلَنْ یَتَأَنَّى الْإِعْجَازُ بِالْتَرْجُمَةِ لِأَنَّ الْإِعْجَازَ خَاصٌّ بِمَا أَنْزَلَ بِاللُّغَةِ الْعَرَبِیَّةِ وَالَّذِی یَتَّقِیْهِ بِتَلَاوْتِهِ هُوَ ذَلِكَ الْقُرْآنُ الْعَرَبِیُّ الْمُبِینُ بِالْفَاطِظِ وَحُرُوفِهِ وَتَرْتِیبِ کَلِمَاتِهِ فَتَرْجُمَةُ الْقُرْآنِ الْحَرْفِیَّةُ عَلَى هَذَا مَهْمَا كَانَ الْمُرْجِمُ عَلَى دِرَايَةِ بِاللُّغَاتِ وَاسَالِیْبِهَا وَیَتَرَاکِیْبِهَا تَخْرِجُ الْقُرْآنَ عَنْ أَنْ یَكُونَ قُرْآنًا“

اس کے بعد لکھا ہے؛ ”ان ترجمۃ المعانی الاصلیة لا تخلو عن فساد فان اللفظ

أصول ترجمہ

الواحد في القرآن قد يكون له معنيان او معان تحتملها الآية فيضع المترجم لفظا يذل على معنى واحد حيث لا يجد لفظا يشاكل واللفظ العربي في احتمال تلك المعاني المتعدده وقد يستعمل القرآن اللفظ في معنى مجازي فيأتي المترجم بلفظ يرادف اللفظ العربي في معناه الحقيقي ولهذا ونحوه وقعت اخطاء كثيرة فيما فيما ترجم لمعاني القرآن“ (۱)

ظاہر ہے کہ محترم مناع القطان کے اس کلام کے پہلے حصہ میں ترجمہ کی جس قسم کو ”الترجمة الحرفية“ سے تعبیر کرنے کے بعد حرام قرار دیا ہے اس سے مراد وہی ہے جسے برصغیر پاک و ہند کے کچھ اہل علم تحت اللفظ ترجمہ کہتے ہیں جس کی حقیقت ترجمۃ القرآن ہرگز نہیں بلکہ ترجمۃ الفاظ القرآن ہے جبکہ ترجمۃ القرآن اور ترجمۃ الفاظ القرآن میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کلام اللہ کے مظہر کا ترجمہ ہوتا ہے جو نہ صرف الفاظ بلکہ الفاظ و معانی سے مجموعہ مرکب ہے الفاظ اپنے معانی پر دلالت کرنے کی حیثیت سے اور معانی الفاظ کے مدلول ہونے کی حیثیت سے اور ترجمۃ الفاظ القرآن جسے ”الترجمة الحرفية“ اور ”ترجمہ تحت اللفظ“ جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے قرآن کا نہیں بلکہ اس کے صرف حصہ الفاظ کا ترجمہ ہوتا ہے۔ یعنی مرکب تام اور کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ قرآن شریف کے الفاظ من حیث الالفاظ المرتبة کی جگہ ترجمہ والی زبان سے الفاظ لائے جاتے ہیں جس پر حرام کا دفعہ لگانا تعجب کا باعث ہونے کے ساتھ قابل افسوس بھی ہے میری حیرت کی انتہا ہو رہی ہے کہ المعهد العالی للقرآن کی مدیریت جیسے عظیم منصب پر فائز شخص کا ایسی فضول بات لکھنا المیہ سے کم نہیں ہے۔

دوسرے حصہ میں ترجمہ کی جس قسم کو ”ترجمة المعاني الاصلية“ کے عنوان سے ذکر کرنے کے بعد اس پر فساد کا حکم لگایا ہے دراصل یہ ترجمۃ القرآن کا وہ محور ہے جس کے ارد گرد اس کی تعریف، غرض، موضوع چکر لگا رہے ہیں اس کے بغیر ترجمۃ القرآن کا تصور ہو سکتا ہے نہ اس

أصول ترجمہ

سے غرض و غایت کا اور معانی اصلہ سے مراد قرآنی آیات کے وہ مدلول ہیں جنہیں مفہوم اول بھی کہا جاتا ہے جنہیں اہل لسان محض سننے اور پڑھنے سے ہی پہچان جاتے ہیں اور غیر اہل لسان یعنی اہل عجم اُن علوم و فنون کے واسطہ سے پہچانتے ہیں جنہیں قرآن فہمی کے لیے علوم آلیہ کہا جاتا ہے جیسا علم تصریف، علم اشتقاق، علم متن لغت، علم النحو، علم المعانی، علم البیان، علم البدیع وغیرہ اور قرآن شریف کے ترجمہ سے اصل مقصد بھی اسی کے ساتھ مربوط ہے کہ ترجمہ کرنے والے کی غرض و غایت قرآنی آیات کے بنیادی اور اصل معانی سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جس کے نہ صرف جواز پر بلکہ حسب ضرورت فرض لازم ہونے پر بھی عملی اجماع چلا آ رہا ہے جیسا امام ابو اسحاق الشاطبی المتوفی 790ھ نے لکھا ہے:

”وكان ذلك جائزًا باتفاق اهل الاسلام فصار هذا الاتفاق حجة في صحة الترجمة على المعنى الاصلی“ (۱)

یعنی قرآنی آیات کے مفہوم اول کے اعتبار سے ترجمہ کے جائز ہونے پر اہل اسلام کا اتفاق ہے تو یہ اتفاق مفہوم اول کے اعتبار سے ترجمہ کے جائز ہونے پر حجت بن گیا۔

ایسے میں مباحث فی علوم القرآن کے مصنف ”مناع القطان“ کا اسے ”لا یخلو عن فساد“ کہنا بجائے خود فساد ہے، نہ صرف امام الشاطبی سے بلکہ جمہور اسلام سے خلاف ہے اور ترجمۃ القرآن کی نہ صرف جوازی صورت سے بلکہ واجبی نوعیت سے بھی انحراف ہے تو پھر اسے لغو اور بے مصرف کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ اسی طرح مباحث فی علوم القرآن کے محولہ صفحات کے تیسرے مقام پر یہ کہنا کہ ”وترجمة معانی القرآن الثانوية امر غیر میسور“ یہ بھی بے مصرف ہے کیوں کہ نظم قرآن کے اعجازی پہلو سے لے کر اُس کی لسانی حلاوت تک اور امتیازی خصوصیات سے لے کر اُس کی لپیٹ میں پوشیدہ رموز و اسرار تک جتنے بھی معارف ہیں یہ سب کے سب اُس کے ثانوی مفہوم کے ساتھ متعلق ہیں۔ جو عام انسانوں کی فہم سے ماوراء ہونے کی بنا پر ترجمۃ القرآن سے جو غرض

(۱) الموافقات للشاطبی، ج: 1، ص: 239، مطبوعہ دارالکتب العربی بیروت۔

أصول ترجمہ

وغایت ہوتی ہے وہ بھی اس سے متعلق نہیں ہوتی کیوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے سے بنیادی مقصد اُس کے مفہوم اول سے دوسری زبان والوں کو آشنا کرنا ہوتا ہے کہ اُسے سمجھ کر اُس کے مطابق عقیدہ رکھیں اور عمل کریں جب ثانوی مفہوم اور اُس کے متعلقات عام انسانوں کی رسائی فہم اور اُن کے علم و عمل سے ماوراء ہیں تو پھر اُن کے ترجمہ کرنے کا کیا تصور باقی رہتا ہے ظاہر ہے کہ ترجمہ القرآن کی تعریف اُن سے متعلق ہے نہ غرض وغایت۔ نیز ترجمہ القرآن تبلیغ اسلام اور تعلیم قرآن کے قبل سے ہے جو عام انسانوں کے لیے ہوتی ہے جبکہ ثانوی مفہوم عام انسانوں کی تعلیم و تبلیغ کے لیے نہیں ہوتی تو پھر اُس کے ترجمہ کا کون سا مصرف باقی رہتا ہے۔

اسی طرح مصنف کے کلام کا چوتھا حصہ جس میں مخصوص عنوان ”الترجمة التفسيرية“ کے تحت لکھا ہے ”ويحق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذا قاموا بتفسير للقرآن يتوخى فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح ثم يترجم هذا التفسير بامانة وبراعة فان هذا يقال فيه“ ترجمه تفسير القرآن او ”ترجمة تفسيرية بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلغة أخرى ولا بأس بذلك“ یہ بھی بے مصرف اور غلط ہے اور ترجمہ القرآن کو مفسرین کی متضاد آراء کا تابع کرنے کے مترادف ہے حالاں کہ یہ کسی مفسر کی رائے اور اُس کی ترجیح کے تابع ہونے کے بجائے مستقل فن ہے جو اپنی شرائط اور اصول رکھتا ہے اور تفسیر سے جدا اور مستقل تعریف، غرض اور موضوع رکھتا ہے۔ اور عرف عام میں معنوی قرآن سمجھا جاتا ہے اور بغیر طہارت کے عدم جوازِ مس کے حوالہ سے قرآن جیسے احکام رکھتا ہے۔

حقائق کی اس روشنی میں کسی مفسر کی مخصوص رائے پر مبنی کسی تفسیر کو یا اُس کی تشریح کو ترجمہ القرآن قرار دینے کا کیا تصور باقی رہتا ہے جبکہ خود تفسیر کے احکام ترجمہ کے احکام سے جدا ہیں اور ان کی تعریف، غرض، موضوع بھی جدا ہیں جب کسی تفسیر و تشریح کو ترجمہ القرآن کہنا جائز نہیں ہے تو پھر تشریح کی تشریح کو یا کسی تفسیر کی تشریح و تعبیر کو ترجمہ القرآن کے طور پر متعارف کرنے کا کیا جواز ہے۔ الغرض ترجمہ القرآن کے حوالہ سے مباحث فی علوم القرآن کے مصنف

أصول ترجمہ

مناع القطان کا یہ مضمون نہ صرف اسلام کی فکر سے خلاف ہے بلکہ الترجمة التفسیریہ کے نام سے قرآن شریف کی معنوی تحریف کرنے کے لیے راستے کھولنے کے مترادف بھی ہے کہ جس کے ذہن میں تفسیر کے نام سے جو کچھ آئے اُس کے مطابق قرآن شریف کا ترجمہ کرے گا اور ہر مبتلاء بدعت اپنی ترجیح کو آیات قرآنیہ کی تفسیر و تشریح قرار دے کر ترجمہ کو اُس پر بنا کرے گا، اُسے تفسیری ترجمہ اور معنوی قرآن کہہ کر التباس الحق بالباطل کرے گا جو احبار و رہبان کے ہاتھوں تورات و انجیل پر ہونے والے مظالم سے مختلف نہیں ہوگا۔ موصوف کا یہ مضمون اس لیے بھی قابل افسوس ہے کہ اس میں ترجمۃ القرآن کی ناقابل فہم تعریف کرنے کے بعد چار قسموں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے اُس کے ماتحت چار قسمیں بتائی ہیں۔ اور اُس قسم کو فساد سے خالی نہ کہہ کر ناجائز ہونے کا تاثر دیا ہے جو پیشروان اسلام کی نگاہ میں متفقہ طور پر جائز ہے اور قرآن شریف کی تفسیر و تاویل اور ترجمانی کرنے کے لیے اصل الاصول ہے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ موصوف کے اس پورے مضمون کو من و عن یہاں پر نقل کرنے کے بعد اُس کے مالہ و ماعلیہ کا تجزیہ پیش کریں وہ یوں ہے؛

”ونشأت دولة الدولة الإسلامية في جزيرة العرب، ولا شك ان اللغة تحيا بحياة امتها وتموت بموتها، فكانت نشأة الدولة الإسلامية على هذا النحو حياة للغة العرب، فالقرآن وحى الاسلام، والاسلام دين الله المفروض، ولن يتأتى معرفة اصوله واسسه الا اذافهم القرآن بلغته، فاخذت موجة الفتح الاسلامى تمتد الى الالسنة الاخرى الاعجمية، فتعربها بالاسلام، وصار لزاما على كل من يدخل فى حوزة هذا الدين الجديد ان يستجيب له فى لغة كتابه باطنا وظاهرا، حتى يستطيع القيام بواجباته، ولم يكن هناك حاجة الى ترجمة القرآن له مادام القرآن قد ترجم لسانه وعربه ايماناً وتسليماً۔

أصول ترجمه

معنى الترجمة

والترجمة تطلق على معنيين:

اولهما: الترجمة الحرفية: وهى نقل الفاظ من لغة الى نظائرها من اللغة الاخرى بحيث يكون النظم موافقا للنظم، والترتيب موافقا للترتيب.

ثانيهما: الترجمة التفسيرية او المعنوية: وهى بيان معنى الكلام بلغة اخرى من غير تقييد بترتيب كلمات الاصل او مراعاة لنظمه.

والذين على بصر باللغات يعرفون ان الترجمة الحرفية بالمعنى المذكور لا يمكن حصولها مع المحافظة على سياق الاصل والاحاطة بجميع معناه. فان خواص تلك اللغة تختلف عن الاخرى فى ترتيب اجزاء الجملة. فالجملة الفعلية فى اللغة العربية تُبدءُ بالفعل فالفاعل فى الاستفهام وغيره، والمضاف مقدم على المضاف اليه، والموصوف مقدم على الصفة، الا اذا اريد الاضافه على وجه التشبيه مثلا كلجين الماء، او كان الكلام من اضافة الصفة، الى معمولها كعظيم الامل، وليس الشأن كذلك فى سائر اللغات.

والتعبير العربى يحمل فى طياته من اسرار اللغة ما لا يمكن ان يحل محله تعبير آخر بلغة اخرى، فان الالفاظ فى الترجمة لا تكون متساوية المعنى من كل وجه فضلا عن التراكيب.

والقرآن الكريم فى قمة العربية فصاحة وبلاغة، وله من خواص التراكيب واسرار الاساليب ولطائف المعنى، وسائر آيات اعجازه ما لا يستقل بادائه لسان.

حكم الترجمة الحرفية

ولهذا لا يجزئ المرء ادنى شبهة فى حرمة ترجمة القرآن ترجمة حرفية، فالقرآن كلام الله المنزل على رسوله المعجز بالفاظه ومعانيه المتعبد بتلاوته، ولا يقول

أصول ترجمه

احد من الناس ان الكلمة من القرآن اذا ترجمت يقال فيها انها كلام الله، فان الله لم يتكلم الا بمأنتلوه بالعربية، ولن يتأتى الاعجاز بالترجمة، لان الاعجاز خاص بما انزل باللغة العربية. والذي يتعبد بتلاوته هو ذلك القرآن العربى المبين بِالْفَاطِظِ وحروفه وترتيب كلماته.

فترجمة القرآن الحرفية على هذا مهما كان المترجم على دراية باللغات واساليبها وتراكيبها تخرج القرآن عن ان يكون قرآنا.

الترجمة المعنوية

القرآن الكريم وكذا كل كلام عربى بليغ. له معان اصلية، ومعان ثانوية. والمراد بالمعانى الاصلية المعانى التى يستوى فى فهمها كل من عرف مدلولات الالفاظ المفردة وعرف وجوه تراكيبها معرفة اجمالية. والمراد بالمعانى الثانوية خواص النظم التى يرتفع بها شان الكلام. وبها كان القرآن معجزا.

فالمعنى الاصلى لبعض الآيات قد يوافق فيه منشور كلام العرب او منظومه، ولا تمس هذه الموافقة اعجاز القرآن، فان اعجازه بيديع نظمه وروعة بيانه، اى بالمعنى الثانوى. واياه عنى الزمخشري فى كشفه بقوله: "ان فى كلام العرب. خصوصا القرآن. من لطائف المعانى مالا يستقل بادائه لسان".

حكم الترجمة المعنوية

وترجمة معانى القرآن الثانوية امر غير ميسور، اذ انه لا توجد لغة توافق اللغة العربية فى دلالة الفاظها على هذه المعانى المسماة عند علماء البيان خواص التراكيب، وذلك مالا يسهل على احد ادعاؤه. وهو ما يقصده الزمخشري من عبارته السابقة.

أصول ترجمه

فوجوه البلاغة القرآنية في اللفظ أو التركيب - تنكيراً وتعريفاً، أو تقديمًا وتأخيرًا، أو ذكرًا وحذفًا، إلى غير ذلك مما تسامت به لغة القرآن، وكان له وقعه في النفوس - هذه الوجوه في بلاغة القرآن لا يفنى بحققها في أداء معناها لغة أخرى، لأن أي لغة لا تحمل تلك الخواص -

أما المعاني الأصلية فهي التي يمكن نقلها إلى لغة أخرى - وقد ذكر الشاطبي في الموافقات المعاني الأصلية والمعاني الثانوية ثم قال: "إن ترجمة القرآن على الوجه الأول، يعني النظر إلى معانيه الأصلية ممكن، ومن جهته صح تفسير القرآن وبيان معانيه للعامة ومن ليس لهم فهم يقوى على تحصيل معانيه - وكان ذلك جائزًا باتفاق أهل الإسلام، فصار هذا الاتفاق حجة في صحة الترجمة على المعنى الأصلي" -

ومع هذا فإن ترجمة المعاني الأصلية لا تخلو من فساد فإن اللفظ الواحد في القرآن قد يكون له معنيان أو معان تحتملها الآية فيضع المترجم لفظًا يدل على معنى واحد حيث لا يجد لفظًا يشاكل اللفظ العربي في احتمال تلك المعاني المتعددة -

وقد يستعمل القرآن اللفظ في معنى مجازي فيأتي المترجم بلفظ يرادف اللفظ العربي في معناه الحقيقي ولهذا ونحوه وقعت أخطاء كثيرة فيما ترجم لمعاني القرآن -

وما ذهب إليه الشاطبي واعتبره حجة في صحة الترجمة على المعنى الأصلي ليس على إطلاقه، فإن بعض العلماء يخص هذا بمقدار الضرورة في ابلاغ الدعوة - بالتوحيد واركاز العبادات، ولا يتعرض لما سوى ذلك، ويؤمر من أراد الزيادة بتعلم اللسان العربي -

أصول ترجمه

الترجمة التفسيرية:-

ويحق لنا ان نقول: ان علماء الاسلام اذا قاموا بتفسير للقرآن، يتوخى فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح، ثم يترجم هذا التفسير بامانة وبراعة، فان هذا يقال فيه "ترجمة تفسير القرآن" او "ترجمة تفسيرية" بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلغة اخرى. ولا بأس بذلك، فان الله تعالى بعث محمدا ﷺ برسالة الاسلام الى البشرية كافة على اختلاف اجناسها والوانها "وكان النبي يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى الناس كافة" وشرط لزوم الرسالة البلاغ، والقرآن الذي نزل بلغة العرب صار ابلاغه للامة العربية ملزمالها، ولكن سائر الامم التي لا تحسن العربية، او لا تعرفها يتوقف ابلاغها الدعوة على ترجمتها بلسانها. وقد عرفنا قبل استحالة الترجمة الحرفية وحرمتها. واستحالة ترجمة المعاني الثانوية، ومشقة ترجمة المعاني الاصلية وما فيها من اخطار، فلم يبق الا ان يترجم تفسير القرآن الذي يتضمن اسس دعوته بما يتفق مع نصوص الكتاب وصريح السنة الى لسان كل قبيل حتى تبلغهم الدعوة وتلزمهم الحجة. وترجمة تفسير للقرآن على نحو ما ذكرنا يصح ان نسميها بالترجمة التفسيرية. وهي تختلف عن الترجمة المعنوية وان كان الباحثون لا يفرقون بينهما، فان الترجمة المعنوية توهم ان المترجم اخذ معاني القرآن من اطرافها ونقلها الى اللغة الاجنبية، كما يقال في ترجمة غيره: ترجمة طبق الاصل. فالمفسر يتكلم بلهجة المبين لمعنى الكلام على حسب فهمه، فكأنه يقول للناس: هذا ما افهمه من الآية، والمترجم يتكلم بلهجة من احاط بمعنى الكلام وصبه في الفاظ لغة اخرى. وشتان بين الامرين. فالمفسر يقول في تفسير الآية: يعنى كذا، ويذكر فهمه الخاص. والمترجم يقول: معنى هذا الكلام هو عين معنى الآية، وقد عرفنا ما في ذلك.

أصول ترجمه

وينبغي ان يؤكد في الترجمة التفسيرية انها ترجمة لفهم شخصي خاص، لا تتضمن وجوه التاويل المحتملة لمعاني القرآن، وانما تتضمن ما ادركه المفسر منها، وبهذا تكون ترجمة للعقيدة الاسلاميه ومبادئ الشريعة كما تفهم من القرآن.

واذا كان ابلاغ الدعوة من واجبات الاسلام فان ما يتوقف على هذا البلاغ من دراسة اللغات ونقل اصول الاسلام اليها واجب كذلك. كما ان معرفتنا لهذه اللغات بالقدر الضروري تمكننا من دراسة كتبها للرد على المبشرين والمستشرقين الذين غمزوا عود الاسلام من بعيد او قريب، وهذا هو ما عناه شيخ الاسلام ابن تيمية في كتابه "العقل والنقل" عندما قال: "واما مخاطبة اهل الاصطلاح باصطلاحهم ولغتهم فليس بمكروه اذا احتيج الى ذلك، وكانت المعاني صحيحة. كمخاطبة العجم من الروم والفرس والترك بلغتهم وعرفهم، فان هذا جائز حسن للحاجة، وانما كرهه الائمة اذالم يحتج اليه" ثم قال: "ولذلك يترجم القرآن والحديث لمن يحتاج الى تفهمه اياه بالترجمة، وكذلك يقرأ المسلم ما يحتاج اليه من كتب الامم وكلامهم بلغتهم، ويترجم بالعربية، كما امر النبي ﷺ زيد بن ثابت ان يتعلم كتاب اليهود ليقرأ له ويكتب له ذلك. حيث لم ياتمن اليهود عليه".

واذا كانت الترجمة بمعناها الحقيقي ولو للمعاني الاصلية لا تيسر في جميع آيات القرآن. وانما المتيسر الترجمة على معنى التفسير كان من الضروري اشعار القارئ بذلك، ومن وسائله كتابة جمل في حواشي الصحائف يبين بها ان هذا الحد وجوه او ارجح وجوه تحتملها الآية "ولو قامت جماعة ذات نيات صالحة وعقول راجحة. وتولت نقل تفسير القرآن الى بعض اللغات الاجنبية، وهي على بينة من مقاصده وعلى رسوخ في معرفة تلك اللغات، وتحامت الوجوه التي دخل منها الخلل في التراجم السائرة اليوم في او ربا لفتحت لدعوة الحق سبيلا كانت مقفلة.

أصول ترجمه

ونشرت الحنفية السمحة في بلاد طافحة بالغواية قائمة“.

أقول عَلَيْهِ الكلام من وجوه **(الاول)** على قوله ”ولم يكن هناك حاجة الى ترجمة القرآن له“ لان الاعاجم الذين لم يشافهوا النبي ﷺ ولم يشاهدوا دواعي الايمان وبواعثه ولم يدخلوا في الاسلام بتأليف القلوب ولا بالحبر ولا بتحول الاحوال وتبدل الظروف.

بل دخلوا في الاسلام بدعوة الداعين النوايين له ﷺ والمبلغين بالقرآن وظاهران التبليغ القرآني للاعاجم لا يمكن بدون ترجمة القرآن بشتى معانيه فانفعالهم الايمانى موقوف على سماع ترجمة القرآن وفهمه بمعنى لو لم يسمعوا ولم يفهموا معانيه الأول التى يقال لها المفهوم الأول لامتنع الايمان به فهم محتاجون لامحالة فى فهم القرآن الى ترجمته بالمعنى المتعارف او بمعنى التعبير الترجمانى عنه فكيف قولك ”ولم يكن هناك حاجة الى ترجمة القرآن له“ وايضا ليس بضرورى لكل من يدخل فى الاسلام ان يعلم لسان القرآن ولغته كما هو المشاهدة فى الاعاجم المتداخلين فى حصار الاسلام لان دخولهم فى الاسلام و ايمانهم به يستلزم حبهم للقرآن والتعظيم له ويعلم كل انسان ان تعلم لسان القرآن لا يلزم حبه ولا تعظيمه والا لا يرى من مسلمى الاعاجم احد فى الدنيا لا يعلم العربية وهو خلاف الواقع مدى الايام من بدء اشاعة الاسلام الى الآن. فعامة الاعاجم وجمهورهم يحتاجون الى ترجمة القرآن بالمعنى المتعارف او بمعنى التعبير من العربى الى لغتهم او بمعنى الترجمانى لافرق بين مسلمهم وغير مسلمهم الا ان التبليغ القرآنى المبني على الترجمة للمسلم لتكميل مقتضيات الايمان ولغير المسلم لدخوله فى الاسلام ولا سبيل لنفى هذا الافتقار بتقدم الزمان وتأخره ولا بتبدل الظروف والاحوال لان الحقائق لا تتبدل بتبدل الظروف

أصول ترجمه

واقتضاء الاحوال وفي ضوء هذه الحقائق لا يبقى للقول المذكور لمصنف مباحث في علوم القرآن أي جواز.

﴿والثاني﴾ على قوله (والترجمة تطلق على معنيين)

اولهما:- الترجمة الحرفية: وهي نقل الفاظ من لغة الى نظائرها من اللغة الاخرى بحيث يكون النظم موافقا للنظم، والترتيب موافقا للترتيب.

ثانيهما:- الترجمة التفسيرية او المعنوية: وهي بيان معنى الكلام بلغة اخرى من غير تقييد بترتيب كلمات الاصل او مراعاة لنظمه.

والذين على بصر باللغات يعرفون ان الترجمة الحرفية بالمعنى المذكور لا يمكن حصولها مع المحافظة على سياق الاصل والاحاطة بجميع معناه

اقول اولاً:- على تقسيمه المذكور لانه مع عدم النقل عن الاسلاف خلاف

المشهور لان المشهور هو ترجمة الالفاظ وترجمة الكلام والمراد من ترجمة الالفاظ ترجمة الفاظ القرآن امام قطع النظر عن كونها كلاما واجزاء الكلام

واما مع اعتبار عدمهما ومن ترجمة الكلام ترجمة القرآن من حيث انه كلام الله المجموع المركب من الالفاظ والمعاني وترجمة الفاظ القرآن ليس

لها الاحكام التشريع والتعبير عن معانيه اللغوية بلغة اخرى فضلا عن الاحاطة بجميع معناه وعن المحافظة على سياق الاصل لانهما يكونان في ترجمة

القرآن لافي ترجمة الفاظ القرآن فقوله "لا يمكن حصولها مع المحافظة على سياق الاصل والاحاطة بجميع معناه" لا يبقى له مصرف الجواز وظني الغالب

والله اعلم ان المصنف بنى قوله هذا على عدم التمييز بين ترجمة الفاظ القرآن وترجمة القرآن فلا يغلط ان يقال ان قوله هذا بناء الغلط على الغلط.

وثانياً:- على قوله "بحيث يكون النظم موافقا للنظم والترتيب موافقا

أصول ترجمه

لترتيب“لان موافقة الترتيب بين الترجمة و المتن معتبر في ترجمة القرآن لافي ترجمة الفاظ القرآن مع انه تكرار محض بلا فائدة لان النظم بمعنى الالفاظ لا يفهم بلا ترتيب فذكر الترتيب بعده لا يخلو عن التكرار لارائحة فيه من المفاد۔

وثالثاً:- على قوله “الترجمة التفسيرية او المعنوية“ لانه غير ماثور عن الاسلاف وكيف يصح نسبة الترجمة الى التفسير او الى المعنى وهي صفة الالفاظ لا التفسير ولا المعنى لانها تستعمل على معنيين الاول المعنى المصدري المتعارف “ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الاخر التي تقوم مقامها“ والثاني مجموعة الالفاظ العوضية التي هي موضوع ترجمة القرآن المبحوث عن عوارضاتها الذاتية مثل الصحة والسقم والفصيح وغير الفصيح وغيرها ولا ينسب احدهذين المعنيين الى احدهما من التفسير والمعنى فضلا الى كليهما فهذا الاصطلاح الجديد “الترجمة التفسيرية والمعنوية“ لا يخلو عن بدعة فلا ينبغي الاصغاء اليه۔

﴿والتالث﴾ على قوله “والتعبير العربي يحمل في طياته من اسرار اللغة ما لا يمكن ان يحل محله تعبير اخر بلغة اخرى فان الالفاظ في الترجمة لا تكون متساوية المعنى من كل وجه فضلا عن التراكيب“ بانه صريح في ان الكلام كل الكلام كلام الله او كلام الناس في اللغة العربية لا يمكن ترجمتها بلغة اخرى وهذا ظاهر البطلان كما ترى في صحة ترجمة “بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ بالاردوى “الله کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا، شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان رحم والا“ فانظر بنظر الانصاف في ضوء شرائط الترجمة هل ترى فيهما من فطور وهكذافي ترجمة سورة الفاتحة (الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا

أصول ترجمه

الضَّالِّينَ)۔ (سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہاں والوں کا بہت مہربان رحمت والا روز جزا کا مالک ہم تجھی کی عبادت کریں اور تجھی سے مدد چاہیں ہمیں سیدھا راستہ چلا راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا، سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہاں کا بے حد مہربان نہایت رحم والا مالک روز جزا کا، ہم تجھ ہی کی عبادت کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں چلا ہم کو راہ سیدھی راہ اُن کی جن پر تو نے انعام کیا نہ ان کی جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کی) لایوجد فی احدہاتین الترحمتین شیء یكون خلاف الآیة ولا خلاف الشرائط وَالْفَاضِلُ الْمَفْرَدَةُ تَقُومُ الْفَاضِلُ الْمَفْرَدَةُ فِي جَمِيعِ آيَاتِ السُّورَةِ وَالْهَيْئَةُ الْجَمَاعِيَّةُ مِنْهُمَا تَطَابِقُ الْهَيْئَةَ الْجَمَاعِيَّةَ لِلْأَصْلِ وَتُفْهَمُ مِنْهُمَا الْمَعْنَى الْأَوَّلُ مِنَ الْآيَاتِ وَلَا يَرَادُ مِنْ تَرْجُمَةِ الْقُرْآنِ إِلَّا هَذَا وَامَّا الْمَعْنَى الثَّوَانِي الَّتِي يُقَالُ لَهَا الْمَقْصُودُ الثَّانِي مِنَ الْمَعَارِفِ فِي طَيِّ الْفَاضِلِ الْآيَاتِ وَحَلَاوَةِ نَظْمِهَا الْمُخْتَصَّةِ بِكَلَامِ اللَّهِ فَلَا يَتَعَلَّقُ بِهَا تَرْجُمَةُ الْقُرْآنِ لِأَنَّ الْمَطْلُوبَ وَالْغَرَضَ الْوَحِيدَ مِنْ تَرْجُمَةِ الْقُرْآنِ هُوَ أَظْهَارُ الْمَقْصُودِ الْأَوَّلِ لِأَهْلِ اللِّسَانِ الْآخِرَ الْمُرْجَمَ فِيهِ لِتَبْلِيغِهِمْ أَحْكَامَ الْقُرْآنِ وَامَّا الْمَقْصُودُ الثَّانِي فَلَا يَتَعَلَّقُ بِهِ الْغَرَضُ مِنَ التَّرْجُمَةِ وَالْمُرَادُ مِنَ الْمَقْصُودِ الْأَوَّلِ الَّذِي يَفْهَمُهُ أَهْلُ لِسَانِهِ بِمَجَرَّدِ السَّمَاعِ وَغَيْرِ أَهْلِ لِسَانِهِ بِوَسَائِلِ الْعُلُومِ الْآلِيَةِ الْخَادِمَةِ لِلْقُرْآنِ مِثْلَ عِلْمِ التَّصْرِيفِ وَالنَّحْوِ وَمَتْنِ اللُّغَةِ وَالِاشْتِقَاقِ وَالْمَعْنَى وَالْبَيَانِ وَهَذَا حَالُ تَرْجُمَةِ الْقُرْآنِ بِاللِّسَانِ الْعَجْمِيِّ وَامَّا صِحَّةُ تَرْجُمَةِ الْكُتُبِ الْعَرَبِيَّةِ بِلِسَانِ الْعَجْمِ فَلَا تَخْفَى عَلَى أَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ وَفِي ضَوْءِ هَذِهِ الْحَقَائِقِ الْعِلْمِيَّةِ لَا يَبْقَى لِمَوْقِفِ مُصَنِّفِ مُبَاحِثٍ فِي عُلُومِ الْقُرْآنِ وَقَوْلِهِ الْمَذْكُورِ مَجَالٌ جَوَازٌ كَيْفَ لَا وَهُوَ خِلَافُ الْوَاقِعِ كَمَا تَرَى۔

﴿وَالرَّابِعُ﴾ عَلَى قَوْلِهِ "حُكْمُ التَّرْجُمَةِ الْحَرْفِيَّةِ وَلِهَذَا لَا يَجِدُ الْمَرْءُ ادْنَى شُبَّةٍ فِي

حُرْمَةِ تَرْجُمَةِ الْقُرْآنِ تَرْجُمَةً حَرْفِيَّةً" بَأَنَّهُ مَجْمَلٌ لَمْ يَمَيِّنْ فِيهِ بَيْنَ التَّرْجُمَةِ الْحَرْفِيَّةِ

أصول ترجمه

”اللفظية“ لتعليم الطلبة كما يفعل المدرسون وبين الترجمة الحرفية لتبليغ الاعاجم والفرق بينهما من وجوه؛

أحدها:- الترجمة الحرفية لتعليم الطلبة لا تكون الا لترجمة الالفاظ المفردة المرتبة للقرآن والترجمة الحرفية لتبليغ الاعاجم لا تكون الا لترجمة القرآن و بينهما بونٌ بعيد-

وثانيها:- الترجمة الحرفية لتعليم الطلبة لا تطلق عليها الترجمة الافي لسان اللغة والترجمة الحرفية لتعليم الاعاجم تطلق عليها الترجمة في لسان اللغة وفي لسان العرف كليهما-

وثالثها:- باعتبار الحكم الشرعي بأن الترجمة الحرفية لتعليم الطلبة تجوز مطلقا لانها ترجمة الفاظ القرآن لا ترجمة القرآن وظاهر ان الالفاظ المفردة للقرآن من حيث اللسانية والعربية لا يقال لها القرآن فترجمتها بمعنى تفهيم معناها بلغة اخرى على نهج التعريف اللفظي والتفسير اللغوي لا يقال له الا التفهيم والتعليم ولا يمنع عنه الشرع بل هو مطلوب الشرع وفرض على سبيل الكفاية واما الترجمة الحرفية لغرض تبليغ القرآن ففيه تفصيل تجوز تارة ولا تجوز اخرى لانها ان كانت محاورة الترجمة مطابقة لمحاوراة الآية وقليل ما هو فتجوز والا فلا تجوز وهو الاكثر وعدم جوازها في ضوء الكتاب والسنة لا يكون سوءاً بل يكون خطأ دون الحرمة و يكون خطأ فحشا وحراماً تارة اخرى فعلى هذا لا يقال لقول مصنف ”مباحث في علوم القرآن“ المذكور السابق اعنى لا يجد المرء ادنى شبهة في حرمة ترجمة القرآن ترجمة حرفية، الا خلافاً للانصاف والمحمل المخل غاية الاخلال (قاله الهادي الى سبيل الرشاد)-

أصول ترجمه

﴿والخامس﴾ على قوله "فترجمه القرآن الحرفية على هذامهما كان المترجم على دراية باللغات واساليبها وتراكيبها تخرج القرآن عن ان يكون قرآنًا" بانه لا يخلو المراد من هذه الترجمة الحرفية المخرجة للقرآن عن القرآنية اما تشمل على كلى قسمي الترجمة اللفظية الذين قد سردناهما قبيل الآن اما لا تشمل القسمين بل احد القسمين اما الترجمة الحرفية لالفاظ القرآن التي تكون لقصد التعليم وتفهم معانيها اللغوية بلغة اخرى واما الترجمة الحرفية للقرآن التي تكون لغرض تبليغ مقاصد القرآن لاهل لغة اخرى ان كان المراد هو الاول فقد ذكرنا محذوره سابقا وان كان الثاني فالأخبار عنه باخراج القرآن عن القرآنية لغو لا فائدة فيه كيف لا والبلغاء متفقون على ان الجملة الخبرية لا تخلو عن فائدة الخبر او لازم فائدة الخبر كما قال في تلخيص المفتاح "لا شك ان قصد المخبر بخبره افادة المخاطب اما الحكم او كونه عالمابه ويسمى الاول فائدة الخبر والثاني لازمها (١) ولا يخفى على احد من اهل العلم ان الترجمة الحرفية لالفاظ القرآن لا يقال لها القرآن لا بلسان اللغة ولا بلسان الشرع لا حقيقة ولا مجازا ولا عرفا فلا توجد لهذا الخبر فائدة ما وان كان المراد هو الثالث فالحكم عليه باخراج القرآن عن القرآنية لا يكون صدقا كليا لانه وان لم يطلق عليه القرآن لغة ولا شرعا فقد يطلق عليه عرفا ويعتقد في العرف العام انه قرآن معنوي ويقال له القرآن مجازا من قبيل المجاز المرسل على سبيل اطلاق الكل على الجزء قال مفتي الديار الشامية ابن عابدين في فتاواه؛

"والاعجمي انما يسمى قرآنا مجازا ولذا يصح نفي اسم القرآن عنه" (٢) ومع نفي

(١) تلخيص المفتاح، بحث احوال الاسناد الخبري، ص: 7-

(٢) فتاوى رد المحتار على الدر المختار شرح تنوير الابصار، ج: 1، ص: 358، مطبوعه

المكتبة الماحديه كوئته باكستان-

أصول ترجمه

اسم القرآن عنه في لسان الشرع يجري عليه بعض احكام القرآن كعدم جواز المس الابطهارة: قال مفتي الديار المصرية في المائة العاشرة الهجرية زين الدين ابن نجيم: "ولو كان القرآن مكتوباً بالفارسية يحرم على الجنب والحائض مسه بالاجماع وهو الصحيح" (١) وفي ضوء هذه الحقائق لا يبقى لقول مصنف مباحث في علوم القرآن السابق ذكره جواز.

﴿والسادس﴾ على قوله "القرآن الكريم وكذا كل كلام عربي بليغ له معان اصلية، ومعان ثانوية.

والمراد بالمعاني الاصلية المعاني التي يستوى في فهمها كل من عرف مدلولات الالفاظ المفردة وعرف وجوه تراكيبها معرفة اجمالية.

والمراد بالمعاني الثانوية خواص النظم التي يرتفع بها شان الكلام. وبها كان القرآن معجزاً.

يرد عليه انه صريح على ان اشتمال الكلام البليغ على المعنيين المعاني الاصلية والمعاني الثانوية مختص باللسان العربي وهو خلاف الواقع بل مرادف لنفي الملاغة عن غير العربية من شتى انواعها بل الواقع المشاهد بالاعين والمسموع بالآذان هو جود البلاغة في كلام العرب والعجم كليهما كما قال الله سبحانه وتعالى "خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۖ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" (٢) والبيان هو المنطق الفصيح المعرب عما في الضمير ولا معنى لبلاغته سواهذا المفهوم لان تعريف ائمة البلاغة مثل عبد القاهر الجرجاني ويوسف السكاكي وعبد الرحمن القزويني للبلاغة بانها مطابقة الكلام لمقتضى الحال مع فصاحتها مرادف لهذا المفهوم لا فرق بينهما

(١) البحر الرائق، ج: 1، ص: 212، مطبوعه دارالمعرفه بيروت لبنان.

(٢) الرحمن: 3، 4.

أصول ترجمه

الابالاعتبار كما لا يخفى على اهل العلم لقد من الله سبحانه وتعالى به على الانسان مطلق الانسان لا فرق فيه بين عربهم وعجمهم كما ان خالق الله سبحانه وتعالى امتنان على الانسان مطلق الانسان لا فرق فيه بين العرب والعجم هكذا الامتنان بتعليم البيان شامل باطلاقه للعرب والعجم فكل بيان كلام بليغ وكل كلام بليغ مشتمل على المعنيين المعنى الاول والثانى وبتعبير اخر المفهوم الاول والمفهوم الثانى ومع هذا الاشتراك لا ينكر عن براعة العربية و تفوقها على العجمية فى قسمى الدلالة دلالة على المعانى الاصلية ودلالة على المعانى الثانويه ولا يُصَرَّفُ النَّظَرُ عن وسعة طرق استعمالها بالنسبة الى العجم لكن لا يلزم من براعة العربيه على الالسن العجميه فى البلاغة نفى البلاغة عن العجمه رأساً۔

﴿والسابع﴾ على قوله "واذا كانت الترجمة بمعناها الحقيقى ولو للمعانى الاصلية لا تتيسر فى جميع آيات القرآن وانما المتيسر الترجمة على معنى التفسير" بانه إحالة على المجهول لانه لم يذكر المعنى الحقيقى للترجمة الى الآن فكيف يَصِحُّ قَوْلُهُ هَذَا عَلَى سَبِيلِ الْحَوَالَةِ وَالنَتِيجَةِ مِنَ الْكَلَامِ السَّابِقِ واما ما ذكره قبل هذاتحت عنوان "معنى الترجمة" بقوله "والترجمة تطلق على معنيين اولهما الترجمة الحرفيه وهى نقل الفاظ من لغة الى نظائرها من اللغة الاخرى بحيث يكون النظم موافقا للنظم والترتيب موافقا للترتيب" فهو للترجمة الحرفية حسب اصطلاحه الجديد لالترجمة العُرفيه وموضوع الكلام هو الترجمة العُرفيه بمعنى ما يقال لها ترجمة القرآن فى تعارف الناس ويظنها العوام والخواص قرآنا معنويا و يجتنب المسلمون عن مسها بغير طهارة فهذا البحث كله لمصنف مباحث فى علوم القرآن حَرِّى أَنْ يُتَاسَفَ عَلَيْهِ كُلُّ التَّاسَفِ لَكِنْ لَا عَجَبَ لَانْ كُلِّ مَنْ يَبْحَثُ عَنِ الشَّيْءِ وَيَحْكُمُ عَلَيْهِ بِشَيْءٍ الْاَنْوَاعِ بِدُونِ تَصَوُّرِهِ التَّامِ لَا تَكُونُ نَتِيجَتُهُ

أصول ترجمه

الاهكذا فمثله كمثل الكاتب على الماء لا يجدى نفعاً ورد الله سبحانه وتعالى على الحاكمين على الشيء بدون العلم بقوله الكريم "وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا" (١) والتأسف على تعريفه المذكور للترجمة الحرفية وهي نقل الفاظ من لغة الى نظائرها من اللغة الاخرى لِأَنَّ مفهومه الصريح اجتماع الفاظ المتن مع الفاظ الترجمة لان النقل الى النظائر لا يتصور بدون الاجتماع معها وبطلانه لا يخفى على احد فضلا عن ان يكون معقولا ولعدم معقوليته لا يوجد له مثال لافي في اللغة ولا في الشرع والعرف وعندى ان ما اوردته في هذه الورطة العميا هو العجب بفهم اللسان العربى وظنه بان فهم العربيه كاف لفهم القرآن وتفهميه وتفسيره وترجمته ما بعده عن الحقيقة فيا للعجب لهذا العجب وجماعة الصحابه من المهاجرين والانصار الذين نزل القرآن بلسانهم وكانوا أعلم الناس باصناف العربيه الفصحاء مع هذا لم يستغنوا في كثير المواضع من القرآن عن شرائط فهم القرآن وترجمته روى الامام المحدث ابو عيسى الترمذى في جامعه قال حدثنا على ابن الخشرم عن الاعمش عن ابراهيم عن علقمه عن عبدالله ابن مسعود قال حدثنا عيسى ابن يونس "كما نزلت الذين الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم أولئك لهم الأمن وهم مهتدون" (٢) شق ذلك على المسلمين فقالوا يا رسول الله واينا لا يظلم نفسه قال ﷺ ليس ذلك انما هو الشرك الم تسمعوا ما "قال لقمان لابنه وهو يعظه يا بني لا تشرك بالله إن الشرك لظلم عظيم" (٣)، وهذا امير المؤمنين عمر ابن الخطاب مع كونه اهل لسان القرآن وافصح العرب استتماره العلميه

(١) النمل: 84-

(٢) الانعام: 82-

(٣) لقمان: 13-

أصول ترجمه

لفهم تفسير بعض المواضع من القرآن مشهور لا يخفى على احد من اهل العلم فلو كان محض فهم العربية كافيا لفهم القرآن وتفسيره و ترجمته لكان ها اولاء السادات من المهاجرين والانصار امراء المؤمنين ومن بعدهم من تابعيهم باحسان لكمال فهم العربية وتفوقهم على من بعدهم بالوف المراتب اولى به لكن لم يُنقل عن احدهم الا كفاً بفهم العربية وعدم الاحتياج الى سائر الشرائط وايضا العربية المستعملة الآن في ديار العرب لا يقال لها انها العربية المستعملة ايام نزول القرآن لان استعمال الالسن واللغى يتبدل بمرور الايام حتى لا يبقى الا الوحدة النوعية فلا فرق بين طلباء القرآن من العرب والعجم بل كلهم يحتاجون في معرفة لغته ومحاوراته و كناياته الى معرفة طرق الاستعمال ايام النزول وفي هذا التناظر ادخلوا دواوين الشعراء الجاهلين والاسلاميين والمخضرمين "الطبقات الثلاثة" في نصاب الجوامع العلميه فظن كفاية فهم العربية لتفسير القرآن و ترجمته لا يخلو عن الخطاء وحاصل الرد على مصنف مباحث في علوم القرآن ان تقسيمه الترجمة الى الاقسام المذكوره غلط لا تطابقه الدراية ولا الرواية وتعريفه للترجمة الحرفية بانها نقل الفاظ من لغة الى نظائرها من اللغة الاخرى مرادف لاجتماع الفاظ الاصل مع الفاظ الترجمة وبطلانه كماترى والحشية في قوله "بحيث يكون النظم مطابقا للنظم والترتيب مطابقا للترتيب" ليست في محلها لانها على ثلاثة اقسام؛

(١) الاطلاقيه وهى التى لا تفيد فائدة زائدة على المُحيثِ -

(٢) التقييديه هى التى تفيد تقييد المحيـث بقيدٍ خاصٍ -

(٣) التعليلة هى التى تكون علة للمُحيثِ وفي هنا لا يصح اى قسم منها

كما لا يخفى على المُتبصّر اليقظان -

أصول ترجمه

ويفهم من تقسيمه الترجمة الى الاقسام المذكوره ومن حكمه على الترجمة الحرفية بحرمة الترجمة وعلى الترجمة المعنوية للمعاني الاصلية بالفساد وعلى الترجمة التفسيرية بالجواز والصحة انه لم يميز بين الترجمة والترجماني ولا بين الترجمة بمعناها اللغوي والترجمة العُرفية وكان ينبغي له ان يعين اولا هذه المعاني ويوضح المناسبة بينها ويشخص ترجمة القرآن على حسب تعارف الناس لان المتنازع فيه بالجواز وعدم الجواز هو هذا المعنى لا الترجمة بالمعنى اللغوي ولا بمعنى الترجماني فمتى مالا يكون المفهوم مشخصا لا يكون البحث الاعبثا كالكتابه على الماء فعلى هذا كان عليه حتما لازما تعريف ترجمة القرآن المتعارفه حسب ما روى عن الاسلاف بانها تبديل الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الاخر التي تقوم مقامها كما في الاتقان في علوم القرآن للامام السيوطي وهو المفهوم في كل موضع من كتب الفقه حيثما يبحث عن جواز القراءة في الصلوة بترجمة القرآن او عدم جوازها للعاجز عن قراءة نظم القرآن كما هو الظاهر على اهل البصيرة.

حاصل الكلام في تعريف الترجمة:-

في هذا المفهوم المشخص المتعارف لترجمة القرآن ان تبديل الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الاخر بمنزلة الجنس للنوع كالحيوان بالنسبة الى الانسان وقيام هذه الالفاظ مقام الفاظ القرآن بمنزلة الفصل القريب للنوع كالناطق للإنسان فكان التعريف المذكور مفيدا تاما للتصور التام لحقيقة ترجمة القرآن والمراد من قيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن ان تكون حاملة لجميع حيثياتها واحوالها من حيث اللغة والصرف والنحو والبلاغة ومقصد النزول وغيرها من الاحوال التي تعرفها العرب بنفس السماع والعجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن فكل ترجمة القرآن تكون حاملة لهذه الحيثية من المطابقه تكون صحيحا وحرى ان يقال لها ترجمة القرآن والقرآن

أصول ترجمه

المَعْنَوِي ونصف القرآن وجائزاً باختلاف وهي المراد المشخص المتنازع فيها في باب قراءة الصلوة اتجوز صلوة القارى بها العاجز عن قراءة القرآن ام لا تجوز وكل ترجمة القرآن لا تكون حاملة لهذه الحيثية غلط لا ينبغي ان تسمى بترجمة القرآن ولم يخطر على قلب احد من مجتهدي الاسلام جواز القراءة بها للعاجز عن قراءة القرآن في الصلوة فافاد التعريف المذكور فائدتين بل اصولين مستقلين؛

اولهما:- كل ترجمة القرآن تطابق الفاظها الفاظ القرآن وتقوم مقامها في جميع حيثياتها المفيدة للمفهوم الاول الذي يفهمه العرب بنفس السماع والعجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن وتطابق هيئتها الاجتماعية نوعية الهيئة الاجتماعية لالفاظ القرآن فهو صحيح ليس في جوازه اختلاف-

وثانيهما:- كل ترجمة القرآن لا تكون بهذا الشأن فهو غلط ليس في عدم جوازه اختلاف وتلوح منه حقيقة اخرى وهي ان عدم المطابقة له كمية تتنوع افرادها وكيفية تشدد في البعض تتضعف في البعض الآخر فليس عدم المطابقة في وصف مثل المخالفة في وصفين او الاوصاف الكثيرة وكذا المخالفة الفاحشة ليست مثل الخلاف الخفيف وتولد منه ان لخطء الترجمة وعدم جوازها سبيل متفرقه لا يدركها الا الفنون الآلية لفهم القرآن ولا يضع عليها الاصبع ولا يظهرها الا العلوم الخادمة للقرآن بكثرة انواعها كما قال الامام الراغب الاصفهاني "كل من كان حظه في العلوم او فركان نصيبه من علم القرآن اكثر" (١) وسبيل صحة الترجمة وجوازها واحد لا تعدد فيها وهي المطابقة وقيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن بان تكون الالفاظ المفردة للترجمة وفق الالفاظ المفردة للقرآن ونوعية الهيئة الاجتماعية لالفاظ الترجمة وفق

(١) اصول تفسير لامام الراغب الاصفهاني، ص: 597، المطبوع مع مفردات القرآن

نور محمد اصح المطابع كراتشي-

أصول ترجمه

نوع الهيئة الاجتماعية لالفاظ القرآن من حيث الاخبار والانشاء والتذكير والتانيث وغيرها بشتى انواعها وهذه الترجمة لحسنها وملائحتها ولا يفائنها للمقصد من ابلاغ المفهوم الاول من القرآن للاعاجم يقال لها الترجمة وفق المحاوراة والمراد بها وفق المحاورتين محاوراة اللسان الذى ترجم فيه ومحاوراة لسان القرآن فللترجمة وفق المحاوره ليس الالهذه الصورة الواحده وخلافه على ثلاثة اقسام؛

اولها:- وفق محاوراة لسان القرآن وخلاف محاوراة لسان الذى ترجم فيه-

وثانيها:- وفق محاوراة لسان الترجمة وخلاف محاوراة القرآن-

وثالثها:- خلاف كلتى المحاورتين وقد فرغت عن امثلتها التوضيحية فى اول باب هذا الكتب فالينظر هناك وفى هنا المقصد الوحيد لنا هو النقد على مصنف مباحث فى علوم القرآن حضرت العلامة مناع القطان حيث حكم على ترجمة القرآن باعتبار المعانى الاصلية بالفساد وجعلها محظورا ولم يقنع بهذا المحذور الذى لم يوجد له اثر فى الاسلاف ولا يرتضيه مزاج الاسلام كيف ياذن به الاسلام وهو ينافى التبيغ بالمفهوم الاول من القرآن وضد لقوله سبحانه وتعالى "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا" (١) لان الرسالة الى جميع الناس عربهم وعجمهم كما هو المتبادر من استغراق لفظ "الناس" وتاكيد به جميعا لا يتم مقصدها الا بالتفهم ويعلم كل احد ان تفهيم كل فريق بلسانهم حسب تحاورهم فتفهم العجم لا يمكن بالعربى كما لا يمكن تفهم العرب الا بالعربى هذا فى عموم الرسالة واما عموم الانداز بالقرآن لكل من بلغ من العرب والعجم فلا يكون الا بمعانيه الاصلية ومفاهيمه الأول التى تفهمها العرب بنفس السماع والعجم

(١) الاعراف: 158-

أصول ترجمه

بوسائل العلوم الآلية لفهم القرآن من التصريف والاشتقاق والنحو والمعاني والبيان وغير ذلك من لوازمها ولا يخفى على احد ان عالمي هذه الوسائط في اقوام العجم عددهم قليل في كل عصر كالملاح في الطعام وهم المكلفون بتفهم اقوامهم الجمهور بمعاني القرآن الاصلية انذاراً وتبشيراً كما قال سبحانه وتعالى "وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" (الرعد: 7) وقال ايضا "وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ" (١) وقال رسول الله ﷺ "بلغوا عني ولو آية" (٢) وقال "فألبليغ الشاهد الغائب فرب مبلغ عسى ان يكون اوعى من سامع" (٣) فكل هذه التبليغات يدور رحاها حول المعاني الاصلية التكليفية للقرآن تارة بالترجمة وتارة بالترجماني حسبما يقتضيه الحال والفرق بينهما من وجوه؛

احدهما:- الترجمة هي ابدال الفاظ القرآن بالفاظ السان الاخر التي تقوم مقامها والترجماني هو التعبير عن المعاني الاصلية للقرآن بلغة أخرى.

ثانيها:- الترجماني لا يتعلق الا بالمعاني فقط والترجمة تتعلق بالالفاظ والمعاني جميعا.

ثالثها:- صحة الترجماني تتوقف على صحة الترجمة سواء شعر به الترجمان او لم يشعر وصحة الترجمة لا تتوقف الا على شرائطها وصحة الترجماني ليست من شرائطها فلا تصور لتوقفها عليها.

رابعها:- ترجمة القرآن وان لم تكن القرآن حقيقة لكن اهل العرف وجمهور الناس يعتقدون بقرآنيته ويقولون لها القرآن المعنوي والترجماني لم يُظَنَ في الاسلام بقرآنيته فضلاً من ان يُعَدَّ قرآناً معنوياً.

(١) فاطر: 24-

(٢) الجامع الصغير مع فيض القدير، ج: 3، ص: 206، حديث: 3159-

(٣) بخارى، كتاب العلم، ج: 1، ص: 16-

أصول ترجمه

خامسها:- ان ترجمة القرآن يثبت لها في الشرع مالا يثبت للترجماني من الاحكام مثل عدم جواز المس الابعدا التطهير من الحيض والنفاس والحدث حسب ما هو المشروح المبسوط في كتب الفتاوى-

التوضيح المزيد ودفع المظنه:-

عسى ان يظن من تنقيدنا هذا على مصنف مباحث في علوم القرآن باننا نجيزُ ترجمة القرآن لكل من يعلم الفنون الآلية لفهم القرآن في الجملة وان لم يكن بارعا فيها فهو ظن باطل ولا نجيز تصوره فكيف نتفوه بموجبه ونعلم بلا تردد وارتباب ان اكثر التراجم للقرآن الكريم الملوثة بالاعطاء والاعلاط نتيجة عدم براعة المترجمين في هذه الفنون الخادمة للقرآن وفصلنا أمثلتها فيما مضى من صفحات هذا الكتاب بلسان اردو فليرجع اليها وكتبنا مراراً في اول باب هذا الكتاب في ضمن شرائط الترجمة أنّ براعة المترجم في هذه العلوم الآلية هو الشرط الاول وملاك الامر لصحة الترجمة حتى لو كان قليل البضاعة في علم واحد فقط مع الكمال في سائرها لا يجوز له الخوض في هذا الخطر المقتضى للاحتياط من جميع الجهات ولو كان فاقدا لشرط واحد فقط مع الاستجماع لباقيها لا يجوز له الشرع المحمدي على صاحبه الصلوة والتسليم ان يدخل في صف المترجمين للقرآن فيكون مثله كمثله الذي يعد نفسه في عداد الشهداء ببلطخ الدم وكتبنا صريحا لامرأة بل بمرات وكرات كثيرة بان ادراك المتن بجميع حيثياتها اللسانية والفنية هو الحجر الاساسي لصحة الترجمة وعليه تبني حقيقة الترجمة بمعنى ابدال الفاظ الاصل بالفاظ السان الآخر التي تقوم مقامها فقيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ الاصل ومطابقتها في جميع الحيثيات فرع هذا الاساس وبدونه خرط القتاد فترجمة القرآن بمعناها العرفي لا بمعنى الترجمة الحرفية ولا الترجمة التفسيرية امر ممكن مطلوب في الشرع، سهل

أصول ترجمه

على المستجمع لشرائطها الموفق من الله عز وجل ومقتضى الرسالة العامه للعرب
ولجميع اقوام العجم واساس تبليغ الاسلام لان تبليغ الاسلام و دعوته للعجم لا تعترى
بنائه واستحكامه وتأثيره فى النفوس عن هذا الاساس اشعر به المبلغ بالقرآن او لم
يشعر فكانت ترجمة القرآن بمعناها المذكور لازما لبدء دعوة الاسلام للاعاجم و اما
بعد ذلك لتوسيع دائرة تبليغ القرآن وتنوير قلوب الناس وامالة افئدتهم اليه ففى عموم
الاحوال فرض لا على سبيل العين بل على الكفايه كما هو المستفاد من قوله سبحانه
وتعالى "لَوْ لَا نَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّينِ وَلِيُنذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا
رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" (١) وفى بعض الاحوال المخصوصه تكون فرضا على سبيل العين كما
اذا كان مُستجمع الشرائط فى الخطه او الملك شخص او احداو الناس مستفيضون من
ضياء المعانى الاصلية للقرآن ويستفهمونها فى لغتهم حسب محاوراتهم قوتئذ ان لم
يترجم لهم هذا الشخص الوحيد مع الاستطاعه يكون اثما ثم تارك الفريضة العينية.

خلاصه البحث بعد التفصيل:-

(١) ان المراد من ترجمة القرآن معناها العرفى فقط بمعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ
السان الآخر التى تقوم مقامها.

(٢) وهى تجوز لاهلها ولا تجوز لغير اهلها لا خلاف فى هذين الحكمين بين الاسلاف
فى جميع المذاهب الاسلاميه والمراد من الاهل هو الذى يستجمع جميع شرائط الترجمة
من عموم شرائط فن الترجمة الى خصوص شرائط ترجمة القرآن.

(٣) الامر المطلوب من ترجمة القرآن هو ابلاغ الناس من اهل لسان الترجمة ومن اليهم
على المعانى الاصلية للقرآن فقط اما المعانى الثوانيه والمعارف المشنيه فى طى نظمه
والحلاوة اللسانيه القرآنيه فلا يتعلق بها مقصد المترجم ولا يسئل الله سبحانه وتعالى

(١) التوبة: 122-

أصول ترجمه

أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ عَنْ عَدَمِ تَحْصِيلِهَا لِأَنَّهَا خَارِجَةٌ عَنْ اسْتَطَاعَةِ النَّاسِ وَلَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا.

(٤) ترجمة القرآن بمعناها المتعارف المعمول بها سهل لأهلها المستجمع للشرائط المُؤَوِّقِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ وَصَعْبٌ غَيْرُ مُمْكِنٍ الْحَصُولِ عَلَى غَيْرِ أَهْلِهَا بِفَقْدِ شَرَايِطِهَا وَبِعَدَمِ تَوْفِيقِهَا مِنْهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى.

(٥) ترجمة القرآن احوط اصناف فن الترجمة لها شرائط فوق شرائط مطلق الترجمة يفوت مقصد الترجمة بعدم مطابقتها او تخرج عن حد الترجمة.

(٦) المراد من ترجمة القرآن التي يبحث عنها في كتب الفقه من حيث جواز الصلوة وعدم جوازها بقرائتها للعاز عن قراءة نظم القرآن هي الترجمة الصحيحة التي يصدق عليها حاصل حدها بمعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ السان الاخر التي تقوم مقامها و هي الصادرة من اهلها المستجمع لجميع شرائطها.

وهي المراد المطلوب والمقصد المحبوب والمرام المرغوب في كل موضع قيل فيه بجوازها او بضرورتها التبليغيه قال جار الله الزمخشري في كشافه تحت تفسير آيت رقم 4، من سورة ابراهيم "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" (فان قلت: لم يبعث رسول الله ﷺ الى العرب وحدهم وانما بعث الى الناس جميعا. قل يا ايها الناس اني رسول الله اليكم جميعا. بل الى الثقلين وهم على السنة مختلفة، فان لم تكن للعرب حجة فغيرهم الحجة، وان لم تكن لغيرهم حجة فلو نزل بالعجمية لم تكن للعرب حجة ايضا، قلت: لا يخلو اما ان ينزل بجميع اللسان او بواحد منها، فلا حاجة الى نزوله بجميع اللسان لان الترجمة تنوب عن ذلك وتكفي التطويل، فبقي ان ينزل بلسان واحد، فكان اولى اللسان لسان قوم الرسول لانهم اقرب اليه، فاذا فهموا عنه وتبينوه وتَنَوَّلُوا

أصول ترجمه

عنهم وانتشروا التراجم ببيانه وتفهيمة، كما ترى الحال وتشاهدها من نيابة التراجم في كل امة من امم العجم، مع ما في ذلك من اتفاق اهل البلاد المتباعدة والاقطار المتنازحة والامم المختلفة والاجيال المتفاوتة على كتاب واحد، واجتهادهم في تعلم لفظه وتعلم معانيه) فكأن قوله "كما ترى الحال وتشاهدها من نيابة التراجم في كل امة من امم العجم الى قوله "واجتهادهم في تعلم لفظه وتعلم معانيه"۔

خلاصة ما فصلناه وعكس عمل التبليغ للاعاجم بالقرآن ومرآة الحقائق العملية التي لا يمكن انكارها ولذا لا ترى احدا من المفسرين الذين جاؤ بتفسير آيت رقم 4 من سورة ابراهيم بعد الزمخشري ناقدًا عليه بل كلهم مستسلمون لديه تسليم السكوت والرضا لان السكوت في معرج البيان بيان حتى ان مصنف الانصاف فيما تضمنه الكشاف من الاعتزال الامام ناصر الدين احمد ابن محمد المالكي مع التزامه النقد على الزمخشري اظهر الرضا به وقال "قال احمد جميع الفصل مرضى" (١)۔

وقال الامام ابو عبد الله الانصاري القرطبي في ضمن تفسيره للاية المذكورة "ولا حجة للعجم وغيرهم في هذه الآية لان كل من ترجم له ما جاء به النبي ﷺ ترجمة يفهمها لزمته الحجة وقد قال الله تعالى "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا" (٢)۔

وقال ﷺ "ارسل كل نبي الى امته بلسانها وارسلني الله الى كل احمر واسود من خلقه"۔

وقال ﷺ "والذي نفسي بيده لا يسمع بي احد من هذه الامة يهودى ولا نصرانى ثم

لم يؤمن بالذي ارسلت به الا كان من اصحاب النار" (٣)

(١) الانصاف فيما تضمنه الكشاف من الاعتزال المطبوع مع الكشاف المجد الثاني،

ص: 366، مطبوعه دار المعرفة بيروت۔

(٢) سباء: 28۔

(٣) الجامع لاحكام القرآن، ج: 5، ص: 340، مطبوعه مكتبة الغزالي دمشق الشام۔

أصول ترجمه

وكل من تفكر في ظاهر هذا الكلام ومضمراته من اوله الى آخره لم يجده الا موافقا لما قاله الزمخشري في كشافه وقال الامام الشاطبي في الموافقات في اصول الدين بعدم انفي امكان الترجمة حسب المعاني الثواني "فاما على الوجه الاول فهو ممكن ومن جهته صح تفسير القرآن وبيان معناه للعامة ومن ليس له فهم يقوى على تحصيل معانيه، وكان ذلك جائزا باتفاق اهل الاسلام فصار هذا الاتفاق حجة في صحة الترجمة على المعنى الاصلى" (١)

وما اظهره الشاطبي في هذا الكلام على سبيل النتيجة ليس الا فذلك ما فصلناه لان من امعن النظر في كلامه من صفحة 237 الى هذه النتيجة يجده يدور رحاها على نكتتين الاولى عدم امكان ترجمه حسب المعاني الثواني والمزايا المختصة باصل المتن سيما نظم القرآن وهو كلام صادق لا يمكن الانكار عنه وعدم امكان الترجمة بهذا المعنى لا يقتضى عدم صحة ترجمه العرفيه لتفرق سبيليهما لان الغرض والغاية المقصودة من ترجمة القرآن هو اطلاع اهل اللسان الآخر ومن اليهم على المعاني الاصلية للقرآن ليفهمها الجمهور ويعملوا بها واما المعاني الثواني والمزايا المختصة فلا يتعلق بها فهم جمهور الناس ولا العمل بها فكيف يؤثر في صحة ترجمه العرفيه التى تساق لتبليغ القرآن للعلم والعمل فمن هنا تبين ضياء النهار من ظلمه الليل والحمد لله اولا وآخرا ظاهرا وباطنا.

وقال المحقق على الاطلاق كمال الدين ابن همام ناقلا عن الفتاوى الكافى "ان اعتاد القراءة بالفارسية او اراد ان يكتب مصحفا بها يمنع وان فعل فى آية او آيتين لا فإن كَتَبَ القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز" (٢)

(١) الموافقات، ص: 239، المطبوعه دار الكتاب العربى بيروت.

(٢) فتاوى فتح القدير شرح الهداية، ج: 1، ص: 248، المطبوع مكتبه نوريه رضويه

أصول ترجمه

وهذا الكلام المتفق بين فقهاء الاسلام يشتمل على ثلاثة احكام الاول عدم جواز قراءة ترجمه القرآن في الصلوة سيما للذى يعتاوه والثانى عدم جواز كتابة المصحف الشريف مجردا عن نظمه والثالث جواز كتابة نظم القرآن وتفسيره وترجمته وهذا يتشكل بشكلىين الاول ان يكتب نظم القرآن او لاوبعده ترجمته وتفسيره معا والثانى ان يكتب نظم القرآن ويكتفى بعده اما بالترجمة فقط واما بالتفسير فقط فكما لايرتبط التفسير بالمعانى الثوانى والمعارف المثوية فى نظم القرآن هكذا لا ترتبط الترجمة الا بالمعانى الاصلية المقصودة بتبليغ القرآن ولا يمكن ان يراد من الترجمة فى هنا الا معناها المتعارف بين الناس اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التى تقوم مقامها وعلى ضوء هذه الحقائق من اقوال الاسلاف ومقتضا تبليغ القرآن للاعاجم من اقتضاء ابلاغ المعانى الاصلية للقرآن الى اسماعهم وتفهمهم اياها حسب المحاورتين محاوره القرآن ومحاوره اللسان الذى يترجم فيه لا كمال يقول مصنف مباحث فى علوم القرآن "فان ترجمة المعانى الاصلية لا تخلو عن فساد" والاسف بعدالاسف عليه أنه لم يكتف على هذه المجازفة بل توغل فى المحذور وقال بعدما عنون بالترجمه التفسيرية "ويحق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذا قاموا بتفسير للقرآن يتوحنى فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح ثم يترجم هذاالتفسير بامانة وبراعه فان هذايقال فيه "ترجمة تفسير القرآن" او "ترجمة تفسيرية" بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلغة أخرى"فانه صريح فى ان ترجمة القرآن بمعنى ترجمة التفسير للقرآن لا للقرآن بان تُفسر الايه حسب ما يراه المفسر قريبا وراجحاتم يترجم هذاالتفسير.

وهو كما ترى من الفساد وفتح الباب لكون القرآن متنازعا فيه لان ترجيح المفسر يختلف عن ترجيح المفسر الآخر ونتيجة فكره تباين ثمرة فكر الآخر واختلاف هذه

الافكار الترجيحية جار من اول الامرحتى من الصحابة والتابعين وأصحاب الاجتهاد

أصول ترجمه

الى آخر الزمان فلو كانت ترجمة القرآن بمعنى ترجمة تفسير القرآن كما يقول مناع القطان مصنف مباحث فى علوم القرآن تكون الترجمة تابعة لتفسير المفسر وتفسير المفسر تابع لترجيحه ونتيجته المنطقية. كون الترجمة تابعة لترجيح المفسر واستصوابه وبطلانه اظهر من الشمس لان الترجمة سيما ترجمة القرآن لا تتبع الا نظم القرآن مع مراعاة جميع شرائطها فجعله ترجمة القرآن تابعة لترجيح المفسر لا يقال له الافتح باب الفساد المفضى الى تحريف القرآن بايدى اهل الهواء والبدع باسم الترجمة ولا يتوقف محذوره بهذا الحد بل يفضى الى التضاد المعنوى فى القرآن كما فى قوله سبحانه وتعالى "وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ" (١) لان بعض علماء التفسير يفسر البلاء العظيم بالنعمة العظيمة والخير وبعضهم بالامتحان والشر كما قال الامام ابو عبد الله الانصارى القرطبى فى الجامع لاحكام القرآن "الاشارة بذالك الى التنجية فيكون البلاء على هذا فى الخير اى تنجيتكم نعمة من الله عليكم وقال الجمهور الاشارة الى الذبح ونحوه والبلاء هنا فى الشر والمعنى وفى الذبح مكروه وامتحان" (٢)

وتضاد ترجمة أحد هذين التفسيرين لترجمة التفسير لآخر ظاهر لا يخفى على احد ونتيجته ليست الا التضاد المعنوى المضاد لقوله سبحانه وتعالى "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" (٣) وهكذا فى جميع الآيات التى تحتل المعانى المتضاده على السواء فمثل مصنف مباحث فى علوم القرآن لا يكون فى تشريحه هذا الا كمثل الذى يفر من المطر ويقف تحت الميزاب.

(١) البقرة: 49-

(٢) التفسير القرطبى، ج: 1، ص: 387، مطبوعه مكتبة الغزالي دمشق الشام-

(٣) النساء: 82-

﴿درء الشبهات﴾ فكر مصنف مباحث في علوم القرآن ومن ياتم به يبتنى على

عدة شبهات ونرى ان نبحت عنها حتى ينجلي ضوء الغلس من ظلمة الغلس ويتنقح موضوع الكلام فيقال اولا ان القرآن كلام الله سبحانه وتعالى، نظمه معجز لا يمكن الاتيان بمثله كما قال سبحانه وتعالى "لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا" (١) وظاهر ان عدم امكان الاتيان بمثله غير مختص بالمشر كين او الا ناسي الموجودين ايام نزول القرآن بل هو بالنسبة الى جميع الناس مسلمهم وغير مسلمهم واولهم وآخرهم ومتعبد بتلاوة الفاظه المنظومة، برزخ بين النظم والنشرو يابى نظمه المشاهدان يقال له المنظوم مطلقا ولا المنشور مطلقا بل يحده قارئه اليقظان وسامعه الفهيم منزلة بين المنزلتين ويحس بان منزلته هذه هي الفلسفة العظمى للاعجازه وظاهر ان هذه الخصال الاربعة لا توجد واحد منها في كلام الناس فضلا عن التمام الاربعة ولا يخفى على احد من الناس ان ترجمته لا تكون الا بالفاظ الاعاجم وكلامهم وهو ليس بكلام الله ولا يصدق عليه القرآن ولا اعجازه ولا تعبد التلاوة به ولا الواسطة بين الواسطتين المنظوم والمنشور بل لا يكون الا احدهما المشخص والفاظ الترجمة لا بد من ان تقوم مقام الاصل وتطابقها كما هو الظاهر من تعريف الترجمة اعنى ابدال الفاظ الاصل بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها فكيف يتصور التوافق والقيام مقامها مع تفاوت هذه الاوصاف وتقابلها بالايجاب والسلب وحاصل الاستدلال عليه بالتفصيل يكون هكذا

ترجمة القرآن غير ممكن

لانها يصدق عليها عدم قيام الفاظها مقام الاصل

(١) الاسراء: 88-

أصول ترجمه

وكل ما يصدق عليها عدم قيام الفاظها مقام الاصل غير ممكن

فترجمة القرآن غير ممكن

وجوابه ان هذا الاستدلال وان يعجب بصورته الناظر لا يسر بفساد مادته الخاطر لان اشرف مقدميه بنائه على سوء الفهم والغلط فما شأنه الا بناء الغلط على الغلط. و تفصيله ان قيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ الاصل ومطابقتها معها في تعريف ترجمة القرآن اعني ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها ليس المراد منه الا بالنظر الى المعاني الاصلية للقرآن التي يفهمها اهل لسان القرآن بنفس السماع والاعاجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن كعلم التصريف والنحو والاشتقاق وعلم المعاني والبيان وغيرها من العلوم الخادمة للقرآن لان المقصود الاصلى من ترجمة القرآن هو اطلاع اهل اللسان الآخر ومن اليهم على المعاني الاصلية المتعلقة بتكليف الناس بالعلم والعمل بها واما المعاني الثوانية مثل الاعجاز وكلامية الله والبرزخية بين التحرير والبيان وبين النظم والنثر والتعبد بتلاوة الالفاظ وغيرها من العلوم والمعارف المثانية في طي نظم القرآن و سائر لوازماتها المختصة به فلا يتعلق بها المقصد من الترجمة لخروجها عن التكليف ومسئوليت الانسان لان الله عز وجل لا يكلف نفسا الا وسعها و ادراكها غير ميسور لجمهور الناس بل لا يعلمها الا الراسخون في العلم واهل التوفيق الخاص منه سبحانه وتعالى وقليل ما هم فاذا لم يتعلق قيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن الذي هو بمنزلة الفصل المُمَيِّز لترجمة القرآن الا بالمعاني الاصلية لم تكن صغرى الدليل المذكور اعني يصدق عليها عدم قيام الفاظها مقام الاصل (بالنظر الى الاوصاف الاربعة المذكورة) الالفواو غلطا فلا يقال لهذا الدليل الا بناء الغلط على سوء الفهم والغلط بالنظر الى متعلق الفصل المُمَيِّز لترجمة القرآن هكذا ينبغي التحقيق بتوفيقه سبحانه و تعالى ومنه الهداية الى سبيل الرشاد.

أصول ترجمه

(الشبه الثانية) يقال عدم امكان الترجمة بالنظر الى المعانى الثوانيه والمعارف

الخصيصة للقرآن يستلزم عدم امكان الترجمة بالنظر الى المعانى الاصلية لانها مكملاتها وتماماتها كما قال الامام الشاطبي في الموافقات في اصول الشريعة "فمثل هذه التصرفات التي يختلف معنى الكلام الواحد بحسبها ليست هي المقصود الاصلى ولكنها من مكملاته وتماماته" فظاهر على كل احد ان كل شيء في الدنيا لا يكمل بدون مكملاته ولا يتم بدون تماماته فكيف تتم ترجمة القرآن بالنظر الى المعانى الاصلية بدون امكان ترجمة القرآن بالنظر الى المكملات والتمامات - وعدمه ظاهر لا يخفى على اهل العلم كما قال ابن قتيبة في كتابه تاويل مشكل القرآن "ولذلك لا يقدر احد ما من التراجع على ان ينقله الى شيء من الالسنه" فعدمه لم لا يستلزم عدمه وحاصل الاستدلال يكون هكذا

ترجمة القرآن بالنظر الى معانيه الاصلية غير ممكن
لأنها مكمله وتمامه بالمعاني التي ترجمتها غير ممكن
وكل ما هذا شأنه فهو غير ممكن
فترجمة القرآن غير ممكن

وجوابه بانه محض المغالطه وان لم يمل عنه الغمر الغافل لظاهر صورته لا يميل اليه المجرب الخبير لفسا مادته اعنى الصغرى التي قيل فيها بتكميل الترجمة بالنظر الى المعانى الاصلية بالمعاني الثوانيه و تميمها بها وهو ليس الا الكذب المحض او المغالطه المحضه بان المعاني الثوانيه بشتى انواعها مكملات المعاني الاصلية وتمامتها كمثلى المحسنات البديعية بالنسبة الى الكلام البليغ ولا يتصور ربطها بالترجمة فضلا عن كونها مكملاتها كما قال الامام الشاطبي في الموافقات في اصول الشريعة "ليست هي المقصود الاصلى ولكنها من مكملاته وتماماته" وان كان مظهر قول الشاطبي

أصول ترجمه

هذا ادنى ضوء المعانى الثوانيه والمعارف المثانى فى طى نظم القرآن كما لا يخفى على اهل المعرفة ويعلم كل انسان بان هنا أموراً اربعة-

احدها القرآن الكريم من حيث مصداقه يعنى كلام الله المنزل على الرسول ﷺ المنقول عنه ﷺ نقلاً متواتراً لا شبهة فيه المجموع المركب من النظم من حيث الدلاله ومن المعنى من حيث المدلول-

وثانيها المعانى الاصلية التى يفهمها العرب بنفس السماع والعجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن-

وثالثها المعانى الثوانيه المثانيه فى طى نظم القرآن التى لا يدركها الا الراسخون فى العلم الموفقون من عند الله عز وجل ونسبتها الى المعانى الاصلية كمثلى نسبة المحسنات البديعية الى الكلام البليغ من التزيين والتسيم والتكميل وغيرها من الفوائد-

ورابعها ترجمة القرآن بالنظر الى معانيه الاصلية التكليفية للعلم والعمل بها والنظر الى معناها المتعارف اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التى تقوم مقامها وهذه الامور لا يحمل بعضها على بعض لتباينها مفهومها ومصداقها ومزيد توضيحها مع التجزية يكون هكذا لا يطلق القرآن على شئ من الامور الثلاثة المذكوره على سبيل الحقيقة اى حقيقة كان لغوية، او شرعية او عقلية فلا يمكن ان يقال "المعانى الاصلية للقرآن قرآن" الا على سبيل تعارف الناس والمجاز واما الامور الثلاثة فلا يمكن اطلاق شئ منها لاعلى القرآن ولا بعضها على البعض راسخاً فلا يجوز ان يقال "القرآن هو المعانى الاصلية او المعانى الثوانيه" وكذا لا يمكن ان يقال "القرآن هو الترجمة" باى وجه الكلام حقيقة ومجازاً، وعرفاً وهذا التباين والتفريق بين الامور الاربعة ليس شياء دقيقاً او عسير الفهم بل فهمه يسير على ذوى البصائر واما فاقدو البصيرة الذين يعدون نفوسهم فى عداد العلماء ويشتهرون فى معاشره المسلمين بالعلم والبصيرة من غير

أصول ترجمه

بصيرة فليسوا بمخاطبين لنا ومقصودنا الوحيد من هذا التحرير هو تحويل اذهان ذوى البصائر الى هذه الحقائق ليكونوا حافظين لكتاب الله الكريم عن التحريف المعنوى باسم الترجمة وكتابنا هذا مضمون به على غير اهله فلا يأخذوه لا يبذل الثمن ولا مجاناً لانهم لا يتأهلون لدرك حقائقه فهو لاهل البصيرة خاصة. وبعدهذه المعارضة نعود الى موضوع الكلام ونقول كلما كانت هذه الامور الاربعة متغايرة المفهوم والمصداق وتأبى حقيقته الحال من حمل بعضها على البعض وكانت المعانى الثوانيه التى لا يمكن ترجمتها من مكملات المعانى الاصلية ومتمماتها لا من متممات ترجمة القرآن بالنظر الى المعانى الاصلية فكيف تصح صغرى القياس المذكور "لأنها مكملة ومتممة بالمعانى التى ترجمتها غير ممكن" فحمل قوله "مكملة ومتممة بالمعانى التى ترجمتها غير ممكن" على سبيل الحد الاوسط على الضمير المنصوب المتصل اعنى هافى "لأنها" من حيث الحد الاصغر الراجع الى الترجمة من حيث الحد الاصغر ليس الا الكذب المحض فلم يتم التقريب فبقى دعوى عدم امكان ترجمة القرآن باعتبار المعانى الاصلية بلا دليل وبرهان.

الشبهة الثالثة يقال بعض الفاظ القرآن وكذا بعض جملة وآياته ذو معنيين متضادين او اكثر ولا يوجد فى العجمة ما يقوم مقامها من حيث الترجمة وان وجد موافق له فى نفس اللغة يخالفه من حيث الاستعمال اما بالنظر الى الحقيقة والمجاز واما بالنظر الى المحاوره وغيرها وصحة الترجمة لا بد لها من المطابقة فى كل الوجوه المتعارفه كما هو المتبادر المتفاهم من تعريف الترجمة اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التى تقوم مقامها. وظاهر ان قيام الفاظ الترجمة فى العجمية مقام الفاظ القرآن فى جميع حيثياتها واحوالها مما لا يكاد ان يوجد وحاصل الاستدلال عليه على سبيل الدليل المباشر يكون هكذا

أصول ترجمه

لولم يمتنع ترجمة القرآن

لما امتنع قيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن من كل الوجوه

لكن قيام الفاظها مقام الفاظه من كل الوجوه ممتنع

فترجمة القرآن ممتنع

وجوابه انا لانسلم صدق هذا الاستدلال لان الحكم في تاليه بامتناع قيام الفاظها مقام

الفاظه من كل الوجوه خطأ ومبنى على سوء الفهم حيث فهموا منه القيام والمطابقه

في ظاهر الاحوال وباطنها وفي المعاني الاصلية التكليفية التي يتعلق بها الغرض

المطلوب من الترجمة وفي المعاني الثوانية التي لا يتعلق بها الغرض المطلوب من

الترجمة فظنوا ان امتناعه يستلزم امتناع الترجمة وهو خلاف ما عليه امر الترجمة من ان

المراد من قيامها مقامها ومطابقتها معها ليس الا بالنظر الى المعاني الاصلية التي

يعلمها علماء العرب بنفس السماع وعلماء العجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن

وهو غير ممتنع بل يسير على من يسره الله عليه ممن استجمع شرائط الترجمة ومع

هذا لو اشكل في المواضع اليسيره العديده من القرآن وهو شاذ ونادر بالنسبة الى جميع

آيات القرآن فحله يمكن في ضوء فن الترجمة واصولها المسلمة المعمول بها بين

اهل العلم وقد بينت امثلتها في اول باب هذا الكتاب فالينظر ثمة - واذ كر ايضا بعض

اصولها المنصوصة بهذا الصنف في البحث الآتي في الباب الثالث المتعلق بالشرائط

المنصوصة بترجمة القرآن واصولها وحاصل الجواب عن الشبهة المذكورة ودليلها

ان الحكم بامتناع المطابقة بين الفاظ الترجمة و الفاظ القرآن خلاف الحقيقة وضد

الانصاف فلا يصغى اليه - بل الانصاف ان يقال اغما لانف محرمي ترجمة القرآن ان

ترجمة القرآن حسب شرائطها واصولها فرض على الكفاية لانها وسيلة التبليغ

المطلوب من الامه بقوله سبحانه وتعالى "وَأَوْحِيْ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ

أصول ترجمه

بَلَّغَ“ (۱) وبقوله ﷺ ”بلغوا عني ولو آية“

وكل وسيلة التبليغ فرض على الكفايه..... فترجمة القرآن فرض على الكفاية

وينبغي ان يقال ايضا ان ترك ترجمة القرآن حسب مواقع الضرورة الداعيه من التبليغ بالقرآن معصية لانه اعراض عن المطلوب الشرعى الثابت من القرآن والسنة وكل اعراض عن المطلوب الشرعى الثابت من القرآن والسنة معصية، فترك ترجمة القرآن معصية۔

﴿الشبهة الرابعه﴾ يقال ان عجائب القرآن لانهاية لها ولا تنقضى بل تنكشف يوما فيوما حسب كثرة النظر فيه كما تشهد به تجربه اهل النظر وكشف اهل الكشف على ضد ما يحذره المقلدون وكما جاء به الخبر الماثور عن النبي ﷺ ”كتاب الله حبل ممدود من السماء الى الارض“ (۲)۔

لا يخفى على احد من اهل البصيرة ان مدآياته من السماء الى الارض ليس معناه الارتباط الباطنى الدائم المستمر المحيط لجميع اقطار الارض وحصص السماء كما هو المتبادر من ذكرهما مطلقا وكذا المراد من عدم انقضاء عجائبه عدم تناهى معارفه العجيبه المثنية فى طى نظمه وتعاطف داله ومدلوله وايضا يعلم كل احد ان الفاظ ترجمته باى لغة كانت لاتفى بهذا الارتباط والمعارف الغير المتناهيين لانها مخصوصة بلسان قوم خاص فى حصة من حصص الارض المعمورة فلا يمكن تصور امكان الوفاء وقيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن وبدونه لا يمكن الترجمة وحاصل الاستدلال فى هذا المنهج يكون هكذا

ترجمة القرآن غير ممكن

لانها لو كانت ممكنة لا يمكن قيام الفاظ ترجمته مقام الفاظه من حيث عدم متناهى

(۱) الانعام: 19۔

(۲) جامع ترمذى، ج: 2، ص: 219، مطبوعه سعيد كمپنى كراتشى۔

أصول ترجمه

المعارف العجيبه والارتباط التام من السماء الى الارض-

لكن لايمكن قيام الفاظ ترجمته مقام الفاظه من حيث عدم تناهى المعارف العجيبه

والارتباط التام من السماء الى الارض

فترجمة القرآن غير ممكن

وجوابه بان هذا القياس ليس بشئ يعقل لعدم اتصال نسبته يعنى بين امكان الترجمة

وبين امكان قيام الفاظها مقام الفاظ القرآن من جهة الحيثية المذكوره لان الاتصال فى

القياس الاتصالى الاستثنائى حسب تفصيل المناطقه لا يخلو عن ثلاث صور الاولى

يكون المقدم علة للتالى كما فى نحو "ان كانت الشمس طائفة فالنهار موجود"-

والثانيه على عكس هذا كما يقال "ان كان النهار موجودا فالشمس طالعة"-

والثالثة يكون المقدم والتالى كلاهما معلولى شئ آخر كما يقال "ان كان النهار موجودا

فالفضاء مضئية"

فظاهر ان المقدم فيه يعنى وجود النهار والتالى يعنى اضائة الفضاء كلاهما معلولان

لوجود الشمس كما لا يخفى على احد من اهل البصر وشرح الاتصال بين المقدم والتالى

فى القياس الاستثنائى الاتصالى بهذا النمط وان كان مشهورا عند الميزانين لكن لا يختص

بهم بل لكونه حقيقة واقعية يجرى فى الالهيات ايضا كما يقال فى الصورة الاولى ان

كان زيد مومنا صادقا بالنبي ﷺ فهو محب له ﷺ

وفى الصورة الثانية "ان كان زيد محبale ﷺ فهو مومن صادق به ﷺ فظاهر ان المحبة

له ﷺ والرضا بحكمه كلاهما لازمان للايمان الصادق به ﷺ فيصدق ان يقال لو كان

زيد محبا صادق ﷺ فهو راض بحكمه ﷺ" كلزوم وجود النهار واضائة الجولطلوع

الشمس وهكذا فى سائر لوازمات الايمن مع الايمان كما بسطته كل البسط فى كتابى

الآخر "أصول تكفير" وفى ضوء هذه الحقائق لا يوجد الاتصال بين نسبتي المقدمتين

أصول ترجمه

فى قياس القائسين المذكورين لعدم التلازم بين امكان الترجمة وبين امكان قيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن من جهة الحيثية المذكورة كما لا يخفى على المستبصر اليقظان لان الترجمة لا يمكن تصورها بدون تصور الغرض المطلوب منها وهو اطلاع اهل لسان الترجمة ومن اليهم على المعانى الاصلية للقرآن واما المعارف العجيبة الغير المتناهية واحاطة الارتباط من السماء الى الارض فمن قبيل المعانى الثوانية لا يتعلق بها الغرض المطلوب من الترجمة وظاهر ايضا ان العامل المختار فى عمله اى العمل كان لا يتصدى اولا وبالذات الا الغرض المطلوب ولا يكون مقصوده الاصلى الاذاك لعدم لزوم امكان قيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن من حيث المعارف العجيبة الغير المتناهية واحاطة الارتباط بين السماء والارض والقدم والازلية وغيرها من الفضائل المختصة بالقرآن لا يقدح فى جواز ترجمة القرآن وامكانها فهذا الاستدلال على عدم امكان ترجمة القرآن بمعزل عن الدراية والرواية فالينظر الذين يستدلون على فساد لفساد ترجمه القرآن وحرمة او على عدم امكانه بمثل هذه الهفوات الى شتى زوايا تنقيدها عليهم بدقيق النظر هل يبدو لهم شىء لا يعقل او يرده الدراية او الرواية واتيقت بفضلته وتوفيقه سبحانه وتعالى لا يجدونه الامزيل الشبهات والاهام ولا نكتفى لجواز ترجمة القرآن بهذا القدر ولا نقف فى هذا الموقف فقط بل نستدل على رغبهم ها اولاء المانعين للامكانها ونقول بتوفيقه سبحانه وتعالى "لولا تكن ترجمة القرآن ممكنا لا يمكن نقيضه وهو عدم ترجمة القرآن لكن عدم ترجمة القرآن ليس بممكن فترجمة القرآن ممكن" واما تفصيل اجزاء دليلنا هذا وتنقيحه فالمقدمة الاولى منها بديهية من قبيل الاوليات لان العقل لا يجوز اجتماع النقيضين ولا ارتفاعهما فلا ضرورة لطلب الدليل عليه واما المقدمة الثانية التى استثنى فيها رفع التالى

أصول ترجمه

اعنى لكن عدم ترجمة القرآن ليس بممكن فمبرهن بدليل انه مقتضا عموم الرسالة كما هو المفهوم من قوله سبحانه وتعالى "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا" (١) "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا" (٢) "وَأَوْحَىٰ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ" (٣) وقوله ﷺ "بلغوا عني ولو آية" (٤) وقوله ﷺ "لا يسمع بي أحد من هذه الأمة يهودى ولا نصرانى ثم يموت ولم يؤمن بالذى أرسلت به الا كان من اصحاب النار" (٥) وعموم رسالته ﷺ للعرب يقتضى التبليغ بالقرآن وتعطير اذانهم بمعانيه الاصلية فى لسانهم سواء كان المبلغ هو ﷺ بشخصه الشريف او ورثائه من علماء الحق كثر الله سبحانه وتعالى سوادهم الى يوم القيامة وللعمم يقتضى ابلاغ معانيه الاصلية وتانسيتهم باحكامه التكليفية وجذبهم الى معانيه الفطرية والى ما يرغبهم الى النظر والتفكر فيه فى سنتهم الاعجمية وهذا لا يمكن الا بترجمة القرآن بالنظر الى معانيه الاصلية التى يعلمها العرب بنفس السماع والعمم بواسطة الفنون اللسانية الآلية لفهم القرآن والعلوم الخادمة له وهذا هو المعروف المتعامل به بالنظر الى تبليغ الاعاجم بالمعاني الاصلية للقرآن مدى الايام من بدء الاسلام الى الآن فى جميع اقطار الارض والبلدان قضاء لاقتضاء عموم رسالته ﷺ واداء لفريضة ابلاغ

(١) السباء: 28-

(٢) الاعراف: 158-

(٣) الانعام: 19-

(٤) جامع الصغير مع فيض القدير، حديث نمبر: 3159، ج: 3، ص: 206، مطبوعه دار الفكر بيروت-

(٥) مشكوة الشريف، كتاب الايمان مع المرققات لملاعلى القارى، ج: 1، ص: 67-

أصول ترجمه

الاعاجم المعاني الاصلية للقرآن كما قال الزمخشري في كشافه "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" (فان قلت: لم يبعث رسول الله ﷺ الى العرب وحدهم وانما بعث الى الناس جميعا- قل يا ايها الناس اني رسول الله اليكم جميعا- بل الى الثقلين وهم على السنة مختلفة، فان لم تكن للعرب حجة فلغيرهم الحجة، وان لم تكن لغيرهم حجة فلو نزل بالعجمية لم تكن للعرب حجة ايضا، قلت: لا يخلو اما ان ينزل بجميع اللسان او بواحد منها، فلا حاجة الى نزوله بجميع اللسان لان الترجمة تنوب عن ذلك وتكفي التطويل، فبقي ان ينزل بلسان واحد، فكان اولى اللسان لسان قوم الرسول لانهم اقرب اليه، فاذا فهموا عنه وتبينوه و تُنَوَّلَ عنهم وانتشر قامت التراجم ببيانه وتفهيمة، كما ترى الحال وتشاهدها من نيابة التراجم في كل امة من امم العجم، مع ما في ذلك من اتفاق اهل البلاد المتباعدة والاقطار المتنازحة والامم المختلفة والاجيال المتفاوتة على كتاب واحد، واجتهادهم في تعلّم لفظه وتعلّم معانيه) فَكَأَنَّ قَوْلَهُ "كما ترى الحال وتشاهدها من نيابة التراجم في كل امة من امم العجم الى قوله" واجتهادهم في تعلّم لفظه وتعلّم معانيه" - خلاصة ما فصلناه وعكسُ عمل التبليغ للاعاجم بالقرآن ومראה الحقائق العملية التي لا يمكن انكارها ولذا لا ترى احدا من المُفسِّرين الذين جاؤ بتفسير آيت رقم 4 من سورة ابراهيم بعد الزمخشري ناقدًا عليه بل كلهم مستسلمون لديه تسليم السكوت والرضا لان السكوت في معرض البيان بيان حتى ان مصنف الانصاف فيما تضمنه الكشاف من الاعتزال الامام ناصر الدين احمد ابن محمد المالكي مع التزامه النقد على الزمخشري اظهر الرضا به وقال "قال احمد جميع الفصل مرضي" (١) -

(١) الانصاف فيما تضمنه الكشاف من الاعتزال المطبوع مع الكشاف المجلد الثاني،

ص: 366، مطبوعه دار المعرفة بيروت -

أصول ترجمه

والامام ابواسحاق الشاطبي في موافقاته "فأما على الوجه الاول فهو ممكن ومن جهته
صح تفسير القرآن وبيان معناه للعامة ومن ليس له فهم يقوى على تحصيل معانيه، و
كان ذلك جائزاً باتفاق اهل الاسلام فصار هذا الاتفاق حجة في صحة الترجمة على
المعنى الاصلى- (١)

خلاصة البحث في الباب:-

(١) وما ذكرناه من الاشتباهات الاربعة بالنظر الى جواز ترجمة القرآن هي امهاتها التي
تولد منها الوسوس بشتى انواعها ونحن تركنا ذكرها لاننا لم نركب فائدة في أن نسردها
بل اكتفينا بهذه الامهات المنتجة النتائج العقيمة ودد بنا لافي هذا الكتاب فقط بل في
جميع تصانيفنا هو الاكتفاء بالاصول والامهات والاجتناب عن التطويل ونحن على
يقين انشاء الله العلى الكريم بان ما اكتفينا به هنا هو كاف لازالة اى شبهة وشاف
لجميع الوسوس المتولدة من الاسس المذكورة المنقلعة بالحقائق اللاتي سردناها بشرط
ان ينظر فيها الناظرون بدق النظر ويتفكروا في سابقها ولاحقها بفكر سليم صاف
لا شرقى ولا غربى بل بخالص نور الايمان-

(٢) ترجمة القرآن بالمعنى المتعارف اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر
التي تقوم مقامها لا يقال لها بالنظر الى المقصد انها جائز فقط بل في جوازها تفصيل
بانها تحب على سبيل العين تارة وعلى الكفاية تارة اخرى اعنى لا بالتعيين على شخص
او اشخاص مخصوصين بل على جماعة المسلمين بالاجمال بحيث اذا اتى بها البعض
حصل المقصود وفي بعض الاحيان لا تحب بل تستحب لغرض التبليغ بالقرآن وهذه
الاحكام الثلاثة لترجمة القرآن توابع لاحوال الناس بالنظر الى الظروف والمعاشرة-

(١) الموافقات، ص: 239، المطبوعه دار الكتاب العربى بيروت-

أصول ترجمه

(٣) مطابقة الفاظ الترجمة بالفاظ القرآن وقيامها مقامها المذكور في تعريف ترجمة القرآن المتعارفه اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها. المراد منه المطابقة بالنظر الى المعانى الاصلية للقرآن التي يفهمها العرب بنفس السماع والعجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن والعلوم الخادمة له لان الفرض المطلوب من ترجمة القرآن هو ابلاغ هذه المعانى فقط لاهل اللسان الذى يترجم فيه ومن اليهم واما المعانى الثوانية المثنيات فى طي نظم القرآن و المعارف والاسرار اللواتى لا يدركها جمهور العرب بنفس السماع ولا العجم بوسيلة الفنون الآلية لفهم القرآن فلا يتعلق بها الغرض المطلوب من الترجمة اذ هي وراء فهم الجمهور من اهل لسان القرآن حيث لا يفهمونها بنفس السماع بدون توفيقه الخاص سبحانه وتعالى فضلا عن العجم فلا فرق بين العرب والعجم بالنظر اليها فلا يبقى اى فائدة لربط مقصد الترجمة بها وهكذا حال القرآن من حيث الارتباط بكل شئ من السماء الى الارض ومن حيث القدم والازليه والبرزخيه بين الخطاب والكتاب وبين نظم الكلام ونشره لا يتعلق الغرض المطلوب من الترجمة بها لكونها خارجة عن المعانى الاصلية للقرآن وتسترها عن فهم جمهور الناس حيث لا يعلمها العرب فضلا عن العجم الا الراسخون فى العلم الموفقون منه سبحانه وتعالى بتوفيق خاص وما جاء فى بعض الروايات ان عمر ابن الخطاب رضي الله عنه تعلم سورة البقرة فى اثنتى عشرة سنية كما فى الجامع لاحكام القرآن للإمام ابى عبد الله الانصارى القرطبى، ج: 1، ص: 40، المطبوعه بمكتبه الغزالي دمشق الشام.

وكذا ما جاء فى عبد الله ابن عمر (رضي الله تعالى عنهما) انه تعلم سورة البقرة مدة ثمانى سنين كما فى الموطا للإمام المالك، ص: 190، مطبوعه مير محمد كراتشى باكستان.

وما جاء عن ابن ابى مليكه فى ابى بكر الصديق رضي الله عنه انه قال سئل ابو بكر الصديق رضي الله عنه فى

أصول ترجمه

تفسير حرف من القرآن فقال اى سماء تظلنى واى ارض تُقلنى واين اذهب و كيف اصنع اذا قلت فى حرف من كتاب الله بغير ما اراد تبارك وتعالى (١)۔

كل هذه وامثالها متعلقة بمعارف القرآن واسراره التى لا يعلمها جمهور الناس من العرب بنفس السماع فضلا عن العجم من ترجمة القرآن لانها خارجة عن المعانى الاصلية التكميلية ومثنية فى طى نظم القرآن وبهذا الاعتبار يصح اطلاق لفظ

المثنائى "اسم مفعول جمع مكسر لمثنى من الثلاثى المجرد اعنى ثنى يثنى ثنيا بمعنى الطى والتلفيف" على كل آية القرآن الكريم كما ينبى عنه الفاظ الحديث "لَا تَنْقُضِ

عَجَائِبَهُ" (٢) ولا يعلمها الا الراسخون فى العلم بعضهم بمحض موهبة الله عز وجل وبعضهم بعد الرياضة وامانة النفس الامارة فى طلبها حتى يصير من المحدثين

والملهمين الموفقين الذين يرون ما لا يراه جمهور الناس ويسمعون ما لا يسمعه اكثر اهل الفضل والكمال فضلا عن العوام۔ وعمر ابن الخطاب وابنه عبد الله (رَضِيَ اللهُ

تَعَالَى عَنْهُمَا) وامثالهما من اكابر الصحابة مع كونهم فائزين بهذه السعادة العظمى قد خفى عليهم بعض خبايا المعارف القرآنية وتفسير بعض الالفاظ لا يكونها غريبة

وحشية غير مانوس الاستعمال حتى يلزم كون القرآن غير فصيح ويلزم كذب دعوى كونه عربيا مبينا ويُسر الفهم العباد بالله بل لوسعة خباياه المخصوصة به وعدم تناهى

زوايا مظاهره التى لا توجد فى غيره فضلا عن الترجمة فلا يتعلق بها الغرض المطلوب من ترجمة القرآن لان المقصود الاصلى من ترجمة القرآن هو اطلاع اهل لسان

الترجمة ومن اليهم على المعانى الاصلية للقرآن التى يقال لها المفهوم الاول ايضا

(١) الجامع لاحكام القرآن، للامام القرطبى الانصارى المجلد الاول، ص: 34،

مطبوعه الغزالي الدمشق الشام۔

(٢) جامع الترمذى، باب فضائل القرآن، ج: 2، مطبوعه سعيد كمپنى كراتشى۔

أصول ترجمه

وكل تفسير خفى على صحابة الرسول ﷺ اهل لسان القرآن سيما الذين نزل حسب تحاورهم كما قال النبي ﷺ "فاكتبوها بلسان قريش فان القرآن انزل بلسانهم" (١) فهو من قبيل المعانى الثوانيه والمفهوم الثانى الذى هو وراء فهم جمهور اهل لسان القرآن وان كانوا قريشا مثل ابى بكر وعمر (رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا) وعدم فهمه لا يقدح فى فضلهم كما لا يضر عربية القرآن الفصحى ولا يخرججه عن البلاغة لانه وراء المعانى الاول المتعلقه بعلم المخاطبين وعملهم والفصاحة والبلاغة لا يتعلقان بالمفهوم الثانى بل يُنْظَرُ فيهما بالنظر الى المفهوم الاول والغرض المسوق له الكلام فقط كما يظهر من كتب البلاغه ولا يخفى على من مارس الفن وهوليس الا المعانى الاصلية للكلام فلا يلزم من عُسر فهم امثال هذه المعارف عُسر فهم القرآن حتى يكون ضد القول عز وجل "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْكِرٍ" (٢) ولا خروج القرآن من الفصاحة والبلاغة ولا عدم امكان الترجمة لان ترجمة القرآن لا يتعلق الا بالمعانى الاصلية للقرآن وكذا حال القرآن من حيث حلاوته اللسانيه والاستلذاذ السماعيه والجذب الحواريه لا يتعلق بها الغرض المطلوب من الترجمة فلا يبقى لتعلق الغرض المطلوب من الترجمة الا المعانى الاصلية التى يفهما جمهور العرب بنفس السماع والعجم بوسيلة العلوم الآلية لفهم القرآن كما هو المتعارف المشاهد فى علماء العجم المهرة فى الفنون الآلية لفهم القرآن والعلوم الخادمة له واما جمهور العجم الذين لا يعلمون العلوم الخادمة فلا سبيل لهم لفهمها الا لترجمه بمعناها المتعارف اعنى "ابدال الفاظ القرآن بالفاظ لسانهم التى تقوم مقامها" حسب الشرح الذى بسطناه للطالبين من اهل العلم واما الذين يرون فى صف علماء العجم لكن لا مهارة لهم فى الفنون والعلوم الخادمة

(١) بخارى شريف، ج: 2، كتاب ابواب فضائل القرآن مطبوعه قديمى كتب خانه كراتشى

(٢) القمر: 17-

أصول ترجمه

للقرآن وان كانوا مدرسين ومعلمي الناس و خطبائهم المشهورين بالعلم والفضل فهم في ضوء تجربتنا في حكم عوام الناس و جمهورهم وان كان بين الطائفتين بونا بعيدا من حيث العلم وعدمه والسائس والمسوس و الرئاس والمرؤس والمقتدى والمقتدى وغير ذلك في الجهات الكثيرة لأن ترجمة القرآن تقتضي الاحتياط كل الاحتياط من كل الوجوه ومشروطة بشروط كثيرة بحيث لا تصح بفقد شرط واحد مع استجماع باقي الشرائط فضلا من ان يصح مع فقد الشرائط فوق الواحد ومن شرائط صحتها وجواز الخوض فيها المهارة التامة في جميع الفنون الآلية لفهم القرآن والعلوم الخادمة له مثل علم التصريف والنحو والاشتقاق ومتن اللغة وعلم المعاني والبيان والبديع قال امام البلاغة يوسف السكاكي؛

”ان الواقف على تمام مراد الحكم تعالى وتقدس من كلامه مفتقر الى هذين العلمين كل الافتقار فالويل كل الويل لمن تعاطى التفسير وهو فيهما راجل“ (١)
وقال الامام الراغب الاصفهاني ”كل من كان حظه في العلوم او فر كان نصيبه من علم القرآن اكثر“ (٢)

وقال الامام فخر الدين الرازي ”ومتى تكلم في القرآن من غير ان يكون متبحرا في علم الاصول وفي علم اللغة والنحو كان في غاية البعد عن الله“ (٣)
وذكر المحدث الشوكاني القاضي بحواله فضيل ابن عياض انه قال ”لن تعلموا القرآن حتى تعرفوا اعرابه“ (٤)

(١) مفتاح العلوم، ص: 70، مطبوع دار الكتب العربية بيروت.

(٢) مقدمة التفسير للراغب الاصفهاني المطبوعه مع مفردات القرآن، ص: 597، مطبع اصح المطابع كراتشي باكستان.

(٣) التفسير الكبير، ج: 7، ص: 191، مطبوعه طهران.

(٤) مقدمة التفسير فتح القدير، ج: 1، ص: 14، طبع دار الفكر بيروت.

أصول ترجمه

هذا شأن تفسير القرآن لا يمكن اداء حقه بدون العلوم الخادمه ويهلك متصديه بهلاكة
الجهل كل الهلاك بدون المهارة فى الفنون الآلية لفهم القرآن فكيف يتصور صحة
ترجمة القرآن بدون المهارة التامه فيها وشأن ترجمة القرآن احوط واصعب واكثر
شرطا من تفسير القرآن وكل ما يوجد ويُرى من اغلاط التراجم فى الدنيا بالسنة
مختلفه ليس الا من نتائج فقد الشرائط فى المترجمين وان كانت الدنيا تقول لهم
المحدث والمفسر والمدرس والمفتى وشيوخ الحديث والتفسير ومرشد الناس وتكفى
لهذه الفاجعة مثالا ترجمة آيت رقم 69 من سورة البقره "إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ
لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّظِيرِينَ" ترجمها المترجمون بلسان اردو (حق تعالى یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک
زر درنگ کانیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو) وترجمة هذه الترجمة
بالعربى تكون هكذا (يقول الحق المتعال ينبغى ان يكون ثورا اصفر لونه ينبغى ان يكون
شديد الصفرة بان يكون ساراً للناظرين) ومفاسد هذه الترجمة تتجاوز عن ثلاثين اغلاطا
بعضها ظاهر لكن لا يُحسّ به اكثر اهل العلم وبعضها اظهر وافحش لا يخفى على احد
من علماء العربيه وهو ترجمة بقرة صفراء يثور اصفر لان الثور مذكر وصفة الصفراء
للبقرة ضده لكون الف تانيثه مستلزم التانيث بان لا يكون مدخوله الا مونثا كما لا يخفى
على من له ادنى رائحة العربيه سيما علماء النحو فترجمة بقرة صفراء بثور اصفر لا
تختلف من آن تترجم الضان الصفراء بكيش اصفراو ان تترجم المعز السوداء بتيس
اسود او تترجم امرئة بيضاء برجل ابيض وهو كما ترى من الفحش الاظهر فى ترجمة
القرآن ولا حول ولا قوة الا بالله وامثال هاآولآء المترجمين ليسوا بأسافل العلماء ولا
مجهول الذكربل من مشاهير الهند الى ان قال بانى باكستان محمد على جناح لاحد
هاآولآء المترجمين اذ كان مؤيداله فى مساعيه لتحرير الهند وتحريك الباكستان،
"ومعنى من علماء الهند فى ضد علماء الذين مع نهرو فى خلاف باكستان لحرى بان

أصول ترجمه

يوذن بذهب“ومقصدا الوحيد من هذا المثال هو تأييد موقفنا المذكور بان المعيار لصحة ترجمة القرآن هو استجماع الشرائط مع التوفيق من عند الله عز وجل لا شهرة المترجم بالعلم والفضل والدرس والفتوى وغير ذلك من الفضائل وعظيم الالقاب ومن الشرائط الواجبة المهارة التامة والرسوخ الكامل في جميع الفنون والعلوم الآلية لفهم القرآن حتى لو كان الذي يتصدى لترجمة القرآن قليل البضاعة في فن واحد فقط من هذه العلوم الوسيلة لفهم القرآن لا يمكن له اداء حق الترجمة ولا يجيز له الشرع للخوض في هذا العمل والا يكون ما يظلمه اكثر مما يعده كما رثيت في هذا المثال.

(٤) ترجمة القرآن بمعناها المتعارف اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها سهل ويسير لمستجمع شرائطها الموفق منه سبحانه وتعالى وله يجيز الشرع للولوج فيها حسب مقتضاء الحال وجوبا في حين واستحبابا في حين آخر وفرضا عينا في شخص وكفاية في الاشخاص اجمالا ووجودها اولاء الكاملين المكملين لمقاصد عموم الرسالة المبلغين دعوتها للاعاجم الحافظين لكتاب الله تعالى من تحريفات الجاهلين لا يفقد مدى الايام بل هو مستمر من ابتداء الاسلام الى ان تقوم الساعة كما جاء في الحديث ”يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين“ (١)

وهي غير تيسر بل صعب كل العصب على فاقد شرائطها لعدم التوفيق منه سبحانه وتعالى ولا يجيز له الشرع للولوج في هذا الخطر وكل ما يرى ويوجد من التراجم الصحيحة في اى لسان من السنة الدنيا فهو من فيض جامعى الشرائط الموفقين من عند الله سبحانه وتعالى.

وكل ما يرى من التراجم الغير المعيارية فهو من فاقدى الشرائط الغير الموفقين وهم

(١) مشكوة المصابيح، كتاب العلم، ص: 36.

أصول ترجمه

الاكثرون بغالب الاكثريه ومثل قلة الطائفة الاولى السعيدة البارة في مقابل هااولاء
الاكثرين كمثل قلة الملح في الطعام حتى لايبعد ان يعد واحد منهم بالف من هااولاء
الاكثرين كماقال البحرى؛

ولم ازامثال الرجال تفاوتاً لدى المجد حتى عدالف بواحد (١)

(٥) والاصل الاصيل والحجر الاساسى لصحة ترجمة القرآن بمعناها المتعارف "ابدال
الفاظ القرآن بالفاظ السان الاخرالتى تقوم مقامها"حسب التفصيل الذى فصلناه قبل
بعداستجماع الشرائط بل قبلها هو التوفيق من الله عزوجل بمعنى ان استجماع الشرائط
لايمكن بدون توفيق الله تعالى وتوفيقه سبحانه وتعالى فى هذاالشان لا يظهر بدون
استجماع الشرائط فالافتقار من كلى الجانبين مع اختلاف الجهة من حيث الوجود
والظهور فالحكم على ترجمة القرآن بالنظرالى المعانى الاصلية للقرآن بالفساد و
بالنظر الى المفردات المرتبه التى يقال لها نظم القرآن بالحرمة وعدم الامكان كماهو
داب العلامة المناع القطان فى مباحث علوم القرآن بنائه على اربع غفلات؛

احدها:- الغفلة عن تعريف ترجمة القرآن وعن الغرض المطلوب منهاوعن موضوعها-

ثانيها:- الغفلة عن شرائط الترجمة-

ثالثها:- الغفلة عن استمرار وجود المتاهلين الموفقين لترجمة القرآن وعن تراجمهم
الموجودة فى شتى السنة الدنيا وان كانت قليل الوجود بالنسبة الى غير المعياريه
كالملح فى الطعام-

رابعها:- التلون بالظروف والمعاشره والتاثر من كثرة التراجم الغير المعيارية والياس
عن ايجادالترجمة المعياريه التى تكون وفق المحاوره "محاورة لسان القرآن ومحاورة

(١) خطبه تفسير الكشاف، ج: 1، ص: 14، مطبوعه دارالمعرفه بيروت-

أصول ترجمہ

السان الذی یترجم فیہ“اعنی حسب وفق المحاورتین فعلى هذا لا یغلط ان یقال الدفعات المذكوره من التحريم والفساد وعدم الامکان من مصنف مباحث فی علوم القرآن ومن الیه من موافقیه فی هذا الحکم انه بناء الغلط على الغلط وهکذا قول علماء لجنة اهل الحديث فی ترجمة القرآن باسم (معانی القرآن الکریم لفظ به لفظ رواں اردو ترجمہ مع قرآنی گرامر) قالوا فی ابتدائیتها (ہم یہاں اپنے اس احساس کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کی توثیق یا تائید بیسیوں دوسرے صاحبان علم نے بھی کی ہے اور ان سب آراء کا ملخص یہ ہے کہ قرآن مجید کا کما حقہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں البتہ اس کی ترجمانی کی بہتر سے بہتر کوششوں اور اسالیب کو اختیار کیا جاسکتا ہے بس یہی ایک نقطہ نظر ہے، جس کے پیش نظر ہر عہد کے مترجمین نے نئے سے نئے قرآنی تراجم پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔“ (۱)

ترجمتہ فی اردو ”نحن هنا نرى ضروريا ان نبين احساسنا الذی وثقه وايدہ العلماء الآخرون فوق اضعاف العشرین وملخص آراء کلهم ان ترجمة القرآن وفق اقتضاء حقہ فی لسان آخر غیر ممکن نعم یختار الجهد والتفنن لترجمانیہ (للتعبیر عنه) على الوجهه الاحسن فالاحسن فنظر الی هذه الفلسفه فقط تسعد مترجموا کل عہد بايجاد التراجم الجدیدہ۔

وموقف السيد ابی الاعلی المودودی بالنظر الی ترجمة القرآن لا یتجاوز عن هذا المنوال حیث قال بعدما اظهر عدم الرضا بترجمة لفظية ”لفظی ترجمے کے طریقے میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہے جن کی تلافی کرنے کے لیے میں نے ترجمانی کا ڈھنگ اختیار کیا ہے میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک

(۱) معانی القرآن الکریم لفظ به لفظ رواں اردو ترجمہ مع قرآنی گرامر، ص: 9، مطبوعہ دار السلام ہیڈ آفس سعودیہ عربیہ الرياض، پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم 36 لوئر مال سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور۔

أصول ترجمه

عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں ہو۔“ (۱)

ترجمتہ فی العربی (للاجتناب عما فی طریق الترجمة اللفظیة من نقص وعدم کمال اخترت جهة الترجمانی واجتهدت فيه عکس الباس الفاظ القرآن لباس اردو ان انقل المفهوم الذی جاء فی ادراکی والاثر الذی فاض علی قلبی بعد قراءة جملة من القرآن الی لسانی مع الجهد التام لصحته بان لا یكون فی جهة بیانه لون الترجمة یكون الترجمانی لعربی مبین با اردو مبین“ وکل هذه الاقوال وامثالها الكثيرة فی ای لغة ولسان كانت مع بنائها علی الغفلات الاربعة المذكورة متلونة بلون البدعة المخترعة التي اخترعها العلامة مناع القطان فی کتابه المذكور بعنوان الترجمة التفسیریة بعدما حکم علی الترجمة الحرفیة ای اللفظیة بعدم الامکان تارة وبالحرمة کره اخرى وعلی الترجمة بالنظر الی المعانی الاصلیة للقرآن بالفساد بعد الجواز حیث قال ”ویحق لنا ان نقول ان علماء السلام اذا قاموا بتفسیر للقرآن یتوخی فیہ اداء المعنی القریب المیسور الراجح ثم یترجم هذا التفسیر بامانة وبراعة فان هذا یقال فیہ ترجمة تفسیر القرآن او ترجمة تفسیریة بمعنی شرح الکلام و بیان معناه بلغة اخرى“

ومفاسد هذه الاقوال والآراء وان کثر فی العهد الحاضر قائلوها اکثر لا تکاد تحصی لکن اصولها الاساسی لا تتجاوز عن الاربعة المذكورة سابقا فالینظر فی ضوئها حتی یتضح ویصفو ضوء النهار من ظلمة الغلس وبهذا القدر من الکلام علی مصنف مباحث فی علوم القرآن العلامة مناع القطان نکتفی ونرجو کفایتہ لدرك الحقائق بتوفیقه عزوجل۔
اللهم انت تشهد وتعلم السرائر وضمائر القلوب وان جهدی هذا لیس الاجهد المقل

(۱) دیباچہ تفہیم القرآن المطبوعہ مع ج: 1، ص: 10، ادارہ ترجمان القرآن لاہور پاکستان۔

أصول ترجمه

لخدمة كلامك الكريم وحفظه عن التحريف المعنوي باي اسم كان سيما بجهة الترجمانى باسم الترجمة وبشكل ترجمة تفسير المفسر وترجيحه وفكره الميسور له بعنوان الترجمة وانا متيقن حق التيقن على ان ترجمة القرآن بمعناه العرفي اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التى تقوم مقامها لا يمكن بغير شرائطها الفطرية وان ترجمة القرآن وفق شرائطها سهل يسير لمستجمعها الموفق من عند الله عز وجل والتراجم المكتوبة بايدى ها اولاء التراجمة السفرة مع قلتها بالنظر الى المكتوبه بايدى فاقدى الشرائط المملوثة بالالغلاط توجد فى مختلف الالسنه تكميلا لوعد حفظ القرآن منه سبحانه وتعالى وقد شاهدت انا بنفسى من مكتوبتها بالفارسي وارادو ووجدتها غالب الصحه وفق الشرائط الا ماشذو قليل ما هو على انه قابل الاصلاح وقد فصلت كلام من اولاء وها اولاء ونظرت تفصيلهما بنظر التقابل فى تفسيرنا مدارج العرفان فعلى العلماء سيما الذين يتصددون لتعاطى معارف القرآن بعنوان الترجمة او الترجمانى او التفهيم او التفسير والتاويل والتشريح والتفصيل ان يعطرو واذهانهم بمطالعتة فانه النظاره التى يرى فيها الصحيح والسقيم وذو الورم والسمين (فلله الحمد اولا و آخر اظاهرا وباطنا وهو ربى ورب العلمين).

وبعد كلامنا هذا على علامه مناع القطان ومن اليه اوريدانيه فى موقفه المذكور نعود الى لساننا الوطنى اردو ونقول.

تيسرى بحث:- جو ترجمہ القرآن کی تاریخ کہ اس کا آغاز کب اور کیسے ہوا، اور اس کی ضرورت کہ دنیا کو اس کی ضرورت کیوں ہے اور اس کے دواعیات کیا ہیں، اور اس پر گزرنے والے مراحل کہ کن ادوار و تلونات سے گزرنے کے بعد موجودہ شکل میں آیا ہے ان تینوں پر بالترتیب بحث کی جائے گی۔ اس کے آغاز و شروعات کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ صحابی رسول حضرت سلمان

أصول ترجمہ

فارسی ﷺ نے اپنی قوم اور اہل فارس کی خواہش پر سورۃ الفاتحہ شریف کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اس عظیم عمل کی بنیاد رکھی ہے لیکن ترجمۃ القرآن کی اہمیت اور اُس سے غرض و غایت کے تناظر میں دیکھا جائے تو نہ حضرت سلمان الفارسی ؓ کے اس جزوی ترجمہ کو آغاز کار کہا جاسکتا ہے نہ کسی اور کے پورے ترجمہ کو کیوں کہ عموم رسالت کا ترجمان اور بلاغ للناس ہونے کی وجہ سے قرآن شریف کا ترجمہ کسی بھی عجمی کو تبلیغ بالقرآن کرنے کو لازم ہے عام اس سے کہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ آیات کا ہو یا کسی ایک سورۃ یا چند سورتوں کا ہو یا پورے قرآن کا بہر حال دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے نارمل حالات میں غیر مسلم عجم کے لیے تبلیغ بالقرآن کا حق ادا ہونا اُس کے معیاری ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں ہے کیوں کہ عموم رسالت اور ابلاغ قرآن کا مقتضاء ہے کہ جب تک کسی غیر مسلم عجمی کو قرآن کی تبلیغ نہ پہنچائی جائے اُس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکلف اور مسئول عن الاسلام نہیں ہوتا اور ایمان نہ لانے پر اُسے عذاب بھی نہیں دیا جاتا جیسا فرمایا ”وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا“ (۱)، نیز فرمایا ”ذَلِكَ أَنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَفِلُونَ“ (۲) اور غیر مسلم عجم کو دعوت اور تبلیغ بالقرآن کرنے کی صرف دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت:- اُن کی خواہش کے مطابق قرآن شریف کا ترجمہ انہیں پہنچایا جائے چاہے تقریری ہو یا تحریری اور مقتضا الحال کے مطابق پیش کیے جانے والے اس ترجمہ کو جو معنوی قرآن کہلاتا ہے موثر کرنے کے لیے قرآنی انداز تبلیغ اختیار کیا جائے کہ جن آیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے اُن کے حاصل مفہوم اور اصل مقصد کو انہیں ذہن نشین کرانے اور سہل الفہم بنانے کے لیے ان دلائل کو بروئے کار لایا جائے جو عرب و عجم سب کے نزدیک قابل قبول اور ناقابل انکار ہیں جن کو علمی زبان میں اولیات، فطریات، وجدانیات، مشاہدات اور مسلمات جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی غیر مسلم عجمی قوم کو شرک فی العبادۃ سے بچانے

(۱) الاسراء: 15۔

(۲) الانعام: 131۔

أصول ترجمہ

کے لیے دعوت تو حید و ایمان دیتے ہوئے آیت کریمہ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ (۱) کا اس کی زبان میں ترجمہ اس طرح سمجھایا جاتا ہے کہ (میں تمہیں تمہارے خالق و مالک کا حکم پہنچا رہا ہوں وہ تم سب سے کہتا ہے، ”اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ اُمید کرتے ہوئے کہ پرہیزگار بنو گے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ جبکہ تم جانتے ہو۔“)

ترجمہ کے ذریعہ تبلیغ بالقرآن کے اس انداز سے اور وحدت استحقاق عبادت سے متعلق حکم الہی کو اس کے عجمی بندوں کو پہنچانے کے اس کلام سے جو کلام اللہ کے ترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے سننے والے عجمیوں کو اس سے مقصد کا پتہ چل جاتا ہے وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہم سے اپنی عبادت کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی استحقاق عبادت اپنی ذات کے ساتھ خاص ہونے پر دلائل بیان کیے ہیں جو ہمیں اور ہم سے اگلوں کو پیدا کرنے اور زمین کو ہمارے لیے بچھونا آسمان کو چھت اور آسمان سے پانی نازل کرنے پھر اس کے ذریعہ ہماری روزی کے لیے پھل پیدا کرنے جیسے عوامل میں پوشیدہ ہیں۔ اس تصور سے تو حیدنا آشنا عجمیوں کے دل میں بت پرستی کے خلاف شک پیدا ہوتا ہے جبکہ اس سے پہلے انداد و اصنام کا مستحق عبادت ہونے سے متعلق ایک طرفہ تصور تھا کہ وہ اللہ وحدہ لا شریک کو بلا شرکت غیر مستحق عبادت سمجھنے والوں کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتے تھے اب مذکورہ آیات کی الہی تبلیغ علی سبیل الترجمہ کا اثر یہ ہوا کہ انداد و اصنام کی عبادت کا یکطرفہ تصور زائل ہو کر شک کے درجہ میں آ گیا کہ الہی تبلیغ میں مذکور دلائل و اوصاف پر فائز الہ اور رواجی الہ میں سے کون ہے جو عبادت کا واقعی

(۱) البقرة: 21-22۔

اُصولِ ترجمہ

استحقاق رکھتا ہے۔ ابلاغ القرآن علی سبیل الترجمہ کے اس اثر کے بعد اگر وہ شرکی ماحول کی اندھی تقلید سے نکل کر عقل کی روشنی سے کام لیں اور برحقِ الہ کے مذکورہ اوصاف و دلائل کو اپنی نظر و فکر کا محور بنالیں تو کوئی بعید نہیں ہے کہ شک زائل ہو کر اُن کے دل میں برحقِ الہ کی وحدت استحقاق عبادت کا ظن یعنی غالب گمان پیدا ہو جائے جو مزید غور و فکر کے بعد یقین میں بدل سکتا ہے جسے علمی زبان میں علم الیقین کہتے ہیں اس انداز سے دائرہ اسلام میں آنے والوں کی متعدد مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں اور اگر وہ ابلاغ القرآن علی سبیل الترجمہ سے پیدا ہونے والے اس اثر و شک میں ہی رہتے ہیں یعنی شرکی ماحول کی اندھی تقلید سے آزاد دل و دماغ سے مذکورہ دلائل و اوصاف پر غور و فکر نہیں کرتے تو پھر تبلیغ بالقرآن علی سبیل الترجمہ کی اس حد پر اکتفا کرنے کی بجائے مسلم مبلغین پر لازم ہے کہ اُن پر مزید محنت کریں اور اُن کے شک کو زائل کر کے یقین کی طرف لانے کے لیے قرآن شریف کی اُن آیات سے کام لیں جو اولیات، فطریات، وجدانیات اور مشاہدات کے انداز میں اہل لسان یعنی عرب کے سامنے پیش کی گئی ہیں جن سے الہی تبلیغ کے مقاصد کو وہ محض سننے کے ساتھ ہی سمجھ جاتے ہیں غیر مسلم عجمیوں کا شک یقین میں بدلنے کے لیے اُن کی ترجمانی پیش کرنی ہوگی مثلاً ”أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ“ (۱) کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ جو الہ تمہارا اور تمہارے آباء و اجداد کا اور تمام اولین و آخرین کا بلا شرکت غیر خالق ہے کیا اُس کے ساتھ استحقاق عبادت میں کوئی اور شریک ہو سکتا ہے؟ اسی طرح آیت کریمہ ”هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“ (۲) کی ترجمانی کر کے سمجھایا جائے کہ اگر زمین و آسمان کو پیدا کر کے تمہارے لیے روزی کا سامان کرنے والا کوئی ہے تو وہ سامنے لے آؤ ورنہ سوچو کہ تم اپنے خالق و رازق کے مقابلہ میں کس کی عبادت کرتے ہو؟

(۱) النحل: 17۔

(۲) غافر: 3۔

أصول ترجمہ

اسی طرح آیت کریمہ ”هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا“ (۱) کی ترجمانی کر کے سمجھایا جائے کہ تم جانتے ہو کہ زمین کو تمہارے تابع کر کے اس سے تمہاری ضروریات پوری کرنے کا عمل اُس وحدہ لا شریک کے سوا کسی اور کا نہیں ہے تو پھر کسی اور کو اُس کے ساتھ شریک فی العبادۃ کرنے کا کیا جواز ہے؟ اسی طرح آیت کریمہ ”قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ“ (۲) کی ترجمانی کر کے انہیں سمجھایا جائے کہ زمین سے بخارات کو آسمان کی طرف اوپر اٹھا کر مخصوص غیبی اور خود کار نظام قدرت سے بارش برسانے کو اور اُس سے پیدا ہونے والے سامان رزق کو اگر اس کے خالق وحدہ لا شریک نے روک دیا جو صرف اتنے عمل سے ہی رُک جاتا ہے کہ بخارات کے اوپر جانے کا رُخ نیچے کی طرف موڑ دے جس کا انجام یہ ہوگا کہ کسی کو پینے کے لیے بھی پانی میسر نہ ہوگا چہ جائیکہ پوری دُنیا آباد ہو سکے جو بارش کے نظام سے آباد ہوتی ہے۔ غیر مسلم اہل عجم کو تبلیغ بالقرآن کر کے دائرہ اسلام میں لانے کے لیے یہ وہ آسان اور موثر طریقہ ہے جس سے عموم رسالت کا مفاد پورا ہونے کے ساتھ غیر مسلم عجمیوں پر اتمام حجت بھی ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہم اس سے غافل تھے اور ہمیں قرآن کی تبلیغ نہیں پہنچائی گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی مبلغ کا انداز خطاب بھی پیغمبری انداز تبلیغ کے مطابق ہو جس میں جارحیت ہوتی ہے نہ دل آزاری نہ کوئی اور ایسی کمزوری جو سامعین و مخاطبین کے لیے موجب نفرت ہو تبلیغ بالقرآن کے اس انداز سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں شامل ہونے والوں کی بے شمار مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں خاص کر خواجہ خواجہ گان معین الدین حسن خواجہ بزرگ چشتی اجمیری (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے اسی انداز تبلیغ کی بدولت بت کدہ ہند کے ظلمات میں قرآن کا نور پھیلایا۔ الغرض جملہ اقوام عجم کو قرآن شریف کی تبلیغ پہنچانا مسلم

(۱) الملک: ۱۵۔

(۲) الملک: ۳۰۔

أصول ترجمہ

امہ پراجتماعی فرض ہے جو عموم رسالت کا مقتضا اور فرمان الہی ”وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ“ (۱) کی تکمیل ہے، اور آیت کریمہ ”أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى“ (۲) سے مطلوب ہے جبکہ حقائق کی روشنی میں غیر مسلم عجم کو تبلیغ بالقرآن کرنے کی صرف مذکورہ دو صورتیں ہیں؛

❶ تبلیغ القرآن بطریقہ ترجمۃ القرآن۔ ❷ تبلیغ بالقرآن بطریقہ ترجمانی قرآن۔

دعوت تبلیغ بالقرآن بامقصد اور نتیجہ خیز تب ہو سکتی ہے جب مقتضاء الحال کے مطابق ہو اور سامعین و مخاطبین کا حال، اُن کا معاشرہ و ماحول اور اُن کے رجحان طبع جیسے عوامل کبھی ترجمۃ القرآن کے مقتضی ہوتے ہیں کبھی ترجمانی کے جیسا مذکورہ مثالوں سے بھی واضح ہو چکا ہے کہ جو شخص کسی صاحبِ محراب و منبر اور اسلامی مبلغ کا کلام نہیں بلکہ صرف اور صرف الہی تبلیغ اور خدائی دعوت سننے کی خواہش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے اُس کے سامنے کلامِ الہی مثلاً آیت کریمہ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (۳) کی ترجمانی پیش کرنا مقتضاء الحال سے خلاف ہوگا کیوں کہ ترجمانی انسان کا کلام اور مبلغ کی کاوش ہے اسے کلام اللہ کہا جاسکتا ہے نہ معنوی قرآن اور فرمانِ الہی کہا جاسکتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو خطاب جس کی لغوی، عقلی اور عرفی حیثیت کلامِ الہی کی ہرگز نہیں بلکہ کلامِ الہی سے معانی و مقاصد کی انسانی تعبیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس میں کمی و بیشی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی ہیئت کذائیہ کی تبدیلی جیسے تغیرات بھی۔ ایسے میں مسلم مبلغ پر فرض بنتا ہے

(۱) الانعام: 19۔

(۲) القیامہ: 36۔

(۳) البقرہ: 21-22۔

أصول ترجمہ

کہ ”قال ربکم“ کے قرآنی انداز تبلیغ کے مطابق محض ترجمہ پیش کرے اور خود کو محض ترجمان بمعنی مترجم کی حیثیت سے پیش کر کے ابلاغ القرآن بہ طریقہ ترجمۃ القرآن کرے جس کے اثرات ظاہر ہونے کے بعد ترجمانی کے موثر ہونے کے لیے بھی راہ ہموار ہو سکتی ہے جو مقتضاء الحال کے مطابق کہلائے گا۔

چند ناگزیر حقائق سے آگاہی :-

عجم اقوام کو قرآن شریف کا پیغام اور رب الناس ﷺ کے احکام پہنچانے کا بے غبار و موثر ذریعہ ترجمۃ القرآن کے سوا اور کچھ نہیں ہے بشرطیکہ مخاطبین و سامعین اور اسے پڑھنے والے معاند و متعصب نہ ہو، جہل مرکب میں مبتلا نہ ہو اور ترجمانی و تفسیر جیسے انسانی دخل عمل کے بغیر محض کلام الہی کو ترجمہ کے ذریعہ یعنی قرآن شریف کے الفاظ کے عوض اپنی زبان کے ایسے الفاظ میں سننا چاہتے ہوں جو الفاظ قرآنی کی متعارف حیثیات کے قائم مقام ہو سکیں جس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس حوالہ سے یہاں پر چند ناگزیر حقائق سے آگاہی ضروری ہے:

- ❶ نبی اکرم سید عالم ﷺ کے بعد مسلم مقتدرہ اور علماء امت پر ابلاغ القرآن فرض لازم ہے۔
- ❷ ابلاغ القرآن عرب و عجم دونوں کو ایک انداز سے نہیں بلکہ عرب کو اصل قرآن پہنچانا ہوتا ہے جو کلام اللہ کہلاتا ہے کیوں کہ اہل لسان ہونے کے ناطے وہ سننے کے ساتھ ہی مقاصد کو سمجھ سکتے ہیں البتہ حسب ضرورت کچھ آیات کی ترجمانی یا تفسیر بھی ان کی رہنمائی کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کیوں کہ کسی آیت کی تفسیر کو یا کسی لفظ کے متعدد معانی میں سے مراد الہی کے طور پر ایک کی تشخیص و تعین میں مغالطہ یا عدم یقین کلام الہی ہونے کے منافی ہوتا ہے نہ اس کی فصاحت و بلاغت کے جبکہ عجم کو اصل کے ساتھ اس کا ترجمہ پہنچانا بھی لازم ہے اس لیے کہ ترجمۃ القرآن کو متعدد وجوہ کی بنا پر متن قرآن لازم ہے کہ متن قرآن کے بغیر محض ترجمہ مروّج کرنا التباس الحق بالباطل پر منتج ہو سکتا ہے جیسا توراۃ و انجیل کے نام سے پائے جانے والے تراجم کی صورت میں سب کو معلوم ہے لیکن قرآن شریف کی حفاظت کے لیے وعدہ الہی کا ثمرہ ہے کہ اسلام میں

أصول ترجمہ

متن قرآن کے بغیر محض ترجمہ پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۳ عجم کو ترجمہ القرآن کی شکل میں ابلاغ القرآن کرنے میں مسلم و غیر مسلم کا فرق ہے کہ مسلم صاحب قرآن سید عالم ﷺ کی رسالت کو اُس کے جملہ لوازمات کے ساتھ تسلیم کرنے کے ساتھ اصحاب محراب و منبر کو بھی مانتا ہے جس وجہ سے مسلم مبلغین کی طرف سے پیش کی جانے والی ترجمانی و تفسیر بھی اُن کے نزدیک قابل تسلیم ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان عجمیوں کو اصحاب محراب و منبر کی طرف سے تبلیغ بالقرآن کی زیادہ تر صورتیں قرآن شریف کی ترجمانی، تفسیر، تاویل اور تفہیم کے انداز میں ہوتی ہیں، کبھی کبھار مخصوص مقاصد کے تحت ترجمہ بھی پیش کیا جاتا ہے اس کے برعکس غیر مسلم عجمیوں کے سامنے ترجمانی پیش کی جاسکتی ہے نہ تفسیر اگرچہ اپنی جگہ وہ تفسیر نبوی اور قطعی و یقینی ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ جب وہ اللہ کے رسول کو ہی نہیں مانتے تو پھر اُن کے ورثاء و ناسبین کی طرف سے پیش کی جانے والی تعبیر کیوں مانیں جس میں اصل سے کمی و بیشی کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ وہ صرف اللہ کو ماننے کی بنا پر یہی چاہتے ہیں کہ الفاظ قرآنی کے عوض اپنی زبان کے ایسے الفاظ میں فرمانِ الہی کو سنیں، دیکھیں اور پڑھیں جو قرآنی الفاظ کے قائم مقام ہو سکیں یعنی عوضی الفاظ معوض عنہ الفاظ کی تمام حیثیات کے مطابق ہو جس کے بعد دونوں کے محاورے بھی ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں جس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ قرآنی الفاظ کے مطابق بنے ٹکے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ غیر مسلم عجمی ابلاغ قرآن کے اس انداز پر اعتراض اس لیے نہیں کر سکتے کہ ایک زبان میں لکھی گئی کتاب چاہے انسان کی ہو یا اللہ تعالیٰ کی بہر حال دوسری زبان والوں کا اُس کے مندرجات سے آگاہی پانے اور مستفید ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں ہے کہ اُس کے الفاظ کو اس زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو لکھنے والے کی مراد پر دلالت کرنے سے لے کر اُن کی جملہ لسانی و معنوی حیثیات کے قائم مقام ہوں جسے عرفِ عام میں ترجمہ کہا جاتا ہے جو اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دوسرے تمام مذاہب میں بھی یکساں مروج ہے تو رات و

أصول ترجمہ

انجیل کو دوسری زبانوں میں منتقل کر کے کتاب موسوی اور کتاب عیسوی کے نام سے جو مروج کیا گیا ہے یہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہے تو پھر تبلیغ ترجمۃ القرآن کے اس انداز پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور اس اصول کی ابتدا اُس وقت سے ہوئی ہے جب سے انسانوں کی ارتقائی دنیا میں ایک دوسرے کے علوم و ایجادات سے استفادہ کرنے کا شعور اُجاگر ہوا جس کی تعیین سے تاریخ مکمل خاموش ہے۔

۴ کسی غیر مسلم عجم قوم یا جماعت کی طرف سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ وہ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر مسلمان ہوگی اُس وقت مسلم مقتدرہ پر فرض لازم قرار پاتا ہے کہ اُن کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کر کے اُنہیں پیش کرے اگر مسلم مقتدرہ موجود نہ ہو تو پوری مسلم اُمہ پر فرض بنتا ہے خاص کر علماء حق پر کہ یہ فریضہ انجام دیں۔ اسلام کا یہ اصول آیت کریمہ ”أَذْعِ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ“ (۱) سے مستفاد ہے جو کسی اہل علم سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے۔

۵ کوئی غیر مسلم قوم یا جماعت مسلمانوں سے یہ تقاضا کرے کہ مسلم رہنماؤں کے دخل عمل اور اُن کی طرف سے ترجمانی و تفسیر کے بغیر ہماری زبان میں کلام اللہ ہمیں سمجھائیں تاکہ ہمیں اس پر غور کرنے کا موقع ملے۔ اس صورت میں مسلم اُمہ پر علی العموم اور جن خواص سے تقاضا کیا جا رہا ہے اُن پر بالخصوص فرض بنتا ہے کہ اُن کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پیش کر کے اُنہیں اسلام کی حقانیت پر غور کرنے کا موقع فراہم کریں کیوں کہ کسی اُن پڑھ عجمی کے لیے بلام و کاست قرآن شریف کے معانی سمجھنے کی واحد سبیل یہی ترجمہ ہے۔

۶ یہود و نصاریٰ میں سے کوئی قوم یا کوئی عجمی قوم یا جماعت کسی مسئلہ سے متعلق الہی حکم کے حوالہ سے قرآن شریف کا تقابل تورات و انجیل سے کرنا چاہے اور کہے کہ قرآن کا حکم اُن دونوں سے بہتر ثابت ہونے پر مسلمان ہوں گے اور تقابل کی صورت اس طرح ہوگی کہ تورات و انجیل کے نام سے اُن کے جو ترجمے پائے جاتے ہیں اُن کے ساتھ قرآن شریف کے

أصول ترجمہ

ترجمہ کا تقابل کیا جائے گا جس کے ساتھ متن قرآن کا ہونا بھی لازم ہے جو رہتی دنیا تک تحریف سے محفوظ ہونے کی سند ہے۔ نیز ترجمہ کے غیر معیاری ہونے کی صورت میں اصل کے ساتھ تقابل کر کے مسترد کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ترجمہ کے نام سے اہل باطل اور نادان دوستوں کی بے مصرف کمی بیشی اور معنوی تحریف کی نشان دہی کرنے والے اہل حق کے وجود مسعود سے زمین کبھی خالی نہیں ہوتی اس صورت میں قرآن شریف کا ترجمہ ان زبانوں میں کرنا فرض لازم قرار پاتا ہے ورنہ پوری امت گناہ گار ہوگی یہ اصول بھی ”ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ“ (۱) کے ماتحت ہونے کے ساتھ آیت کریمہ ”وَجَادِلْهُمْ بَالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ“ (۲) اور آیت کریمہ ”لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا“ (۳) سے مستفاد ہے۔

❷ کسی غیر مسلم عجم قوم یا جماعت سے فقط اتنی امید ہو کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اس پر ایمان لائے گی یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہوگی یا اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کا زہر پھیلانے سے باز آئے گی یا کسی بھی حوالہ سے اسلام کے حق میں سودمند ہونے کی امید ہونے کی صورت میں ان کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پیش کرنا مسلم امت کی مذہبی ذمہ داری اور فرض لازم قرار پاتا ہے یہ بھی مذکورہ آیات سے مستفاد ہے جو کسی ایسے اہل علم سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو اندھی تقلید کی قید و بند سے آزاد ذہن کے ساتھ ان پر غور کرے۔

❸ دنیا کی کسی زبان اور معاشرہ میں جب قرآن شریف کے غلط ترجمے مروج ہو رہے ہوں عام اس سے کہ مترجم غیر مسلم ہو یا مسلم اناڑی جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم سے اور

(۱) النحل: 125۔

(۲) النحل: 125۔

(۳) بنی اسرائیل: 88۔

أصول ترجمہ

فنونِ آلیہ سے ہی بے خبر ہیں یا ان علوم و فنون میں نیم خواندہ اور ناقص ہوں یا ترجمہ کی شرائط کے جامع نہ ہوا اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو موجودہ دور میں غیر معیاری مترجمین کے ان تمام طبقوں کے ہاتھوں لکھے ہوئے تراجم کی بہتات ہے جنہیں قرآن شریف کی معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایسے میں اُسی زبان و معاشرہ میں قرآن شریف کا معیاری ترجمہ پیش کرنا ان علماء حق پر فرض قرار پاتا ہے جو شرائط کے جامع ہیں، فنِ ترجمہ سے لے کر ترجمۃ القرآن تک کے اصولوں اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہ ہیں ورنہ اس شکر نماز ہر کی حوصلہ شکنی و انسداد کرنے کے بجائے دل میں گڑھتے رہنے سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے کیوں کہ حدیث نبوی ﷺ ”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ“ (۱) کے مطابق ترجمۃ القرآن کی شرائط کے جامع یہ مسعودالوجود حضرات ”أَضْعَفُ الْإِيمَانِ“ کے انحطاط کے بجائے ہاتھ اور زبان سے کام لینے کی ایمانی قوت پر فائز ہیں کہ قرآن شریف کو معنوی تحریف سے بچانے کے لیے معیاری ترجمہ لکھ کر ریکارڈ درست کر سکتے ہیں۔ ایسے میں جامع الشرائط حضرات پر معیاری ترجمہ وجود میں لانے کی فرضیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

۹ کسی عجمی معاشرہ یا کسی قوم کو اسلام کے خلاف نفرت دلانے کی غرض سے دیدہ و دانستہ طور پر سازش کے تحت قرآن کا غلط ترجمہ شائع کیا جا رہا ہو تو علم ہونے کے بعد مسلم اسٹیٹ پر فرض بنتا ہے کہ اُسی زبان میں معیاری ترجمہ شائع کر کے اُسے ناکام کرے اور مسلم اسٹیٹ کی عدم موجودگی میں پوری اُمتِ مسلمہ پر اور خاص کر جامع الشرائط علماء حق پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں پوری اُمت گناہ گار قرار پائے گی خاص کر صاحب استطاعت علماء حق کہ ترجمہ کی شرائط کے جامع ہونے کے باوجود حسبِ ضرورت اُس پر عمل نہ کرنے اور قرآن شریف کا دفاع اور اسلام کو سازش سے بچانے کی تدبیر نہ کرنے کی غفلت کی

(۱) صحیح مسلم شریف، باب کون النہی عن المنکر.....

أصول ترجمہ

بنا پر بعید نہیں ہے کہ ”يُضَاعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ“ (۱) کی وعید کے تحت آجائے۔ (أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ)

حاشیتی اضافہ:- اغیار کی اس سازش کے انسداد کے لیے کیا قرآن شریف کا حقیقی ترجمہ پیش کرنے کے سوا کوئی اور مہذب طریقہ ہے؟ ہم 100% یقین کے ساتھ دُنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے خلاف اُٹھنے والی اس انوکھی سازش کو دفع کرنے کے لیے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ سامنے لائے بغیر چارہ نہیں ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ متن قرآن کے بغیر محض ترجمہ کے ناجائز ہونے اور اسلام میں اس کی اجازت نہ ہونے کا اصل فلسفہ بھی یہی ہے کہ قرآن شریف کے اپنے الفاظ کو دیکھ کر ایسی سازشوں کا ازالہ کیا جائے جو مسلم اُمہ میں موجود جامع الشرائط علماء حق کے لیے آسان ہے۔ ایسے میں ترجمۃ القرآن جیسے فی الجملہ فریضۂ اسلام پر حرمت و فساد اور عدم جواز جیسی دفعات لگانے والے حضرات کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ سامنے لائیں، بغیر اس کے سازش سے اسلام کو بچانے کے لیے اُن کے پاس کیا سبیل ہے؟ کیا ترجمانی، ترجمۃ معانی القرآن، ترجمہ تفسیریہ، ترجمۃ تفسیر القرآن جیسے بے مقصد اور خود ساختہ طریقوں سے اس کا انسداد ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا ان خود ساختہ اصطلاحات سے اغیار کو تقویت نہیں ملتی کہ وہ بھی یہی کہیں کہ ہم نے بھی قرآن سے جو معنی تفسیر کے طور پر سمجھے اُن ہی کا ترجمہ کیا ہے اپنے اس دعویٰ کی تائید کے لیے وہ قرآن شریف کے نادان دوستوں کے لکھے ہوئے غلط تراجم پیش کر کے اگر یہ کہیں کہ جیسا تم نے کیا ہم نے بھی ویسا ہی کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر سوچا جائے کہ ان حضرات کے پاس کیا جواب ہے ظاہر ہے کہ شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ (فَالِی اللّٰهِ الْمُسْتَكٰی)

❶ مسلم عجم کے کسی معاشرہ کے بارے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کے معانی سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کی واحد سبیل ترجمہ ہے جس میں قرآن شریف کے

(۱) الاحزاب: 30۔

أصول ترجمہ

الفاظ کو اُن کی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو الفاظِ قرآنی کے مطابق ہوں جس میں ترجمہ کے الفاظِ متنِ قرآن کے الفاظ کی تعداد کے مطابق نہ تھے ہوں اور ترجمانی و تفہیم اور تفسیر جیسے دخلِ عمل سے محفوظ ہو۔ اس صورت میں ترجمہ القرآن وجود میں لانا استحباب کے درجہ میں ہوتا ہے۔

چند حقائق بطور نتیجہ:- ترجمہ القرآن کے حوالہ سے معروضی حالات کی اس

روشنی سے چند مزید حقائق نتیجہ کے طور پر آپ ہی سامنے آ جاتے ہیں؛

❶ ترجمہ، ترجمانی، تفسیر، تاویل، تفہیم کا آپس میں متباہن حقائق ہونا کہ ایک دوسرے پر صادق آتے ہیں نہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں بلکہ ہر ایک کے استعمال کے مواقع ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ترجمانی کی جگہ تفسیر جائز ہے نہ تاویل اور نہ تفہیم اسی طرح برعکس بھی حالانکہ ان چاروں میں متنِ قرآن سے کمی بیشی اور من پسند الفاظ اضافہ کرنے کے جواز جیسے انسانی عمل دخل کی بڑی گنجائش ہوتی ہے جو ان سب میں قدر مشترک ہے جبکہ ان کے مقابلہ میں ترجمہ ایسا عمل ہے جس میں متنِ قرآن سے کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی، مترجم کو اپنی من پسند الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، متنِ قرآن کی اجتماعی ہیئت نوعیہ میں کسی قسم کی تبدیلی لانا روا نہیں ہوتا بلکہ متن کی مکمل پاسداری و اتباع ضروری ہوتی ہے جیسا کہ ترجمہ کی تعریف ”ابـدا لـالفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ سے آپ ہی ظاہر ہو رہا ہے۔

❷ تفسیر و تاویل کا مسلم معاشرہ کے ساتھ مختص ہونا کہ غیر مسلم معاشرہ میں معتبر نہیں ہیں جبکہ ترجمانی و تفہیم مسلم معاشرہ کے لیے قابل قبول ہونے کے ساتھ غیر مسلم معاشرہ میں بھی فی الجملہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان کی بنیاد ترجمہ پر استوار ہو گئی ہو یعنی اصالتہً نہیں بلکہ ترجمہ کی شکل میں پیش کیا گیا خطاب اللہ کے لیے موید و موضح اور تفہیم کے انداز پر ہو جبکہ ترجمہ القرآن خطاب اللہ کو غیر مسلم عجم تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے جس پر اُن کی طرف سے کسی قسم کا اعتراض ہو سکتا ہے نہ مسلم مبلغین کی طرف سے کمی بیشی کرنے کا شبہ۔

أصول ترجمہ

۱۳ ترجمۃ القرآن کی اہمیت واضح ہونے کے ساتھ اُس کا جامع النقیضین ہونا کہ ممکن بھی ہے لامکن بھی۔ اہمیت اس طرح کہ وہ تبلیغ بالقرآن کی ہر شکل کے لیے اصل الاصول و بنیاد ہے کہ اُس کے بغیر ترجمانی ممکن ہے نہ تفسیر اور تاویل کی گنجائش ہو سکتی نہ تفہیم کی۔ الغرض غیر مسلم عجم کو ابلاغ القرآن کرنے اور خطاب اللہ پہنچانے کا بے غبار طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور جامع النقیضین اس لیے کہ ترجمہ کی صحت کے لیے تمام واجبی شرائط کے جامع مترجم کے لئے ممکن ہے بلکہ سہل الحصول و آسان ہے جبکہ شرائط سے غافل مترجم کے لیے ناممکن ہے کیوں کہ وہ پوری عمر صرف کرے تب بھی معیاری ترجمہ وجود میں نہیں لاسکتا یہ الگ بات ہے کہ کودک نادان کا نشانہ کبھی نشانہ پر لگنے کی طرح اس کا کیا ہوا ترجمہ بھی کبھی کبھار درست ہو جاتا ہے جسے عوامی زبان میں نجات و اتفاق کہتے ہیں۔

۱۴ غیر مسلم عجم تک دعوت اسلام پہنچانے کو ترجمۃ القرآن کا لازم ہونا کہ جب سے اسلام جزیرہ عرب کو فتح کرنے کے بعد اہل عجم کی حدود میں پہنچا اور عجم کی مختلف زبان بولنے والی قوموں کو دعوت الی القرآن کا پیغام پہنچانے لگا اُس وقت سے ہی ترجمۃ القرآن کا آغاز ہو گیا تھا کیوں کہ اس کے بغیر ترجمانی انہیں قناعت دلا سکتی ہے نہ تفسیر بلکہ موثر اور بے غبار انداز دعوت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ مسلم مبلغین جو حقیقت میں پیغمبر کے نائب ہوتے ہیں اور داعی اللہ کہلاتے ہیں یعنی نظام مصطفیٰ ﷺ کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے وہ ان غیر مسلم عجم کے سامنے اللہ کے کلام کا ترجمہ پیش کریں کہ تمہارا رب عزوجل تم سے یہ فرما رہا ہے اور نظام مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دے رہا ہے جب دعوت الی الایمان سے متعلق قرآن شریف کے کسی مناسب حال حصے کے ترجمہ سننے کی برکت سے وہ اس پر دلائل سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تب دلائل پر مشتمل آیات کی ترجمانی بھی مفید ہو سکتی ہے اور تفہیم بھی ایسے میں ترجمۃ القرآن کا دعوت تبلیغ الی العجم کو لازم ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن اصل مقصد دعوت تبلیغ الی الایمان ہے اور غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانا ہے چاہے تبلیغ کے جس انداز سے بھی ہو اسی فلسفہ کی وجہ سے تاریخ اسلام یہ تفصیل بتانے سے خاموش ہے ورنہ مورخین اسلام کی نظر اگر دعوت الی الایمان کی نوعیت اور اس کی تفصیل پر ہوتی

اصول ترجمہ

تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ عجمیوں کی ہر زبان میں ترجمہ القرآن کے فی الجملہ آغاز و ابتدا کی تاریخ بھی مرتب ہو چکی ہوتی لیکن ہر کام میں مقاصد پر نظر ہونے کی طرح یہاں پر بھی ذرائع تبلیغ کی تفصیل پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دعوت تبلیغ دے کر انہیں نظام مصطفیٰ ﷺ کے تحت لانے پر تھی۔ حقائق کی اس روشنی میں حضرت سلمان فارسی کے ترجمہ فاتحہ القرآن کو بالیقین اس کا آغاز کہا جاسکتا ہے نہ کسی اور کے ترجمہ کو کیوں کہ جب تاریخ ہی معلوم نہیں ہے تو پھر کسی کو اول قرار دینے کا تصور ہو سکتا ہے نہ آخر کہنے کا۔

اس کے برعکس جنہوں نے جس جزوی ترجمہ کو یا پورے قرآن شریف کے کسی ترجمہ کو اس عمل کا آغاز کہا ہے ہماری نظر میں وہ اس کی اپنی سوچ ہے کہ اپنی معلومات کے مطابق کہا ہے جو واقعہ کی تصویر نہیں ہو سکتی کیوں کہ جب غیر مسلم عجم کو دعوت اسلام دینے کو ترجمہ القرآن لازم ہے کہ اس کے بغیر دعوت ایمان کی کوئی بھی صورت موثر و بے غبار نہیں ہو سکتی اور ناقابل اعتراض نہیں ہو سکتی اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ مبلغین اسلام نے دنیا کی ہر قوم اور ہر زبان کے لوگوں کے پاس پہنچ کر انہیں ان کی زبان میں دعوت اسلام دی ہے اور ترجمہ کی شکل میں انہیں قرآن پہنچایا ہے لیکن اس کی تاریخ اور تفصیل کی نشان دہی کرنے سے تاریخ یکسر خاموش ہے۔ ایسے میں نہ دنیا کی کسی زبان میں کیا گیا ترجمہ کو اس عمل کا آغاز کہنا قرین انصاف ہو گا نہ عجم کے کسی خطہ میں کیے گئے ترجمہ کو عام اس سے کہ ترجمہ تقریری ہو یا تحریری یعنی محض وقت کی ضرورت اور زبانی طور پر کیا گیا ہو جیسا دو فریقوں کے مابین ترجمان کی وساطت سے ہوتا ہے یا دستاویزی مکتوب کی شکل میں ہو جیسا متعارف تراجم کی صورت میں دیکھا جاتا ہے۔ نیز جزوی ترجمہ ہو یا قرآن شریف کے کچھ حصہ یا کچھ سورتوں کا یا پورے قرآن شریف کا بہر حال دنیا کے کسی خطہ میں کیے گئے ترجمہ کو اس کی تاریخ کہنا انصاف ہو گا نہ دنیا کی کسی زبان میں کیے گئے ترجمہ کو، مگر یہ کہ جس کی تاریخ معلوم ہو اس کے بارے میں ایسا کہنے میں حرج نہیں ہے جیسا دیار ہند کے اپنے وقت کی فارسی زبان میں حضرت شاہ ولی اللہ کا کیا ہوا ترجمہ القرآن بنام فتح الرحمن کو اس خطے کا اولین ترجمہ قرآن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح

أصول ترجمہ

حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد اُن کے بیٹے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے اردو زبان میں کیے ہوئے ترجموں کو اس خطے کی اردو زبان کے اولین تراجم کہا جاتا ہے جس کے مطابق اول الذکر کو اس خطے کی فارسی زبان کے مکمل تراجم کا آغاز اور ثانی الذکر دونوں کو اس خطے کی اردو زبان میں لکھے گئے مکمل تراجم کا آغاز کہنا درست قرار پاتا ہے کیوں کہ ان کی تاریخ معلوم ہے۔

اسی طرح کرہ ارض کے کسی بھی خطے اور زبان میں کیے گئے کسی ترجمہ کو اس کا تاریخی پس منظر صاف و شفاف ہونے کی بنا پر صرف اُسی خطے کی زبان کے حوالہ سے اس عمل کا آغاز کہنے میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ الغرض کرہ ارض کے کسی خاص خطے اور خاص زبان سے قطع نظر علی الاطلاق کسی بھی ترجمہ کو اس عمل کا آغاز اور اس کی تاریخ نہیں کہا جاسکتا چاہے دنیا کی جس زبان میں بھی کیا گیا ہو، اس کے علاوہ ترجمۃ القرآن کے آغاز اور اس کی تاریخ کی بحث میں پڑنے کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہے جتنا وقت اس بے مقصد بحث میں ضائع کیا جاتا ہے اُسے اگر غلط تراجم سے قرآن شریف کو بچانے کے لیے صرف کیا جائے تو اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ ہم اس کتاب کے دوسرے باب کی پہلی بحث میں ترجمۃ القرآن کی فی الجملہ فرضیت اور اس کی اہمیت سے متعلق وضاحت کر آئے ہیں کہ یہ جتنا مشکل کام ہے اتنا آسان بھی ہے، مشکل اور ناقابل حصول اُن کے لیے ہے جنہیں ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کا علم ہی نہیں ہے، شرائط کے جامع نہیں ہیں اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہ نہیں ہیں یعنی اس پر خطر کام کا حق ادا کرنے کی اہلیت کے بغیر مترجم بننے کی کوشش کرتے ہیں اور لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونے کی طرح بغیر شرائط کے مترجمین کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ سے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں آنا جوئے شیر لانے سے مختلف نہیں ہے اور آسان اُن سعادت مندوں کے لیے ہے جو فنِ ترجمہ کے اصول و شرائط سے آگاہی کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں اور اس کی واجبی شرائط کے جامع ہونے کے ساتھ اس کے احتیاطی تقاضوں کو بھی بروئے کار لاتے ہیں گویا اس شرف کے ساتھ فیض یابی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق یافتہ ہوتے ہیں۔ علماء حق کے لیے

أصول ترجمہ

ضروری ہے کہ ترجمہ القرآن کی تاریخ جیسے مباحث میں الجھنے کے بجائے ترجمہ القرآن کی اہمیت پر توجہ دیں کہ یہ اہل عجم کو دعوت اسلام دینے اور تبلیغ بالقرآن کی بنیاد ہے جس کی صحت کے بغیر قرآن شریف کی ترجمانی درست ہو سکتی ہے نہ تفسیر، اور تاویل معیاری ہو سکتی ہے نہ تفہیم اس کی کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ کے پڑھنے سے بے علموں کے ایمان کو نقصان پہنچ سکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شرائط سے خلاف ہونے والے ترجمہ کی اجازت دی جائے جبکہ موجودہ دور میں نہ صرف علاقائی زبانوں میں کیے گئے اکثر تراجم فحش غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں بلکہ پاکستان کی قومی زبان اردو میں مختلف مکاتب فکر مشاہیر کے کیے گئے تراجم کی غالب اکثریت بھی غلط ہے، غیر معیاری ہیں اور قرآن شریف کی معنوی تحریف کے زمرے میں شامل ہیں جبکہ قرآن فہمی کے لیے فنونِ عالیہ و علومِ خادمہ سے نا آشنا وہ حضرات جو ترجمہ سے استفادہ کے کوشاں ہوتے ہیں اور حقیقت سے نا آشنائی کی وجہ سے ترجمہ کے نام پر سامنے آنے والی ہر تحریر کو معنوی قرآن سمجھتے ہیں، انجام کار انجانے میں التباس الحق بالباطل کی ظلمت میں پڑ جاتے ہیں یعنی علمی استفادہ اور نور قرآن سے روشنی پانے کے بجائے مرادِ الہی سے برعکس معانی کو مقصدِ الہی کہہ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہوا قرآن شریف کے غلط تراجم پڑھنے والے اُن حضرات کا المیہ جو قرآن فہمی کے لیے موجود علومِ عالیہ سے نا آشنا ہیں جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ سے استفادہ کرنے والوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو علماء اور اصحابِ محراب و منبر کہلاتے ہیں اور قرآن فہمی کے لیے موجود فنونِ عالیہ و علومِ خادمہ سے بھی قدرے شغف رکھتے ہیں لیکن عالم و فاضل اور مفتی و مدرس بلکہ شیخ الحدیث و التفسیر کہلانے والے ان حضرات کی غالب اکثریت بھی اس قابل نہیں ہوتی جو معیاری و غیر معیاری تراجم میں تمیز کر سکے یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شرائط کے سانچہ میں فٹ اور اوٹ پٹانگ تراجم کی تفریق کرنے کے قابل نہیں ہیں کبھی کبھار اگر کچھ تمیز کر بھی لیتے ہیں تو وہ ان کے نظریہ سے خلاف دوسرے مسالک کے مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم سے متعلق ہوتی ہے اپنے بڑوں کے لکھے ہوئے تراجم کی بڑی سے بڑی غلطی بھی انہیں نظر نہیں آتی یعنی دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے اپنی آنکھ کا

أصول ترجمہ

شہتیر بھی نہیں۔ انجام کار مذکورہ علمی القاب کے لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود قرآن شریف کے معنوی محافظ ہونے کے حوالہ سے بیکار و بے سود ہوتے ہیں، اور فنونِ آلیہ لفہم القرآن سے محروم طبقہ کے حکم میں شمار ہوتے ہیں جو مسلم اُمہ کے لیے المیہ ہے۔

طبقہ جامع الشرائط:-

اس کے برعکس علماء حق کے مقدس طبقہ میں کچھ اقل و قلیل حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو فنونِ آلیہ لفہم القرآن میں ماہر ہوتے ہیں اور علومِ خادمہ للقرآن اُن کی رگ و ریشہ میں شامل ہو چکے ہوتے ہیں اور ترجمۃ القرآن کی شرائط و اصول اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے بھی آگاہ ہوتے ہیں اور معیاری و غیر معیاری کی تمیز بھی کر سکتے ہیں جس میں پسند و ناپسند مترجمین کی تفریق بھی نہیں کرتے بلکہ مترجم کسے باشد اُس پر نظر رکھنے کی بجائے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کون سا ترجمہ شرائط کے مطابق ہے کہ اُسے معیاری کہہ کر قبول کیا جائے اور دُنیا کو اُس سے استفادہ کرنے کی تبلیغ کی جائے اور کون سا ہے جو شرائط سے منحرف اور غیر معیاری ہے کہ اُسے مسترد کر کے دُنیا کو اُس سے اجتناب کرنے کی تبلیغ کی جائے۔ اس طبقہ کا وجود مسعود اونچی دوکان پھیکا پکوان والے مذکورہ طبقہ کی بہتات کے مقابلہ میں اتنا قلیل ہے جتنا نمک طعام میں لیکن عددی قلت کے باوجود سب پر بھاری ہے اور سب پر اس کا بول بالا ہے اور صحیح معنی میں خادمِ قرآن کہلانے کے قابل ہے جس کے وجودِ مسعود کی برکات کا ثمر ہے کہ قرآن شریف معنوی تحریف سے محفوظ ہے۔ قرآن شریف کی حفاظت و اشاعت اور اس کی خدمت کرنے کے شائق علماء حق کو چاہئے کہ قرآن شریف کے ترجمہ کے حوالہ سے بے سود پہلوؤں کو موضوع بحث بنا کر وقت ضائع کرنے کے بجائے اس رُتبے کو پانے کی کوشش کریں اور اس عظیم طبقہ کے ہم سفر و ہم کار ہونے کے لیے محنت کریں جس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کی جائے اور معیاری و غیر معیاری تراجم کے مابین تمیز کے لیے ترجمۃ القرآن کی جملہ شرائط کا احاطہ کیا جائے اور جن خطوط پر چل کر اس مقدس طبقہ نے یہ رُتبہ پایا ہے علم و عمل کے میدان میں ان سے روشنی لی جائے۔ ترجمۃ

اصول ترجمہ

القرآن کے حوالہ سے ہمارے نصف صدی سے زیادہ عرصہ کا تجربہ بتا رہا ہے کہ قرآن شریف اپنے نادان دوستوں اور نااہل مترجمین کے ہاتھوں جتنا مظلوم ہو رہا ہے شاید دنیا کی کسی اور کتاب پر اتنا ظلم ہو رہا ہو۔ برصغیر پاک و ہند کی مختلف علاقائی زبانوں میں کیے گئے تراجم سے لے کر پاکستان کی قومی زبان (اردو) میں پائے جانے والے سینکڑوں ترجموں میں ہمارے تجربہ کے مطابق 95% غلط ہیں، غیر معیاری حضرات کے کیے گئے تراجم ہیں، شرائط سے خلاف اور ناقابل عمل ہیں، جن سے قرآن شریف کے حقیقی معانی معلوم ہونے کے بجائے اُن کے پڑھنے والے نیم خواندہ حضرات مغالطہ میں مبتلا ہو رہے ہیں، جن پر افسوس بالائے افسوس یہ کہ اس زیاں کا انہیں احساس بھی نہیں ہو رہا۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے معروضی حالات کی یہ تلخیاں اور قرآن شریف کی مظلومیت کا یہ المیہ کرۂ ارض کے صرف ایک براعظم اشیاء کے چھوٹے سے حصہ (برصغیر پاک و ہند) سے متعلق ہے جبکہ دوسرے براعظموں اور شرق و غرب کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے تراجم ہماری دسترس و اطلاع سے دور ہونے کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں بعید از قیاس نہیں کہ وہ ان سے بھی بدتر ہوں (فَالِی اللّٰهِ الْمُشْتٰکٰی)۔ علماء دین اور اصحاب محراب و منبر حضرات دین کی حفاظت کے ذمہ دار و مسئول ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ وَ کَانُوا عَلَیْهِ شٰہِدَآءَ“ (۱)

یعنی کتاب اللہ کی حفاظت کے ذمہ دار کیے گئے ہیں اور اس کے نگران ہیں۔

جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ غیر ضروری مسائل میں الجھنے کے بجائے قرآن شریف کی حفاظت کا اہتمام کریں، ترجمۃ القرآن کی صحت اور معیاری ہونا حفاظت دین کی بنیاد ہے جبکہ غیر معیاری ترجمہ فساد فی الدین کی ماں ہے۔ ذرائع مواصلات کے موجودہ دور میں کرۂ ارض پر آباد مختلف زبان والے انسانوں کا ایک دوسرے سے بُعد اور بے خبری کی کیفیت بڑی تیزی کے ساتھ قرب و آگاہی میں بدلتی جا رہی ہے آج اگر مشرق و مغرب کی دنیا ایک شہر کی طرح ایک دوسرے

اصول ترجمہ

کے قریب آچکیں ہیں تو آئندہ چل کر ایک محلہ کی مانند اور بعد ازاں گھر کے ایک کمرہ کی مانند ہونے والی ہے۔ الغرض جس طرح دنیا کی ترقی کا حجم وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ بعد کی منزلیں سمٹ کر قرب میں بدل رہی ہیں اسی تناسب سے دعوت و تبلیغ اسلام اور ابلاغ قرآن کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے جسے موثر و معیاری بنانے کے لیے ترجمۃ القرآن کا معیاری ہونا ضروری ہے، اصل الاصول اور سب کی بنیاد ہے۔ جو طبقہ جامع الشرائط کے وجودِ مسعود سے وابستہ ہے الہیات کے ماہرین میں اگر اس طبقہ کا وجود نہ ہو تو پھر برائے نام علماء سے حق کا دفاع ہی ممکن نہیں ہے چہ جائیکہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کی اُمید ہو سکے کیوں کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہونے کی بنا پر سب سے اہم اور سب سے مشکل عمل ہے الہیات کے کثیر الانواع شعبہ ہائے علم اس کے خادم ہونے کی وجہ سے اُن سب میں دسترس رکھنے والے اس طبقہ جامع الشرائط کے سوا کسی اور کے لیے اس میں آنے کا جواز ہے نہ صحیح و سقیم کے حوالہ سے لب کشائی کرنے کا۔

حاصل کلام:- ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے جامع الشرائط طبقہ کے علاوہ کسی اور کے لیے اس عمل میں آنا جائز نہ ہونے کی طرح صحیح و سقیم کے حوالہ سے تراجم سے بحث کرنا بھی جائز نہیں ہے اور اس طبقہ کا وجودِ مسعود ہمیشہ سے ہے جس سے زمین کبھی محروم نہیں ہوتی۔

علماء حق کو مشورہ:-

اسلامی اقدار سے آگاہ حضرات جانتے ہیں کہ مسلم اُمت کی سیاسی مقتدرہ و مرکز اس بات کے ذمہ دار و مسئول ہوتے ہیں کہ عالمی سطح پر اُمت کے حقوق کی پاس داری کریں، ملک کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کے ساتھ ملت کی بھی نگہبانی کریں لیکن خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد شومئی قسمت شوقِ تاجداری اور شخصی اقتدار کی عفریت نے اس رحمت سے اُمت کو محروم کر دیا اور مسلم قومی ریاستیں جو دوہرے تصورِ اقتدار پر قائم ہوتی ہیں یعنی سیاسی اقتدار اور مذہبی اقتدار یعنی

أصول ترجمہ

آدھا تیرا آدھا بیٹراُن کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ مذہبی مقتدرہ یعنی اصحابِ محراب و منبر کو اپنے حق میں استعمال کریں جس کے لیے علماء سواور کچھ گندم نما جو فروش مشائخ کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں تاہم حق بین، حق شناس اور حق گو علماء حق کے وجودِ مسعود سے زمانہ کبھی خالی نہیں ہوتا اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے ان کے استمرارِ وجود سے متعلق فرمایا:

”لَنْ تَزَالَ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ“ (۱)

دوسری روایت میں ان کے کردار سے متعلق آیا ہے:

”يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ، وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِيْنَ“ (۲)

کرہ ارض کے متبادل و متبائن حصوں میں پائے جانے والے یہ حضرات اگرچہ اپنی اپنی زبانوں، ماحول اور معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق اسلام کا دفاع کر رہے ہیں، اُمتِ مسلمہ کی شیرازی بندی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن شریف کی حفاظت کے لیے اور اس کی حقیقی تعلیمات کو انسانوں تک پہنچانے کے ساتھ تحریف سے بچانے کے لیے ہمہ جہت مصروفِ عمل نظر آ رہے ہیں علماء حق کہلانے کے قابل اس مقدس طبقہ کو ہمارا مشورہ ہے کہ علاقائی سطح پر یہ سب کچھ جاری رکھتے ہوئے عالمی سطح پر بھی مربوط ہونے کی ضرورت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تحریف و اشتباہ سے قرآن شریف کو بچانے کے لیے علاقائی اور انفرادی طور پر انجام دیئے جانے والی ان کاوشوں کو اگر عالمی ارتباط کی شاہراہ پر لایا جائے تو اس سے بڑی طاقت بن سکتی ہے جو زمانہ کی رفتار کا مقابلہ کر سکتی ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کے نام سے قرآن شریف کی معنوی تحریف میں جو افزونی آرہی ہے اُس پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے علماء حق جانتے ہیں کہ اسلامی احکام کی دو قسمیں ہیں:

(۱) بخاری مع شرح عمدة القاری، کتاب العلم، ج: ۲، ص: ۵۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت۔

(۲) مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم، ص: ۳۶۔

أصول ترجمہ

پہلی قسم:- جن کا تعلق انسانوں کے عرف اور معاشرہ سے ہے جن میں بڑی لچک ہے اور اونچ نیچ کی کافی گنجائش ہے۔

دوسری قسم:- جو آفاقی اور بین الاقوامی ہیں۔

اقوام عجم کو خطاب اللہ پہنچانا یعنی آیات قرآنیہ کے اصل معانی سے انہیں اُن کی زبان میں آگاہ کرنے کا فریضہ جو مسلم امت پر عائد ہوتا ہے یہ دوسری قسم کے زمرہ میں آتا ہے جس کے مطابق دُنیا کی جس زبان میں بھی قرآن شریف کا ترجمہ کیا جائے اُس میں قرآن شریف کے محاورہ کو اُس کے محاورہ کا تابع کرنے کے بجائے اُس کے محاورہ کو قرآن شریف کے محاورہ کا تابع اور اُس کی مطابق کرنا ضروری ہے ورنہ معنوی تحریف ہو سکتی ہے (العیاذ باللہ)۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے اسلام کا یہ حکم بین الاقوامی ہونے کے ساتھ بین اللسانی بھی ہے کہ دُنیا کی ہر زبان میں کیے جانے والے ترجمۃ القرآن کا با محاورہ ہونا ضروری ہے جس میں ترجمہ والی زبان کا محاورہ قرآن شریف کے محاورہ کا تابع اور اُس کے مطابق ہوتا ہے یعنی ترجمہ دونوں محاوروں کے اس طرح سے مطابق ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا محاورہ اصل و متبوع اور ترجمہ والی زبان کا محاورہ اُس کے تابع ہوتا ہے قرآن شریف کا معجز اور کلام اللہ ہونے کا ثبوت ہے کہ دُنیا بھر کی ایک دوسرے سے مختلف و متباہن محاورہ والی زبانیں ترجمہ کے طور پر قرآن شریف کے محاورہ پر منطبق ہوتی ہیں شرط صرف یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا جامع الشرائط ہو خاص کر دونوں زبانوں پر مکمل عبور رکھتا ہو۔ حقائق کی اس روشنی میں دُنیا کی مختلف زبانوں میں کیے گئے تراجم کو غلطی سے بچانے کے لیے اور غلط شدہ کی نشان دہی کے لیے علماء حق کے اس مقدس طبقہ کا باہم ارتباط ناگزیر ہے یہ کام اسلامی احکام کی روشنی میں مسلم اسٹیٹ اور سیاسی مقتدرہ کی ذمہ داری ہے جو آسانی سے ایسا کر سکتا ہے جس کی عدم موجودگی میں اس کی تمام تر ذمہ داری و مسئولیت علماء حق کے اس مقدس طبقہ پر عائد ہوتی ہے۔ (فبارک اللہ

فی اعمارهم و افاض علینا من فیوضاتهم)

ایک بے مقصد بحث کی نشان دہی:-

برصغیر پاک و ہند کے کچھ علماء نے ترجمۃ القرآن کے عنوان سے ہندوپاک کے کچھ مترجمین کا تذکرہ کرنے کے ساتھ اُن کے تراجم کی خصوصیات و تفردات بھی بیان کیے ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ فتح الرحمن کو اس عمل کا آغاز قرار دیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن لکھ کر اس راہ کا قفل توڑ دیا ہے اور اس عمل کو ناجائز کہنے والے علماء کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے جس کے بعد دوسرے مرحلے میں شاہ صاحب کے دو بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے بالترتیب مختلف انداز کے دو ترجمے لکھ کر اس عمل کو مزید تقویت پہنچائی ہے جس کے بعد تیسرے مرحلہ میں مختلف مکاتب فکر کے لوگوں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح ترقی کرتے کرتے موجودہ دور تک پہنچا ہے جسے مختلف مسالک کے مابین مقابلہ اور مسابقہ فی الترجمہ کا دور کہا جاسکتا ہے۔ ترجمۃ القرآن کی تاریخ اور اس پر گزرنے والے مراحل بیان کرنے کے اس انداز کے مقابلہ میں بعض حضرات نے ترجمۃ القرآن کے نام سے لکھی گئی ہر دستیاب تحریر کا تذکرہ کیا ہے جن کی تعداد ہزار سے بھی متجاوز ہے جبکہ ہم ان دونوں طریقوں کو بے مقصد اور وقت کا ضیاع کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے کیوں کہ قرآن شریف صرف برصغیر پاک و ہند کے لیے نہیں بلکہ تمام کرۂ ارض کے باشندوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے تو پھر برصغیر پاک و ہند کی تخصیص کا کیا جواز ہے اور صرف اسی کے باشندے مترجمین اور اُن کے کیے ہوئے تراجم میں اس عمل کے آغاز و مراحل بیان کرنے کی کیا تک ہے جبکہ کرۂ ارض کے دیگر اہل عجم اور دوسرے براعظموں کے رہنے والے عجم کی اکثریت کے مقابلہ میں یہ نہایت قلیل ہیں کیوں کہ برصغیر پاک و ہند کا یہ خطہ صرف براعظم ایشیاء کے اس گوشے کا ایک چھوٹا سا گوشہ ہے نیز قرآن شریف کا نور براعظم ایشیاء کے اس گوشے میں پہنچنے سے بہت پہلے کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں پہنچا ہے وہیں سے دائرہ اسلام میں آنے والے عجمیوں اور اُن کی اولاد نے مسلم عرب کے ساتھ مل کر دعوت

أصول ترجمہ

اسلام کو وسعت دی جبکہ براعظم ایشیا کا یہ گوشہ اُس وقت قرآن کی خوشبو سے بھی مانوس نہیں تھا۔ اسلام کی تاریخ سے آگاہ حضرات جانتے ہیں کہ جیسا جزیرہ عرب کے قبائل میں اسلام پھیلنے کے لیے فتح مکہ کی مثال نہیں ملتی، اسی طرح مختلف زبانوں والے عجم میں قرآن شریف کا پیغام پھیلنے کے لیے دو عجم بادشاہتوں یعنی فارس و روم کی فتح کی مثالیں بھی کہیں اور نہیں ملتیں اپنے وقت کی ان دو سپر طاقتوں کی وسیع مملکتوں میں کئی درجن مختلف زبانیں بولنے والی قومیں آباد تھیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں دائرہ اسلام میں لانے اور آہستہ آہستہ اسلام کا شیدائی بنانے کے پس منظر میں مختلف عوامل کو دخل ہے تاہم تبلیغ ترجمۃ القرآن سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا خاص کر ان قبائل و شخصیات کے حق میں جو کسی اسلامی مبلغ کی تفسیر و تاویل اور ترجمانی جیسے دخل عمل کے بغیر محض قرآن شریف کا ترجمہ اور فقط ترجمہ پڑھ کر اُس کی صداقت پر غور کرنا چاہتے ہوں اور کہتے ہوں کہ جب قرآنی آیات کے الفاظ کو ہماری زبان کے ایسے الفاظ میں بدل کر ہمیں دکھایا جائے جو اُن کے قائم مقام ہوں تب ہم اُس کی صداقت پر غور کریں گے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت اور اس کی جامع و مانع تعریف بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آیات قرآنی کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں یعنی اُن کی جملہ حیثیات اور اہل فہم کے نزدیک متعارف حالات کے مطابق ہوں، اہل علم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی غیر مسلم عجمی سے ایسا مطالبہ پیش آنے کی صورت میں قرآن شریف کا ترجمہ انہیں فراہم کرنا مسلم امت پر فرض لازم قرار پاتا ہے عام اس سے کہ ترجمہ تقریری ہو یا تحریری، چند آیات یا چند سورتوں کا ہو یا پورے قرآن شریف کا۔ عجم کے طول و عرض میں قرآن شریف کی خوشبو پھیلنے کے اس پس منظر میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ عجم مسلمانوں میں ایمان کے استحکام سے لے کر قرآن شریف کے ساتھ لگاؤ اور محبت تک اور قرآنی علوم و معارف کے ساتھ دلچسپی سے لے کر اُس کے دفاع کے جذبہ تک جو بھی قابل تحسین کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے اس کی پشت پر قرآن شریف کی صوتی کشش، نظم کی جاذبیت،

أصول ترجمہ

معنوی تاثیر، فنی اور بلاغی اعجاز جیسے عامل کے ساتھ ترجمہ القرآن کو بھی بڑا دخل ہے جس کے ذریعے عجم مخاطبین اُس کے اصل معانی سے آگاہی پا کر اُس کی طرف جھکتے ہیں، اُن کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے اور اپنی عملی زندگی کو اُس کے رنگ میں رنگنے کے کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے میں ترجمہ القرآن کو دُنیا کے عجم کی مختلف زبانوں اور مختلف خطوں کے تناظر میں لینے کے بجائے صرف براعظم ایشیا کے اِس چھوٹے سے گوشہ یعنی برصغیر پاک و ہند میں محدود کرنے کو قرین انصاف نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ محدودیت کی یہ روش قرآن شریف کی لامحدودیت کے منافی اور دُنیا کے عجم کی مختلف زبانوں میں کیے گئے تراجم سے خلاف ہے تو پھر اسے بے مقصد نہ کہیں تو اور کیا کہیں اِس کے بجائے اِن حضرات کو چاہئے تھا کہ اپنی رسائی فہم کے مطابق اِس محدود حصہ ارض میں کیے گئے جن تراجم کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے نقصانات اور فحش اغلاط کی طرف توجہ دیئے بغیر انہیں کافی و شافی ترجمہ کہنے کی بے احتیاطی کی ہے۔ اِس بے مصرف بحث اور غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی جگہ اُن پر لازم تھا کہ اِن سب کو پیش نظر رکھ کر صحیح و سقیم کے تناظر میں دیکھتے، معیاری و غیر معیاری کی تفریق کرتے اور دُنیا کو یہ بتاتے کہ اِن میں کون کون سے ایسے ہیں جو شرائط سے خلاف اور غلط ہیں بے مقصد و ناقابل قبول ہیں کہ اُن سے اجتناب کیا جائے اور کون سے ایسے ہیں جو شرائط کے مطابق ہونے کی بدولت معیاری اور مفید مقصد ہیں کہ اُن سے روشنی لی جائے اِس کے ساتھ یہ بھی اُن پر لازم تھا کہ ترجمہ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع ضبط تحریر میں لا کر اور اُس کے تناظر میں اِن سب کا تجزیہ کرتے کہ کون کون سے ایسے ہیں جو ترجمہ القرآن کی تعریف سے خلاف ہونے کی وجہ سے ترجمہ کہلانے کے ہی قابل نہیں ہیں اور کون سے ایسے ہیں جو ترجمہ القرآن سے غرض و غایت کے مفید نہ ہونے کی وجہ سے بے مقصد و بے سود ہیں اور کون سے ایسے ہیں جن پر ترجمہ القرآن کا موضوع صادق نہ آنے کی وجہ سے غیر معیاری و مردود ہیں۔ اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ کسی بھی تصنیف اور ترجمہ پر تبصرہ کرنے والے کی حیثیت امین کی ہوتی ہے خاص کر قرآن شریف کے کسی ترجمہ سے

أصول ترجمہ

متعلق مثبت یا منفی اظہار خیال کرنا زیادہ سے زیادہ احتیاط کا مقتضی ہے خدا نخواستہ اگر کسی غیر معیاری اور غلط ترجمہ کی تحسین کی جائے اور انجانے میں اُسے کافی و شافی قرار دیا جائے تو یہ امانتداری کے خلاف ہوگا، غلط ترجمہ مروج ہونے اور لوگوں کو اس کی طرف مائل کرنے کے مترادف ہوگا جس کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔ حقائق کی اس روشنی میں ہم یہاں پر اُن چند غلط تراجم کا مشتبہ نمونہ از خروارے ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں جن کی ان حضرات نے تحسین کی ہیں اور انہیں قرآن شریف کا شافی و کافی ترجمہ قرار دے کر کہا ہے کہ ان کی موجودگی میں دوسرا ترجمہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سورۃ البقرہ، آیت نمبر 67 تا 71 ”قَالُوا اذْعُ لَنَارَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ قَالَ اِنَّهُ يَقُولُ اِنَّهَا بَقْرَةٌ لَا فَاْرِضْ وَلَا بَكْرٌ عَوَانُ بَيْنَ ذَلِكَ فَاَفْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ۝ قَالُوا اذْعُ لَنَارَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهُ يَقُولُ اِنَّهَا بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقْعُ لَوْنُهَا تُسْرُ النَّظِيرَيْنِ ۝ قَالُوا اذْعُ لَنَارَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقْرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُونَ ۝ قَالَ اِنَّهُ يَقُولُ اِنَّهَا بَقْرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا اَللّٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ“ ان پانچ آیات کے درج ذیل تین ترجموں کے بگاڑ کو دیکھا جاسکتا ہے:

❶ اور وہ زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخر ابناتے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اُس بیل کے کیا اوصاف ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے وسط میں سواب زیادہ حجت مت کیجیو بلکہ کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے کہنے لگے کہ اچھا یہ بھی درخواست کیجئے ہمارے لیے اپنے رب سے ہم سے یہ بھی بیان کر دیں کہ اُس کا رنگ کیسا ہو آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے کہ اب کی بار اور ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم

اصول ترجمہ

سے بیان کر دیں کہ اُس کے اوصاف کیا کیا ہو کیوں کہ ہم کو اس بیل میں قدرے اشتباہ ہے اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ اب کی بار ٹھیک سمجھ جاویں گے موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ تو بیل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاوے اور نہ اُس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے غرض ہر قسم کے عیب سے سالم ہو اور اُس میں کوئی داغ نہ ہو یہ سن کر کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی پھر اُس کو ذبح کیا اور اُن کی جھتوں سے بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔“ یہ اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔

۲ ”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ خداتم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو وہ بولے کیا تم ہم سے ہلسی کرتے ہو؟ (موسیٰ نے) کہا کہ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں اُنہوں نے کہا اپنے پروردگار سے التجا کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ بیل کس طرح کا ہو۔ (موسیٰ نے) کہا پروردگار فرماتا ہے کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا بلکہ ان کے درمیان (یعنی جوان) ہو سو جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے ویسا کرو۔ اُنہوں نے کہا اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ ہم کو یہ بھی بتادے کہ اُس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ نے کہا پروردگار فرماتا ہے کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں (کے دل) کو خوش کر دیتا ہو۔ اُنہوں نے کہا (اب کے) پروردگار سے پھر درخواست کیجئے کہ ہم کو بتادے کہ وہ اور کس کس طرح کا ہو کیوں کہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں (پھر) خدا نے چاہا تو ہمیں ٹھیک بات معلوم ہو جائے گی۔ موسیٰ نے کہا کہ خدا فرماتا ہے کہ وہ بیل کام میں لگا ہوا نہ ہو نہ تو زمین جوتا ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتا ہو اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو کہنے لگے تم نے سب باتیں درست بتادیں۔ غرض (بڑی مشکل سے) اُنہوں نے اس بیل کو ذبح کیا اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔“ یہ فتح محمد جالندھری کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔

۳ ”اور جب کہا موسیٰ نے واسطے قوم اپنی کے کہ تحقیق اللہ حکم کرتا ہے تم کو یہ کہ ذبح کرو ایک بیل کہا اُنہوں نے کیا پکڑتا ہے تو ہم کو ٹھٹھا کہا پناہ پکڑتا ہوں میں ساتھ اللہ کے یہ کہ ہوں میں

أصول ترجمہ

جاہلوں سے کہا اُنہوں نے دعا کروا سٹے ہمارے رب اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے وہ بیل کہا تحقیق وہ کہتا ہے تحقیق وہ بیل نہ بوڑھا ہے اور نہ بچہ جوان ہے درمیان میں اس کے پس کرو جو کچھ حکم کیے جاتے ہو کہا اُنہوں نے دعا کروا سٹے ہمارے رب اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے رنگ اس کا کہا تحقیق وہ کہتا ہے تحقیق وہ بیل ہے زرد ڈھڈھا ہے رنگ اُس کا خوش کرتا ہے دیکھنے والوں کو کہا اُنہوں نے دعا کروا سٹے ہمارے پروردگار اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے وہ بیل تحقیق وہ بیل گیا اوپر ہمارے اور تحقیق ہم اگر چاہا اللہ نے البتہ راہ پانے والے ہیں کہا تحقیق وہ کہتا ہے تحقیق وہ بیل ہے نہ جوتا ہوا کہ پھاڑے زمیں کو اور نہ پانی پلاتا کھیتی کو تندرست ہے نہیں داغ بیچ اس کے کہا اُنہوں نے اب لایا تو بیچ پس ذبح کیا اُنہوں نے اس کو اور نہ نزدیک تھے کہ کریں۔“ یہ شاہ رفیع الدین کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔

ان تینوں میں قدر مشترک اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ ان سب میں متن کے لفظ ”بَقْرَةٌ“ سے مراد بیل لیا گیا ہے اور اُس کا ترجمہ بیل میں کیا گیا ہے جو غلط فحش ہے اور اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کیوں کہ یہاں پر اُس کے متعلق لفظ ”بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ“ استعمال ہوا ہے جو ”بَقْرَةٌ“ سے مراد گائے ہونے پر قطعی دلیل ہے کیوں کہ لسانی اعتبار سے یہاں پر لفظ ”بَقْرَةٌ“ موصوف اور ”صَفْرَاءُ“ اُس کی صفت ہے۔ نیز لفظ ”صَفْرَاءُ“ میں جو الف ہے یہ اصل کلمہ سے زائد اور علامت تانیث ہے کہ جس کلمہ پر بھی یہ آجائے اُس کا مؤنث ہونا لازم ہے علم نحو کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے؛

”التانیث ولزومها“ (۱)

متن متین میں ہے؛ ”التانیث فبالالف متحتم التانیث بلا شرط ومتكرر بلزومها وضعا فيقوم مقام علتین“ (۲)

یعنی الف علامت تانیث منع صرف کے دو سبب کے قائم مقام ہوتا ہے۔

(۱) ہدایۃ النحو بحث اسم غیر المنصرف۔

(۲) متن متین للامام النحاة فی الہند عبدالرسول بحث اسم غیر المنصرف۔

أصول ترجمہ

ایک :- جس کلمہ پر آیا ہے وہ مونث ہے۔

دوسرا :- تانیث اس کو لازم ہے کہ یہ جس کلمہ پر بھی آجائے وہ ہمیشہ مونث ہوتا ہے کہ مذکر پر آنا اس کا ممکن نہیں ہے۔

اور سب جانتے ہیں کہ بیل مذکر ہے مونث نہیں تو پھر ”بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ کے بیل“ میں کرنے کو غلط فحش کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسا ”امْرَءٌ صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ کے مرد“ کیا جائے۔ الغرض یہاں پر آیت کریمہ میں بقرہ بنی اسرائیل سے متعلق لفظ ”بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ“ جو استعمال ہوا ہے یہ اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ اُس سے مراد گائے ہے بیل ہرگز نہیں، اس کا ضروری لازمہ ہے کہ ان پانچوں آیتوں میں جہاں پر بھی لفظ ”بَقْرَةٌ“ آیا ہے یا اُس کی طرف راجع ہونے والے ضمائر استعمال ہوئے ہیں ان سب کا مظہر و مصداق گائے ہے بیل کی گنجائش ایک میں بھی نہیں ہے لیکن افسوس کہ مترجمین نے مراد الہی سے برعکس ان تمام مقامات کا ترجمہ بیل میں کیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ترجمہ کے پانچ مقامات پر ایسا کیا گیا ہے اور ثانی الذکر کے چھ مقامات میں جبکہ آخر الذکر ترجمہ کے سات مقامات میں یہ ظلم کیا گیا ہے جو ناقابل معافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تراجم اس قابل ہی نہیں ہیں کہ انہیں ترجمۃ القرآن کہا جائے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل وہی ترجمہ ہوتا ہے جس پر ترجمۃ القرآن کی تعریف ”ابْدَالُ الْفَافِ الْقُرْآنَ بِالْفَافِ اللِّسَانِ الْآخِرِ الَّتِي تَقُومُ مَقَامَهَا“ صادق آسکے جو یہاں پر مفقود ہے کیوں کہ ان میں متن قرآن کے لفظ ”بَقْرَةٌ“ اور اُس کی طرف راجع ہونے والے ضمائر کو ترجمہ والی زبان کے جس لفظ میں بدلا گیا ہے وہ اُن کے قائم مقام اور مطابق نہیں ہے بلکہ ضد ہے کہ وہ مونث یہ مذکر ہیں کاش ان مترجمین کو ترجمۃ القرآن کی تعریف پیش نظر ہوتی یا اس کی شرائط کو ملحوظ خاطر رکھتے تو ترجمۃ القرآن کے نام سے ایسے بگاڑ اور معنوی تحریف کی ایسی مثالیں کبھی قائم نہ کرتے۔ (فالی اللہ المشتکی)

اللہ ہی بہتر جانتا ہے ایسے سابقین کی تقلید کرنے والے وہ لاحقین جو مختلف چھوٹی چھوٹی اور علاقائی

اصول ترجمہ

زبانوں میں ترجمہ القرآن لکھنے کا شوق پورا کرتے ہیں ان کی اندھی تقلید میں کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے جبکہ ہمارے پیش نظر صرف مشاہیر کے تراجم ہیں چاہے جس مکتبہ فکر سے ہی متعلق کیوں نہ ہوں اور شرائط کے جامع ہوئے بغیر کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنے والے غیر مشاہیر کو ہم لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں سے مختلف نہیں سمجھتے ہیں اسی وجہ سے ان کے کیے ہوئے تراجم کا تذکرہ کرنے کو بھی وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں نہ صرف اتنا بلکہ غیر معیاری اور غلط تراجم کا تذکرہ کر کے انجانے میں انہیں قرآن شریف کی خدمت کہنا درج ذیل محذورات پر منہج ہو سکتا ہے:

❶ ترجمہ خوانوں کی گمراہی کا سبب ہونا۔

❷ ترجمہ کی شرائط سے بے خبر اور نا اہل مترجمین کا حوصلہ بڑھانے کا سبب ہونا۔

❸ قرآن شریف کے معانی و مقاصد کے حوالہ سے التباس الحق بالباطل کا سبب ہونا۔

❹ اغیار کی نگاہ میں باعث تضحیک ہونا خاص کر یورپ و امریکا کے مستشرقین اور وہ غیر مسلم

سکارلز جو قرآن فہمی کے لیے ضروری فنون کی سمجھ رکھتے ہیں اور اُس کی روشنی میں دونوں زبانوں کی حد تک صحیح و سقیم تراجم کی تفریق کر سکتے ہیں وہ قرآن شریف کے نادان دوستوں کے ہاتھوں اُس پر ہونے والے ان مظالم پر یقیناً ہنستے ہوں گے۔

❺ متعصب اغیار کی طرف سے اعتراض کا سبب ہونا کیوں کہ قرآن فہمی کے لیے علومِ آلیہ کی سمجھ رکھنے کی وجہ سے صحیح و سقیم تراجم کی تفریق پر قادر اغیار میں دو طبقے ہیں:

پہلا طبقہ:- جس میں انصاف کا مادہ موجود ہے جس وجہ سے اسلام کے ان نادان دوستوں کی بے اعتدالیوں کو قرآن کی طرف منسوب نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ان غلطیوں سے اسلام بھی بری ہے اور اُس کے دانا دوست بھی اور قرآن شریف کے حقیقی خادین ان خرافات کو پسند کرتے ہیں نہ قرآن شریف کی طرف انہیں منسوب کرنا درست ہے اس تصور کی حد میں وہ ان نا اہل مترجمین پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔

دوسرا طبقہ:- جو انصاف سے خالی اور تعصب سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر وقت اسلام پر اعتراض

کرنے کے لیے بہانہ کی تلاش میں ہوتا ہے دنیا کی مختلف زبانوں میں کیے ہوئے اس قسم کے غلط تراجم کو وہ سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے ہیں تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔

۶ معیاری وغیر معیاری تراجم کے مابین عدم تفریق کے مروج ہونے کے لیے سبب ہونا۔

تراجم سے بلا تفریق بحث کرنے والے حضرات اسلام کے خلاف پیدا ہونے والے ان تمام نقصانات کے ذمہ دار اور غلط تراجم لکھنے والوں کے جرم میں شریک ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے لکھنے والے حدیث نبویؐ ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ (۱) دوسری روایت میں فرمایا ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ (۲) کی رو سے شرائط کے جامع ہوئے بغیر اس عمل میں آنے کا گناہ پار ہے ہیں جبکہ انہیں معیاری تراجم کے ساتھ یکساں ذکر کرنے والے یہ مصنفین و مؤلفین انہیں معیاری اور درست ہونے کی سند دے کر قرآن شریف کی رو سے گناہ گار ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْبَاطِلِ“ (۳) اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن شریف کا غلط اور مراد الہی سے خلاف ترجمہ کرنا ایسا گناہ ہے کہ اس پر جہنمی ہونے کی وعید سنائی گئی ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ترمذی شریف کی روایات کے مطابق ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ اور ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ اسی طرح ابوداؤد کی روایت کے مطابق ”مَنْ قَالَ فِي كِتَابِ اللَّهِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ“ (۴) یہ تمام تر روایات خبر احاد ہیں انفرادی طور پر ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو یقین کا فائدہ دے لیکن ان کے اجتماعی مفاد پر اسلامی عقیدہ

(۱) جامع الصغیر، حدیث نمبر 8899، مع فیض القدیر، ج 6، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔

(۲) ترمذی شریف، ج 2، ص: 589، باب تفسیر القرآن مطبوعہ رحمانیہ لاہور۔

(۳) المائدة: 2۔

(۴) ابوداؤد شریف، ج 2، ص: 158، کتاب العلم مطبوعہ ایچ ایم سعید کراچی۔

أصول ترجمہ

قائم ہے اور بلا تفریق مسلک کل مکاتب فکر اہل اسلام کا اجمعی عقیدہ ہے کہ شرائط کی جامعیت کے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ کرنا جائز ہے نہ تفسیر کرنا، عہد صحابہ سے لے کر آج تک کسی بھی فقہی مسلک کے قابل ذکر امام و مجتہد یا محدث و مفسر نے بغیر شرائط کے تفسیر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے جب شرائط کے جامع ہوئے بغیر قرآن شریف کی تفسیر کرنا حرام و ممنوع ہے اور مذکورہ حدیثوں کا مظہر و معصیت ہے تو پھر اجتماع شرائط کے بغیر ترجمہ القرآن کے عمل میں آنے کی اجازت کون دے سکتا ہے جبکہ ترجمہ کا عمل تفسیر کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے، کثیرالشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے۔ ایسے میں غلط تراجم کو انجانے میں صحت کی سند دینے یا انہیں قرآن کی خدمت قرار دینے یا انہیں قابل فخر اور قابل تقلید کہنے کی جو مثالیں مختلف حضرات کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں ہم اُن سب کو اس حوالہ سے بے احتیاط و خطا کار سمجھتے ہیں اور غلط ترجمہ لکھنے والوں کے ساتھ گناہ میں شریک سمجھتے ہیں۔ ان حضرات پر لازم تھا کہ غلط تراجم کو صحت کی سند دینے کے بجائے صحیح و سقیم کی تمیز بتاتے اور دُنیا کو آگاہ کرتے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اور مختلف زبانوں میں لکھے گئے تراجم میں کون کون سے معیاری ہیں، شرائط پر منطبق اور ترجمہ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کے مطابق ہیں کہ انہیں قرآن شریف کی خدمت سمجھ کر پیروی کی جائے، اور کون کون سے غیر معیاری، شرائط سے منحرف اور غلط ہیں کہ اُن سے اجتناب کیا جائے۔

نہایت قابل توجہ المیہ:-

ترجمہ القرآن کی تاریخ اور ادوار، مختلف زبانوں میں لکھے گئے تراجم پر تبصرہ کرنے والے حضرات کی اس اندھیرنگری سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ خود اس موضوع پر گفتگو کرنے کے اہل نہیں تھے ورنہ معیاری و غیر معیاری تراجم کا یکساں تذکرہ نہ کرتے، غلط تراجم کو قابل فخر اور کافی و شافی نہ کہتے اور شرائط سے منحرف تراجم کو صحت کی سند دینے کی جسارت کبھی نہ کرتے اس اہم اور پرخطر موضوع پر تبصرہ کرنے کے اہل صرف وہی ہو سکتے ہیں جنہیں عرف عام میں استعمال ہونے

اُصولِ ترجمہ

والے ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کا ادراک ہو، فنِ ترجمہ کی عمومی شرائط و اُصول سے لے کر ترجمۃ القرآن کی اضافی شرائط اور اس کے احتیاطی تقاضوں کا شعور ہو کہ اس کی روشنی میں صحیح و سقیم کی تمیز کر سکیں۔

ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے ربط و یابس کو یکساں ذکر کرنے والے ان مبصرین میں بعض وہ ہیں جنہوں نے تراجم کی اکائیوں پر تبصرہ کیا ہے اور بعض نے دہائیوں کا تذکرہ کیا ہے اور صحیح و سقیم کی اس یکساں فہرست کو طویل سے طویل تر کرنے کے تسلسل میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی الجامعہ الاسلامیہ کے ایک ذمہ دار (ڈاکٹر احمد خان) نے ایک ہزار سے زائد تراجم کی دستاویزات کو متعارف کرایا ہے جسے مقدمہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ اسلامی سکالرز کی اس بے مصرف کاوش میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس میں اس موضوع کو سنجیدگی سے لیا گیا ہو جس کی واحد صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ سب سے پہلے عرف عام میں استعمال ہونے والے اس لفظ ”ترجمۃ القرآن“ کی جامع و مانع تعریف پیش کی جاتی اور اس سے غرض و غایت اور اس کا موضوع جیسے کلیدی امور کا تعارف کیا جاتا بعد ازاں اس کی فطری شرائط اور احتیاطی تقاضوں کی تفصیل سے پردہ اٹھایا جاتا کہ صحیح و سقیم کی تمیز کے لیے معیارِ ممیز کا تعین ہوتا پھر اُس کی روشنی میں معیاری و غیر معیاری کو پرکھا جاتا اور معیاری کے محاسن و اہمیت ظاہر کر کے دُنیا کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی جاتی اور غیر معیاری کے خطرناک نتائج سے دُنیا کو آگاہ کیا جاتا یہ اس لیے ضروری تھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ فنِ ترجمہ کے ماتحت مستقل اور خاص فن ہے جس کا تصور اُس کی تعریف و غرض و موضوع کے بغیر نہیں ہو سکتا اور عام فنِ ترجمہ کے اُصول و شرائط سے اضافی کچھ احتیاطی اُصول اور اضافی شرائط کے ساتھ بھی مشروط ہے جس کے مطابق ہوئے بغیر اس کی صحت ممکن ہے نہ افادیت لیکن ترجمۃ القرآن کے نام سے لکھے گئے ہر رطب و یابس کو ایک نظر سے دیکھنے والے ان حضرات پر افسوس کہ ان میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو خود ان شرائط کا جامع ہو جبکہ صحیح و سقیم کو پرکھنے اور کھرے کھوٹا کی تمیز کرنے کے لیے شرائط کا جامع ہونا ضروری ہے جس کے بغیر رجم بالغیب تو ہو سکتا

أصول ترجمہ

ہے جبکہ نشانہ پر لگنا ممکن نہیں ہے ترجمہ القرآن کے حوالہ سے بحث کرنے والے حضرات کے معروضی حالات کی اس روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ غلط ترجمہ کرنے والے حضرات ترجمہ القرآن کی تعریف، غرض و موضوع کی پہچان سے غافل اور شرائط سے بے خبر ہونے کی طرح انہیں درست قرار دینے اور انہیں معیاری تراجم کے ساتھ یکساں ذکر کرنے والے ان حضرات کا دامن بھی اس دولت سے خالی ہے جو المیہ سے کم نہیں ہے ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بعض علمی جامعات (یونیورسٹیاں) کچھ ایسے تھیسس کے مقالہ جات پر بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں دے رہی ہیں جو تراجم کے تنقیدی اور تقابلی جائزے سے متعلق ہیں اور شائع ہو کر مارکیٹ میں دستیاب ہیں جن میں غیر معیاری تراجم کو معیاری پر ترجیح دے گئی ہے، شرائط سے منحرف کو مستحسن قرار دیا گیا ہے اور ترجمہ القرآن کی تعریف سے برعکس کو افضل بتایا گیا ہے افسوس اُن یونیورسٹیوں پر اور تھیسس کے ایسے مقالہ جات کو ڈگری کے مستحق قرار دینے والے ممبران پر کہ وہ صحیح و سقیم کی تمیز کرنے سے ہی غافل ہیں اور تراجم القرآن کے مابین تقابلی جائزہ جیسی اہم ذمہ داری کو سطحی نظر سے دیکھ کر ڈگریاں جاری کر دیتے ہیں، جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے ایسے میں ہم اس موضوع کو نہایت قابل توجہ المیہ سمجھتے ہیں یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے، کوئی علاقائی اور جزوی نقصان پر منتج نہیں ہے بلکہ معنوی قرآن یعنی ترجمہ القرآن سے متعلق ہونے کی بنا پر ملت کا نقصان ہے، قرآن شریف کی معنوی تحریف کی حوصلہ افزائی ہے اور اسلام کی بنیاد کو ہی متزلزل و مشکوک کرنے کے مترادف ہے، قرآن شریف کے نادان دوستوں کی اس نازیبا روش کا آغاز سعودیہ عربیہ کے علماء سے ہوا ہے کہ گورنمنٹ کی سرپرستی سے شہر ریاض میں قضاء کے لیے جو درسگاہ بنام المعهد العالی للقضاء قائم ہے اُس کے مدیر عالی جناب المناع القطان نے اپنی کتاب مباحث فی علوم القرآن کے ص 285 تا 290 میں التباس الحق بالباطل کے اس فساد کی بنیاد رکھی ہے کیوں کہ صاحب موصوف نے قرآن شریف کے الفاظ کے ترجمہ پر عدم امکان، ناجائز اور حرام جیسی دفعات لگانے کے بعد ترجمہ القرآن پر بھی فساد کا دفعہ لگایا ہے کہ یہ بجائے خود ممکن ہونے کے باوجود فساد سے خالی نہیں ہے اس کے بعد ترجمہ القرآن

أصول ترجمہ

کے نام سے بدعت ایجاد کرتے ہوئے کہا کہ قرآن شریف کے ترجمہ کی صرف ایک صورت ممکن ہے کہ علماء پہلے اپنی ثواب دید کے مطابق آیات قرآنیہ کی تفسیر متعین کریں پھر اس تفسیر کا ترجمہ امانتداری کے ساتھ پیش کریں جسے الترجمة التفسیریۃ، ترجمۃ تفسیر القرآن اور ترجمۃ معانی القرآن جیسے ناموں سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ مصنف مباحث فی علوم القرآن کی اس بدعت کے اثرات اب تک کن کن ملکوں میں پھیل چکے ہیں ان کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں ہے البتہ برصغیر پاک و ہند کے علماء کو ہم اس سے متاثر ہوتے دیکھ رہے ہیں اور اس خطے کے جامعات میں بھی اس کا نفوذ ہو رہا ہے یہاں تک کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اس کی لپیٹ میں آچکی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اس کے ماتحت اداروں کے زیر اہتمام ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے منعقد ہونے والے پروگراموں کے لیے ترجمۃ القرآن لکھنے کے بجائے (ترجمۃ معانی القرآن) لکھا جاتا ہے جس پر واقف حال حضرات افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں، اسے کہتے ہیں:

۔ چوں کفر از کعبہ ہر خیزد کجا ماند مسلمانی

الہیات کے حوالہ سے ناپختہ علماء اور عجمی اداروں کا حجاز سے اٹھنے والے اس فتنہ سے متاثر ہونا تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ قرآن فہمی کے حوالہ سے اہل عرب کو اپنے سے فائق و افضل سمجھنا اہل عجم کی فطرت میں شامل ہے اگرچہ قرآن فہمی کے لیے دوسری شرائط سے وہ عاری ہی کیوں نہ ہو اور تفسیر قرآن یا ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے ہی بیگانہ کیوں نہ ہوں پھر بھی یہ ان سے حسن ظن ہی رکھتے ہیں جسے ہم اندھی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں جو قرآن فہمی کے لیے ضروری شرائط اور تفسیر و ترجمۃ القرآن کے احتیاطی تقاضوں اور ضروری شرائط جیسے حقائق سے غفلت کا نتیجہ ہے جس کی زندہ مثال ہے کہ پاکستانی سکالر مولانا عتیق الرحمن کیلانی ولد مولانا عبدالرحمن کیلانی مدرس کنگ سعود یونیورسٹی الرياض سعودیہ العربیہ نے اپنے والد کا کیا ہوا ترجمہ بنام تیسیر القرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے:

”مختلف زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی

أصول ترجمہ

نص کا بعینہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں پیش کرنا انسانی بساط سے باہر ہے۔ انتہائی کامیاب مترجم بھی صرف قریب ترین مفہوم پیش کر سکتا ہے جس سے ”گزارا“ چل جاتا ہے یہ تو عام عبارات کا حال ہے۔ قرآن کریم کی آیات تو ویسے بھی ”معجزہ“ ہیں۔ ان کا ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علماء نے ”ترجمہ قرآن“ کو غلط عبارت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ درست عبارت ”ترجمہ معانی القرآن“ ہے۔“ (۱)

اسی طرح دو اور پاکستانی اہل حدیث سکالرز حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبد الجبار کے اشتراک عمل سے وجود میں آنے والا ترجمہ بنام ”معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ“ کے مقدمہ میں اُس کے ناشر جو دار السلام الریاض، لاہور کے مدیر بھی ہیں نے لکھا ہے؛ ”اس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ ممکن نہیں بلکہ صرف ترجمانی ہی کا امکان ہے“ اور خود دونوں مترجمین نے اس کے مقدمہ میں حرف اول کے عنوان کے تحت لکھا ہے؛

”ہم یہاں اپنے اس احساس کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کی توثیق یا تائید بیسیوں دوسرے صاحبان علم نے بھی کی ہے اور ان سب آراء کا تلخیص یہ ہے کہ قرآن مجید کا کما حقہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں البتہ اس کی ترجمانی کی بہتر سے بہتر کوششوں اور اسالیب کو اختیار کیا جاسکتا ہے بس یہی ایک نقطہ نظر ہے، جس کے پیش نظر ہر عہد کے مترجمین نے نئے سے نئے قرآنی تراجم پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔“ (۲)

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ترجمۃ التفسیر، ترجمہ معانی القرآن اور ترجمانی قرآن یہ تینوں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں جس کا تعلق قرآن شریف کے اُن معانی کے ساتھ ہے جو انسانی ذہن کی ترجیح

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن، اسلامک پریس، دارالسلام، وسن پورہ لاہور، پاکستان۔

(۲) معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ مع قرآنی گرامر، ص: 9، مطبوعہ دارالسلام ہیڈ آفس سعودیہ عربیہ الریاض، پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی

شوروم 36 لوئر مال سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور۔

أصول ترجمہ

ہیں، جسے قبول کرنے کے لیے ترجمۃ القرآن کی تعریف تیار ہے نہ شرائط کیوں کہ وہ ایک سانچہ ہے، ایک معیار اور ترازو ہے جس میں کسی کی ذہنی ترجیح کو دخل ہو سکتا ہے نہ پسند کو اور دنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ و محاورہ مختلف ہونے کے باوجود ترجمۃ القرآن ہونے کی حیثیت سے محاورہ قرآن کے تابع اور اس کے مطابق ہوتے ہیں جس میں ذرہ برابر فرق کا بھی امکان نہیں ہے چہ جائیکہ اُسے انسانی ذہن کی ترجیح کا تابع کرنا جائز ہو ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسا تورات و انجیل کے معانی کے ترجمہ کا ہوا ہے (العیاذ باللہ)۔

ایسے میں حجاز مقدس سے اُٹھنے والے اس فتنہ کے مضمرات پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور عالمی سطح پر حق بین و حق گو علماء کرام کو اس حوالہ سے مل بیٹھنا پڑے گا۔ مدینہ، مکہ اور ریاض کی یونیورسٹیوں سمیت حجاز مقدس کے دوسرے تمام مراکز اور الہیات کی دانش گاہوں سے اصلاح احوال کی اُمید نہیں کی جاسکتی کیوں کہ اُن میں کسی نہ کسی حوالہ سے برصغیر پاک و ہند کے نیم خواندہ علماء دخیل ہیں جو ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے صحیح و سقیم کی تمیز سے عاری ہونے کے باوجود مشیر کا کردار ادا کر رہے ہیں نہ صرف اتنا بلکہ اندھوں کی صفوں میں واحد العین کا عمل کر رہے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ السعودیۃ العربیہ کے فرمان روا کی طرف سے دُنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن شریف کا ترجمہ شائع کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے جو اہتمام کیا جاتا ہے اُس میں سب سے زیادہ دخل عمل ان حضرات کا ہوتا ہے اس لیے ہم الجامعة الازہر، طہران یونیورسٹی، شام و عراق یونیورسٹیوں کے ارباب اقتدار کو دعوتِ توجہ دیتے ہیں کہ اس کے لیے مل بیٹھیں اور ترجمۃ القرآن کے لیے واجبی شرائط کے جامع علماء کی ٹیم بیٹھا کر ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف کے تحفظ کا اہتمام کریں۔ (وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب)

ایک کثیر الورود اشتباہ کا ازالہ:-

ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوعِ مشغول کیے بغیر اس سے گفتگو کرنے والے

حضرات کی چھیڑی گئی دوسری مباحث کے بے سود و بے مقصد ہونے کی طرح یہ بھی بے مصرف ہے

أصول ترجمہ

کہ انہوں نے ترجمۃ القرآن کی خود ساختہ تقسیم کرتے ہوئے کبھی ”تحت اللفظ ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ“ کہا ہے اور کبھی ”لفظی ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ“ کہا ہے اور کبھی ”ترجمۃ الفاظ القرآن اور ترجمۃ معانی القرآن“ کہا ہے اور کبھی ”تفسیری ترجمہ اور لفظ بہ لفظ ترجمہ“ کہا ہے جو حقیقت میں لغت سے بھی خلاف ہے اور عرف سے بھی کیوں کہ عربی و عجمی دونوں میں یکساں استعمال ہونے والے اس لفظ ”ترجمۃ القرآن“ سے متعلق اس قسم کی تقسیم کی مثال لغت میں ملتی ہے نہ عرف عام میں بلکہ اس کی حیثیت خود ساختہ تقسیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس میں لغت و عرف دونوں سے خلاف اختراع کیا جا رہا ہے جو بدعت فی اللغۃ ہونے کے ساتھ بدعت فی العرف بھی ہے اور قرآن شریف سے متعلق ہونے کی بنا پر اسے بدعت فی الاسلام بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ ایسا کثیر الورود اشتباہ ہے اور التباس الحق بالباطل کی انوکھی مثال ہے جس میں نیم خواندہ حضرات سے لے کر عوام تک کو مغالطہ ہوتا ہے یہاں تک کہ ہمارے تجربہ کے مطابق برصغیر پاک و ہند کے ناواقف حال ماحول میں اسے شہرت کا درجہ حاصل ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت اور اس کی تعریف، غرض، موضوع سے آگاہ حضرات جانتے ہیں کہ بطور متقابل بیان کیے جانے والے ان آٹھوں الفاظ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ اُسے ترجمۃ القرآن کہا جاسکے یا ترجمۃ القرآن کا لفظ اُس پر صادق آسکے کیوں کہ لفظ ”تحت اللفظ ترجمہ“ اور لفظ ”لفظی ترجمہ“ اسی طرح لفظ ”ترجمۃ الفاظ القرآن اور لفظ بہ لفظ ترجمہ“ ان چاروں کا حاصل مفہوم ایک ہے جو الفاظ قرآن کے ترجمہ سے عبارت ہے جس کی حیثیت تعریف لفظی سے مختلف نہیں ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت قرآنی الفاظ کے تعارف سے عبارت نہیں بلکہ وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے عبارت ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں یعنی اُن کی جملہ حیثیات کے مطابق ہوں اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف صرف الفاظ سے عبارت نہیں ہے بلکہ الفاظ من حیث الدال اور معانی من حیث المدلول کے مجموعہ سے عبارت ہے جیسا اصول فقہ کی

اصول ترجمہ

تمام کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے کہ ”هو اسم للنظم والمعنى جميعا“ (۱)۔ اسی طرح ان چاروں کے مد مقابل بیان کیے جانے والے مذکورہ الفاظ یعنی بالمحاورہ ترجمہ، ترجمہ معانی القرآن، تفسیری ترجمہ ان سب کی حقیقت بھی ایک ہے جو ترجمانی سے عبارت ہے کیوں کہ ان حضرات کے نزدیک بالمحاورہ سے مراد ترجمہ والی زبان کا محاورہ ہے کہ آیات قرآنیہ کے جن معانی کو اپنی فہم و دانش کے مطابق درست و راجح سمجھا جائے انہیں ترجمہ والی زبان کے محاورہ میں پیش کیا جائے جس پر تفسیری ترجمہ کے ساتھ ترجمہ معانی القرآن اور ترجمانی جیسے الفاظ بھی صادق آتے ہیں کیوں کہ ان سب کا تعلق صرف معانی قرآن کے ساتھ ہے جبکہ محض معانی قرآن کو حقیقی قرآن نہیں کہا جاتا کیوں کہ حقیقی قرآن صرف معانی سے نہیں بلکہ الفاظ و معانی دونوں کے مجموعہ سے عبارت ہے، ایسے میں ان میں سے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس پر ترجمہ القرآن صادق آسکے کیوں کہ ترجمہ القرآن کا لفظ اپنے متعارف معنی میں محض الفاظ قرآن سے متعلق ہے نہ صرف معانی قرآن سے بلکہ قرآن اور صرف قرآن سے متعلق اور اس کی صفت ہے اور اس کی جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ یہ آیات قرآنیہ کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے عبارت ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکیں یعنی ان کی جملہ لسانی حیثیات سے لے کر متعارف احوال تک سب کے مطابق ہو، ترجمہ القرآن کی اس تعریف کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس عمل میں آنے والوں سے غلطی کا امکان نہیں ہوتا بشرطیکہ دوسری تمام شرائط اور احتیاطی تقاضوں پر بھی پوری طرح اترتا ہو، نیز ترجمہ القرآن کے سانچے اور اس کی شرائط اور احتیاطی تقاضوں کے حامل ہوئے بغیر اس عمل میں آنے والوں سے معیاری ترجمہ ممکن نہ ہونے کی طرح صحیح و سقیم کی تمیز بھی ممکن نہیں ہے ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسا ترجمہ القرآن کو بے مصرف تقسیم کرنے والوں نے کیا ہے جبکہ ترجمہ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کے ساتھ اس کی شرائط کو پیش نظر رکھنا ایک ایسا معیار ممیز ہے جو صحیح و سقیم کی

(۱) الحسامی، بحث کتاب اللہ تعالیٰ۔

أصول ترجمہ

حدیں جدا کر دیتا ہے جس کے مطابق قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے چاہے دنیا کی کسی بھی زبان میں ہو صرف ایک صورت ہے جسے بامحاورہ کہا جاسکتا ہے لیکن یہ بامحاورہ اُس معنی میں نہیں ہے جو برصغیر پاک و ہند کے کچھ حلقوں میں مشہور ہے جس میں قرآن شریف کے معانی کو اپنی سمجھ اور ترجیح کی بنا پر ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق پیش کیا جاتا ہے چاہے قرآن کے محاورہ سے خلاف ہی کیوں نہ ہو العیاذ باللہ نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع اور اُس کی شرائط کے مطابق وجود میں آنے والا بامحاورہ ترجمہ وہی کہلاتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو جس میں صرف حیثیت کی تفریق ہوتی ہے کہ لسانِ قرآنی کا محاورہ من حیث الاصل والممتنع ضروری ہوتا ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کا محاورہ اُس کا تابع اور فرع ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے۔ نیز ترجمہ سے مقصد کے حوالہ سے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر ترجمہ سے مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے ورنہ کسی ایک سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی غلط ہوگا جس کی مکمل تفصیل اور مثالیں اس کتاب کے باب اول میں ہم بیان کر آئے ہیں جنہیں سمجھنا اور پیش نظر رکھنا ترجمہ سے شغف رکھنے والے ہر شخص کی ضرورت ہے۔

غیر معیاری تراجم کا ایک اور فساد:-

ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع اور شرائط کو پیش نظر رکھے بغیر لکھے گئے تراجم سے اور انہیں قرآن شریف کی خدمت و تبلیغ قرار دینے کی بے احتیاطی سے جیسے مذکورہ اشتباہات اور التباس الحق بالباطل کی مذکورہ صورتیں پیدا ہو رہی ہیں ویسے ہی ایک اور فساد بھی جنم پا رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ دیکھ کر قرآن شریف کے کچھ نادان دوست ترجمۃ القرآن کے جواز و امکان سے ہی انکار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں جس کی ایک فنیج مثال اس وقت ”منہاج الفرقان بین علم اللہ و علم الانسان“ کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے جو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لاہوری اور اُس کے حلقہ اثر سے متاثر سکالرز (خضر یسین لاہوری، انجیئر محمد علی مخدوم اور انجیئر حافظ عمران

(حسین) کے اشتراک عمل سے لکھی گئی ہے اور ان سب کی فکری کاوش کا ثمر ہے جس کے پیش لفظ کے آغاز میں لکھا ہے:

”قرآن مجید کو انسانی استعداد کے زائیدہ متون کی طرح فرض کر لینے کا اثر یہ ہے کہ انسانیت کی ہدایت کے لیے متبادل متون وضع کر لیے گئے اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج قرآن مجید سے حاصل ہونے والی ہدایت کے نتائج فرض کر لیے گئے ہیں۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ قرآن مجید سے زندگی میں کسی تبدیلی کی توقع مذہبی ذہن میں مایوسی کی حد تک ناپید ہو گئی۔“

اس کے بعد مقدمہ کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے: ”قرآن مجید کا ترجمہ ہو یا ترجمانی وہ قرآن مجید کا متبادل ہی متصور ہو سکتے ہیں۔ بظاہر قرآن مجید کا ترجمہ یا ترجمانی شاید نقصان دہ شے معلوم نہ ہو، توجہ کرنے سے یہ سوال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا کلام اللہ کا متبادل وضع کرنا ممکن ہے؟ کیا الوہی کلام کو انسانی کلام کی صورت دینا خود ایک مستقل ”مفسدہ“ نہیں ہے؟ یقیناً یہ ایک مستقل مفسدہ ہے۔ علت جو بھی ہو، الوہی کلام سے محرومی فی نفسہ انسانیت کا اتنا بڑا نقصان ہے کہ کوئی مصلحت بھی اس کا ازالہ نہیں کر سکتی۔“

اور اس کے بعد صفحہ 11 پر لکھا ہے: ”الوہی کلام سے حاصل ہونے والی ہدایت قرآن مجید میں اس طرح پوشیدہ نہیں کہ جسے غور و فکر سے دریافت کرنا پڑے، قرآن مجید خود ہی ہدایت ہے۔ قرآن مجید کو ہدایت کا ماخذ قرار دینا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے۔ قرآن مجید الوہی ہدایت کا ماخذ نہیں بلکہ خود الوہی ہدایت ہے۔ انسان کا غور و فکر الوہی بیان کو محکوم نہیں بنا سکتا اور نہ ہی الوہی ہدایت کو اپنے غور و فکر سے دریافت کر سکتا ہے۔“

اس کے بعد 135 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو پانچ ابواب پر تقسیم کر کے پہلے باب کے تحت صفحہ 22 پر لکھا ہے: ”قرآن مجید کا ترجمہ ممکن ہے نہ ترجمانی ممکن ہے۔ قرآن مجید کو الوہی کلام اور اس کی ممتاز و منفرد ہیئت کو الوہی معانی کے بیان کے لیے ناگزیر نہ سمجھا جائے تو پھر اس کا

أصول ترجمہ

ترجمہ ہیئت سے محرومی کے ساتھ ممکن ہو جائے گا۔ ترجمہ یا ترجمانی کرنے والا غیر شعوری طور پر دراصل قرآن مجید کو محض ایک عربی متن خیال کرتا ہے اور اسے ان ”ناگزیر اوصاف“ کا حامل متن نہیں سمجھتا جن سے قرآن مجید کا الوہی کلام ہونا مشروط ہے۔ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والا غیر شعوری طور پر ان منکرات کو قبول کرنے کے بعد ترجمے کی جسارت کرتا ہے۔ قرآن مجید کو قرآن مجید یا الوہی کلام ماننے اور اس کی کلامی ہیئت کا ادراک کر لینے کے بعد اس عظیم کلام کا متبادل بیان وضع کرنے یعنی ترجمہ کرنے کی جرات کوئی نہیں کر سکتا۔ یاد رکھیے متن کا ترجمہ اس کا ”متبادل متن“ ہوتا ہے اور قرآن مجید کا متبادل غیر شعوری حالت میں ہی وضع کیا جاسکتا ہے ورنہ اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔“

یہ پانچ ابواب دراصل قرآن شریف کے ترجمہ و ترجمانی کے ناجائز و حرام اور فساد و ناممکن ہونے کے مدعا پر پانچ انداز استدلال ہیں جن میں سے ہر ایک کی شمشیر قرآن شریف کے ترجمہ و ترجمانی میں سے ہر ایک کی گردن اڑا رہی ہے اور ہر ایک کو قرآن شریف کا متبادل و متقابل اور اس کی تصغیر و تقصیر قرار دے کر فساد و حرام جیسی دفعات کا زیر بار کر رہی ہے۔ ہم کو اس کے مصنفین کی نیت پر شک کرنے کے ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس انوکھے آوازہ کا پس منظر معلوم کر سکتے ہیں البتہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ جراتیں اور تبلیغ بالقرآن کی راہیں مسدود کرنے کی یہ حرکتیں قرآن شریف کے کیے گئے غلط تراجم کے تلخ نتائج ہیں کہ ان حضرات نے ترجمۃ القرآن کی تعریف و غرض سے منعکس اور اس کی واجبی شرائط سے خلاف تراجم کو اور ایسے تراجم پر مبنی ترجمانی کو دیکھ کر اتنی بڑی جسارت پر اتر آئے کہ جس سے ابلاغ القرآن کرنے والے اہل حق کی تذلیل لازم آرہی ہے، ترجمۃ القرآن و ترجمانی ناجائز ہونے کے ساتھ تفسیر کی راہیں بھی مسدود ہو رہی ہیں اس کے برعکس ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ”منہاج الفرقان بین علم اللہ و علم الانسان“ کے مصنفین قرآن شریف کے غیر معیاری تراجم اور ان پر ہنا ہونے والی ترجمانی پر نظریں محدود کرنے کے بجائے اگر معیاری تراجم کا مطالعہ کرتے یا فن ترجمہ کی تعریف، غرض، موضوع کو پیش نظر رکھتے

أصول ترجمہ

یا کم از کم ترجمہ القرآن کی تعریف و غرض کا تصور رکھتے تو کبھی ایسی جسارت نہ کرتے کیوں کہ ترجمہ القرآن جو عبارت ہے قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں یعنی اُن کے متعارف احوال و صفات اور حیثیات کے مطابق ہوں جس میں مترجم کی ذمہ داری اور اُس کے اختیار میں ایسے الفاظ کا انتخاب کر کے اُن کی اجتماعی ہیئت کو متن قرآن کی متعارف اجتماعی ہیئت کے مطابق کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جبکہ معانی بعینہ وہی رہتے ہیں جو قرآن شریف کے اپنے ہیں ایسے میں ترجمہ کو قرآن شریف کا متبادل کلام قرار دینے کا کیا جواز باقی رہتا ہے جبکہ کلام کا تصور ہی بغیر معنی کے ممکن نہیں ہے۔ اس اختراعی اصطلاح کے بجائے اسے اصل سے حکایت اور اُس کی نقل کہنا چاہئے اور اس کے الفاظ کو اُس کے الفاظ سے متبادل کہنا ہوگا جبکہ متبادل کلام قرار دینے کی اجازت اُس کی تعریف نہیں دے رہی، نیز متبادل الفاظ میں اور متبادل کلام میں بڑا فرق ہے کہ متبادل کلام پر لفظ کلام اور جملہ کا صادق آنا ضروری ہے کیوں کہ وہ طلب اور خبر میں سے کسی ایک کے افادہ سے خالی نہیں ہوتا جبکہ متبادل الفاظ میں ایسا ہونا ضروری نہیں ہے جبکہ ترجمہ القرآن کی تعریف میں متبادل الفاظ کا ذکر ہے، متبادل کلام کا ہرگز نہیں ایسے میں ”منہاج الفرقان بین علم اللہ و علم الانسان“ کے مصنفین کا یہ کہنا کہ ”قرآن مجید کا ترجمہ ہو یا ترجمانی وہ قرآن مجید کا متبادل ہی متصور ہو سکتے ہیں بظاہر قرآن مجید کا ترجمہ یا ترجمانی شاید نقصان دہ معلوم نہ ہو توجہ کرنے سے یہ سوال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا کلام اللہ کا متبادل وضع کرنا ممکن ہے؟ کیا اُلوہی کلام کو انسانی کلام کی صورت دینا خود ایک مستقل مفسدہ نہیں ہے؟ یقیناً یہ ایک مستقل مفسدہ ہے علت جو بھی ہو اُلوہی کلام سے محرومی فی نفسہ انسانیت کا اتنا بڑا نقصان ہے کہ کوئی مصلحت بھی اُس کا ازالہ نہیں کر سکتی“ بے مصرف نہیں تو اور کیا ہے اس کا مصرف و جواز تب ہی ہوتا جب ترجمہ سے کلام الہی کے معنی میں تبدیلی آتی جیسا غیر معیاری ترجموں میں ہوتا ہے، یا اُس کی جگہ محض ترجمہ کو کلام الہی قرار دیا جاتا جیسا یہود و نصاریٰ کے ناقص مشائخ و علماء سوء کے ہاتھوں تورات و انجیل کے کیے گئے ترجموں میں ہوا ہے کہ اصل کلام اللہ کے بغیر اُس کے حسب منشاء ترجمہ و ترجمانی کو کلام

أصول ترجمہ

اللہ قرار دے کر خلق خدا کے لیے اشتباہ پیدا کیا گیا ہے جبکہ اسلام اصل قرآن کے بغیر محض ترجمہ شائع کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا جب اصل قرآن خطابی ترجمہ کی صورت میں قبل الترجمہ اور کتابی ترجمہ کی صورت میں فوق الترجمہ موجود ہے اور ترجمہ میں اُس کے کسی لفظ کے معنی کو بدلا گیا ہے نہ اجتماعی نوعیت کی معنویت میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے تو پھر ترجمہ کو اُس کے متبادل کلام قرار دینے کا کیا جواز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ”منهاج الفرقان بین علم اللہ و علم الانسان“ کے مصنفین نے اس پوری تحریر میں قرآن شریف کے ترجمہ و ترجمانی پر جتنے دفعات بھی لگائے ہیں اور جن زاویوں سے بھی ان کے ناجائز و فساد ہونے کی کوششیں کی ہیں اُن سب کی عمارت اسی ایک بنیاد پر قائم ہے کہ ترجمانی و ترجمۃ القرآن کلام اللہ کے متبادل کلام ہیں، انسانی ذہن کے زائیدہ متن و مضامین ہیں اور کلام الہی کے معانی کا انتقال نہیں بلکہ انسانی علم ہیں جو علم الہی اور کلام الہی کے متبادل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ فن ترجمہ اور خاص کر ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے غفلت کا نتیجہ ہے اور ترجمۃ القرآن کی شرائط سے بے توجہی کا ثمر ہے اس لیے ہم اُن سے یہی کہیں گے کہ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے ان امور پر غور کریں اس طرح بناء الغلط علی الغلط کی اس بیماری سے آپ ہی شفا نصیب ہوگی ورنہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت تک پہنچے بغیر اور اُس سے غرض و موضوع کو پیش نظر رکھے بغیر اس میں گفتگو کرنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوگا جو ان حضرات کی تحریر میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ یہی حال مصنفین کے دوسرے کلام ”قرآن مجید کا ترجمہ یا ترجمانی کلام اللہ ہونے کے بجائے انسانی کلام ہے جو اُلوہی ہدایت کی حامل ہے نہ متحمل ہے، انسانی کلام میں قرآن مجید کے معنی کی تفہیم ممکن نہیں ہے، اُلوہی اظہار بیان کو قرآن مجید نے انسان کے لیے چیلنج کے طور پر پیش کیا ہے اگر قرآن مجید کے معانی کا ابلاغ اُلوہی اظہار و بیان کے علاوہ میں ممکن ہوتا تو قرآن مجید اسے کبھی چیلنج بنا کر پیش نہ کرتا۔“ اس کا وار بھی صرف اُن حضرات پر ہو سکتا ہے جو ترجمۃ القرآن کو کبھی تحت اللفظ ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کی طرف تقسیم کرتے ہیں اور کبھی لفظی ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کو ایک دوسرے کے مد مقابل قرار دے کر تقسیم کرتے ہیں اور کبھی تفسیری ترجمہ اور معانی قرآن کا ترجمہ جیسی

أصول ترجمہ

بے حقیقت بولیاں بولتے ہیں جیسا برصغیر پاک و ہند کے بعض علمی حلقوں میں مشہور ہے جس کے پس منظر سے پردہ اٹھانے کے ساتھ حقیقت سے دوری کی تفصیل بھی اس تحریر کے گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں، جسے سمجھنے میں اس مرض کا شافی علاج ہے۔

اسی طرح مصنف مباحث فی علوم القرآن کے موقف پر بھی اس کا وار ہو سکتا ہے جس نے ترجمہ القرآن کی حقیقت پر نظر رکھے بغیر اور واجبی شرائط کو خاطر میں لائے بغیر ترجمہ القرآن کو ”الترجمة الحرفیہ“ اور ”الترجمة المعنویة“ کی طرف خود ساختہ تقسیم کیا ہے بعد ازاں ”الترجمة الحرفیہ“ کو حرام و ممنوع قرار دینے کے ساتھ ”الترجمة المعنویة“ پر بھی فساد کی دفعہ لگائی ہے اس کے بعد لکھا ہے؛

”و یحق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذا قاموا بتفسیر القرآن یتوخی فیہ اداء المعنی القریب المیسور الراجح ثم یترجم لهذا التفسیر بامانة وبراعة فان هذا یقال فیہ ترجمة تفسیر القرآن او ترجمة تفسیریة بمعنی شرح الکلام و بیان معناه بلغة أخرى“ (۱)

ظاہر ہے کہ مدیر المعبد للقطعة فی الرياض السعودیہ کے اس موقف کا ترجمہ القرآن کی حقیقت اور اس کی تعریف کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے گزشتہ سطور میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ مصنف مباحث فی علوم القرآن ترجمہ کی تعریف سے ہٹ کر اس میں گفتگو کرتے ہیں اور انجام کار ترجمہ القرآن کی حقیقت ترجمہ معانی القرآن بتاتے ہیں یا قرآن شریف کی من پسند تفسیر کے ترجمہ کو ترجمہ القرآن قرار دینے کی غلطی کرتے ہیں۔ (لاحول ولا قوة الا بالله)

ایسے میں ”منهاج الفرقان بین علم الله وعلم الانسان“ کے مصنفین کی طرف سے اٹھائے گئے جملہ اعتراضات والزامات کا مورد بھی ان حضرات اور ان کے اس عمل کے سوا کوئی اور نہیں ہے جبکہ ترجمہ القرآن کی حقیقت اور اس سے متعلق امور مثلاًشہ کے سانچے میں فٹ ہونے

(۱) مباحث فی علوم القرآن، ص: 288، مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ پشاور۔

أصول ترجمہ

کے ساتھ شرائط کے مطابق وجود میں آنے والے تراجم ان سے بری الذمہ ہیں اسی طرح صحیح ترجمہ پر بنا ہونے والی ترجمانی اور تفسیر بھی اس قسم کے اعتراضات سے پاک اور الزامات سے محفوظ ہو سکتے ہیں لیکن ”منہاج الفرقان بین علم اللہ و علم الانسان“ کے مصنفین کی ٹیم پر افسوس کہ انہوں نے سب کو ایک نظر سے دیکھا اس پر مستزاد یہ کہ ہر دو فریق بنیادی غلطی میں شریک ہیں وہ ہے ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے بے التفاتی اور شرائط سے غفلت ورنہ فریق اول یعنی برصغیر پاک و ہند کے محدودے چند علماء سمیت مباحث فی علوم القرآن کے سعودی مصنف ”المناع القطان“ اگر ترجمۃ القرآن سے متعلق امورِ ثلاثہ اور شرائط کو پیش نظر رکھتے مذکورہ بے اعتدالیوں کا ارتکاب کبھی نہ کرتے اسی طرح ”منہاج الفرقان بین علم اللہ و علم الانسان“ کے مصنفین کی ٹیم اگر مذکورہ امور کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی شرائط کو ملحوظ خاطر رکھتے تو ترجمۃ القرآن کو قرآن شریف کے متبادل کلام قرار دینے کی جسارت کرتے نہ ترجمانی کو بلکہ یہ دونوں فریق اگر صرف ترجمۃ القرآن سے غرض و غایت یعنی مقصد ترجمہ کو ہی پیش نظر رکھتے پھر بھی ایسی غلطیاں نہ کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے کہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے سے مقصد اس کے اصل معانی سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے یعنی اُن معانی و مفاہیم سے جو جمہور الناس کے عقیدہ و عمل سے متعلق ہیں جن میں عرب و عجم کی تفریق ہے نہ مختلف زبان اور متفرق رنگ و نسل والوں کی۔ قرآن شریف سے مفہوم اول کہلانے والے یہ وہ معانی و مقاصد ہیں جنہیں اہل عرب محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ جاتے ہیں جبکہ اہل عجم فنونِ آلیہ لفہم القرآن اور علومِ خادمہ للقرآن کے واسطے سے سمجھتے ہیں جبکہ مفہوم ثانی کہلانے والے وہ معانی اور وہ رموز و معارف جو نظم قرآن کے تہ درتہ میں مضمر ہیں اور جمہور الناس کی فہم و ادراک سے ماوراء ہیں نیز اعجاز بیان اور تلاوت کا عبادت ہونے جیسے وہ ناگزیر و امتیازی اوصاف جن کا قرآن شریف کے سوا کسی انسانی کلام میں پایا جانا ممکن نہیں ہے ان کے ساتھ ترجمۃ القرآن سے غرض و غایت کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے ہم ایمانی وثوق اور کامل یقین کے ساتھ یہ لکھ رہے ہیں کہ ترجمۃ القرآن سے مقصد کی ان حدود کو سمجھنے والوں سے وہ غلطیاں

أصول ترجمہ

ہرگز نہیں ہو سکتیں جو مذکورہ دونوں فریقوں سے ہوئی ہیں باقی رہی ”منہاج الفرقان بین علم اللہ و علم الانسان“ کے مصنفین کی وہ باتیں مثلاً لکھا ہے (”قرآن شریف علم ہے مآخذ علم نہیں۔“ اور لکھا ہے ”قرآن مجید کو ہدایت کا مآخذ قرار دینا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے، قرآن مجید اُلوی ہدایت کا مآخذ نہیں بلکہ خود اُلوی ہدایت ہے“ اور لکھا ہے ”نزول وحی کے ذریعہ سے علم اللہ انسان کا علم بن جاتا ہے یہ ایسا علم ہے جسے انسان اپنے معمول کے قوائے علمیہ سے حاصل کر سکتا ہے اور نہ معمول کی قویٰ سے اس کی تصدیق کر سکتا ہے علم اللہ انسان کا جب بھی علم بنے گا وہ ایمانی علم ہوگا علمی ایمان ہرگز نہیں ہوگا۔“)

کتاب کے پانچوں ابواب میں پھیلے ہوئے اس قسم کے تمام جملوں کی حیثیت خیالی تصورات سے مختلف نہیں ہیں جن کا ربط علمی دنیا سے ہے نہ عملی ذمہ داری سے نیم خواندہ حضرات کا ان سے مضطرب یا متحیر ہونا ان کی علمی پسماندگی کا نتیجہ ہے جبکہ اہل بصیرت انہیں مجنون کے یو سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ الہیات کے حوالہ سے علم کے متلاشیوں کا وقت ضائع کرنے میں ان کی ایسی مثال ہے جیسا منطقی مسائل سے متعلق دُنیا کو مغالطہ دینے والوں نے کہا ہے ”اول الفکرۃ آخر العمل و اول العمل آخر الفکرۃ“ جو واقفِ حال حضرات کے نزدیک آسان مسئلہ کو جان بوجھ کر معمہ بنانے کی غلطی سے خالی نہیں ہے جبکہ نیم خواندہ دُنیا کے لیے ضیاع وقت کا سامان ہے۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِي إِلَى سَبِيلِ الرِّشَادِ)

چوتھی بحث:- جو خالصتاً ترجمہ القرآن سے متعلق ہے جسے اس کتاب کی روح اور اصل مقصد کہا جاسکتا ہے گویا باب اول جو فنِ ترجمہ سے متعلق ہے اس کے لیے بمنزلہ تمہید تھا ہر شخص سمجھتا ہے کہ فنِ ترجمہ کے اصول و ضوابط اور شرائط سے خلاف ہونے والا ترجمہ چاہے جس کتاب کا بھی ہو معیاری ترجمہ نہیں کہلاتا اسی طرح ترجمہ کی حقیقت یعنی اس کی تعریف اور غرض سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی غلط ہوتا ہے چہ جائیکہ قرآن شریف کے کسی ایسے ترجمہ کو اس کے مطابق اور معیاری کہا جاسکے

أصول ترجمہ

نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کلام اللہ ہونے کی وجہ سے اس کے ترجمہ کی غلطی کسی دوسری کتاب کے غلط ترجمہ کی طرح محدود قبائح و نقصانات کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اس میں قدرے بے اعتدالی اور کسی ایک شرط سے خلاف ورزی بھی لامحدود غلطیوں پر منتج ہو سکتی ہے جس پر پنا ہونے والی تفسیر درست ہو سکتی ہے نہ تاویل اور نہ عقیدہ و عمل۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ چاہے دنیا کی جس زبان میں بھی کیا جائے وہ صرف اتنا نہیں ہے کہ اُس کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو اصل کے قائم مقام ہوں بلکہ اس عمل میں کلام اللہ کی عظمت کے ساتھ اس کے نظم یعنی الفاظ کی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور ترجمہ کے محاورہ کو اُس کے محاورہ کے مطابق کرنے کے ساتھ ایجاز و اختصار کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور خطاب اللہ مع الرسول سے متعلق اسلامی تعلیمات کو مد نظر رکھنے کے ساتھ خطاب الرسول مع اللہ کے تقاضوں کو ذہن میں مستحضر رکھنا بھی ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح خطاب الخاص مراد عام کے انداز ادا کا حق نبھانے کے ساتھ خطاب العام مراد خاص کے انداز ادا کا حق پورا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے نہ صرف اتنا بلکہ نظم قرآن کی لپیٹ میں پوشیدہ رموز و اسرار اور ختم نہ ہونے والے علوم و معارف کی اہمیت کو نہ بھولنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ترجمہ کا براہ راست تعلق اُن معارف کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ترجمۃ القرآن سے غرض و غایت اور بنیادی مقصد اُس کے الفاظ سے معلوم ہونے والے اُن معانی و مقاصد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جنہیں مفہوم اول کہا جاتا ہے جنہیں اہل لسان یعنی اہل عرب محض سننے اور پڑھنے کے ساتھ ہی سمجھ جاتے ہیں اور اہل عجم اُن علوم و فنون کے واسطے سے سمجھ لیتے ہیں جنہیں علومِ آلیہ لفہم القرآن کہا جاتا ہے اس کے باوجود ترجمہ میں ایسے الفاظ استعمال کرنا یا ایسا انداز اختیار کرنا جائز نہیں ہو سکتا جو اُن کے منافی ہو۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے یہ وہ امور ہیں جن کے پیش نظر اسے عام ترجمہ اور کسی بھی کتاب کے ترجمہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس میں ترجمہ کے عمومی اصول و ضوابط اور عام شرائط پر اکتفا کیا جاسکتا ہے بلکہ

أصول ترجمہ

اس کے احتیاطی تقاضوں کی وجہ سے مترجم کی ذمہ داریوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ فن ترجمہ کے عمومی اصول و ضوابط میں اشتراک کے بعد یہ کچھ اضافی اور مخصوص شرائط کا بھی مقتضی ہے اس بحث میں ان کی تفصیل کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ اہل عجم کو اس کے ابلاغ کا حصہ ہے جسے تذکیر بالقرآن اور تبلیغ بالقرآن بھی کہا جاتا ہے عام حالات میں اس کی شرعی حیثیت فرض کفایہ کی ہے جبکہ مخصوص حالات میں فرض عین بھی بن جاتا ہے بہر حال اس کے جواز کے لیے صحت اولین شرط ہے یعنی قرآن شریف کے غلط ترجمہ کو جائز کہا جاسکتا ہے نہ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور اس کی صحت کے لیے بنیادی شرط صرف ایک ہے وہ ہے اس کی جامع و مانع تعریف کے مطابق ہونا اور اس کی تعریف ہے ”اببدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ یعنی قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو ان کے قائم مقام ہو سکیں جبکہ اس کے مطابق ہونے کے لیے ترجمہ کے عمومی شرائط سے اضافی اور مخصوص شرائط ناگزیر ہیں۔ جن کی تعداد درج ذیل ہیں:

- ❶ فن ترجمہ کے فطری اصولوں کی پابندی۔
- ❷ ترجمہ کی عمومی شرائط کی پابندی۔
- ❸ حسب المواقف ترتیب متن کی پابندی۔
- ❹ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون کے متعارف اصول و ضوابط کی پابندی کہ ان سے خلاف نہ ہو۔
- ❺ عظمت شان الہی اور آداب شان نبوت سے متعلق اسلامی تعلیمات کی پابندی۔
- ❻ ترجمہ کیے جانے والی آیات کے ایجاز و اختصار کی پابندی کہ ترجمہ بلا ضرورت طویل نہ ہو۔
- ❼ ترجمہ کیے جانے والی آیات کے سیاق و سباق اور مافیہ الکلام کی پابندی۔
- ❽ آیت کریمہ کی لغوی صفات کی تمیز کرنا کہ خاص ہے یا عام۔ مشترکہ ہے یا مؤول، ظاہر ہے یا

أصول ترجمہ

نص، مفسر ہے یا محکم وغیرہ نیز معنوی صفات کہ عبارة النص ہے یا اشارة النص دلالة النص ہے یا مقتضاء النص۔

۹ تفسیر قرآنی، تفسیر نبوی اور اسلاف کی تفسیر کو پیش نظر رکھنا۔

۱۰ متن قرآن کے کسی لفظ کو چھوڑنے سے اور اس کے الفاظ سے بلا ضرورت داعیہ اضافہ کرنے سے اجتناب کرنا۔

۱۱ ترجمہ کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ کا اور ان کی ترتیب و انداز کا فصیح ہونا۔

۱۲ نیت کا خالص ہونا۔

۱۳ ہر قسم کے تعصب اور ذہنی ترجیح سے دل و دماغ کا پاک ہونا۔

۱۴ عرفان نصیبی و توفیق الہی۔

مخصوص شرائط کی تفصیل اور فلسفہ:-

۱ فن ترجمہ کے عمومی اصولوں کی پابندی اس لیے ضروری ہے کہ ترجمۃ القرآن فن ترجمہ کے ماتحت خاص صنف ہے جبکہ عام کے ہر ضابطہ و اصول کا ثبوت ہر خاص کے لیے ضروری ہوتا ہے ایسا ہی جیسا فلسفہ کے حصہ منطق میں کہا جاتا ہے ”کل ما هو مقوم العالی مقوم للسافل“ جس کے مطابق یہاں پر یوں کہا جاسکتا ہے ”کل ما هو مصحح العام مصحح للخاص“ مثال کے طور پر فن ترجمہ کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متن کے جس لفظ کے دو ایسے مفہوم ہوں کہ دونوں متکلم کی مراد کے طور پر درست ہوں کہ ایک سے بھی انکار کی گنجائش نہ ہو اور ترجمہ والی زبان میں ہر ایک کے انفرادی اعتبار سے ترجمہ کے لیے الفاظ میسر ہوں لیکن دونوں کو یکساں شامل ہونے کے قابل لفظ ناپید ہو ایسی تمام صورتوں میں ایک کا ترجمہ تسلسل میں لے کر دوسرے کو بریکٹ میں کیا جاتا ہے مثال کے طور پر سورۃ البقرہ، 282 کے حصہ ”وَلَا يُضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ“ کے ترجمہ میں ”اور ضرر نہ دے لکھنے والا اور نہ گواہ (یا ضرر نہ دیا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو)“ اس کی پابندی اس لیے ضروری ہے کہ اگر ایسا نہ کرے گا دو صورتوں سے خالی نہ ہوگا:

أصول ترجمہ

پہلی صورت :- ایک کے ترجمہ پر اکتفا کرے گا۔

دوسری صورت :- دونوں کا ترجمہ تسلسل میں کرے گا۔

جبکہ یہ دونوں غلط ہیں کیوں کہ ترجمہ کی تعریف سے ہی خلاف ہیں کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہے ”ابدال لفظة بلفظة تقوم مقامها“ یعنی اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا جو اُن کے قائم مقام یعنی اُن کے تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہوں۔ (۱)

ظاہر ہے کہ اول صورت میں ترجمہ والا لفظ دوسرے مفہوم کو شامل نہ ہونے کی وجہ سے اصل کے قائم مقام ہونے کا قابل نہیں ہے جبکہ دوسرے میں ہر مفہوم کے لیے جدا جدا الفاظ ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام اور اُس کی جامعیت کے مطابق نہیں ہے تو پھر قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے ایسے عمومی اصولوں کی پابندی کو ناگزیر شرط کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

۲ ترجمہ کی عمومی شرائط کی اجتماعی پابندی کا بھی تقریباً یہی فلسفہ ہے جو عمومی اصولوں سے متعلق ابھی ہم نے بیان کیا فرق صرف اتنا ہے کہ وہیں پر ضابطہ کلیہ ”کل اصول ضروری لصحة الترجمة العامة ضروری لصحة ترجمة القرآن“ کے انداز پر تھا جبکہ یہاں پر ”کل ما هو شرط لصحة الترجمة العامة شرط لصحة ترجمة القرآن“ کے انداز پر ہے جبکہ اصول و ضوابط اور شرط کے مابین فرق اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے ایسے میں اس کتاب کے باب اول میں عام ترجمہ کے صحت کے لیے جتنی شرائط اور اُن کی جتنی مثالیں بیان ہو چکی ہیں اُن سب کو یہاں پر بھی پیش نظر رکھا جائے۔

۳ حسب المواقف آیات قرآنیہ کی ترتیب کے مطابق کرنا اس لیے ناگزیر ہے کہ بغیر کسی ناگزیر ضرورت داعیہ یا جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی تنگی دامن کے بغیر ترجمہ کو اصل کی ترتیب کے خلاف کرنا جائز نہیں ہو سکتا ورنہ بلاغت کے حوالہ سے آیت کریمہ کے معنوی حسن اور ترتیب

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۱، ص: ۱۱۱، مطبوعہ الحجازی بالقاهرہ۔

اُصولِ ترجمہ

سے متعلقہ مقاصد کا اظہار ترجمہ میں ممکن نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ آیاتِ قرآنیہ کی ترتیب میں فصاحت و بلاغت کو سب سے بڑا دخل ہے۔ جب آیت کریمہ کی ترتیب سے خلاف کی جانے والی تفسیر بھی معیاری نہیں ہوتی تو پھر متن کی ترتیب سے خلاف ترجمہ کے معیاری ہونے کا تصور ہی نہیں رہتا کیوں کہ تفسیر کے مقابلہ میں ترجمہ کا معاملہ زیادہ مشکل اور زیادہ قابلِ احتیاط ہوتا ہے اُصولِ تفسیر میں ترتیبِ متن کی مطابقت کو ضروری قرار دیا گیا ہے جیسا الاتقان فی علوم القرآن کے الفاظ ”وَمُرَاعَاةُ التَّالِيفِ“ سے واضح ہے۔ (۱)

اس شرط کی خلاف ورزی کی مثالوں میں ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے“ جس میں متن کی ترتیب سے خلاف کر کے لفظ ”اسم“ یعنی اسم اللہ کے مفہوم کو آخر میں رکھا گیا ہے جو کئی وجوہ سے غلط، خلاف الاصل اور متن کی بلاغی حیثیت کے منافی ہے جو کسی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کی بلاغی حیثیت کے ساتھ اُس کی عرفانی اور واقعی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کی اس بے ڈھنگی کیفیت کا جائزہ لے۔

۲ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون کی پابندی ناگزیر ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اس کے بغیر ترجمہ کا اصل کے مطابق ہونا ممکن نہیں ہے جیسا آگے بیان ہونے والی تفصیل سے واضح ہو جائے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) اس شرط کے مندرجہ ذیل حصے ہیں؛

(i) آیت کریمہ کی صرفی حیثیت ملحوظ رکھنا یعنی متن اگر اسم ہو ترجمہ بھی اسم کے انداز میں کیا جائے ورنہ فعل کا ترجمہ اسم میں اور اسم کا ترجمہ فعل میں کرنے سے اصل کا مفہوم بدل سکتا ہے۔ اسی طرح مفرد متن کا ترجمہ مفرد میں اور تشنیہ یا جمع والے متن کا ترجمہ تشنیہ و جمع کے انداز میں کیا جائے۔ مذکر کا ترجمہ مذکر میں اور مؤنث کا ترجمہ مؤنث میں، فعل معلوم کا معلوم کے انداز میں اور مجہول کا ترجمہ بھی مجہول کے انداز میں کیا جائے ورنہ برعکس ہونیکی صورت میں ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۱۸۵، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

جاسکتا مگر ترجمہ والی زبان کی طرف سے واضح مجبوری اور تنگی دامن کا عارضہ ہو لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جیسا تفسیر اتقان کے الفاظ ”قَالَ الْعُلَمَاءُ يَجِبُ عَلَى الْمُفَسِّرِ أَنْ يَتَحَرَّى فِي التَّفْسِيرِ مُطَابَقَةَ الْمُفَسَّرِ“ سے واضح ہے۔ (۱)

اس کی خلاف ورزی کی مثال سمجھنے کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۷۱ ”وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَا يَبْصُرُونَ“ کے کیے گئے تراجم کے اس نمونہ کو دیکھا جاسکتا ہے ”اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے“ جس میں متن کے لفظ مؤنث ”ظُلُمٍ“ جو ”ظلمۃ“ کی جمع اور مؤنث ہے کے ترجمہ میں ”اندھیروں میں“ کہنے کے بجائے اندھیروں میں کہہ کر متن کی لسانی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ ”إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً“ (۲) کا کیا گیا یہ ترجمہ ”ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب“ جس میں ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کے اسم فاعل لفظ ”جَاعِلٌ“ کا ترجمہ مستقبل میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے جس کا منشاء شاید یہ ہو کہ مترجم نے اسم فاعل کو یہاں پر عامل بنانے کی غرض سے اُس کے مفہوم کو مستقبل کی طرف موڑا ہو حالانکہ صفت الہی ہونے کے ناطے یہاں پر اس قیاس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ پر نظر ہو۔ ایک اور حیثیت سے اس کی مخالفت کی مثال کے لیے آیت کریمہ ”شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ (۳) کے مندرجہ ذیل تراجم کو بھی دیکھا جاسکتا ہے (خود اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ گواہ ہے کہ کوئی عبادت کے قابل نہیں اُس کے سوا، اللہ کی گواہی ہے کہ کوئی معبود نہیں بجز اُس کے) یہ تراجم بالترتیب ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عاشق الہی میرٹھی اور عبدالماجد دریا آبادی نے کیے ہیں اور سب غلط ہیں کیوں کہ آیت کریمہ میں لفظ ”شَهِدَ“ علم تصریف کے

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۱۸۵، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

(۲) البقرہ: ۳۰۔

(۳) آل عمران: ۱۸۔

أصول ترجمہ

مطابق ماضی کا صیغہ ہے جبکہ تراجم کا مذکورہ انداز اُس کے مطابق نہیں ہے کہ اول الذکر میں ترجمہ کے طور پر اُس کی جگہ ”گواہی دیتا ہے“ کہا گیا ہے جو اُس کا نہیں بلکہ لفظ ”اللہ یشہد“ کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح دوسرے میں ”اللہ گواہ ہے“ کہا گیا ہے جو اُس کا نہیں بلکہ لفظ ”اللہ شہید“ کا ترجمہ ہے جو آیت کریمہ میں نہیں ہے اسی طرح آخر الذکر میں ”اللہ کی گواہی ہے“ کہا گیا ہے جو اُس کا نہیں بلکہ لفظ ”شہادۃ اللہ“ کا ترجمہ ہے جو آیت کریمہ کا حصہ ہی نہیں ہے ایسے میں ان میں سے کس کو آیت کریمہ کی صرفی حیثیت کے مطابق کہا جائے ظاہر ہے کہ ایک کو بھی نہیں مترجمین پر افسوس کہ یہ سب کچھ لکھتے وقت اتنا بھی نہیں سوچا کہ یہاں پر لفظ ”شہد اللہ“ کی جگہ لفظ ”اللہ شہید، شہادۃ اللہ“ جیسے کسی بھی لفظ کو استعمال کرنا جب مناسب نہیں تھا تو پھر اُس کے ترجمہ میں ایسے انداز اختیار کرنے کا کیا جواز ہے۔

نیز اصل سے عدول کرنے کے لیے ترجمہ والی زبان کی طرف سے بھی یہاں پر کوئی عارضہ یا کوئی لسانی مجبوری بھی موجود نہیں ہے بلکہ اصل کے مطابق ترجمہ ”اللہ نے گواہی دی کہ اُس کے سوا لائق عبادت کوئی اور نہیں، اللہ نے گواہی دی کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے تو پھر اصل سے خلاف کرنے کا کیا جواز ہے۔ ایک اور حیثیت سے مخالفت کی مثال کے لیے آیت کریمہ ”زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا“ (۱) کے کیے گئے درج ذیل تراجم دیکھے جاسکتے ہیں ”فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر، دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے، کافروں کو دنیا کی زندگی بھلی معلوم ہوتی ہے“ یہ تراجم بالترتیب مولانا محمود الحسن اور اشرف علی تھانوی اور مولانا وحید الزمان نے کیے ہیں اور سب غلط ہیں کیوں کہ آیت کریمہ کی صرفی حیثیت سے خلاف ہیں اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ آیت کریمہ میں لفظ ”زُيِّنَ“ فعل مجہول ہے اور لفظ ”الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا“ اُس کے لیے قائم مقام فاعل ہے جبکہ اول الذکر ترجمہ میں فعل مجہول کا ذکر ہے نہ اُس کے قائم مقام فاعل کا جیسا اس کے انداز ”فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر“ سے

(۱) البقرة: 212۔

أصول ترجمہ

ظاہر ہے تو پھر اصل کے مطابق کیوں کہلائے۔ اسی طرح آخر الذکر دونوں بھی دو وجہ سے اُس سے خلاف ہے:

پہلی وجہ:- وہ ماضی ہے یہ ماضی نہیں بلکہ حال کا انداز ہے۔

دوسری وجہ:- وہ مجہول ہے جبکہ ان کا انداز معلوم کا ہے مجہول کا نہیں تو پھر اُس کے مطابق کیوں کہلائے۔

(ii) آیت کریمہ کی نحوی حیثیت ملحوظ خاطر رکھنا یعنی مرکب تام اور جملہ کا ترجمہ بھی جملہ میں اور مفرد کا ترجمہ بھی مفرد میں، اسم موصول کا ترجمہ بھی موصول کے انداز پر اور اسم موصوف کا ترجمہ بھی موصوف کے انداز پر، علیٰ ہذا القیاس ترجمہ کا آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ غلط ہوگا۔

اس کی خلاف ورزی پر مشتمل غلط تراجم کی سینکڑوں مثالوں میں سے درج ذیل کو دیکھا جاسکتا ہے جو سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ“ کے ترجمہ میں کیا گیا ہے ”سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے ۝ نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے ۝ روز جزا کا مالک ہے“ یہ ترجمہ محض اس وجہ سے غلط ہے کہ آیت کریمہ کی نحوی حیثیت سے خلاف ہے کیونکہ نحوی اصولوں کے مطابق متن کی ان تینوں آیات کا مجموعہ صرف ایک جملہ ہے اس تفصیل کے ساتھ کہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ“ میں مذکور اسم جلالت موصوف ہے جس کے بعد چاروں الفاظ بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور موصوف اپنی ان چاروں صفات کے ساتھ مل کر مجرور ہے حرف جار ”لِ“ کے لیے جبکہ جار اپنے مجرور سے مل کر باعتبار متعلق خبر ہے ”الْحَمْدُ“ کے لیے اور مبتداء و خبر مل کر جملہ اسمیہ لفظاً اور انشائیہ معنا قرار پاتا ہے جس میں نحاۃ کی دورائے ہیں نہ مفسرین کی۔ اس کے مطابق درست ترجمہ یوں ہو سکتا ہے ”سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو مالک سارے جہاں والوں کا ۝ بہت مہربان رحمت والا ۝ روز جزا کا مالک“ جس سے بے اعتنائی کرتے ہوئے مترجمین نے ”رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ، رَحِيمٌ ۝ مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ“ جیسے اوصاف مفردہ کا ترجمہ بھی جملہ میں کر دیا جسے سننے کے لیے سیبویہ تیار ہے نہ عبدالرحمن جامی، امام تفتازانی اسے گوارا کرتا ہے نہ عبدالقادر جبر جانی۔

أصول ترجمہ

علم نحو کے حوالہ سے اس اجمال کے بعد یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ لامحدود علم ہے جس کے دائرہ وسعت کو سمجھنے کے لیے امام الزجاج سے منقول مشہور قول کافی ہے انہوں نے کہا ہے ”اموت وفي قلبی من حتی شیء“ یعنی مرتے دم تک میرے دل میں حرف (حتی) سے متعلق شک رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شاخوں کی کوئی نہایت ہی نہیں ہے جن میں سے مشتے نمونہ از خروارے درج ذیل سے روشنی لی جاسکتی ہے:

● آیت کریمہ کے الفاظ میں عامل و معمول اور فاعل و مفعول بہ کی تمیز کر کے ترجمہ کو اُس کے مطابق رکھنا یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے خلاف ہونے والے ترجمہ کو محاورہ متن کے مطابق نہیں کہا جاسکتا اس کی مثالوں کی ایک جھلک آیت کریمہ ”فَإِنَّهُ أَكْلَهَا ضَعْفَيْنِ“ (۱) کے درج ذیل تراجم میں دیکھی جاسکتی ہے ”تو دونا میوہ پیدا ہوا، تو پھل دگنا آئے“ یہ ترجمے بالترتیب مولانا وحید الزمان اور مولانا السید وجیہ السیماء عرفانی نے کیے ہیں جو اصل کے محاورہ سے سراسر خلاف ہیں کیوں کہ اُس میں لفظ ”أَكْلَهَا“ مفعول بہ ہے فعل متعدی ”أَتَتْ“ کے لیے جبکہ ان میں اُسے فاعل ظاہر کیا گیا ہے تو پھر اس معکوس العملی کو اصل کے مطابق کون کہے۔ نیز ان دونوں میں متن کے فعل متعدی یعنی ”أَتَتْ“ کا ترجمہ فعل لازم میں کرنے کی بھی غلطی کی گئی ہے جیسا بالترتیب ان کے مذکورہ الفاظ ”دونا میوہ پیدا ہوا، پھل دگنا آئے“ سے ظاہر ہے جو اردو محاورہ سے ذرہ برابر واقف شخص سے بھی پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے۔ آیت کریمہ کے ترجمہ میں اس غلطی کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ علم نحو کے حوالہ سے آیت کریمہ کی مذکورہ حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اُس کا معیاری ترجمہ (تو دیا اپنا پھل دگنا، تو پھر اس بے ڈھنگاپن کی ضرورت ہی کیا ہے جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ شرط کی اہمیت کی غرض سے اُس کی خلاف ورزی کی دوسری مثال کے لیے آیت کریمہ کے

أصول ترجمہ

حصہ ”لَا يَفْقِدُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا“ (۲) کے درج ذیل تراجم دیکھے جاسکتے ہیں (قیامت کے دن اُن لوگوں کو اپنی کمائی میں سے کچھ ہاتھ نہ لگے گا، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کا ثواب اُس چیز کا جو انہوں نے کمایا، ریاکاروں کو اُس خیرات میں سے جو انہوں نے کی تھی کچھ بھی ہاتھ نہیں لگے گا، اسی طرح یہ ریاکار لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہ کر سکیں گے، ایسے لوگ کچھ بھی نہ حاصل کر سکیں گے اپنی کمائی سے) یہ تراجم بالترتیب وحید الزمان، اشرف علی تھانوی، مولانا محمود الحسن، ڈپٹی نذیر احمد، فتح محمد جالندھری، مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے کیے ہیں جو سب کے سب غلط ہیں جس کی واضح وجہ آیت کریمہ کی مذکورہ نحوی حیثیت سے خلاف ہونا ہے کیوں کہ آیت کریمہ کے لفظ ”لَا يَفْقِدُونَ“ میں ”واو“ کی شکل میں جو ضمیر مرفوع متصل بارز ہے یہ فاعل کے طور پر ریاکاروں کی طرف راجع ہے جو آیت کریمہ کے سابق و ماقبل میں مذکور ہو چکی ہے مترجم کی ذمہ داری ہے کہ ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس کے مطابق کرے جو (اپنی کمائی سے کسی چیز پر قابو نہ پائیں گے، وہ اپنی کمائی سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے، وہ قادر نہ ہوں گے اپنے کیے میں سے کسی چیز پر بھی) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جس سے برعکس مترجمین نے جو انداز اپنایا ہے اس کا آیت کریمہ کی مذکورہ حیثیت سے کوئی ربط ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اُس کے مطابق کہلائیں (فالی اللہ المشتکی)

ضروری وضاحت:- کوئی یہ نہ سمجھے کہ مذکورہ تراجم محض اسی ایک شرط سے خلاف ہونے

کی وجہ سے غلط ہیں تا کہ ان میں موجود دوسری بے اعتدالیوں اور متعدد شرائط سے انحراف کو کالعدم سمجھا جائے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہاں پر ہمارا مقصد صرف اس ایک شرط سے خلاف ورزی کی مثال پیش کرنا ہے جبکہ ان میں پائی جانے والی دوسری بے اعتدالیوں کو دوسری شرائط سے انحراف کی مثالوں میں بیان کیا جاتا ہے کیوں کہ غلط تراجم کے سلسلہ دراز میں بہت کم ایسے ہیں جن میں صرف ایک شرط سے خلاف ورزی کی گئی ہو جبکہ غالب اکثریت میں متعدد شرائط سے انحراف ہوا ہے جن کی

أصول ترجمہ

تفصیل کے لیے ہماری دوسری تصنیف تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے جس میں کافی حد تک تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔

۲ ضمائر کی تمیز پر نظر رکھنا ورنہ حاضر کا ترجمہ غائب میں یا غائب اور بعید کی طرف راجع ضمیر کا ترجمہ قریب و حاضر میں کرنے سے ترجمہ غلط ہوگا جس کی ایک مثال آیت کریمہ کے حصہ ”فَإِنْ أَنْتَهُوَ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ (۱) کا مولانا محمد جونا گڑھی کا کیا ہوا یہ ترجمہ ہے ”اگر یہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے“ جو اصل سے خلاف اور غلط ہے کیوں کہ متن کے فعل ”أَنْتَهُوَ“ میں ”واو“ کی شکل میں جو ضمیر فاعل مرفوع متصل ہے حاضر نہیں بلکہ ضمیر غائب ہے تو پھر اُس کے ترجمہ میں لفظ ”یہ“ کہنے کا کیا جواز ہے جو حاضر کے ساتھ مختص ہے جبکہ اُس کا حقیقی ترجمہ ”پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، پس اگر وہ اپنی شرارت سے منع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے“ جیسے کسی بھی جائز طریقے سے ممکن ہے تو پھر مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کا کیا جواز ہے۔

دوسری مثال جو اس سے برعکس ہے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 229 کے ابتدائی حصہ ”الطَّلَاقِ مَرَّتَانِ“ کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا یہ ترجمہ ہے ”وہ طلاق دو مرتبہ کی ہے“ اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ لفظ ”یہ“ کہنے کی جگہ وہ کہنے سے ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوتا یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا ہے کیوں کہ جمہور مفسرین کے مطابق یہاں پر لفظ ”الطَّلَاقِ“ پر آیا ہوا الف لام عہد کے لیے ہے جس سے مراد وہ طلاق ہے جو اس سے قبل مذکور ہوئی ہے، جو سیاق و سباق کے مطابق غائب نہیں بلکہ حاضر میں شمار ہوتی ہے جس کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ ”یہ طلاق دو بار تک ہے، طلاق دو بار تک ہے“ جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے تو پھر اس بے ڈھنگاپن کو اصل کے مطابق کون کہہ سکتا ہے۔

۳ ترجمہ کیے جانے والی آیات کریمہ اگر ”إِنْ“ سے مخفف ”إِنْ“ پر مشتمل ہو۔ ایسے تمام مواقع پر

أصول ترجمہ

اُس کی قسموں پر مکمل تسلی و یقین ضروری ہے کہ آیا وہ ”اِنَّ“ سے تخفیف پا کر استعمال ہونے والی کون سی ”اِنْ“ ہے یا بے عمل اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ”اِنْ“ مثقلہ سے مخفف ہو کر ”اِنَّ“ کی شکل میں استعمال ہونے والے اس لفظ کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:۔ جسے علم نحو کی اصطلاح میں ملغی العمل کہا جاتا ہے یعنی عمل ساقط کرنے والا کیوں کہ لفظ ”اِنَّ“ کا جو مشہور عمل ہے کہ اسم کو منصوب اور خبر کو مرفوع کر دیتا ہے جیسا کہا جاتا ہے ”اِنْ زَيْدًا قائم“ اس صورت میں اُس کا عمل ساقط ہو جاتا ہے جس وجہ سے اس کی ظاہری صورت اُس ”اِنْ“ کے ساتھ مشابہ ہو جاتی ہے جسے ”اِنْ“ نافیہ کہتے ہیں یعنی جن دو اسموں پر داخل ہوتا ہے اُن کے مابین نسبت کو نفی کرنے کے سوا کوئی اور لفظی عمل نہیں کرتا جیسا کہا جاتا ہے ”اِنْ زَيْدٌ قائم“ یعنی زید قائم نہیں ہے جو اس کے آنے سے قبل ”زَيْدٌ قائم“ کی نسبت ثبوتی پر مشتمل تھا اب منفی ہو گیا اس التباس و اشتباہ سے بچنے کے لیے ”اِنْ“ ملغی العمل کے بعد لام کے استعمال کو ضروری قرار دیا گیا ہے جسے لام فارقہ کہا جاتا ہے یعنی ”اِنْ“ نافیہ اور ”اِنَّ“ ملغی العمل کے مابین فرق بتانے والا۔

دوسری قسم:۔ جسے بے عمل کہا جاسکتا ہے یعنی ”اِنَّ“ ثقیلہ سے مخفف ہو کر لفظ ”اِنْ“ کی صورت میں آنے کے بعد بھی ”اِنَّ“ والا عمل کرتا ہے یہ قسم ”اِنْ“ نافیہ کے ساتھ مشابہ نہیں ہے جس وجہ سے اس کے بعد لام استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

قرآن شریف میں بکثرت استعمال ہونے والے لفظ ”اِنْ“ کے حوالہ سے اس تفصیل کی روشنی میں اُس کی ان قسموں کو پیش نظر رکھنے کی شرط سے کون انکار کر سکتا ہے جبکہ اس سے غفلت کی صورت میں لام فارقہ کو لام ابتدائیہ تاکید یہ سمجھنے کی غلطی کا قوی امکان موجود ہوتا ہے جس کی ایک مثال آیت کریمہ کے حصہ ”وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الضَّالِّينَ“ (۱) کے مندرجہ ذیل تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے (اور بے شک اس سے پہلے تم ضرور گمراہوں میں سے تھے، اور بے شک تم اُس کی ہدایت

أصول ترجمہ

سے پہلے ضرور بھٹکنے والوں میں سے تھے) یہ ترجمے بالترتیب میرے استاذ الحدیث جو اپنے وقت کے غزالی زمان اور کامل ولی اللہ تھے مولانا سعید احمد کاظمی نور اللہ مرقدہ الشریف نے اور میرے استاذ بھائی پنجاب حکومت کے اپنے وقت کے امور مذہبیہ کے وزیر شیخ الحدیث ڈاکٹر مفتی غلام سرور القادری رحمۃ اللہ علیہ نے کیے ہیں جنہیں محض اس وجہ سے معیاری نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں مذکورہ شرط سے بے التفاتی کی گئی ہے۔ ورنہ متن کے لفظ ”لَمِنْ الضَّائِنِ“ کا ترجمہ اول الذکر ”تم ضرور گمراہوں میں سے تھے“ جیسے تاکیدی انداز میں کرتا نہ ثانی الذکر ”ضرور بھٹکنے والوں میں سے تھے“ جیسے موکد انداز میں کرتا یہ بے اعتدالیاں محض اس وجہ سے ہوئی ہیں کہ حضرات نے متن کے لفظ ”لَمِنْ الضَّائِنِ“ پر آیا ہوا لام کو لام فارقہ کے بجائے لام ابتدائیہ تاکید یہ تصور کیا جس کی یہاں پر گنجائش نہیں تھی ایسے میں تراجم کے اس انداز کو بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس سے برعکس ”ان“ عاملہ اور ”ان“ غیر عاملہ نیز لام ابتدائیہ تاکید یہ اور لام فارقہ کی مذکورہ تفصیل کو پیش نظر رکھ کر آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ ”اور بے شک اس سے پہلے تم بہکے ہوئے تھے، اور بے شک اس سے قبل تم گمراہ تھے“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو اسلاف کے تراجم میں بھی ملتا ہے۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:- ممکن ہے کہ یہاں پر کسی کے دل میں یہ تصور آجائے کہ لام ابتدائیہ تاکید یہ کی طرح اُس لام کو بھی علم نحو کی بعض کتابوں میں لام ابتدائیہ کہا گیا ہے جو لفظ ”ان“ ملغی العمل کے بعد لازم الاستعمال ہوتی ہے۔ ایسے میں ممکن ہے کہ اسے لام ابتدائیہ کہنے والے نحاۃ کے نزدیک اس میں بھی اُس کی طرح تاکید کا افادہ پایا جاتا ہو جس کے مطابق آیت کریمہ کے مذکورہ تراجم کے جواز کا پہلو نکل آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علم نحو کی کتابوں میں اس حوالہ سے جو کہا گیا ہے درست ہے لیکن ابتدائیہ

کہلانے کی بنا پر تاکید کے افادہ کا تصور کرنا غلط ہے کسی نحوی نے اس میں تاکید کے افادہ کا تصور

کیا ہے نہ کسی بلاغی نے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائیہ کہلانا ان دونوں کے مابین قدر مشترک ہونے کے ساتھ فارقہ اور تاکید یہ ہونے کی تفریق ہے جس میں نحاۃ کے دورائے ہیں نہ بلغاء کی اس کی ایسی مثال ہے جیسا حیوان کہلانا انسان اور فرس کے مابین قدر مشترک ہے جبکہ حیوان ناطق اور حیوان ساحل ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

۲ آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے ذیل میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس آیت کریمہ کا ترجمہ کیا جا رہا ہو اُس میں موجود ضما کر کی نوعیت کا ادراک ہو مستتر ہونے کی صورت میں اُس کا ترجمہ بھی مستتر انداز میں کرنا ضروری ہے اور بارز ہونے کی صورت میں اُس کا ترجمہ بھی اُس کے مطابق بارز انداز میں کرنا ضروری ہے ورنہ ترجمہ کا معیار گر سکتا ہے اسی طرح ضمیر کے مرجع اور اُس سے مراد کو بھی اُس کی ذات کے تناظر میں دیکھ کر اُس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ ترجمہ اصل متکلم کی مراد سے خلاف ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد و منشاء سے خلاف ہونے والے ترجمہ کا نقصان کسی دنیوی کتاب کے منشاء سے خلاف ہونے والے نقصان کی طرح محدود نہیں ہے اس لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ مبادا کسی بھی ضمیر کا ترجمہ تعبیر منشاء الہی کے خلاف نہ ہو ورنہ کیا سے کیا بن سکتا ہے اور نہ سہی فصاحت سے منافی ضرور ہوگا اور اہل علم جانتے ہیں کہ فصیح و بلیغ کلام کا ترجمہ اگر غیر فصیح و بلیغ انداز میں کیا جائے تو وہ اصل کے مطابق نہیں کہلائے گا اس کی ایک مثال کے لیے آیت کریمہ ”وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ“ (۱) کے ان تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے (اور ڈرو اُس دن سے کہ پھیرے جاؤ گے اُس دن خدا کی طرف، اور اُس دن سے ڈرو جس دن تم سب کے سب خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور ڈرتے رہو اُس دن سے کہ جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف) انہیں محض اس وجہ سے معیاری اور اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں ضمیر مجرور متصل جو لفظ ”فیه“ میں ہے کا ترجمہ ضمیر میں کرنے کے بجائے اسم ظاہر میں کیا گیا ہے جو اصل کے قائم مقام نہیں ہو سکتا یہ تراجم بالترتیب الشاہ مفتی مظہر اللہ دہلوی، حجتہ الاسلام فرمان علی

أصول ترجمہ

اور مولانا محمود الحسن نے کیے ہیں مترجمین پر افسوس کہ جب اصل کے مطابق ترجمہ (اور ڈرو اُس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھیرے جاؤ گے، اُس دن سے ڈرو جس میں پھیرے جاؤ گے اللہ کی طرف) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو پیش نظر شرط کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ کی تعریف پر بھی منطبق ہیں تو پھر شرط سے انحراف کر کے اس بے ڈھنگا پن کی راہ چلنے کا کیا جواز تھا۔

دوسرے انداز کی مثال کے لیے قرآن شریف کے اُن مقامات پر غور کیا جاسکتا ہے جن میں ضمیر مخاطب خاص لیکن مراد عام ہے جس کے متصلاً بعد ضمیر مخاطب خاص اور مراد بھی خاص ہے۔ مثال کے طور پر ”مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا“ (۱) اس میں ضمیر مخاطب (ک) کی صورت میں بظاہر یکساں چار ضمیر مذکور ہوئے ہیں جبکہ جمہور مفسرین کے مطابق اول الذکر تین خطاب خاص مراد عام کے قبیل سے ہیں جس کا مظہر ہر سننے والا اور کوئی بھی مخاطب ہو سکتا ہے جبکہ آخر الذکر خطاب اور مراد دونوں خاص کے قبیل سے ہے جس کا مظہر نبی اکرم سید عالم ﷺ کے سوا کوئی اور نہیں ہے حقیقت کی اس روشنی میں مترجم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہر ایک کی تعبیر و اظہار اُس کی شان کے لائق انداز میں کرے، مثال کے طور پر (اے سننے والے تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے اور اے محبوب ہم نے تمہیں سب لوگوں کے لیے رسول بھیجا، اے انسان تجھے جو بہتری پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچے وہ تیری طرف سے ہے اور اے نبی ہم نے تمہیں تمام انسانوں کے لیے رسول بھیجا ہے) جیسے کسی بھی انداز میں کرے جو بامحاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہیں اور ہر اعتبار سے بامقصد و بے غبار ہیں بخلاف اُن تراجم کے جن میں ضما کر کے اس اصول سے خلاف کیا گیا ہے اس میں مترجمین کے دو طبقے ہیں۔ ایک کا انداز ترجمہ اس طرح ہے:

① ”اے انسان تجھے جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے

أصول ترجمہ

اور جو کوئی بد حالی پیش آوے وہ تیرے ہی سبب سے ہے اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔“

② ”اے انسان جو کچھ کہ تجھ کو بھلائی پہنچے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ تجھ کو برائی پہنچے تو وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے اور اے محمد ہم نے تجھ کو بھیجا ہے لوگوں کا پیغمبر بنا کر۔“

③ ”اے آدم زاد تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی شامت اعمال کی وجہ سے ہے اور اے محمد ہم نے تم کو لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔“

④ ”جو پہنچے انسان تجھ کو کوئی بھلائی تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے تجھ کو کوئی برائی تو وہ تیری طرف سے ہے اور ہم نے بھیجا ہے آپ کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر۔“

یہ چاروں بالترتیب اشرف علی تھانوی، عاشق الہی میرٹھی، فتح محمد خان جالندھری اور حافظ صلاح الدین یوسف کے کیے ہوئے تراجم ہیں جن میں پہلے تینوں ضما کر کا ترجمہ درست کیا گیا ہے جبکہ چوتھے کی تعبیر و ترجمہ اس کے شایان شان کرنے کی کوشش کے باوجود نبھانہ سکے کیوں کہ بعض نے اس کی تعبیر و ترجمہ کے طور پر ”اے محمد“ کہا جیسا دوسرے اور تیسرے میں اور بعض نے لفظ ”آپ“ کہا جیسا اول الذکر اور آخر الذکر میں ہے جبکہ یہ دونوں اندازِ مخاطب محاورہ سے خلاف ہیں کہ اردو محاورہ میں خطاب اللہ مع الرسول کی تعبیر و ترجمہ میں لفظ ”آپ“ کہنے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”یا محمد“ کہہ کر خطاب کرنے کی کوئی مثال قرآن شریف کے محاورہ میں موجود نہیں ہے اسی طرح اردو محاورہ میں بھی لفظ ”اے محمد“ کہہ کر خطاب کرنے کا محاورہ موجود نہیں ہے گویا ترجمہ کا یہ انداز دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف ہے تو پھر انہیں آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ کون کہے۔

پیش نظر آیت کریمہ کے مترجمین کے دوسرے طبقہ کے تراجم اس طرح ہیں (تمہیں جو کوئی اچھائی پہنچتی ہے تو وہ محض اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو کوئی برائی پہنچتی ہے وہ تو تمہارے اپنے سبب سے ہوتی ہے اور اے پیغمبر ہم نے تمہیں لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے، تجھے جو بھی سکھ پیش آیا

أصول ترجمہ

ہے وہ بس اللہ ہی کی طرف سے ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تیرے اپنے ہی سبب سے ہے اور ہم نے آپ کو انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے) یہ دو بالترتیب مولانا مفتی تقی عثمانی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے کیے ہوئے ترجمے ہیں جو آیت کریمہ میں مذکور پہلے تینوں ضمائر کی تعبیر و ترجمہ واضح نہ کرنے میں شریک ہیں۔ چوتھی ضمیر کی تعبیر و ترجمہ کے حوالہ سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں کہ اول الذکر نے اُس کا حق نبھایا ہے جبکہ آخر الذکر نے اُس کا ترجمہ لفظ ”آپ“ میں کر کے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو ”ناراض“ کر دیا ہے۔ ان دو طبقوں میں آیت کریمہ میں مذکور ضمائر کے حوالہ سے جزوی بے توجہی کی گئی ہے جبکہ آیت کریمہ کے کچھ تراجم ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن میں ضمائر کے حوالہ سے خطاب خاص مراد عام اور خطاب اور مراد دونوں خاص کی تفریق سے مکمل بے توجہی برتی گئی ہے جس کی مثال کے لیے مولانا محمد جونا گڑھی کے اس ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے ”تجھے جو بھلائی ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے ہم نے تجھے تمام لوگوں کو پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے“ جس میں سابق الذکر دونوں ضمیر منصوب متصل اور آخر الذکر میں مقصد کے حوالہ سے جو فرق ہے اُسے ایک مقام پر بھی ظاہر نہیں کیا گیا ہے تو پھر اسے کامل غفلت کیوں نہ کہا جائے۔ جبکہ متن سے مراد کے اظہار سے قاصر تفسیر بھی معیاری نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایسے ترجموں کو درست کہا جائے حالانکہ ترجمہ کا معاملہ تفسیر کی بہ نسبت زیادہ قابل توجہ اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے۔ تفریق المراد فی الضمائر والخطاب کی اہمیت کا نتیجہ ہے کہ اس قسم آیات کی تفسیر کرتے ہوئے جمہور مفسرین نے ہر ایک سے مراد الہی کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر مالکی المذہب مفسر ابو عبد اللہ القرطبی المتوفی 1273ھ نے لکھا ہے:

”والخطاب للنبي ﷺ والمراد امته ما اصابكم يا معشر الناس من خصب واتساع رزق فمن تفضل الله عليكم وما اصابكم من جذب وضيق رزق فمن انفسكم“ (۱)

(۱) الجامع لاحکام القرآن، ج: 5، تحت الاية المذكورة۔

أصول ترجمہ

حنفی المذہب مفسر الشیخ السید محمود البغدادی الاوسی المتوفی 1270ھ نے لکھا ہے:
”والخطاب فیہ کما قال الجبائی وروی عن قتادہ عام لكل من یقف علیہ
لالنبی ﷺ“ (۱)
شافعی المذہب مفسر جلال الدین السیوطی المتوفی 910ھ نے لکھا ہے: ”ما اصابک ایہا
الانسان“

اس کے بعد آیت کریمہ میں آخر الذکر ضمیر سے مراد بتاتے ہوئے لکھا ہے:
”وارسلناک یا محمد“ (۲)

جعفری المذہب مفسر الفضل ابن الحسین الطبرسی المتوفی 548ھ نے لکھا ہے:
”هذا خطاب للنبی والمراد بہ الامۃ“ (۳)

حنبلی المذہب مفسر عبدالرحمن ابن الجوزی المتوفی 597ھ نے لکھا ہے: ”فی الخطاب
بهذا الکلام ثلاثۃ اقوال احدها انه عام فتقدیرہ ما اصابک ایہا الانسان قالہ
قتادہ والثانی انه خطاب للنبی ﷺ والمراد بہ غیرہ ذکرہ الماوردی“
اس کے بعد آیت کریمہ میں مذکور اول الذکر ضمائر کے خطاب کو خاص مراد العام قرار دیتے ہوئے
لکھا ہے: ”لان الایۃ عامۃ“ (۴)

معتزلی المذہب مفسر جارا اللہ الزمخشری المتوفی 538ھ نے لکھا ہے:
”ما اصابک یا انسان خطابا عاما“ (۵)

(۱) تفسیر روح المعانی، ج: 5، تحت الایۃ المذکورہ۔

(۲) تفسیر جلالین علی هامش الفتوحات الالہیہ، ج: 1، تحت الایۃ المذکورہ۔

(۳) مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج: 3، تحت الایۃ المذکورہ۔

(۴) زاد المیسر فی علم التفسیر، ج: 1، تحت الایۃ المذکورہ۔

(۵) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون فی وجوہ التأویل، ج: 1، تحت الایۃ المذکورہ۔

أصول ترجمہ

ایسے میں یہ تراجم نہ صرف مرادِ الہی کو ظاہر کرنے سے قاصر ہیں بلکہ جمہور مفسرین سے بھی خلاف ہیں تو پھر تفریق خطاب کی پہچان کا ترجمہ کی صحت کے لیے شرط ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے جبکہ اسلاف نے قرآنی محاورہ کی اس قسم تفریقات کو مستقل عنوان کیساتھ ذکر کیا ہے جس سے اہم مقصد مفسر و مترجم کی رہنمائی کرنا ہے کہ تفسیر و ترجمہ کو اس کے مطابق کرے جیسا امام جلال الدین السیوطی نے لکھا ہے:

”النوع الحادی والخمسون، فی وجوه مخاطباتہ، قال ابن الجوزی فی کتابہ النفیس الخطاب فی القرآن علی خمسة عشر وجہا، وقال غیرہ علی اکثر من ثلاثین وجہا،

أحدھا خطاب العام والمراد بہ العموم كقوله الله الذی خلقکم.

والثانی خطاب الخاص والمراد بہ الخصوص كقوله أكفرتم بعد إيمانکم یاہیا الرسول بلغ.

الثالث خطاب العام والمراد بہ الخصوص كقوله یاہیا الناس اتقوا ربکم لم یدخل فیہ الأطفال والمجانین.

الرابع خطاب الخاص والمراد العموم كقوله یاہیا النبی إذا طلقتم النساء افتتح الخطاب بالنبی والمراد سائر من یملك الطلاق وقوله یاہیا النبی إنا أحللتنا لك أزواجك“ (۱)

اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیش نظر آیت کریمہ ”مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا“ کے آخر الذکر ضمیر منصوب متصل کا ذکر الخاص والمراد بہ الخاص کے قبیل سے ہونے میں کسی کو شک ہو سکتا ہے اور نہ اول الذکر دونوں کا ذکر الخاص والمراد بہ العموم کے قبیل سے ہونے میں۔

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۳۳، مطبوعہ الحجاز بالقاہرہ، مصر۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:-

ہمارے اس جزم و یقین کے اظہار پر کہ آیت کریمہ ”وَأَرْسَلْنَاكَ“ کے خطاب خاص والمراد بہ الخاص کے ترجمہ میں لفظ ”آپ“ استعمال کرنا اردو محاورہ سے خلاف ہے اور اسی طرح لفظ ”اے محمد“ کہنا دونوں محاوروں سے خلاف ہے ممکن ہے کسی کو یہ اشتباہ ہو جائے کہ اردو زبان کے محاورہ میں قابل تعظیم ہستیوں کی بابت اس انداز کلام کو مہذب اور باادب سمجھا جاتا ہے جیسا کہا جاتا ہے ”آپ ﷺ نے فرمایا ہے“ اسی طرح کسی صحابی یا کسی امام مذہب کا تذکرہ ہو رہا ہو اثناء کلام اُن سے متعلق بھی ایسا کہا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا اور آپ نے منع کیا تو پھر آیت کریمہ کے ترجمہ میں نامناسب اور بے محاورہ کیوں کہلائے؟ اسی طرح ”اے محمد“ بھی کوئی اجنبی لفظ نہیں ہے بلکہ یہ عربی کے ”یا محمد“ کا ترجمہ ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا ”یا محمد ارفع راسنک واشفع تشفع وسل تعط“ (۱)

نیز کچھ صحابہ کرام سے بھی اس طرح کی ندا کا ثبوت ملتا ہے تو پھر آیت کریمہ کے ترجمہ میں ”اے محمد“ کہنے کو دونوں محاوروں سے خلاف کیوں کہا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انسانوں کا ایک دوسرے کے حوالہ سے گفتگو کرنا یا ایک دوسرے سے بالمشافہ کلام کرنا الگ چیز ہے جس پر قرآن شریف کے ترجمہ کو قیاس نہیں کیا جاسکتا یہ اتنا قابل احتیاط عمل ہے کہ مفسر کے لیے جائز ہونے والے بہت سے انداز بھی یہاں پر جائز نہیں ہوتے چہ جائیکہ انسانوں کے حوالہ سے ہونے والی گفتگو پر اسے قیاس کرنا جائز ہو سکے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے جس میں قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام اور اُن کی متعارف حیثیات کے مطابق ہو سکیں۔ انسانوں کی گفتگو میں ایک دوسرے کے مراتب کے تناظر سے آپ کہنا مستحسن امر ہے، مہذب انداز کلام ہے اور اردو محاورہ میں مشہور و مانوس

(۱) مسلم شریف، کتاب الشفاعہ۔

أصول ترجمہ

بھی ہے لیکن اس کا ترجمہ القرآن سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ سے خطاب کے ترجمہ میں آپ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو آپ کہہ کر پکار رہا ہے یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یا کسی پیغمبر یا کسی بھی مسلمان کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے خطاب کے ترجمہ میں آپ کہا جائے جیسا کسی بندہ کو آپ کہہ کر پکار رہا ہے اس کی کوئی مثال اردو محاورہ میں موجود نہیں ہے اور مانوس الاستعمال و متعارف نہیں ہے۔ جن حضرات نے قرآن شریف کے ایسے مخصوص مقامات کا ترجمہ اس انوکھے انداز سے کیا ہے زبان دانی میں اُن کا کوئی مقام ہے نہ سخن شناسی میں اردو زبان کے حوالہ سے اُن کی حیثیت ایسی ناقابل قبول و غیر معتبر ہے جیسا قرآن و حدیث کے حوالہ سے طبقہ مولدین کا کلام ناقابل قبول ہے۔

اشتباہ کے دوسرے حصہ کا بھی تقریباً یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرنے میں لفظ ”یا محمد“ کہنے کا محاورہ قرآن و سنت کی زبان میں نہیں ہے جہاں تک حدیث مسلم کے حوالہ سے ”ارفع راسک یا محمد“ کا تصور ہے اُس کا تعلق دُردنیا سے نہیں بلکہ دارِ آخرت سے ہے اور آخرت کا معاملہ دُنیا سے مختلف ہے ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیے جاسکتے جبکہ اللہ کے رسول سید عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وجیہ ہیں، معظم ہیں اور محبوب و مکرم ہیں جس وجہ سے ان کے ساتھ اللہ کا خطاب عام خطاب کی طرح نہیں بلکہ خطاب الکرامہ کہلاتا ہے جس وجہ سے پورے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی لفظ ”یا محمد“ کہہ کر خطاب نہیں فرمایا۔ پیشروانِ اسلام نے اس کا فلسفہ یہ بتایا ہے کہ لفظ ”محمد“ رسول اللہ ﷺ کے لیے اسم محض ہے اور محض اسم سے پکارنے میں تکریم و تعظیم کا وہ انداز نہیں ہوتا جو اوصاف سے پکارنے میں ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے ساتھ خطاب تکریم چاہتا ہے۔ حضرت امام جلال الدین السیوطی نے فرمایا:

”ولم يقع فی القرآن الخطاب بیا محمد بل أيُّها النبی، یا أيُّها الرسول تعظیما له وتشریفا وتخصیصا له بذالك عما سواه وتعلیما للمومنین ان لا ینادوه باسمه“ (۱)

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۳۳، مطبوعہ الحجازی بالقاهرہ مصر۔

أصول ترجمہ

قاضی عیاض المتوفی ۵۴۲ھ نے الشفا بتعريف حقوق المصطفى ﷺ میں اپنے سے پیشرو اسلاف و صلحاء کے حوالہ سے لکھا ہے:

”قال بعضهم ومن فضله أن الله تعالى خاطب الانبياء باسمائهم وخاطبه بالنبوة والرسالة في كتابه فقال أَيُّهَا النَّبِيُّ، أَيُّهَا الرَّسُولُ“ (۱)

ایک اور مقام پر فرمایا جو ملا علی القاری کی مزوج شرح کے ساتھ اس طرح ہے:

”ولا تنادوه باسمه ای العلم نداء كمناداة بعضكم بعضا ای باسمه الذی سماه به ابواه ولكن عظموه باطنا و قروه ای ظاهرا و نادوه با شرف ما يحب ای ما يعجبه ان ينادى به ای من وصف رسالة او نعت نبوة بان تقولوا یا رسول الله، یا نبی الله ای امثالهما من نحو یا حبيب الله یا خليل الله وهذا فی حياته و کذا بعد وفاته فی جميع مخاطباته“ (۲)

سید محمد البغدادی الاوسی نے سورۃ النور، آیت نمبر 63 کے تحت محض اسم کے ساتھ اللہ کے رسول سید عالم ﷺ کو یاد کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”وفی احکام القرآن للسیوطی ان فی هذا النهی تحريم ندائه ﷺ باسمه والظاهر استمرار ذلك بعد وفاته الى الآن“ (۳)

ملا علی القاری نے اسلام کے اس حکم کے دوام و بقاء اور قیامت تک جاری بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”واعلم انه ينبغي هذه المراعاة ايضا بعد وفاته عليه الصلاة والسلام فی مسجده لا سيما عند مشهده و کذا عند قراءة حديثه و مسنده و کذا عند سماع

(۱) الشفاء بتعريف حقوق المصطفى، ج: 1، ص: 111، مطبوعه دار الكتب العربيه بيروت۔

(۲) الشفاء بتعريف حقوق المصطفى مع شرح ملا علی القاری، ج: 2، ص: 64، مطبوعه دار الكتب العربيه بيروت۔

(۳) تفسير روح المعاني، ج: 18، ص: 225، مطبوعه دار الاحياء التراث العربی۔

أصول ترجمہ

القرآن وتفسير الفرقان كما اشار اليه سبحانه وتعالى بقوله ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ﴾ (۱) وقال تعالى ﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ (۲) ای برفع الصوت فوق صوته او بندائنه باسمائه فلا تقولوا يا محمد يا احمد بل قولوا يا نبي الله و يا رسول الله كما خاطبه به سبحانه وعظم شانه“ (۳)

سلف صالحین کی ایسی تصریحات کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خطاب اور مختص ضماؤ کے ترجمہ میں اے محمد کہنے کو معیاری ترجمہ کہا جاسکتا ہے نہ با محاورہ، مراد الہی کے مطابق کہا جاسکتا ہے نہ مفسرین کے مطابق بلکہ اس کی حیثیت ترجمہ کے نام سے مفسرین کی نقل کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بغیر شرائط کے مترجم بننے کے شائق حضرات نے تفسیر کی کتابوں میں ایسا دیکھ کر اُسے ترجمہ بنا دیا جس سے اُن مفسرین کی روح کو بھی تکلیف پہنچ رہی ہوگی کیوں کہ انہوں نے یہ لفظ تفسیر کے طور پر لکھا ہے ترجمہ کے نہیں جبکہ مفسر کو بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش ہوتی ہے جو مترجم کے لیے جائز نہیں ہوتی۔

۵ ترجمہ کیے جانے والی آیات کی نحوی حیثیات کے سلسلہ میں لفظ ”ظن“ کا مفہوم بھی ہے جو اس طرح ہے کہ علم نحو اور لغت کے مطابق لفظ ”ظن“ سے بننے والے فعل چاہے ماضی ہو یا مستقبل بہر حال اُس کے بعد لفظ ”اَنَّ“ آجائے جیسے آیت کریمہ ”وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ“ (۴) یا ”اَنَّ“ سے

(۱) فصلت: 26۔

(۲) النور: 63۔

(۳) شرح شفاء للقاضی عیاض، شرح ل لِمَلا علی القاری، ج: 2، ص: 62، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان۔

(۴) القیامہ: 28۔

أصول ترجمہ

مخفف ”أَنْ“ آجائے جیسے آیت کریمہ ”إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ“ (الانشقاق، 14) تو ایسے تمام مقامات پر ظن یقین کے مفہوم میں ہوتا ہے یعنی لفظ ”أَنْ“ و ”أَنْ“ فعل ظن کو ظنیت سے نکال کر یقین میں کرنے کے لیے آتے ہیں۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

”الظَّنُّ إِسْمٌ لِمَا يَحْصُلُ عَنْ أَمَارَةٍ وَمَتَى قَوِيَّتْ أَدَّتْ إِلَى الْعِلْمِ وَمَتَى ضَعُفَتْ جِدًّا لَمْ يَتَجَاوَزْ حَدَّ التَّوَهُّمِ وَمَتَى قَوِيَّ أَوْ تَصَوَّرَ تَصَوُّرَ الْقَوِيِّ أُسْتَعْمِلَ مَعَهُ أَنَّ الْمَشَدَّةَ وَأَنَّ الْمُخَفَّفَةَ مِنْهَا وَمَتَى ضَعُفَ أُسْتَعْمِلَ إِنَّ وَإِنَّ الْمُخْتَصَّةَ بِالْمَعْدُومِينَ مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ فَقَوْلُهُ ”الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبِّهِمْ“ وَكَذَا يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهَ فَمِنَ الْيَقِينِ“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ظن کسی چیز کی علامت سے حاصل ہونے والے علم کا نام ہے اور یہ جب قوی ہوتا ہے یقین تک پہنچتا ہے اور جب زیادہ ضعیف ہو تو وہم کے درجہ سے آگے تجاوز نہیں کرتا اور جب قوی یا قوی کی طرح متصور ہو تو اُس کیساتھ ”أَنْ“ اور کبھی ”أَنْ“ سے مخفف ”أَنْ“ بھی استعمال کیا جاتا ہے اور جب ضعیف ہو تو اُس کے ساتھ ”إِنَّ“ اور اس سے مخفف ”إِنْ“ استعمال کیے جاتے ہیں جو قول و فعل معدوم کے ساتھ خاص ہے تو اللہ کا فرمان ”الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبِّهِمْ“ اور اسی طرح ”يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهَ“ یقین کے قبیل سے ہیں جس میں وہم اور خیال کا تصور ہی نہیں ہے۔

نہ صرف اتنا بلکہ ”أَنْ“ ثقیلہ یا خفیفہ اپنے مابعد سے مل کر مصدر منسلخ ہونے کے بعد محلاً منصوب ہوتا ہے اور فعل ظن کے لیے ایسا مفعول بہ ہوتا ہے جو دوسرے مفعول بہ کا بھی قائم مقام ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مبتداء کی قسم ثانی ”أَقَائِمُ الدِّيدَانِ“ میں لفظ ”الدِّيدَانِ“ قائم کے لیے فاعل ہونے کے ساتھ قائم مقام خبر بھی ہے جو کسی بھی نحو شناس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ فعل ”ظن“ کے

أصول ترجمہ

ایسے تمام مواقع پر دوسرے مفعول بہ کو صراحتاً ذکر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ افعال قلوب کے زمرہ میں فعل ظن جو قرآن شریف کے بے شمار جگہوں میں استعمال ہوا ہے نحوی اصولوں کی اس روشنی میں اُن کے ترجمہ کی ایک مثال آیت کریمہ ”الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ“ (۱) کے تراجم ”جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے، جنہیں اپنے رب سے ملنے کا یقین ہے، جو یقین رکھتے ہیں کہ بے شک ہم نے اپنے رب سے ملنا ہے“ جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو علم نحو کے اس اصول کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہیں بخلاف اُن تراجم کے جو علم نحو سے مستفاد اس اصول کی شرط کو پامال کر کے لکھے گئے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں جیسے درج ذیل تراجم (جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے عنقریب ملنے والے ہیں، جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں، جن کو خیال ہے کہ وہ روبرو ہونے والے ہیں اپنے رب کے، خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے، جن کو خیال ہے کہ وہ ضرور اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں) یہ تراجم بالترتیب مفتی غلام سرور القادری، مفتی تقی عثمانی، مولانا محمود الحسن، اشرف علی تھانوی، عاشق الہی میرٹھی کے کیے ہوئے ہیں اور سب اس وجہ سے غلط ہیں کہ ان میں علم نحو کے مذکورہ اصولوں سے غفلت برتی گئی ہے۔ اول الذکر میں اگرچہ ظن کو خیال کے معنی میں لینے کی غلطی سے اجتناب کیا گیا ہے تاہم فعل ظن کے بعد مذکور ہونے والے ”اَن“ کا اپنے صلہ سے مل کر مصدر منسلخ ہونے کے اصول کو پامال کیا گیا ہے نہ صرف اتنا بلکہ اس کے ساتھ لفظ ”عنقریب“ کا بے مصرف اضافہ کر کے ترجمہ کی تعریف سے ہی عدول کیا گیا ہے جو قابل معافی نہیں ہے جبکہ اُس کے بعد والے چاروں میں علم نحو کے مذکورہ دونوں اصولوں سے خلاف کیا گیا ہے جنہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرات نے یہ سب کچھ لکھتے وقت علم نحو کی اہمیت کو بالائے طاق رکھا تھا اور فعل ظن سے متعلق علم نحو کی کتابوں میں پڑھے ہوئے مذکورہ اصولوں کو کتابوں میں بھول گئے تھے (فالی اللہ المشتکی)

(۱) البقرة: 46۔

۶ ترجمہ کیے جانے والی آیات کی نحوی حیثیات کے سلسلہ دراز میں اس بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ آیت کریمہ موصول ہے یا مفصول یعنی عطف کے قبیل سے ہے یا بغیر عطف کے اور موصول ہونے کی صورت میں حرف واصل یعنی حرف عطف کی نوعیت پر اطمینان ہونا ضروری ہے (و، ف، ثم، حتی، او، اما، ام، لا، بل، لکن) کی فہرست میں موجود کون سا حرف ہے اور کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً (ثم) ہے تو تاخر زمانی کے لیے ہے یا تاخر کلامی یا تاخر ترتیبی کے لیے اسی طرح اگر (او) ہے تو اُس سے مقصد کو جاننا ضروری ہے کہ اختیار کے لیے ہے یا اباحت کے لیے، شک کے لیے ہے یا تشکیک یا ابہام کے لیے یا تنويع و تقسيم کے لیے تقریباً یہی صورتیں (اما) میں بھی ہو سکتی ہیں اور اسی طرح اگر (ام) ہے تو تسلی ہونا ضروری ہے کہ متصل ہے یا منقطعہ ورنہ بے اطمینانی و نا سمجھی کی وجہ سے ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کی غلطی ہو سکتی ہے جو معنوی تحریف کہلائے گی (اعاذنا اللہ منہ)

اسی طرح اگر (لکن) ہے تو دیکھنا ہوگا کہ اس کے ساتھ (واو) ہے یا نہیں یہ تمیز اس لیے ضروری ہے کہ (لکن) کا حروف عاطفہ میں شمار ہونے اور عطف کا کردار ادا کرنے کے لیے مسلمہ شرط ہے کہ اُس کے ساتھ (واو) نہ ہو ورنہ (ولکن) ہونے کی صورت میں (لکن) عطف کے لیے ہرگز نہیں بلکہ استدراک کے لیے متعین ہو جاتی ہے اور عطف کے لیے (واو) مشخص ہو جاتی ہے گویا جس آیت کریمہ میں بھی (ولکن) ہو وہاں پر عطف اور استدراک کا اجتماع ہوتا ہے اور یہ بمنزلہ استثناء منقطع ہوتا ہے جس کے مابعد والے جملہ کا مفہوم ماقبل والے جملہ کے مفہوم کے منافی ہونے کے باوجود آپس میں معطوف و معطوف علیہ کہلاتے ہیں اور کلام کی استثنائی صورت اُس کی عطف والی صورت پر غالب ہوتی ہے کیوں کہ مستثنیٰ منقطع حقیقت میں مستقل کلام ہوتا ہے علم نحو کے ہمع الہوامع شرح جمع الجوامع للسيوطی میں ہے:

”لأنه في حكم جملة منفصلة عن الأولى“ (۱)

یعنی مستثنیٰ منقطع پہلے والے جملہ سے جدا مستقل جملہ کے حکم میں ہے۔

(۱) ہمع الہوامع، ج: ۱، ص: ۲۲۳، مطبوعہ منشورات الرضی قم ایران۔

أصول ترجمہ

مترجم پر لازم ہے کہ قرآن شریف کے ایسے تمام مقامات کا ترجمہ کرتے ہوئے اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ والی زبان سے اس کے مطابق الفاظ و انداز اختیار کرے ورنہ ترجمہ غلط ہو سکتا ہے جسے اصل کے مطابق اور معیاری نہیں کہا جاسکتا جس کی مثالوں کے لیے مشتے نمونہ از خروارے سورۃ البقرہ، آیت 57 کے حصہ ”وَلٰكِنْ كَانُوا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ“ کے درج ذیل تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے (اور لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے، لیکن آپ اپنا ہی نقصان کرتے رہے، اور لیکن تھے وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے) جو محض اس وجہ سے غلط ہیں کہ ان میں علم نحو کے مذکورہ اصول سے خلاف کیا گیا ہے ورنہ اول الذکر اور آخر الذکر میں لکھا گیا لفظ (اور) کا کیا جواز ہے ظاہر ہے کہ مترجمین نے اسے آیت کریمہ کے حصہ (ولکن) میں مذکور (واو) کا متبادل اور اس کا ترجمہ کے طور پر لکھا ہے جبکہ مذکورہ اصول کے مطابق اس کی عطف والی حیثیت (لکن) کی استدراک و استثنائی حیثیت کے غلبہ کی وجہ سے مغلوب اور غیر موثر ہو چکی ہے اور اس کا مابعد ماقبل سے متصل نہیں بلکہ منقطع ہو چکا ہے اسی طرح ثانی الذکر ترجمہ میں (ولیکن) کہنے کا بھی جواز نہیں ہے کیوں کہ یہاں پر اول الذکر اور آخر الذکر سے برعکس متن کے لفظ (و) کو ترجمہ کا جزو بنانے کے لیے اعادہ کیا گیا ہے بہر حال ترجمہ کے ان دونوں طریقوں میں آیت کریمہ میں مذکور لفظ (ولکن) کے واو کی عطف والی حیثیت کو موثر سمجھ کر ایسا کیا گیا ہے جو اس کی نحوی حیثیت سے غفلت کا نتیجہ ہے انجام کار ان تراجم کی حیثیت مفصول متن کا ترجمہ موصول میں کرنے کی غلطی سے مختلف نہیں ہے جبکہ اس کی مذکورہ نحوی حیثیت کے مطابق ترجمہ (ہاں اپنی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے، لیکن اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے، مگر اپنی جانوں کا ہی نقصان کرتے رہیں) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے، اسلاف کے کیے ہوئے معیاری تراجم میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

اس کی دوسری مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 272 کے حصہ ”وَلٰكِنْ اللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ“ کے درج ذیل ترجموں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے (اور لیکن اللہ راہ پر لاوے جس کو چاہے، و لیکن خدا تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت پر لے آئیں، اور لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی اختیاری ہدایت کی توفیق

دیتا ہے جسے چاہتا ہے) ان تینوں کی غلطی کی بھی وہی وجہ اور وہی تفصیل ہے جو سابقہ مثال میں بیان ہوئی ہے کیوں کہ علم نحو کے مذکورہ اصول کے حوالہ سے لفظ (ولکن) اور (ولکن) میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے کہ دونوں کی استثنائی واستدرا کی حیثیت عطف کی حیثیت پر غالب ہو کر اُسے معنوی طور پر کالعدم کر رہی ہے گویا ان کی غلطی کی حیثیت بھی پہلے کی طرح بناء الغلط علی الغلط یا بنا الغلط علی الغفلة سے خالی نہیں ہے۔ یہ تراجم بالترتیب مولانا محمود الحسن اور اشرف علی تھانوی اور مولانا نعمت اللہ چشتی نے کیے ہیں یہاں پر بھی پہلی کی طرح آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے مطابق ترجمہ (ہاں اللہ راہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے، ہاں اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، لیکن اللہ ہدایت دے جسے چاہے) جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہے لیکن صرف اُن خوش نصیبوں کے لیے جو آیت کریمہ کے مذکورہ نحوی حیثیت کے ساتھ دوسری تمام شرائط کا بھی ادراک رکھتے ہوں ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسا مترجمین نے کیا ہے یا کر رہے ہیں۔

7 ترجمہ کیے جانے والی آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے سلسلہ دراز میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ آیت کریمہ کا کوئی حصہ مصدر ہونے کی صورت میں مترجم کو اُس کے متعلق پوری طرح بصیرت ہونا ضروری ہے کہ آیا نفس مصدر ہے یا مصدر معلوم یا مجہول، نیز حاصل بالمصدر معلوم ہے یا حاصل بالمصدر مجہول ورنہ ایک کی جگہ دوسرے کا ترجمہ کرنے کی غلطی ہو سکتی ہے جیسا سورۃ بقرہ، آیت 164 کے ابتدائی حصہ ”إِنْ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ“ کے کیے گئے تراجم (بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے، بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، بے شک تخلیق میں، بے شک تخلیق میں آسمانوں کی اور زمین کی، بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں، بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں، بے شک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں، بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں) یہ تراجم بالترتیب غزالی زمان سید احمد سعید الکاظمی، مفتی غلام سرور القادری، ڈاکٹر طاہر القادری، حافظ صلاح الدین یوسف و معاونین، مولانا محمود الحسن، اشرف علی تھانوی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، فتح محمد جالندہری اور مولانا مفتی تقی عثمانی جیسے

مشاہیر نے کیے ہیں جو محض اس وجہ سے غلط ہیں کہ ان میں متن کے لفظ (خلق) جو مصدر بمعنی حاصل بالمصدر المجهول ہے ترجمہ نفس مصدر میں کیا گیا ہے جیسا ان کے الفاظ (پیدا کرنے، تخلیق، بنانے) سے صاف ظاہر ہے کیوں کہ اردو محاورہ میں یہ تینوں الفاظ نفس مصدر کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جبکہ آیت کریمہ میں لفظ (خلق) نفس مصدر کے مفہوم میں ہونا ممکن نہیں بلکہ حاصل بالمصدر المجهول کے مفہوم میں متعین ہے۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ پیش نظر آیت کریمہ کے آٹھوں حصوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر دلیل کے طور پر سمجھانے کے لیے نازل فرمایا ہے اور قرآن شریف میں جہاں کہیں بھی توحید کی کوئی دلیل بیان ہوئی ہے وہ اولیات، فطریات، وجدانیات، حدسیات اور محسوسات و مشاہدات جیسے بدیہیات سے خالی نہیں ہے کیوں کہ بدیہیات کو سمجھنے میں مسلم و غیر مسلم اور موحد و مشرک کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ یہاں پر بھی جن آٹھ چیزوں یعنی زمین و آسمان کی پیدائش کا نظام، دن رات کے بدلتے آنے کا نظام، لوگوں کے فائدے پر مشتمل ہو کر کشتی کا دریا میں چلنے کا نظام، بارش برسائے جانے کا نظام، پانی کے سبب سے مردہ زمین کو زندہ کرنے کا نظام، اس کے سبب سے جملہ انواع حیوانات کو پھیلانے کا نظام، ہواؤں کی گردش کا نظام، زمین اور آسمان کے درمیان غیبی حکم کا تابع بادل کا نظام۔ ان میں سے ایک ایک نظام کو اللہ تعالیٰ نے دلیل توحید کے انداز میں بیان فرمایا ہے اور ان کو نازل کرنے سے بنیادی مقصد و عبارت النص اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ لوگ ان کو سمجھنے کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی وحدۃ استحقاق عبادت کو سمجھ سکیں کیوں کہ ان میں سے ہر ایک نظام کا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے پر سب کو یقین ہے، جس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے جبکہ اللہ کی توحید یعنی وحدۃ استحقاق عبادت اور بلا شرکت غیر تنہا لائق عبادت ہونے پر سب کو یقین حاصل نہیں ہے بلکہ مسلم و موحد کے سوا باقی انسانوں میں بعض کو اس سے انکار ہے جبکہ بعض کو شک ہے تو پیش نظر آیت کریمہ میں ان نظام ہائے متعددہ کے ذریعہ انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ جب تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے ہر ایک کا خالق و مالک صرف وہی غیبی

أصول ترجمہ

طاقت ہے جس کو اللہ کہا جاتا ہے، تمہیں یقین ہے کہ ان نظاموں کا خالق و مالک ہونے میں وہ تنہا وحدہ لا شریک ہے تو پھر اس کا لائق عبادت ہونے میں وحدہ لا شریک اور تنہا و یکتا ہونے پر یقین کیوں نہیں کرتے حالانکہ تم اس بات کو بھی جانتے ہو کہ جو ہستی بھی ان نظاموں کا بلا شرکت غیر خالق و مالک ہو مستحق عبادت بھی وہی ہو سکتی ہے اور تو حید فی القدرة والاحسان کے ان تمام نظاموں کا تعلق بدیہیات کے نوع مشاہدات کے قبیل سے ہے اس لیے کہ ہر شخص زمین و آسمان کی پیدائش کے نظام سے لے کر فضا میں حکم الہی کے پابند بادل کے نظام اور اس سسٹم کو آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر لیتا ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف اللہ یعنی وہی غیبی طاقت ہے۔ اس کے ساتھ پیش نظر آیت کریمہ کی ترکیبی حیثیت کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے وہ اس طرح ہے کہ آیت کریمہ کے مذکورہ تمام حصے اپنے اپنے متعلقات سے مل کر لفظ ”إِنَّ“ کے لیے خبر مقدم ہیں جبکہ آیت کریمہ کا آخری حصہ ”لَا يَتْلَقُومُ يَعْقِلُونَ“ اس کے لیے اسم موخر ہے جس کے مطابق علم نحو کے تقاضے سے پوری آیت کریمہ چھ ترکیبوں میں اس طرح تقسیم ہوتی ہے:

❶ ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا يَتْلَقُومُ يَعْقِلُونَ“

❷ ”إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَا يَتْلَقُومُ يَعْقِلُونَ“

❸ ”إِنَّ فِي الْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ لَا يَتْلَقُومُ يَعْقِلُونَ“

❹ ”إِنَّ فِي مَا أُنْزِلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ لَا يَتْلَقُومُ يَعْقِلُونَ“

❺ ”إِنَّ فِي تَصْرِيفِ الرِّيحِ لَا يَتْلَقُومُ يَعْقِلُونَ“

❻ ”إِنَّ فِي السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَتْلَقُومُ يَعْقِلُونَ“

ان حقائق کو پیش نظر رکھنے والے کسی بھی اہل علم سے مخفی نہیں رہ سکتا کہ ان تراکیب میں سے پہلی قسم میں مذکور ”خلق“ مخاطبین کے لیے مشاہدات و محسوسات کے قبیل سے تب ہو سکتا ہے کہ جب حاصل بالمصدر مجہول کے معنی میں ہو ورنہ نفس مصدر کے مفہوم میں ہونے کی صورت میں محسوس و

أصول ترجمہ

مشاہدہ کے قبل سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ ”خَلَقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ بمعنی آسمان و زمین کو پیدا کرنے اور بنانے کے مفہوم میں اُس وقت کا واقعہ ہے جبکہ وقت بھی نہیں تھا اور انسانوں سے غیب تھا اور غیب وہ چیز ہے جس کا ادراک عقل سے ہو سکتا ہے نہ حواس سے جبکہ آیت کریمہ دلیل توحید کے قبل سے ہونے کی بناء پر مُدْرَك بالعقل والحواس ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ غیب ہو۔ ایسے میں آیت کریمہ ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ کا ترجمہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں کرنا درست ہو سکتا ہے نہ پیدا کرنے میں کرنا کیوں کہ یہ نفس مصدر اور مقولہ فعل سے ہونے کی بناء پر اُس وقت کے ساتھ خاص ہوتا ہے جس میں واقع ہوا ہے جبکہ آیت کریمہ کا تعلق وقت نزول سے لے کر قیامت تک وجود میں آنے والے انسانوں کے ساتھ ہے ایسے میں آیت کریمہ کا ترجمہ ”آسمانوں اور زمین کے بنانے اور پیدا کرنے“ کے ساتھ کرنے کو کسی صورت بھی جائز نہیں کہا جاسکتا، متن کے مطابق اور معیاری ترجمہ نہیں کہا جاسکتا بخلاف حاصل بالمصدر معلوم یا حاصل بالمصدر مجہول کے اس لیے کہ یہ فاعل کے ساتھ یا مفعول بہ کے ساتھ قائم ہونے کی وجہ سے سرلیح الزوال نہیں ہوتا بلکہ حاصل بالمصدر مجہول مفعول بہ کی صفت اور اُس کے ساتھ قائم ہونے کی بناء پر اُس کی تادیر بقاء کے مطابق باقی رہ سکتا ہے پیش نظر آیت کریمہ یعنی ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ (۱) میں لفظ ”خلق“ کا یہی حال ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش والی صفت حاصل بالمصدر مجہول کی شکل میں ان کے ساتھ ایسی قائم ہے کہ جب تک وہ موجود ہیں یہ بھی موجود ہے۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ ہے کہ ہر دور تاریخ کا انسان ان کی پیدائش کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے یعنی ان کی مخلوقیت و موجودیت اور ان کو وجود میں لائے جانے کے بعد انہیں حاصل ہونیوالی وہ کیفیت تسخیر جو ان کا اپنے خالق و مالک کی طرف محتاج اور اُس کے حکم کے تابع و مسخر ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ کسی بھی وقت انسان اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور کر رہا ہے۔ الغرض آیت کریمہ میں لفظ ”خلق“ حاصل بالمصدر المجہول کے معنی میں ہی متعین ہے۔ جس کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری

(۱) البقرة: 164۔

أصول ترجمہ

ترجمہ (بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، بالیقین آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اردو محاورہ کے مطابق پیدائش، بناوٹ اور ساخت جیسے الفاظ مصدر مجہول کے انداز پر ہوتے ہیں جو علمی زبان میں مقولہ کیف کے قبیل سے کہلاتے ہیں اور قابل ادراک و محسوس ہوتے ہیں جس وجہ سے ان کا آیت کریمہ کے مصدر بمعنی حاصل بالمصدر المجہول کے متبادل اور اس کا قائم مقام ہونا درست ہونے کے ساتھ مقصد نزول کے بھی مطابق ہے۔

⑧ ترجمہ کی صحت کے لیے آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کی تمیز کے سلسلہ دراز میں یہ بھی ہے کہ آیت کریمہ کا کوئی لفظ اسم جنس کے قبیل سے ہو جو کبھی مذکر کے لیے، کبھی مونث کے لیے اور مفرد کبھی جمع کے لیے استعمال ہو سکتا ہے یعنی سب کے لیے استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ایسے تمام مواقع پر مترجم کو پوری طرح بصیرت حاصل ہونا ضروری ہے کہ یہاں پر کس انداز سے استعمال ہوا ہے ورنہ مذکر کے لیے استعمال ہونے والے مقام کا ترجمہ مونث میں یا اس سے برعکس اور مفرد کے لیے استعمال ہونے والے مقام کا ترجمہ جمع میں یا اس سے برعکس کرنے کی غلطی ہو سکتی ہے جس کی مثالوں کے لیے مشتمل نمونہ از خروارے پیش نظر آیت کریمہ کے تیسرے حصہ (وَالْفُلُكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ) (۱) کے درج ذیل تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے (اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں تیرتی ہیں، اور کشتیوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر چلتی ہیں، اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب لے کر، اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں لے کر جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو، اور کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں چلتی ہیں، اور کشتیوں اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں، اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں (یعنی مال تجارت) سمندر میں لے کر چلتے ہیں، کشتیوں کا لوگوں کو نفع

(۱) البقرة: 164۔

أصول ترجمہ

دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا، اور کشتیاں جو دریاؤں میں لیے چلتی ہیں اُس کو جو لوگوں کو نفع دے، اور جہازوں (اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزیں اٹھا کر چلتی ہیں، اور اُن کشتیوں میں جو دریا میں وہ سامان لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے، اور کشتیوں میں جو کہ چلتی ہیں سمندر میں سامان لے کر جو کہ نفع دیتا ہے لوگوں کو، اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں لے کر چلتے ہیں، اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے مفید اشیاء لیے سمندروں میں چلتی ہیں، اور کشتیوں میں وہ جو چلتی ہیں سمندر میں ساتھ اُن چیزوں کے جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو، اور کشتیوں (جہازوں) میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں مال تجارت وغیرہ دریا میں لے کر چلتے ہیں، اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں یعنی مال تجارت سمندر میں لے کر چلتی ہیں، اور اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں میں چلتی ہیں) یہ تراجم بالترتیب ان مشاہیر کے کیے ہوئے ہیں مفتی تقی عثمانی، مفتی عزیر احمد بدایونی، مولانا محمود الحسن، اشرف علی تھانوی، عاشق الہی میرٹھی، علامہ وحید الزمان، فتح محمد جالندھری، عبدالماجد دریا آبادی، مفتی مظہر اللہ دہلوی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا سید محمد کچھو چھو، ڈاکٹر طاہر القادری، مولانا مفتی غلام سرور القادری، مولانا نعمت اللہ چشتی نظامی، مولانا عبدالحق دہلوی، مولانا عبدالرحمن کیا نوئی، حافظ صلاح الدین یوسف وشرکاء، سید فرمان علی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، غزالی زمان سید احمد سعید کاظمی جن میں سے بعض نے آیت کریمہ کے لفظ (الفلك) کے ترجمہ کے لیے لفظ (کشتیاں، کشتیوں) جیسے جمع کے الفاظ استعمال کیے ہیں جسے ایک غلطی کہا جاسکتا ہے کہ مفرد مونث کا ترجمہ جمع مونث میں کیا ہے جبکہ بعض نے (جہازوں) کہہ کر دو غلطیاں کی ہیں جو مفرد مونث کا ترجمہ اُس کی ضد یعنی جمع مذکر کی صورت میں ہے جبکہ آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ (اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے کر چلتی ہے، اور کشتی جو دریا میں وہ کچھ لے کر چلتی ہے جو لوگوں کو نفع دے) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو آیت کریمہ کی نہ صرف نحوی حیثیت بلکہ جملہ حیثیات کے مطابق ہونے کے ساتھ مقصد نزول کے بھی مطابق ہے اور ترجمہ القرآن کی تعریف پر بھی منطبق ہے کہ وہ قرآن

أصول ترجمہ

شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں۔ (۱)

جبکہ یہاں پر آیت کریمہ میں لفظ (الفلك) کا مفرد مونث میں استعمال ہونا امر یقینی ہے کیوں کہ اُس کے بعد صفت کے طور پر اسم موصول وصلہ (التي تجري) مفرد مونث ہیں جس میں مذکر کا تصور ہو سکتا ہے نہ جمع کا۔ ایسے میں کثیر تعداد میں مترجمین کے مذکورہ انداز کو آیت کریمہ کے مطابق کون کہہ سکتا ہے ہاں اُن حضرات کی بات ہی اور ہے جنہیں ترجمۃ القرآن کی حقیقت کا ادراک ہے نہ اُس کی تعریف کا، اُس کی شرائط کا احاطہ ہے نہ احتیاطی تقاضوں کا، اُن کے سامنے ترجمۃ القرآن کے نام سے جو کچھ بھی آتا ہے اُسے معنوی قرآن کہتے جاتے ہیں جو اُن کی ذہنی پسماندگی اور بے بضاعتی کا نتیجہ ہے قرآن شریف کے غلط تراجم مروج ہونے کے المیہ میں ایسے حضرات کو بڑا دخل ہے ورنہ ترجمہ پڑھنے والوں میں اگر 10% بھی اہل شعور ہوتے تو ایسا المیہ کبھی نہ ہوتا مترجمین نے یہاں پر صرف اسی ایک جگہ غلطی نہیں کی بلکہ اس کے بعد آیت کریمہ کے لفظ (فی البحر) کے ترجمہ میں بھی اسم جنس (بحر) کا ترجمہ جمع میں کرنے کی غلطی کی ہے جیسا سید احمد سعید الکاظمی، مفتی تقی عثمانی اور صلاح الدین یوسف و معاونین کے ترجموں میں ہوا ہے۔ اور اس کے بعد آیت کریمہ کے آخری حصہ "والسحاب المسخر بين السماء والارض" میں مذکور اسم جنس (سحاب) کے ترجمہ میں بھی کچھ مترجمین نے یہی روش اختیار کی ہے جیسا اشرف علی تھانوی کے ترجمہ میں ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات اگر ترجمۃ القرآن کی تعریف کو پیش نظر رکھتے تب بھی ایسی غلطی کبھی نہ کرتے اسی طرح آیت کریمہ کے سیاق و سباق پر نظر رکھتے پھر بھی ایسا نہ کرتے لیکن سب سے آنکھیں پھیر کر وہ کچھ لکھ دیا جسے آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔ ایسے میں اسم جنس کے مواقع استعمال کی تمیز کو ترجمہ کی صحت کے لیے شرط کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

⑨ ترجمہ کی صحت کے لیے آیت کریمہ کی نحوی حیثیات کی تمیز کے سلسلہ میں واو عاطفہ، واو استینافیہ

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 1، ص: 111، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

اور واو حالیہ کے مابین تمیز بھی ضروری ہے کیوں کہ ان سے مقاصد جدا ہیں اور ان کی حقیقتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں جس کے مطابق واو عاطفہ سے مقصد اُس کے ماقبل و مابعد کو ایک حکم کے ماتحت بتانا ہوتا ہے۔ نیز دونوں کے اعراب بھی ایک جیسے ہوتے ہیں جس وجہ سے انہیں آپس میں تابع و متبوع اور معطوف و معطوف علیہ کہا جاتا ہے جبکہ واو استینافیہ سے مقصد مستقل کلام ہوتا ہے کہ جس جملہ پر بھی داخل ہوتا ہے وہ اپنے ماقبل و مابعد سے جدا ہوتا ہے جس وجہ سے اسے جملہ معترضہ بھی کہتے ہیں اور اس واو کو واو استینافیہ کہنے کی طرح واو اعتراضیہ بھی کہا جاتا ہے جبکہ اس جملہ کا ماقبل کے اعراب اور اُس کے حکم سے کسی قسم کا بھی اعرابی ربط نہیں ہوتا جس وجہ سے اس کے متعلق ”لا محل لہا من الا لاعراب“ کہا جاتا ہے اور واو حالیہ سے مقصد اُس سے ماقبل جملہ میں موجود کسی ذوالحال کی ہیئت کذائیہ بتانا ہوتا ہے اور اس کے مابعد مذکور ہونے والا جملہ حالیہ کہلاتا ہے اور محل نصب میں ہوتا ہے یعنی منصوب ہونے کے سوا کسی اور اعراب کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ گویا حقیقت اور مقاصد کے حوالہ سے یہ تینوں ایک دوسرے کی ضد ہیں جس وجہ سے ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوتا ورنہ کلام بلاغت کے دائرہ سے نکل جائے گا تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کو جائز کون کہہ سکے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے مشاہیر نے اس سے غفلت برتی ہے جس کی مثالوں کے لیے مشتے نمونہ از خروارے سورۃ الصف شریف کی آیت نمبر 5 کے حصے ”وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ لِمَ تُوذُّونَنِي وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ“ کا مولانا محمود الحسن کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے (اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا بھیجا آیا ہوں تمہارے پاس) جسے اصل کے مطابق اور معیاری نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ آیت کریمہ کے حصہ (وَإِذْ تَعْلَمُونَ) پر آئی ہوئی واو عاطفہ نہیں بلکہ حالیہ ہے جس میں نجات کے دو رائے ہیں نہ بلغاء کی اور مفسرین کا اختلاف ہے نہ اہل لغت کا تو پھر اُس کا معیاری ترجمہ (جبکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا بھیجا آیا ہوں تمہارے پاس، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں بالیقین اللہ کا رسول

أصول ترجمہ

ہوں تمہاری طرف) جیسے کسی بھی انداز میں کرنے کے بجائے لفظ (اور) کہہ کر واوِ عاطفہ کے انداز میں کرنے کا کیا جواز ہے ظاہر ہے کہ اس غلطی کا پس منظر ترجمہ کی صحت کے لیے مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے بطور دانے از انبارے دوسری مثال ”فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ“ (۱) جس میں شرط و جزا کے مابین یعنی (فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا) اور (فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ) کے مابین مذکور فعل یعنی (وَلَنْ تَفْعَلُوا) جملہ استینافیہ ہے جس پر آئی ہوئی واوِ عاطفہ نہیں بلکہ واوِ استینافیہ ہے جس میں کسی حوالہ سے بھی دورائے نہیں ہیں جس کے مطابق آیت کریمہ کا با مقصد اور معیاری ترجمہ (پھر اگر نہ لاسکو ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، پھر اگر نہ کر سکیں ہم بتائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو واوِ استینافیہ سے مقصد کو ظاہر کرنے کے ساتھ واوِ عاطفہ کے اشتباہ سے بھی محفوظ ہے اور ترجمہ کی تعریف پر منطبق ہونے کے ساتھ جملہ شرائط کے بھی مطابق ہے۔ لیکن اس کی توفیق اُن ہی کو نصیب ہو سکتی ہے جو شرائط کا احساس رکھتے ہیں اور ترجمہ القرآن کے احتیاطی تقاضوں کی پابندی کرتے ہیں ورنہ ایسا ہی ظلم ہوگا جیسا عام تراجم کی شکل میں ملتا ہے۔ (اعاذنا اللہ منہ)

ایک اشتباہ کا ازالہ:- یہاں پر ممکن ہے کسی کے دل میں یہ تصور پیدا ہو جائے کہ ترجمہ کے اس انداز کو ترجمہ القرآن کی تعریف پر منطبق کیونکر کہا جائے جبکہ اس میں مذکور الفاظ (ہم اعلان کرتے ہیں، اور ہم بتائے دیتے ہیں) متن کے کسی لفظ کے عوض نہیں ہیں جبکہ ترجمہ کے ہر لفظ کا متن کے کسی لفظ عوض ہونا ضروری ہے کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہے کہ وہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں جیسا ”اببدال لفظة بلفظة تقوم

أصول ترجمہ

مقامہا“ (۱) یہاں پر آیت کریمہ میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے کہ ترجمہ کے ان اضافی الفاظ کو اُن کا عوض کہنا درست ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ مُعَوَّض عنہ ہونے کی حیثیت سے دو قسم ہیں: پہلی قسم: جو حقیقتاً مذکور ہوں، دوسری قسم: جو حکماً مذکور ہوں۔

جس میں مذکور التزامی، مذکور اقتضائی، دلالت النص، اشارۃ النص اور بیان ضرورت جیسے تمام امور شامل ہیں پیش نظر آیت کریمہ اور اس کے معیاری ترجمہ میں بھی ایسا ہی ہے کہ بادی النظر میں جس لفظ کو متن سے اضافہ اور بلا عوض تصور کیا جا رہا ہے۔ حقیقت میں وہ مذکور التزامی ہے کیوں کہ واو استینافیہ کے تصور کو اس کا تصور لازم ہے نہ صرف اتنا بلکہ ملزوم کے طور پر واو استینافیہ کے وجود کو اس کا وجود بھی لازم ہے فرق صرف وجود حقیقی اور وجود حکمی کا ہے جیسا مذکور التزامی کہنے سے آپ ہی پہچانا جاتا ہے۔

یہی صورت واو حالیہ کے ترجمہ کی بھی ہے کہ اُس کے تصور کو بھی حال کا تصور لازم ہے جبکہ عطف اور اُس کے لوازمات اور احکام کا تصور واو استینافیہ میں ہے نہ واو حالیہ میں۔ حقائق کی اس روشنی میں واو کی صورت میں استعمال ہونے والے ان تینوں متضاد حقائق کی تمیز کو ترجمہ کی صحت کے لیے شرط قرار دیئے بغیر کون رہ سکتا ہے ورنہ ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کی غلطی ہو سکتی ہے جس کی مثال کے لیے مشتے نمونہ از خروارے مفتی تقی عثمانی کے اس ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے (پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کر سکو، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکو گے تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے) جس میں واو استینافیہ کا ترجمہ اُس کے لازم میں کرنے کے بجائے واو عاطفہ میں کیا گیا ہے جو قابل معافی نہیں ہے ترجمہ کی حد سے نکلنے اور غلط قرار پانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا جتنا اردو مترجمین کی غالب اکثریت نے کیا ہے لیکن مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۱، ص: ۱۱۱، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

واو استینافیه کے مابعد جملہ مستانفہ معترضہ کو ماقبل والے جملہ شرطیہ پر معطوف ظاہر کرنے کے لیے
اُردو رسم الخط کے مطابق عطفیہ (،) بھی لگا دیا۔ (فیاللعجب لهذا العجب)

ضروری وضاحت:- قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم اور فنون خادمہ والی شرط کے
سلسلہ دراز میں علم نحو کے تحت جن اصولوں کو ہم نے یہاں پر ذکر کیا، اس سے ہمارا مقصد اہل علم
کو اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ اس فن کے کسی بھی لسانی اصول و ضابطہ سے غفلت پر مشتمل ترجمہ
درست نہیں ہو سکتا بلکہ ترجمۃ القرآن کے معیاری ہونے کے لیے اس کی پابندی ایسی ضروری ہے
جیسا انسانی بدن کے لیے ریڑھ کی ہڈی۔ نیز ان میں نحاۃ کی دورائے ہیں نہ بلغاء کی بلکہ سب کے
مابین متفقہ ہیں جبکہ رائج و مرجوح اور رائج و رائج اور فصیح و فصیح کے حوالہ سے اختلافی اصولوں کی کوئی
حد ہے نہ نہایت اور ترجمۃ القرآن کسی نحوی یا کسی بلاغی کی شخصی یا انفرادی رائے پر نہیں بلکہ جمہور اہل
فن کے نزدیک متعارف اصولوں پر مبنی ہوتا ہے اس لیے ہم نے ان ہی پر اکتفا کیا ورنہ علم نحو کے ہر
اصول اور ہر پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جیسا حضرت فضیل ابن عیاض (نور اللہ مرقدہ
الشریف) نے فرمایا: ”لن تعلموا القرآن حتی تعرفوا اعرابه“ (۱)

مخصوص شرائط کا اجمال:-

- ❶ **فن ترجمہ کے فطری اصولوں کو پیش نظر رکھنا** ورنہ کسی ایک اصول و ضابطہ سے خلاف
ہونے والا ترجمہ بھی قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔
- ❷ **ترجمہ کی عمومی شرائط کو پیش نظر رکھنا** ورنہ کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی
قرآن شریف کا درست ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔
- ❸ **آیت کریمہ کی ترتیب ملحوظ خاطر رکھنا** کہ بغیر کسی ناگزیر ضرورت داعیہ یا جس زبان میں

(۱) مقدمہ تفسیر فتح القدیر لمحمد ابن علی الشوکانی الصنعانی المتوفی 1250ھ،

أصول ترجمہ

ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی تنگی دامن کے بغیر ترجمہ کو اصل کی ترتیب کے خلاف کرنا جائز نہیں ہو سکتا ورنہ بلاغت کے حوالہ سے آیت کریمہ کے معنوی حسن اور ترتیب سے متعلقہ مقاصد کا اظہار ترجمہ میں ممکن نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ آیات قرآنیہ کی ترتیب میں فصاحت و بلاغت کو سب سے بڑا دخل ہے۔ جب آیت کریمہ کی ترتیب سے خلاف کی جانے والی تفسیر بھی معیاری نہیں ہوتی تو پھر متن کی ترتیب سے خلاف ترجمہ کے معیاری ہونے کا تصور ہی نہیں رہتا کیوں کہ تفسیر کے مقابلہ میں ترجمہ کا معاملہ زیادہ مشکل اور زیادہ قابل احتیاط ہوتا ہے اصول تفسیر میں ترتیب متن کی مطابقت کو ضروری قرار دیا گیا ہے جیسا الاتقان فی علوم القرآن کے الفاظ ”وَمِرَاعَاةُ التَّالِيفِ“ (۱) سے واضح ہے۔

اس شرط کی خلاف ورزی کرنے کی مثالوں میں ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے“ جس میں متن کی ترتیب سے خلاف کر کے لفظ ”اسم“ یعنی اسم اللہ کے مفہوم کو آخر میں رکھا گیا ہے جو کئی وجوہ سے غلط، خلاف الاصل اور متن کی بلاغی حیثیت کے منافی ہے جو کسی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کی بلاغی حیثیت کے ساتھ اُس کے عرفانی اور واقعی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کی اس بے ڈھنگی صورت کا جائزہ لے۔

۲ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون کو ملحوظ خاطر رکھنا کہ اُن میں سے کسی کے اصول و ضوابط سے برعکس نہ ہو ورنہ آیت کریمہ کا حقیقی مفہوم اور اُس کا مقصد نؤول دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس شرط کے مندرجہ ذیل حصے ہیں؛

(i) آیت کریمہ کی صرفی حیثیت کو ملحوظ رکھنا یعنی متن اگر اسم ہو ترجمہ بھی اسم کے انداز میں کیا جائے ورنہ فعل کا ترجمہ اسم میں اور اسم کا ترجمہ فعل میں کرنے سے اصل کا مفہوم بدل سکتا ہے۔

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۱۸۵، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

اسی طرح مفرد متن کا ترجمہ مفرد میں اور تثنیہ یا جمع والے متن کا ترجمہ تثنیہ و جمع کے انداز میں کیا جائے۔ مذکر کا ترجمہ مذکر میں اور مؤنث کا ترجمہ مؤنث میں، فعل معلوم کا معلوم کے انداز میں اور مجہول کا ترجمہ بھی مجہول کے انداز میں کیا جائے ورنہ برعکس ہونے کی صورت میں ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے واضح مجبوری اور تنگی دامن کا عارضہ ہو یا کوئی بلاغی یا محاورتی عارضہ کا غلبہ ہو لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جیسا تفسیر اتقان کے الفاظ ”قَالَ الْعُلَمَاءُ يَجِبُ عَلَى الْمُفَسِّرِ أَنْ يَتَحَرَّى فِي التَّفْسِيرِ مُطَابَقَةَ الْمُفَسَّرِ“ سے واضح ہے۔ (۱)

اس کی خلاف ورزی کی مثال سمجھنے کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۷ ”وَتَرَكَّهُمْ فِي ظُلُمٍ لَا يَبْصُرُونَ“ کے کیے گئے تراجم کے اس نمونہ کو دیکھا جاسکتا ہے ”اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے“ جس میں متن کے لفظ مؤنث ”ظُلُمٍ“ جو ”ظلمۃ“ کی جمع اور مؤنث ہے کے ترجمہ میں ”اندھیروں میں“ کہنے کے بجائے اندھیروں میں کہہ کر متن کی لسانی حیثیت کے خلاف کیا گیا ہے جس میں مترجمین کی غالب اکثریت مبتلا ہے۔

اسی طرح سورۃ البقرہ، آیت نمبر 30 ”إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً“ کا کیا گیا یہ ترجمہ ”ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب“ جس میں ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کے اسم فاعل لفظ ”جَاعِلٌ“ کا ترجمہ مستقبل میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے جس کا منشاء شاید یہ ہو کہ مترجم نے اسم فاعل کو یہاں پر عامل بنانے کی غرض سے اس کے مفہوم کو مستقبل کی طرف موڑا ہو حالانکہ صفت الہی ہونے کے ناطے یہاں پر اس قیاس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ پر نظر ہو۔

(ii) آیت کریمہ کی نحوی حیثیت ملحوظ خاطر رکھنا یعنی مرکب تام اور جملہ کا ترجمہ بھی جملہ میں اور

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 185، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

مفرد کا ترجمہ بھی مفرد میں، اسم موصول متن کا ترجمہ بھی موصول کے انداز پر اور اسم موصوف کا ترجمہ بھی موصوف کے انداز پر، علیٰ ہذا القیاس ترجمہ کا آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ غلط ہوگا۔ (۱)

اس کی خلاف ورزی پر مشتمل غلط تراجم کی سینکڑوں مثالوں میں سے درج ذیل کو دیکھا جاسکتا ہے جو سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ“ کے ترجمہ میں کیا گیا ہے ”سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے ۝ نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے ۝ روز جزا کا مالک ہے“ یہ ترجمہ محض اس وجہ سے غلط ہے کہ آیت کریمہ کی نحوی حیثیت سے خلاف ہے کیونکہ نحوی اصولوں کے مطابق متن کی ان تینوں آیات کا مجموعہ صرف ایک جملہ ہے اس تفصیل کے ساتھ کہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ“ میں مذکور اسم جلالت موصوف ہے جس کے بعد چاروں الفاظ بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور موصوف اپنی ان چاروں صفات کے ساتھ مل کر مجرور ہے حرف جار ”لِ“ کے لیے جبکہ جار اپنے مجرور سے مل کر باعتبار متعلق خبر ہے ”الْحَمْدُ“ کے لیے اور مبتداء و خبر مل کر جملہ اسمیہ لفظاً اور انشائیہ معنا قرار پاتا ہے جس میں نجات کی دورائے ہیں نہ مفسرین کی۔ اس کے مطابق درست ترجمہ یوں ہو سکتا ہے ”سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو مالک سارے جہاں والوں کا ۝ بہت مہربان رحمت والا ۝ روز جزا کا مالک“ جس سے بے اعتنائی کرتے ہوئے مترجمین نے ”رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ، رَحِيمٌ ۝ مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ“ جیسے اوصاف مفردہ کا ترجمہ بھی جملہ میں کر دیا جسے سننے کے لیے سیبویہ تیار ہے نہ عبدالرحمن جامی، امام تفتازانی اسے گوارا کرتا ہے نہ عبدالقادر جرجانی۔

(iii) آیت کریمہ میں واقع الفاظ کی اشتقاقی حیثیت کو پیش نظر رکھنا ورنہ ترجمہ کا اصل کے

(۱) (i) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 185، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ

(ii) مقلّمہ روح المعانی المطبوعہ مع الجلد: 1، ص: 5، مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت۔

أصول ترجمہ

مطابق ہونے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ جس کی مثال کے لیے سورۃ النمل، آیت نمبر ۲۸ ”فَانْظُرْ مَا ذَايُرْجِعُونَ“ کا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”پھر دیکھ وہ کس بات کی طرف رجوع کرتے ہیں“ جسے اس مفروضے پر بنا کیا گیا ہے کہ یہاں پر متن کے لفظ ”یرجعون“ ”رجوع“ سے مشتق ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ قرآن شریف میں اس مادہ سے یعنی (ر، ج، ع) سے بنے ہوئے جتنے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اُن میں سے بعض رجوع سے بنے ہیں اور بعض رَجْع سے بنے ہیں جبکہ رجوع کے دو مفہوم ہیں؛

اول:- جس شخص یا جس جگہ یا سمت سے آگے بڑھا ہے دوبارہ اُسی کی طرف لوٹنا۔

دوم:- کسی قول و فعل اور کردار سے لوٹنا یعنی اُسے ترک کیا جائے۔

اسی طرح لفظ ”رجع“ کے بھی دو مفہوم ہیں:

اول: کسی کی بات کا جواب دینا۔ دوم: إعادہ ہونا یا إعادہ کرنا۔

قرآن شریف کے متعدد مقامات پر استعمال ہونے والے ان الفاظ سے مرادی مفہوم کو متعین سمجھنے کے لیے کلام کے سیاق و سباق پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے جس کے بغیر ایک کی جگہ دوسرے مفہوم کا مغالطہ ہو سکتا ہے، جیسا یہاں پر مترجمین کو ہوا ہے۔ آیت کریمہ ”فَانْظُرْ مَا ذَا يَرْجِعُونَ“ (۱) میں سیاق و سباق کا تقاضا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ یہاں پر لفظ ”یرجعون“ رجوع سے نہیں بلکہ رَجْع سے مشتق ہے اور جواب دینے کے مفہوم میں متعین ہے۔ جمہور مفسرین کا موقف بھی یہی ہے جس میں بلغاء اور نحاة کی دورائے ہیں نہ مفسرین کی، اہل لغت کی نہ بلغاء کی۔ (۲)

(iv) آیت کریمہ کی نفس لغت جسے علمی زبان میں متن لغت کہا جاتا ہے کو پیش نظر رکھنا کہ

(۱) النمل: 28۔

(۲) مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی، مادہ (ر، ج، ع)۔

أصول ترجمہ

ترجمہ کے الفاظ اُس کے مفہوم سے مختلف نہ ہوں ورنہ ترجمہ غلط ہوگا۔ جس کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۴۶ ”الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ وَإِنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ کا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں“ جس میں متن کے لفظ ”ظن“ کا ترجمہ ”خیال“ میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے حالانکہ ان کی حقیقتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ ظن تصدیقات کے قبیل سے ہے جبکہ خیال تصور کی قسم ہے جس وجہ سے ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوتا جب ایک کی جگہ دوسرے کا استعمال جائز نہیں ہے تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کیوں کر جائز ہوگا۔ (۱)

(۷) علمِ بلاغت کے اصولوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا تاکہ ترجمہ آیت کریمہ کی بلاغی حیثیت کے مطابق ہو سکے ورنہ غلط ہوگا اس کی مثال بھی نمبر ۴ کی مذکورہ مثالوں میں دیکھی جاسکتی ہے جس میں علم المعانی کے مطابق حصر والی آیت ”وَإِنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ کا ترجمہ بغیر حصر کے سادہ انداز میں کیا گیا ہے جسے اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا۔ اسی فلسفہ کی بنا پر علمِ بلاغت کی دونوں قسموں یعنی علم المعانی اور علم البیان میں مہارت کے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ و تفسیر کرنے کو ہلاکت کہا گیا ہے۔ (۲)

(۷) اسلامی عقائد یعنی علم کلام کے حوالہ سے مسلمات اسلامیہ کو پیش نظر رکھنا ورنہ ترجمہ اصل کے مطابق اور معیاری کہلانے کے قابل نہیں ہوگا اس کی خلاف ورزیوں کی مثالیں سمجھنے کے لیے مشتمل نمونہ از خروارے سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۲ کے لفظ ”الْحَي“ کے اس ترجمہ ”وہ

(۱) (i) مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی، مادہ (ظ، ن،)۔

(ii) تفسیر روح المعانی، ج: ۱، ص: ۲۴۹، تحت الایت نمبر ۴۶، سورۃ البقرہ۔

(۲) مفتاح العلوم للسکاکی، ص: ۷۰، مطبوعہ بیدار قم تحت بحث علم المعانی والبیان۔

أصول ترجمہ

ہمیشہ زندہ“ کو دیکھا جاسکتا ہے جو علم کلام میں صفاتِ باری تعالیٰ کی قسمیں اور ہر قسم کی جدا جدا حقیقت اور مختلف احکام جو بیان ہوئے ہیں اُن سے خلاف ہے تو پھر متن کے مطابق کیوں کہلائے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت نہ صرف صفتِ مشبہ ہے اور ذاتِ الہی کو لازم ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی اُن قسموں میں بھی شامل ہے جن کو صفتِ حقیقیہ محضہ کہا جاتا ہے جن کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور چیز کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا جس سے بے اعتنائی کرتے ہوئے مترجمین نے یہاں پر تصویر کے صرف ایک رُخ کو پیش نظر رکھا کہ یہ صفتِ مشبہ ہے اور ذاتِ الہی کو لازم ہے اُس کی ذات ہمیشہ قائم و دائم ہونے کی طرح یہ بھی ہمیشہ قائم و دائم ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے کی نوعیت کو نہیں دیکھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حقیقیہ محضہ کے قبیل سے ہے جس میں کسی غیر کی طرف اضافت بھی معتبر نہیں ہوتی چہ جائیکہ ہمیشگی کو اُس کا جزو بنانا جائز ہو کیونکہ ہمیشگی جس کی بھی ہو زمانہ کی ہی صفت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے غیر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ حقیقیہ محضہ ہونے کی اس حقیقت کے مطابق ترجمہ ”آپ زندہ، اپنے آپ زندہ، خود زندہ، از خود زندہ“ جیسے کسی بھی بے غبار انداز میں کرنا ممکن ہے تو پھر اُسے چھوڑ کر ترجمہ کو تصویر کے ایک رُخ پر پنا کرنے کا کیا جواز ہے۔ جو علم کلام سے غفلت کا نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لیے اسلاف نے ترجمہ و تفسیر کے لیے علم العقائد و الکلام کو ضروری شرط قرار دیا ہے۔ (۱)

(vii) آیت کریمہ جس فن کے زاویہ علم سے متعلق ہو اُس کے متعلق مترجم میں شعور ہونا ضروری ہے ورنہ ترجمہ نہ صرف غلط ہوگا بلکہ اغیار کے لیے موردِ الزام بھی بن سکتا ہے جس کی مثالیں سمجھنے کے لیے سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۲ ”تُولِجُ اللَّيْلُ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارُ فِي اللَّيْلِ“ کے کیے گئے تراجم کا یہ نمونہ دیکھا جاسکتا ہے ”تورات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن

(۱) (i) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۱۸۱، مطبوعہ قاہرہ مصر۔

(ii) مقدمہ تفسیر البحر المحیط، المطبوعہ الجلد الاول، ص: ۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

أصول ترجمہ

کورات میں داخل کرتا ہے“ جو لسانِ قرآنی کے محاورہ کے مطابق تو درست ہے جبکہ اُردو محاورہ میں ایسا نہیں ہے بلکہ ترجمہ میں اس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے جو آسانی سے ہو سکتا ہے تاکہ یہ تصور ہی پیدا نہ ہونے پائے کہ رات کو دن میں داخل کرنا ممکن ہے نہ دن کو رات میں داخل کرنا کیوں کہ یہ آپس میں ضدین ہیں اور ضدین کا جمع ہونا معتاد حالات میں محال ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ شمسی کی سلامتی میں سورج کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ سکے اور نہ رات دن پر سبقت کر سکے۔

ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے جس کے بغیر ترجمہ کا معیاری ہونا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ترجمہ کی حقیقت ”ابْدَال لَفْظَةٍ بِلَفْظَةٍ تَقُومُ مَقَامَهَا“ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یعنی متن کے لفظ کو ترجمہ والی زبان کے لفظ کے ساتھ بدلنا جو اصل کے قائم مقام ہو سکے۔ (۲)

حقیقت کا اظہار:- یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یورپ و امریکہ کے مستشرقین کی طرف سے یا کسی بھی دشمنِ اسلام کی طرف سے ان تراجم کو سامنے رکھ کے قرآن شریف کے ناقابلِ عمل کتاب ہونے اور اسلام کے ناقابلِ عمل مذہب ہونے کا اعتراض اٹھایا جائے کہ مسلمانوں کی کتاب پوری دنیا کے مشاہدہ کے خلاف پر مشتمل ہے چنانچہ اسے تسلیم کرنے کے لیے کوئی شخص تیار نہیں ہے ان حالات میں اس کا جواب ان مترجمین سے ہو سکتا ہے نہ ان کے پڑھنے والوں سے بلکہ ایسے تراجم کے سبب مسلمانوں کو شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا جس کے واحد ذمہ دار یہ مترجمین ہیں۔

حقیقت کی اس روشنی میں علماء حق پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ایسے غیر محتاط اور غیر معیاری تراجم

(۱) یس: 40۔

(۲) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 111، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

اصول ترجمہ

کی نشان دہی کر کے ان کی ذمہ داری اٹھانے سے دستبردار ہو جائیں اور قرآن شریف کے ترجمہ کے حوالہ سے درست ریکارڈ کی تبلیغ کریں اور یاد رکھیں کہ اس حوالہ سے معیاری اور غیر معیاری کی تمیز اگر نہ بتائی جائے تو پھر آگے چل کر کسی وقت بھی اغیار کی طرف سے اعتراضات کے دروازے کھولے جاسکتے ہیں، جس کا نتیجہ اسلام کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

(viii) عظمتِ شانِ الہی، آدابِ نبوی اور شعائرِ اللہ کے مراتب کو ملحوظ خاطر رکھنا جو تہذیبِ الکلام کے تحت درج ہونے کے ساتھ الہیات میں بھی نہایت اہم چیز ہے بصورتِ دیگر ثواب کے بجائے گناہ ہونے کے ساتھ ترجمہ بھی غلط ہو سکتا ہے جن کی مثالوں کے لیے بالترتیب سورۃ آل عمران، آیت ۱۴۲، اور سورۃ الضحیٰ، آیت ۷، ۸ کے کیے گئے تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے ("ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جوڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا ثابت قدم رہنے والوں کو"، "اور پایا تجھ کو بھٹکتا ہوا پھر راہ سمجھائی"، "اور اللہ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار بنادیا") ظاہر ہے کہ کسی بھی حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف بے علمی کی نسبت کرنا سوادب ہونے کے ساتھ خلاف واقعہ بھی ہے۔ اسی طرح پیغمبر اکرم رحمتِ عالم ﷺ کی طرف بھٹکنے اور نادار و مفلس ہونے جیسی کمزوریاں منسوب کرنا بھی سوادب سے خالی نہیں ہے۔ یہی حال ان تراجم کا بھی ہے جن میں اس ناگزیر شرط سے بے توجہی کرتے ہوئے اللہ کی تعظیم و آداب کو انسانوں کی تعظیم و آداب پر قیاس کر کے اُس وحدہ لا شریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یا انسانوں کے باہمی گفتگو کرنے کے انداز پر اُس وحدہ لا شریک کو یاد کیا گیا ہے جن کی شرعی حیثیت بدعت فی الترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اس شرط کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے الاتقان فی علوم القرآن اور تفسیر روح المعانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ (۱)

(۱) (i) تفسیر الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۱۸۱۔

(ii) مقدمة التفسير الكاشف المطبوعه مع الجلد الاول، ص: ۹، مطبوعه دار العلم بیروت۔

(iii) مقدمه روح المعانی، ج: ۱، ص: ۶۔

أصول ترجمہ

(ix) آیت کریمہ کے ایجاز و اختصار لفظی کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کیوں کہ بے مصرف تطویل پر مشتمل ترجمہ اصل کے مطابق اور معیاری کہلانے کے قابل نہیں ہو سکتا، قرآن فہمی کے لیے ناگزیر علوم آلیہ کے زمرہ میں ایجاز کے نام سے یہ ایسا باریک و لطیف فن ہے کہ اصل معنی مقصودی سے ایک لفظ زیادہ کرنا بھی اس کے منافی ہے اگرچہ وہ معنی مقصودی کے متعلقات اور اس کے لوازمات و مناسبات میں شامل ہو تب بھی فن بلاغت اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو علم بلاغت کی کتابوں سے آشنائی رکھنے والے حضرات سے مخفی نہیں ہے، بلا ضرورت اصل معنی مرادی سے کسی جملہ کا اضافہ کرنا تو بڑی بات ہے فن بلاغت کے آئمہ اس حوالہ سے حروف کی بھی ذہنی پیمائش کرتے ہیں اور کسی ضرورت داعیہ کے بغیر ایک حرف زیادہ لانے کو بھی غیر مستحسن سمجھتے ہیں۔ جیسے مغنی اللیب عن کتب الاعاریب میں اس کے متعلق مستقل باب باندھ کر لکھا ہے:

”يُنْبَغِي لِلْمُعَرَّبِ أَنْ يَتَخَيَّرَ مِنَ الْعِبَارَاتِ أَوْ جَزَئِهَا وَاجْمَعَهَا لِلْمَعْنَى الْمُرَادِ فَيَقُولَ فِي نَحْوِ ضَرْبٍ، فَعَلَ مَا ضَرِبَ لَمْ يُسَمَّ فَاعِلُهُ وَلَا يَقُولَ مَبْنِيٌّ لِمَا لَمْ يُسَمَّ فَاعِلُهُ لَطُولِ ذَلِكَ“ (۱)

یہاں جس بات کو تطویل قرار دے کر اس سے بچنے کا کہا گیا ہے اور جس مختصر کلام کو اس پر ترجیح دی جا رہی ہے اُن کے مابین جملہ کا نہیں بلکہ تعداد حروف کے موازنہ کے حوالہ سے صرف ایک حرف کا فرق ہے۔ اس کے چند سطر بعد لکھا ہے:

”فِي الْوَاوِ، حَرْفٌ عَطْفٌ لِمَجْرَدِ الْجَمْعِ“ أَوْ ”لِمَطْلُوقِ الْجَمْعِ وَلَا يَقُولُ لِلْجَمْعِ الْمَطْلُوقِ“

یہاں بھی صرف ایک حرف کا فرق ہے۔ اسی طرح علم بلاغت کی باریکی و لطافت اور ضرورت و اہمیت کو واضح کرنے کے سلسلہ میں تلخیص المفتاح اور اس کی شروح مختصر المعانی و مطول میں بھی

(۱) مغنی اللیب عن کتب الاعاریب، ج: ۲، ص: ۷۴۰، مطبوعہ دار نشر الکتاب الاسلامیہ لاہور۔

أصول ترجمہ

ایجاز و اطناب و مساوات کی بحث میں کسی ضرورت داعیہ کے بغیر مقصود اصلی سے زیادہ الفاظ پر مشتمل ہونے والے کلام کو متکلم کی عاجزی اور اس کلام کی کمزوری اور ضعف کی دلیل قرار دیتے ہوئے متعدد مثالیں بیان کی ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا:

”لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ“ (۱)

من حیث البلاغت شاعر کے اس کلام سے موازنہ کر کے آیت کریمہ کو اعلیٰ اور اس کے ہم معنی اس شعر:

وَنُنَكِّرُ أَنْ شِئْنَا عَلَى النَّاسِ قَوْلَهُمْ وَلَا يُنَكِّرُونَ الْقَوْلَ حِينَ نَقُولُ

کو کمزور اور ضعیف اور ادنیٰ سمجھے جانے کی واحد وجہ اس کے الفاظ کے زیادہ ہونے کو قرار دیا گیا ہے جبکہ مفہوم دونوں کا ایک ہے کہ دونوں متکلم یعنی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اور شعر میں شاعر اپنی بالادستی ظاہر کرنے کے ساتھ دوسروں کی زبردستی اور اپنی طرف ان کی محتاجی کا اعلان کرنا چاہتا ہے جس پر اول کلام ”آیت کریمہ“ مختصر الفاظ کے ساتھ دلالت کر رہا ہے جبکہ دوسرے کلام ”مذکورہ شعر“ زیادہ الفاظ کے ساتھ دلالت کر رہا ہے۔ اسی طرح کا فیصلہ آئمہ بلاغت نے ایک ہی مضمون کے اظہار کے لیے کیے گئے مندرجہ ذیل دو شعروں سے متعلق کیا ہے:

يَصْدُ عَنْ الدُّنْيَا إِذَا عَنَّ سَوْدَدُ وَلَوْ بَرَزَتْ فِي رِي عَذْرَاءَ نَاهِدِ

جس میں شاعر نے عزت و سرداری ملنے کی توقع کی خاطر محبوب سے محبوب دنیوی آسائشوں سے منہ موڑ کر محنت و مشقت اور غربت کی زندگی اپنانے کی عادت کا اظہار کیا ہے اور اسی مضمون اور مقصد کے اظہار کے لیے دوسرے شاعر کا جو کلام ہے یعنی:

وَلَسْتُ بِمَيَّالٍ إِلَى جَانِبِ الْغِنَى إِذَا كَانَتْ الْعُلْيَاءُ فِي جَانِبِ الْفَقْرِ (۲)

(۱) الانبیاء: 23۔

(۲) المطول مع التلخیص ومع شرح میر السید السند، ص: 300، مطبوعہ بیدار قم ایران۔

أصول ترجمہ

اس کو مقابلہ بلاغت و موازنہ فصاحت کے ترازو میں پہلے کے ساتھ تولنے کے بعد پہلے کو اس پر فضیلت دیکر اس کے مرجوح ہونے کا فیصلہ محض اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ اس کے چند حروف پہلے کے حروف سے زیادہ ہیں ورنہ مقصد کے اظہار کے حوالہ سے قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔

علم نحو و بلاغت کی کتابوں میں آئمہ بلاغت کی یہ تصریحات اور معنی مقصودی کی ادائی میں بلا ضرورت زیادہ الفاظ سے بچنے کے لیے یہ اہتمام اور قوانین و ضوابط محض اس مقصد کے لیے مدوّن ہو کر بلاغت نام پائے ہیں کہ قرآن فہمی کے لیے ان سے مدد لی جائے، ان کو بطور آلہ استعمال کر کے قرآن شریف کی بلاغت کو سمجھا جائے اور آیات قرآنیہ کا ترجمہ ان کے خلاف نہ کیا جائے۔ اسی مقصد کی بنیاد پر المطول و المختصر المعانی جیسی دقیق کتب بلاغت کے پڑھنے اور پڑھانے کو عبادت سمجھا جاتا ہے ورنہ ان میں اور کسی دوسری دنیوی کتاب میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا، مقام افسوس نہیں تو اور کیا ہے کہ تین چار سال لگا کر محنت شاقہ سے یہ فن حاصل کرنے کے بعد جائے استعمال میں اسے نظر انداز کیا جاتا ہے، اُسے پیش نظر رکھ کر روشنی لینے کے بجائے پس پشت ڈال کر اندھیرے کا سفر اختیار کیا جاتا ہے اور قرآن شریف کا ترجمہ اُس کے خلاف کر کے معکوس العملی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ایسے غیر محتاط اور غیر معیاری مترجمین قرآن پر افسوس کرتے ہوئے امام البلاغت یوسف السکا کی نے قرآن فہمی کے لیے علم بلاغت میں مہارت کو ضروری شرط اور ناگزیر ضرورت قرار دینے کے بعد لکھا ہے؛

”فَالْوَيْلُ كُلُّ الْوَيْلِ لِمَنْ يَتَعَاطَى التَّفْسِيرَ وَهُوَ فِيهِمَا رَاجِلٌ“ (۱)

یعنی پوری طرح ہلاکت ہے اُس شخص کے لیے جو علم المعانی و بیان میں پیدل و تہی دست ہوتے ہوئے قرآن شریف کی تفسیر کرنے بیٹھ جاتا ہے۔

اسی طرح کل مکاتب فکر اہل اسلام کے متفقہ امام التفسیر الراغب الاصفہانی نے قرآن فہمی کے لیے علم بلاغت کی تینوں قسموں یعنی علم المعانی، بیان اور بدیع میں مہارت کو ناگزیر شرط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) مفتاح العلوم حصہ بلاغت، ص: 70، مطبوعہ بیدار قم ایران۔

اصول ترجمہ

”وَلَا حَظَّ فِي مَعْرِفَتِهِ لِمَنْ لَمْ يَتَوْفَّرْ نَصِيبُهُ مِنَ الْبَلَاغَةِ“ (۱)

یعنی قرآن فہمی میں اُس شخص کا حصہ نہیں ہو سکتا جسے علم بلاغت میں وافر حصہ نصیب نہ ہو۔
جب علم بلاغت کے اصولوں کو پیش نظر رکھے بغیر آیات قرآنیہ کی معیاری تفسیر کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر ترجمہ کیوں کر ممکن ہوگا جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ کا معاملہ تفسیر سے زیادہ مشکل ہے، کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے۔

۵ آیت کریمہ کے سیاق و سباق اور کلام کے موضوع سخن کو ملحوظ خاطر رکھنا تاکہ ایک سے زیادہ معانی کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ سے مرادی مفہوم۔ نیز حقیقی مفہوم میں یا مجازی معنی میں استعمال ہونے والے الفاظ سے مرادی مفہوم کی پہچان ہو سکے جس کے بغیر آیت کریمہ کا اصل مقصد دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ لسان قرآنی میں استعمال ہونے والے بعض الفاظ اتنے کثیر الجہات ہوتے ہیں کہ اُن سے مرادی مفہوم کی پہچان کے لیے کلام کے موضوع سخن اور اس کے سیاق و سباق پر نظر رکھنے کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔

اس کی خلاف ورزی کرنے کی مثالوں میں سورۃ البقرہ، آیت نمبر 28 ”كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ“ کے مندرجہ ذیل ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے ”کافرو تم خدا سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اُس نے تم کو جان بخشی پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کریگا پھر اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے“ جس میں متن کے لفظ ”كَيْفَ تَكْفُرُونَ“ کے مصداق کو کافروں کے ساتھ مختص قرار دے کر اُس کے عموم سے خلاف کیا گیا ہے جو سیاق و سباق سے غفلت کا نتیجہ ہے کیوں کہ یہاں پر اس سے ماقبل و مابعد کی آیات میں عموم ہی عموم ہے کہ مسلم و غیر مسلم دونوں کو یکساں تبلیغ کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدۃ استحقاق عبادت سے انکار کرنے کی کوئی واقعی وجہ موجود نہیں ہے

(۱) مقدمة التفسير المطبوعه مع مفردات القرآن، ص: 585، مطبوعه اصح المطابع کراچی۔

أصول ترجمہ

جبکہ اُس وحدہ لاشریک کو تنہا مستحق عبادت سمجھنے اور ماننے کے لیے اُس کا نظامِ احیاء و اماتت کافی و شافی دلیل موجود ہے اور تم سمجھتے ہو کہ احیاء و اماتت کے اس نظام میں وہ لاشریک ہے جو بلاشرکت غیر مستحق عبادت ہونے کے موجب ہے لیکن مترجمین نے سیاق و سباق کے اس عموم سے بے التفاتی کرتے ہوئے عام کا ترجمہ خاص میں کر کے واقعہ سے خلاف کرنے کے ساتھ جمہور مفسرین سے بھی انحراف کیا ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔ اس لیے کہ یہ ترجمہ کی روح ”ابدال لفظہ بلفظہ تقوم مقامہا“ (۱) سے ہی خلاف ہے جو مذکورہ شرائط کو پامال کرنے کا نتیجہ ہے ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ (۲)

❶ آیت کریمہ کی لغوی صفات اور فقہی اقسام کو ملحوظ خاطر رکھنا کہ جس لفظ یا جس مجموعہ کلام کے مفہوم کو مرادِ الہی سمجھ کر دوسری زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے جب تک مکمل یقین حاصل نہ ہو کہ وہ از قبیل خاص ہے یا عام، مشترک ہے یا مؤل، مطلق ہے یا مقید، ظاہر ہے یا نص، مفسر ہے یا محکم، خفی ہے یا مشکل، مجمل ہے یا تشابہ، حقیقت ہے یا مجاز، صریح ہے یا کنایہ۔ اس حیثیت سے یقین حاصل ہونے کے بعد نفس مفہوم کی حیثیت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ جب تک مترجم کو اُس کی نوعیت پر یقین نہ ہو کہ آیت کریمہ کے جس مفہوم کو میں دوسری زبان کی طرف منتقل کر رہا ہوں یہ عبارت النص کے قبیل سے ہے یا اشارۃ النص کے، دلالت النص ہے یا اقتضاء النص اُس وقت تک ترجمہ کے لیے مناسب الفاظ استعمال کر سکتا ہے نہ مناسب انداز۔

اس شرط کی خلاف ورزی کی مثال کے لیے بھی مذکورہ بالا مثال دیکھی جائے کہ مترجمین نے متن کے لفظ ”کَيْفَ تَكْفُرُونَ“ کے فاعل و مخاطب جو سیاق و سباق کے مطابق عام ہے اور مسلم و غیر مسلم، موحد و مشرک سے لے کر ہر اُس انسان کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری و

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۱۱۱، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

(۲) مقدمہ تفسیر البحر المحیط، المطبوعہ الجلد الاول، ص: ۶، مطبوعہ دارالفکر بیروت۔

أصول ترجمہ

ساری نظام احیاء و امات کو سمجھتا ہے کہ اس میں اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں ہے۔ معروضی حالات کی اس روشنی میں مترجمین کا اسے کافروں کے ساتھ مختص کرنا عام کا ترجمہ خاص میں کرنے کی غلطی سے خالی نہیں ہے۔ (۱)

④ آیت کریمہ کی تفسیر قرآنی ”القرآن يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا“ کو ملحوظ خاطر رکھنے کے بعد بالترتیب تفسیر نبوی ﷺ اور کل مکاتب فکر اسلاف کے ذخیرہ تفسیر کو ملحوظ خاطر رکھنا، اس لیے ضروری ہے کہ آیت کریمہ یا اس کا کوئی حصہ اگر خفی، مشکل یا مجمل کے قبیل سے ہو یا کسی بھی وجہ سے مرادی مفہوم پر دلالت کرنے میں واضح نہ ہو تو اس کی پہچان کے یہی ذرائع ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر درست ترجمہ ممکن نہیں ہو سکتا۔

جس کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 228 ”وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ“ کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے“ جو قرآنی تفسیر کے خلاف ہونے کیساتھ تفسیر نبوی اور جمہور مفسرین کرام سے بھی خلاف ہے کیوں کہ قرآن شریف کے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کی مطلق فضیلت و برتری کا فرمایا ہے جو آیت کریمہ ”الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ“ جیسے نصوص کے عموم سے مفہوم ہو رہا ہے۔ اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے فرمایا:

”لَوْ كُنْتُ أَمْرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرَّةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا لِمَا جَعَلَ اللَّهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ“ (۲)

مفسرین کرام نے بھی قرآن و سنت کی اس روشنی کے مطابق پیش نظر آیت کریمہ میں لفظ ”درجہ“ کو اس کے عموم و اطلاق پر ہی جاری رکھا ہے۔ ایسے میں اس شرط کی اہمیت سے انکار

(۱) (i) تفسیر الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 181۔

(ii) مقدمہ روح المعانی، ج: 1، ص: 6۔

(۲) ابوداؤد شریف۔

أصول ترجمہ

کون کر سکتا ہے اس کا ماخذ بالترتیب مندرجہ ذیل آیت و حدیث اور تصریح اسلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ“ (۱)

یہ قرآن ہم نے تم پر نازل کیا کہ تو انہیں بیان کرے وہ جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پوچھنے پر صحابی رسول معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا؛

”أَقْضَى بِكِتَابِ اللَّهِ قَالَ فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي كِتَابِ اللَّهِ قَالَ فِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَلَا فِي كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى قَالَ اجْتَهِدْ بِرَأْيِي وَلَا أَلُو فَضَرَبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ صَدْرَهُ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لِمَا يَرْضَى رَسُولُ اللَّهِ“ (۲)

سنن ابوداؤد کی تخریج کے مطابق یہ حدیث اگرچہ قضاۃ سے متعلق ہے تاہم بزرگان دین نے قرآن و سنت کی فہم کے حوالہ سے اس ترتیب کو اصل الاصول قرار دیا ہے جو اہل علم سے مخفی نہیں ہے تو پھر قرآن شریف کے ترجمہ و تفسیر کے لیے اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

قرآن و سنت کی خدمت میں عمریں گزارنے والے علماء کرام نے لکھا ہے؛

”إِذَا لَمْ نَجِدِ التَّفْسِيرَ فِي الْقُرْآنِ وَلَا فِي السُّنَّةِ رَجَعْنَا فِي ذَلِكَ إِلَى أَقْوَالِ الصَّحَابَةِ فَإِنَّهُمْ أَذْرَى بِذَلِكَ لِمَا شَاهَدُوا مِنَ الْقَرَائِنِ وَالْأَحْوَالِ الَّتِي يَخْتَصُّونَهَا وَلِمَا لَهُمْ مِنَ الْفَهْمِ التَّامِّ وَالْعِلْمِ الصَّحِيحِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ لَا سِوَمَا عُلَمَائِهِمْ وَكِبَرَائِهِمْ كَالْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ وَالْأَئِمَّةِ الْمُهْتَدِينَ الْمُهْدِينَ كَعَبْدِ اللَّهِ ابْنِ مَسْعُودٍ ؓ فَإِذَا لَمْ تَجِدِ التَّفْسِيرَ فِي الْقُرْآنِ وَلَا فِي السُّنَّةِ وَلَا

(۱) النحل: 44۔

(۲) سنن ابوداؤد شریف، ج: 2، ص: 149، کتاب القضاء۔

أصول ترجمہ

وَجَدْتُهُ عَنِ الصَّحَابَةِ فَقَدْ جَاءَ كَثِيرٌ مِنَ الْأَئِمَّةِ فِي ذَلِكَ“ (۱)

ماضی قریب کے ایک مدبر فی القرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

”معانی وحقائق کی طرح قرآن اپنی ادبی و نحوی مشکلات کے حل کے لیے بھی سب سے

زیادہ مستند مرجع و ماخذ ہے اس حقیقت کو ہمارے پچھلے علماء نے بھی تسلیم کیا ہے۔“ (۲)

▲ آیت کریمہ کی حیثیت تشبیہ کو ملحوظ خاطر رکھنا (دوسری شرط کی مذکورہ تفصیل کے بعد یہ شرط تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے) یہ اس لیے کہ جب آیت کریمہ یا اُس کا کوئی حصہ حقیقت، مجاز مرسل اور کنایہ میں سے کسی ایک کے قبیل سے بھی نہ ہو تو اُس کا تشبیہ کے قبیل سے ہونا امر یقینی بن جاتا ہے اور تشبیہ پر مشتمل کلام اپنی باریک لطافتوں، گونا گوں قسموں اور بیان کے متنوع رموز و اسرار کا حامل ہونے کی وجہ سے علم بیان کی جان سمجھا جاتا ہے جس بناء پر علم بلاغت کا حصہ ہونے کے باوجود اُس سے جدا نوعیت کے حامل ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی اہتمام کے باعث علم بلاغت کی جملہ مباحث میں اس کو سب سے زیادہ کثیر الجہات اور زیادہ قابل توجہ سمجھا جاتا ہے قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے آیت کریمہ کی اس حیثیت کو ملحوظ خاطر رکھنے کو ناگزیر شرط قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کریمہ کا تشبیہ کے قبیل سے ہونے کی صورت میں جب تک مترجم کو اُس کی نوعیت پر یقین نہ ہو کہ یہ تشبیہ کی کوئی قسم ہے استعارہ ہے یا تشبیہ بلغ اُس وقت تک درست ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہوگا کیوں کہ علاقہ تشبیہ پر مشتمل ہونا ان دونوں کے مابین قدر مشترک ہونے کے باوجود تشبیہ کی یہ دونوں قسمیں آپس میں ضدین کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے کہ استعارہ میں مشبہ کسی انداز سے بھی مذکور فی الکلام نہیں ہوتا جبکہ تشبیہ بلغ میں اُس کا مذکور فی الکلام ہونا ضروری ہے اور نہ سہی کم از کم منوی فی الکلام ہونا تو ناگزیر ہے۔ ایسے میں مترجم کو تشبیہ کی نوعیت پر یقین نہ ہونے کی صورت میں استعارہ کے قبیل سے

(۱) مقدمہ تفسیر البیضاوی المسماء بمرآة التفسیر، ص: 1، مطبوعہ المیزان اردو بازار لاہور۔

(۲) مقدمہ تدبر قرآن، ج: 1، ص: 15، مطبوعہ دارالاشاعت اسلامیہ امرت روڈ لاہور۔

اصول ترجمہ

آیت کا ترجمہ تشبیہ بلیغ کے انداز میں یا تشبیہ بلیغ کے قبیل سے آیت کریمہ کا ترجمہ استعارہ کے انداز میں کرنے کی غلطی کر سکتا ہے صرف اس حد تک نہیں بلکہ تشبیہ کی نوعیت پر یقین ہو جانے کے بعد اگر وہ استعارہ کے قبیل سے ہے تو اس بات پر بھی یقین ہونا ضروری ہے کہ آیت کریمہ اُس کی کونسی قسم میں شامل ہے آیا استعارہ تمثیلیہ ہے یا تخیلیہ، ملکیہ ہے یا مصرحہ ورنہ ایک کی جگہ دوسرے کے انداز کا ترجمہ کرنے کی غلطی کر سکتا ہے جس کو قبول کرنے کے لیے آیت کریمہ کی بلاغت تیار نہیں ہے۔ اسی طرح اگر تشبیہ بلیغ کے قبیل سے ہے تو اس بات پر بھی مترجم کو یقین ہونا ضروری ہے کہ اُس کی کونسی قسم میں شامل ہے آیا تشبیہ بلیغ کی وہ قسم ہے جس میں مشبہ بھی مشبہ بہ کی طرح ملفوظ و مذکور فی الکلام ہوتا ہے یا اُس زمرہ میں ہے جس میں مشبہ محذوف فی الکلام ہوتا ہے یا وہ ہے جس میں مشبہ مذکور ہوتا ہے نہ محذوف و مقتدر بلکہ صرف اور صرف منوی ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ تشبیہ بلیغ کی پہلی دو قسموں کے اور تیسری قسم کے ترجموں کے انداز میں فرق ہوتا ہے کہ پہلی دو قسموں کے ترجمہ میں مشبہ کو ترجمہ میں ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ تیسری قسم کے ترجمہ میں اُس کو ظاہر نہ کرنا ضروری ہے ورنہ ایک کی جگہ دوسرے کا ترجمہ کرنے سے تشبیہ کی حقیقت میں اشتباہ ہوگا، متن کی بلاغت کے منافی ہوگا اور مراد الہی کے اظہار کے بجائے اُس کی مخالفت ہوگی۔

اس شرط کی خلاف ورزی کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 18 ”صُمُّ بَكْمُ عُمَىٰ فَهَمْ لَا يَرْجِعُونَ“ کے مندرجہ ذیل ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے ”وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں چنانچہ اب وہ واپس نہیں آئیں گے“ جس میں مشبہ کے لیے لفظ ”وہ“ لا کر متن کی بلاغی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہاں پر منافقین کو بہرے، گونگے اور اندھے کے ساتھ جو تشبیہ دی گئی ہے یہ مفسرین کرام کی تصریحات کے مطابق دو حال سے خالی نہیں ہے: ایک بعید سا احتمال یہ ہے کہ یہ استعارہ تبعیہ ہے۔

دوسرا احتمال جو قوی اور مختار عندا لمحققین ہے یہ کہ تشبیہ بلیغ کی وہ قسم ہے جس میں مشبہ صرف

أصول ترجمہ

منوی ہوتا ہے ترجمہ کو ان میں سے جس پر بھی استوار کیا جائے لفظ ”وہ“ لا کر مشبہ کو ذکر کرنا جائز نہیں ہوتا استعارہ کی صورت میں اس لیے کہ اُس میں مشبہ کسی طرح بھی مذکور نہیں ہوتا اور تشبیہ بلیغ کی صورت میں اس لیے کہ یہاں پر متن اُس کی تیسری قسم کے قبیل سے ہے کہ مشبہ صرف منوی ہے جس کو ترجمہ میں ملفوظ کرنے سے ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوتا۔

حقائق کی اس روشنی میں مذکورہ شرط کی اہمیت میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے، اس کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اسلاف نے لکھا ہے:

”وَلَا حَظَّ فِي مَعْرِفَتِهِ لِمَنْ لَمْ يَتَوَفَّرْ نَصِيبُهُ مِنَ الْبَلَاغَةِ“ (۱)

یعنی قرآن شریف کی فہم میں اُس کا نصیبہ نہیں ہو سکتا جس کا نصیبہ علم بلاغت میں نہیں ہے۔ اسی سلسلہ میں تفسیر کشاف کے مقدمہ میں جارہ اللہ الزمخشری کی مشہور عبارت کی تشریح کرتے ہوئے اُس کے محشی میرالسید السند نے لکھا ہے:

”ان الاطلاع على فرائده والكشف عن وجوه خرائده لا يحصل الا بها فهو لهما لا لغيرهما“ (۲)

یعنی قرآن شریف کے رموز و اسرار پر اطلاع پانا اور اُس کے معارف کے خوبصورت چہروں کو کھولنا علم المعانی و علم البیان کے بغیر ممکن نہیں ہے گویا قرآن فہمی کے اصل آلہ اور ذرائع یہی ہیں۔

۹ اصل کے کسی لفظ یا کسی حصہ کو چھوڑنے سے اجتناب کرنے کیساتھ اُس کے الفاظ پر اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرنے سے بھی اجتناب کرنا اور نہ اصل کے کسی حصہ سے بے اعتنائی کرنے کی صورت میں اگرچہ وہ متروک لفظ صرف ایک حرف ہی کیوں نہ ہو اصل کا مفہوم تبدیل ہو سکتا ہے اور متن پر اضافہ کرنے سے ترجمہ کی حد سے نکل کر تشریح و تفسیر کی حد میں داخل ہوگا

(۱) مقلدہ التفسیر امام الراغب الاصفہانی، ص: 585 مطبوعہ اصح المطابع آرام باغ کراچی۔

(۲) حاشیہ میرالسید السند علی الکشاف، ج: 1، ص: 16 مطبوعہ دارالمعرفت بیروت۔

اصول ترجمہ

جبکہ آیت کریمہ کے معیاری ترجمہ میں تشریح و تفسیر ہوتی ہے نہ اصل مفہوم کی تبدیلی ایسے میں ان دونوں سے اجتناب کا قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے شرط قرار پانا عین مقتضائے فطرت ہے۔

اس کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 228 ”وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ“ کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جائے ”اور شریعت کے موافق عورتوں کا مردوں پر وہی سب کچھ حق ہے جو مردوں کا عورتوں پر ہے“ جس میں لفظ ”وہی سب کچھ حق ہے جو مردوں کا عورتوں پر ہے“ جیسے الفاظ کو متن پر اضافہ کر کے عورتوں کے لیے وہ تمام حقوق بتائے گئے ہیں جو مردوں کے لیے ثابت ہیں حالانکہ آیت کریمہ سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔ ورنہ عورتوں سے متعلق مخصوص حقوق مردوں کے لیے بھی اور مردوں سے متعلق مخصوص حقوق عورتوں کے لیے ثابت ماننا پڑے گا جو قرآن و سنت کے منافی اور مضحکہ خیز ہے۔ اور متن کے کسی لفظ کو چھوڑنے کی مثالوں میں وہ تمام تراجم شامل ہیں جن میں آیات کریمہ کی ابتداء میں آئے ہوئے حروفِ عاطفہ یعنی ”واو“ اور ”فا“ کے ترجمہ سے بے اعتنائی کر کے انجانے میں موصول متن کو مفصول بنایا گیا ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔ اس شرط کی اہمیت سے متعلق امام جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے؛

”وَأَنْ يَتَحَرَّزَ فِي ذَلِكَ مِنْ نَقْصٍ لِمَا يُحْتَاجُ إِلَيْهِ فِي ابْضَاحِ الْمَعْنَى أَوْ زِيَادَةٍ لَا تَلِيقُ بِالْغَرَضِ“ (۱)

▶ ترجمہ کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ اور ان کے انداز ترتیب کا فصیح و بلیغ ہونا اس لیے ضروری ہے کہ انسانوں کے کسی بھی فصیح و بلیغ کلام کا ترجمہ اگر فصاحت و بلاغت کے منافی کلام سے کیا جائے تو اسے معیاری ترجمہ نہیں کہا جاتا۔ جب انسانی کلام کا یہ عالم ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس معجز کلام مقدس کا غیر فصیح و بلیغ انداز میں کیا جانے والا ترجمہ کیونکر معیاری قرار پائے گا۔ اس کے متعلق امام سیوطی نے لکھا ہے؛

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 185، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

”يَجِبُ عَلَى الْمُفَسِّرِ أَنْ يَتَحَرَّى فِي التَّفْسِيرِ مُطَابَقَةَ الْمُفَسَّرِ“ (۱)

یعنی قرآن شریف کے جس لفظ اور جس حصہ کی تفسیر و ترجمہ کر رہا ہے ترجمہ کو اُس کے مطابق کرنا واجب ہے کیوں کہ ترجمہ قرآن کی صورت میں مفسر یعنی متن آیت کریمہ ہے جو فصیح بھی ہے بلیغ بھی، لہذا ترجمہ کے الفاظ و انداز کا اُس کے مطابق فصیح و بلیغ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوگا۔

اس کی خلاف ورزی کی مثال میں ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جائے ”شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے“ جس میں اُس کی نحوی حیثیت کیساتھ بلاغی حیثیت کا بھی خون کیا گیا ہے اس لیے کہ نحوی اصولوں کے مطابق اسم جلالت یہاں پر موصوف اور لفظ ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ اُس کی صفت بعد الصفت ہیں اور ترکیب توصیفی یعنی صفت و موصوف کا مجموعہ مرکب جملہ ہوتا ہے نہ کلام بلکہ جملہ کے مقابلہ میں مفرد ہی ہوتا ہے جبکہ لفظ ہے جملہ کی علامت و پہچان ہے جس کو مفرد کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ حقیقت کی اس روشنی میں ان تراجم کو متن کی فصاحت کے مطابق نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی وجوہ سے غلط ہے۔ کیوں کہ یہ متن کی لغوی حیثیت کے منافی ہونے کیساتھ اُس کی نحوی اور بلاغی حیثیت کے بھی خلاف ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو متن کی لغوی، نحوی اور بلاغی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا جائزہ لے۔

① نیت کا خالص ہونا کہ حسب استطاعت قرآن شریف کا حق ادا کرنے اور اس سے مقصدِ الہی کو دوسری زبان میں منتقل کر کے قرآن شریف کی تبلیغ اور اللہ تعالیٰ کی رضا پانے کے سوا اور کوئی دنیوی مقصد ہرگز نہ ہو ورنہ دنیوی مقصد کی دست آوری ہو یا نہ ہو بہر تقدیر قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کرنے کے لیے توفیق ایزدی میسر نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ص: ۱۸۵، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

”لَا يَمْسُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ (۱)

یعنی اُس کے معارف کا ادراک نہیں کر سکتے مگر پاک لوگ۔

ظاہر ہے کہ طہارت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری، دوسری باطنی۔

ظاہری طہارت یہ کہ جسمانی طور پر پاک ہو اور باطنی یہ کہ بد اعتقادی، تنگ نظری، جہل مرکب اور تعصب جیسی آلودگی سے محفوظ ہو۔ اسی طرح مس کی بھی دو قسمیں ہیں؛

پہلی قسم:- مسِ مصحف ہے کہ قرآن شریف کو یا اُس کے کسی حصے کو ہاتھ لگایا جائے۔

دوسری قسم:- مسِ معارف ہے کہ آیاتِ قرآنی میں موجود معارف کا ادراک کیا جائے اور یہ آیت کریمہ جملہ خبریہ ہونے کی بناء پر مس کی دوسری قسم میں ظاہر ہے جس میں پہلی قسم کا احتمال بھی موجود ہے کہ لفظ کے اعتبار سے خبر اور معنی کے اعتبار سے انشاء مراد ہو جس کے پیش نظر فقہاء کرام نے بغیر طہارت کے قرآن شریف کے ہاتھ لگانے کو ناجائز قرار دیا ہے جو بجائے خود درست ہونے کے باوجود اس کے ظاہری مفہوم کو نہیں پہنچ سکتا کہ اس میں لفظاً معنأً خبر مراد ہو جس کے مطابق اپنی ذہنی ترجیح کو اصل بنا کر قرآن شریف کو اُسی کی طرف کھینچنے والے کو اس کی حقیقی سمجھ نصیب نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے اس قسم کے ظاہر الدلالت نصوص کے ہوتے ہوئے معیاری ترجمہ کے لیے مذکورہ شرط کے ضروری ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

جن کی مثالوں میں اُن تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے، جن کو مترجمین نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں ناموری کے لیے یا اپنے مخصوص مسلکی نظریات ثابت کرنے کے لیے اور آیاتِ قرآنی سے اپنی ذہنی ترجیحات و نظریہ کی تائید ظاہر کرنے کے لیے لکھا ہے جو بجائے خود المیہ ہے کیوں کہ جو حضرات عرفان آشنا نہیں ہیں یا کسی ذہنی ترجیح، ماحولیاتی اثر اور مذہبی عصبیت کے اسیر ہیں یا خلوص نیت کی سعادت سے محروم ہیں وہ اس عظیم منصب کے لیے آگے آنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”لَا يَمْسُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ (۲) اور مذہبی عصبیت کے حصار میں محصور

(۱) واقعہ: 79۔

(۲) الواقعہ: 79۔

أصول ترجمہ

ایسے ناتوان و محروم طبقہ سے متعلق امام غزالی نے فرمایا ہے:

”لو اجتمع علیہ الاولون والآخرون لم یقدروا علی نزع البدعة من صدرہ بل الهوی والتعصب وبغض خصوم المجادلین و فرقة المخالفین یتولی علی قلبہ ویمنعہ من ادراک الحق حتی لو قیل لہ هل تُرید أن یُکشف اللہ تعالیٰ لک الغطاءَ و یعرفک بالعیان ان الحق مع خصمک لکرہ ذلک خیفۃ ان یفرح بہ خصمہ ہذا هو الداء العضال الذی استطار فی البلاد والعباد و ہونوع فساد أثرہ المجادلون بالتعصب“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ متعصب بدعت پرست کے دل سے اس گمراہی کو نکالنے کے لیے اگر اولین و آخرین سب جمع ہو کر کوشش کریں پھر بھی نہیں نکال سکتے بلکہ خواہش پسندی اور عصبیت اور مخالفین کو نچا دکھانے کی فکر اس کے دل پر سوار ہو کر حق کی پہچان سے اسے منع کر رہی ہے اور اس کی حق جوئی سے محرومی کا یہ عالم ہے کہ اگر اسے یہ کہا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ خود بالمشافہ تجھ سے کہے کہ تیرا مخالف فریق حق پر ہے کیا تو اسے پسند کرے گا تو وہ خوش ہونے کے بجائے ناپسند کرے گا کیوں کہ وہ اپنے مخالف فریق کی خوشی کو برداشت نہیں کر سکتا یہ وہ لاعلاج مرض ہے جو ملکوں میں اور خلق خدا میں پھیل چکا ہے اور یہ فساد کی ایک قسم ہے جس کو متعصب مجادلین نے پسند کیا ہے۔ ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے انکار کی کیا مجال ہو سکتی ہے۔ (۲)

۱۲ کسی ذہنی ترجیح سے مترجم کے ذہن کا پاک اور محفوظ ہونا۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ جو شخص کسی بھی من پسند کی ترجیح اور رجحان کو لے کر ترجمہ کرنے بیٹھ جائے گا تو وہ آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم کو تلاش کر کے اس کی اتباع کرنے اور ترجمہ میں اسی کو ظاہر کرنے کے بجائے آیت

(۱) ۲۹۔ احیاء علوم الدین، ج: ۱، ص: 79، مطبوعہ بیروت۔

(۲) (i) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 182، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

(ii) مقدمہ تفسیر مہائمی، ص: 6، مطبوعہ عالم الکتب بیروت۔

اُصولِ ترجمہ

کریمہ کا رخ اپنے مقصد کی طرف کرنے کی کوشش کرے گا، خود کو اُس آیت کریمہ کے تابع کرنے کے بجائے اُسے اپنے رجحان کے تابع کرے گا اور ترجمہ میں حقیقت کو ظاہر کرنے کے بجائے اپنی ترجیح کو ہی ظاہر کرے گا تو پھر معیاری ترجمہ کرنے کی توفیق ممکن نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لَا يَمْسُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ (۱)

کسی ذہنی ترجیح سے پاک و آزاد ذہن والے ہی اس کے معارف کو پاسکیں گے۔

اسی فلسفہ کی بنیاد پر سلف صالحین نے مذکورہ قبائح کو قرآن فہمی کی راہ سے مانع اور حجاب قرار دیا ہے۔ (۲)

۱۳ عرفان نصیبی و توفیق الہی، یہ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کے لیے مذکورہ تمام شرائط محض اسباب کے درجہ میں ہیں جن کے بغیر معیاری ترجمہ وجود میں لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان تمام شرائط و اسباب کا اجتماعی وجود معیاری ترجمہ کے لیے علت تامہ ہے کہ اس کے بعد قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کا وجود میں آنا امر یقینی ہو اس کا وجود ضروری اور تخلف ممتنع ہو۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے علت تامہ صرف اور صرف توفیق الہی ہے کہ اُس وحدہ لا شریک رحیم و کریم کی توفیق جب تک میسر نہ ہو اُس وقت تک مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جبکہ اس کی سعادت نصیب ہونے کے بعد ہی اجتماع شرائط و اسباب کا یہ عمل ثمر آور ہو جاتا ہے اور توفیق الہی کی یہ عرفان نصیبی اُن ہی حضرات کو میسر ہوتی ہے جن کو عالم باعمل کہا جاتا ہے، جو ”يَنْفُونَ“

(۱) واقعہ: 79۔

(۲) (i) احیاء علوم الدین، ج: 1، ص: 284، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت۔

(ii) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 182، مطبوعہ قاہرہ مصر۔

اصول ترجمہ

عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ“ (۱) کے مظہر ہوتے ہیں، جو ”مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَثَهُ اللَّهُ عَلِمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ“ (۲) کے مصداق ہوتے ہیں گویا توفیق الہی اور عرفان نصیبی کی یہ شرط قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرنے کی سعادت پانے کے لیے اصل الاصول اور بنیاد ہے۔ (۳)

اس کے علاوہ اس شرط کی سابقہ شرائط کے ساتھ ایک ربط یہ بھی ہے کہ یہ اُن سب کے موثر ہونے کے لیے کلیدی کردار ہونے کے باوجود خود امر محسوس نہیں ہے کہ مشاہدہ میں آسکے بلکہ خالص فیض ربی اور باطنی رابطہ ہے جس کی بدولت مترجم کو باقی تمام شرائط پر فائز ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوتی ہے۔ نیز سابقہ تمام شرائط اسی ایک کے مظاہر اور یہ تنہا اُن سب میں ظاہر ہے اور مترجم کے دل و دماغ اور زبان قلم میں اُن سب کا اجتماعی وجود اس کی موجودگی پر دلیل اور اس کی پہچان ہے اور اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کی برکت سے باقی تمام شرائط کے مطابق ترجمہ کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ کی آورد نہیں بلکہ آمد ہوتی ہے جو محض عطیہ الہی ہے۔

این سعادت باذور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشنده
الغرض ان تینوں یعنی نمبر 9، 10، 11 کی خلاف ورزی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول اور غیر معیاری قرار پانے والے تراجم کی مثالوں کو سمجھنے کے لیے مختلف حضرات کی طرف سے کئے گئے مندرجہ ذیل تراجم دیکھے جاسکتے ہیں:

(i) سورة البقرہ، آیت نمبر 69 ”قَالُوا دُعُ لَنَا رَبَّكَ يَبْنَ لَنَا مَا لَوْهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْهَا تَسُرُّ النَّظِيرِينَ“ کے ترجمہ میں کہا گیا ہے ”کہنے لگے کہ اچھا یہ بھی درخواست کر دیجئے ہمارے لیے اپنے رب سے ہم سے یہ بھی بیان کر دیں کہ اُس کا رنگ کیسا ہو

(۱) مشکوٰۃ شریف، ص: 36، کتاب العلم۔

(۲) تفسیر روح المعانی، ج: 1، ص: 91۔

(۳) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 181، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا نیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو۔

اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر مترجمین نے لفظ ”صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ کے نیل“ کرنے کی جو خطرناک غلطی کی ہے اس کی اصل وجہ دسویں شرط کی خلاف ورزی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہندوستان کے گاؤں پرستوں کی تاریخ میں نیل کی عبادت دیکھ کر گاؤں پرستی کو نیل کے ساتھ مختص ہونے کو ذہن میں راسخ کر لیا اور اُسے ذہنی ترجیح بنا کر آیت کریمہ کو بھی اُس پر منطبق کیا اور انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ اپنے نظریہ اور اپنی ذہنی ترجیح کو چاہے وہ جس حوالہ سے بھی ہو پسند کرتا ہے، اُسی طرف مائل اور اُس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ سچ فرمایا گیا ہے؛

”حُبُّكَ الشَّيْنَى يُغَمِّى وَيُصَمِّمُ“ یعنی کسی بات کو پسند کرنا تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے۔

اور اسی بہرا پن و اندھا پن کا نتیجہ ہے کہ آیت کریمہ میں مترجمین کو الف تانیث نظر نہیں آیا اور علم نحو کی کتابوں میں ہزار بار پڑھی اور سنی ہوئی بات کو پیش نظر رکھنے سے قاصر رہے کہ لفظ ”صَفْرَاءُ“ جیسے اسماء پر آئی ہوئی الف ممدودہ ہر جگہ میں علامت تانیث ہوتا ہے اور کسی بھی جگہ میں آیا ہو اس علامت تانیث والے اسم کو مونث ہونا لازم ہے کہ یہ جس اسم میں بھی ہو اُس کا مونث ہونا ضروری اور مذکر ہونا ممنوع ہے۔ علم نحو کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ علامت تانیث والا یہ الف علمی زبان کے مطابق منع صرف کے دو سبب کے قائم مقام ہونے پر دلیل کے طور پر لکھا ہے؛ ”التانیث ولزومها“

ان حقائق کی روشنی میں آیت کریمہ میں مذکور لفظ ”بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ کے نیل“ میں کرنے کی غلطی عورت کا ترجمہ مرد میں اور شجر کا ترجمہ حجر میں کرنے کی غلطی سے مختلف نہیں ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی غافل شخص لفظ ”شاة صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ کا بکرا“ کرے جو قابل معافی نہیں ہے۔ مترجمین کی اس غلطی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں پر لفظ ”صَفْرَاءُ“ کی لغوی حیثیت کو نہیں سمجھتے تھے کیوں کہ وہ عربی زبان کے کسی معمولی پڑھے لکھے شخص سے بھی

پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے کہ یہ مونث کا صیغہ ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس پر آئے ہوئے ”الف“ ممدودہ کی حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے کیوں کہ علم نحو کے ابتدائی طلباء بھی جانتے ہیں کہ یہ الف اصلی نہیں بلکہ زائد اور علامت تانیث ہے جس کے مدخول کا مونث ہونا لازم ہے کہ یہ جس اسم پر بھی آئے اس کا مونث ہونا ضروری اور مذکر ہونا ممنوع ہے اور یہ بھی نہیں کہ وہ گائے اور بیل کے مابین تمیز کرنے سے قاصر تھے نہیں ایسا ہرگز نہیں کیوں کہ بے پڑھے لکھے بچے بھی سمجھتے ہیں کہ گائے مؤنث اور بیل مذکر ہے بلکہ اس کی واحد وجہ شرط نمبر 12، 13 کے خلاف ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مترجمین نے عہد قدیم کے گاؤ پرستوں کی تاریخ میں بیل کی پرستش دیکھ کر یہ عقیدہ جمالیا کہ مصر کے گاؤ پرستوں کے ماحول میں عمریں گزارنے والے بنی اسرائیل بھی گائے کی نہیں بلکہ بیل کی عبادت کرنے کے دلدادہ تھے جس وجہ سے قاتل کا پتہ لگانے کے لیے انہیں بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس تصور کو ذہنی ترجیح بنا کر آیت کریمہ کا ترجمہ کرنے بیٹھ گئے تو شرائط کی طرف پشت کرتے ہوئے آیت کریمہ کو اسی پر چسپاں کر لیا۔ آیت کریمہ کی لغوی اور لسانی حیثیت کے خلاف کرنے کے ساتھ اس کی واقعی حیثیت کو بھی بگاڑ دیا ہے جس کے پس منظر میں شرط 12، 13 سے خلاف ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ان تراجم کا شرط (13) سے خلاف ہونا محتاج بیان ہی نہیں ہے کیوں کہ عرفان کی سعادت جس مترجم کو نصیب ہو وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتا اور شرط نمبر (12) سے خلاف ہونا بھی واضح ہے کہ بقرہ بنی اسرائیل سے متعلقہ اس آیت کریمہ میں اگر بیل کو ذہنی ترجیح نہ بنایا گیا ہوتا تب بھی ایسی غلطی نہ کی جاتی۔ ایسی دل خراش مثالوں سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانا کتنا مشکل کام ہے (وَاللّٰهُ الْهَادِي إِلَى سَبِيلِ الْرِّشَادِ)

(ii) سورة الرحمن، آیت نمبر 22 ”يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ“ کے ترجمہ میں کہا گیا ہے ”حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ (رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا) جیسے والدین سے امام

اصول ترجمہ

حسن اور امام حسین (رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا) جیسی اولاد پیدا ہوتی ہے“ جو لسانِ قرآنی کی لغوی حیثیت کے منافی ہونے کے ساتھ سیاق و سباق کے بھی خلاف ہے اور ناقابلِ فہم ہونے کے ساتھ لسانی قواعد کے بھی خلاف ہے جس کا پس منظر مترجم کا اپنے مخصوص نظریہ کو اصل قرار دیکر آیت کریمہ کا رخ ادھر موڑنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے ظاہر ہے کہ اخلاص نیت اور عرفان کی توفیق میسر ہونے کی صورت میں ایسی غلطیوں کا ارتکاب کبھی نہیں کیا جاسکتا۔

(iii) سورۃ البقرہ، آیت نمبر 60 ”وَإِذَا سَأَلَكَ الْمَوْتُ عَنْ نَفْسِكَ فَقُلْ إِنِّي مَرْجِعٌ إِلَىٰ رَبِّكَ“ کے ترجمہ میں کہا گیا ہے ”جب قوم نے موسیٰ سے پانی کا مطالبہ کیا تو ہم نے انہیں کہا کہ اپنی قوم کو پہاڑ پر لے جاؤ وہیں جا کر انہوں نے دیکھا کہ پانی کے بارہ چشمے پھوٹ رہے تھے۔“ الغرض جس مترجم نے بھی مذکورہ شرائط میں سے کسی سے بے اعتنائی کی ہے ٹھوکر ہی کھائی ہے طبقہ مبتدعین اور اہل ہوا کے لکھے ہوئے تراجم کا زیادہ تر حصہ ایسی ہی لغویات پر مشتمل ہے جو ترجمہ کہلانے کے قابل ہی نہیں ہے چہ جائیکہ معیاری ہو۔

حقائق کی اس روشنی میں مذکورہ شرائط کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے یا وہ کون سا اہل علم ہو سکتا ہے جو ان کے بغیر قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کو امر ممکن کہہ سکے۔

مخصوص شرائط کی تفصیل :-

پہلی شرط :- فنِ ترجمہ کے فطری اصولوں کو پیش نظر رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ترجمہ القرآن اپنے عربی مفہوم کے اعتبار سے فنِ ترجمہ کے ماتحت خاص صنف ہے جبکہ عام کے تمام لوازمات اور تقاضوں کا ثبوت خاص کے لیے ضروری ہوتا ہے جیسا فلسفہ کی قسم منطق میں کہا جاتا ہے ”كُلُّ مَقْوْمٍ لِلْعَالِي مَقْوْمٌ لِلْسَافِلِ“ اس کلیہ کی روشنی میں یہ اصول کہ ”کل ما هو ضروری للفن ضروری لصفه“ بھی بدیہیات کے قبیل سے شمار ہوتا ہے۔

أصول ترجمہ

اردو زبان میں اس سے خلاف کیے گئے تراجم کی ایک مثال تیسرے پارے کے آغاز ”تلك الرسل“ (۱) کا ترجمہ ہندوستان کے مشہور عالم وحید الزمان نے کیا ہے ”یہ پیغمبر (یا سب پیغمبر)“ جو فن سے خلاف ہونے کی بنا پر غلط ہے کیوں کہ حرف ”یا“ کے ساتھ بریکٹ میں معیاری ترجمہ کا کوئی حصہ لکھنے کے لیے جو مصرف ہوتا ہے وہ یہاں پر موجود نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیت کریمہ کے اندر کوئی لفظ ایسا ہو جس کے دو مفہوم ہوں اور دونوں درست ہوں۔ مفسرین کرام کی طرف سے بھی کسی ایک کو ترجیح نہیں دی گئی ہو اور علوم آلیہ کی روشنی میں بھی کسی ایک کو ترجیح نہ دی جاسکتی ہو اور مفسرین کرام نے بھی اُن دونوں کو یکساں انداز میں بیان کرتے آئے ہوں۔ ایسے میں مترجم کو مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ایک پر اگر اکتفا کرتا ہے تو ترجیح بلا مرجح کا محذور لازم آتا ہے اور دونوں کا ترجمہ ظاہر کرنے سے ترجمہ کا معیار گر جاتا ہے کیوں کہ ڈبل ترجمہ کرنے سے جہاں متن کی مخالفت ہوتی ہے وہاں متن سے اضافی الفاظ کی طوالت بھی ہوتی۔ ایسے میں سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ اُن میں سے ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں ظاہر کرے اور دوسرے کو بریکٹ میں بیان کرے اور ساتھ حرف ”یا“ لا کر متن کے اعجاز کے ساتھ اپنے عجز اور ترجمہ والی زبان کی کوتاہی دامن کا بھی اشارہ دے کہ کلام الہی کے اس لفظ کے مطابق لفظ لانے سے عاجز ہوں۔

قرآن شریف میں موجود اس کی متعدد مثالوں میں سے ایک آیت کریمہ ”وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ“ (۲) بھی ہے کہ مفسرین کرام کے مطابق لفظ ”بَلَاءٌ“ کا ایک مفہوم آزمائش کے ہیں جس کے مطابق اس پوری آیت کا ترجمہ ”اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی“ جیسے الفاظ میں ہوگا۔ اور دوسرا مفہوم انعام کے ہیں۔ جس کے مطابق پوری آیت کریمہ کا ترجمہ ”اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا انعام تھا“ جیسے الفاظ میں ہوگا۔

(۱) البقرة: 253۔

(۲) البقرة: 49۔

أصول ترجمہ

ایسے میں ترجمہ کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ”اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی (یا بڑا انعام)“ کہنے یا اس کے برعکس ”اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا انعام تھا (یا بڑی آزمائش)“ کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے لیکن یہاں پر پیش نظر آیت کریمہ میں ایسا نہیں ہے کیوں کہ اُس کے ہر دو جزو صرف ایک مفہوم کے حامل ہیں اس لیے کہ ”تک“ اسم اشارہ ہے اور ”الرسل“ رسول کی جمع مکسر ہے جس کے ترجمہ میں ”یہ رسول ہیں“ کہنے سے دونوں مفہوموں کا اظہار ہو جاتا ہے تو پھر تراجم کے اس انداز کو اصل کے مطابق کون کہے، مگر وہ جن کو معیاری ترجمہ کی اہمیت کا احساس ہے نہ فطری شرائط کا ادراک جن سے ہم کو گلہ ہے نہ شکوہ کیوں کہ اس پوری تحریر میں ہمارے مخاطب صرف وہی حضرات ہیں جو قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کی اہمیت اور اُس کے لوازمات سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی غفلت برت رہے ہیں۔

دوسری مثال:- ”وَلَا يُضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ“ (۱) کا ترجمہ ہندوستان کے

دو مشہور عالم اشرف علی تھانوی اور فتح محمد جالندھری نے کیا ہے جو بالترتیب اس طرح ہیں؛

❶ ”اور کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو۔“

❷ ”اور کاتب دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح کا نقصان نہ کریں۔“

یہ دونوں ترجمے ایک دوسرے سے متضاد ہونے کے باوجود دونوں غلط ہیں متضاد اس لیے ہیں کہ اول الذکر متن کے لفظ ”وَلَا يُضَارُّ“ کو صیغہ مجہول سمجھنے پر مبنی ہے جبکہ ثانی الذکر اُسے صیغہ معلوم سمجھنے پر مبنی ہے جیسا ان کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے۔ غلط اس لیے ہیں کہ احتیاطی تقاضوں کے حوالہ سے اُصولِ ترجمہ کے خلاف ہیں کیونکہ فنِ ترجمہ کے عمومی اُصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب متن کا کوئی لفظ دو متضاد مفہوم رکھتا ہو اور ہر ایک درست ہو اور کسی ایک کو واضح ترجیح بھی نہ ہو جبکہ اُن متضاد مفہوم میں سے ہر ایک کے حوالہ سے ترجمہ کے لیے انفرادی الفاظ دستیاب ہوں لیکن کوئی ایسا جامع لفظ ترجمہ والی زبان میں دستیاب نہیں ہے جو اصل کے قائم مقام اور اُس کی

اُصولِ ترجمہ

جامعیت کے مطابق ہو سکے۔ ایسے تمام مواقع پر فنِ ترجمہ کا احتیاطی اُصول یہ ہے کہ ایک کے حوالہ سے ترجمہ کو تسلسل میں رکھ کر دوسرے کے حوالہ سے ترجمہ کو یائے تنویدیہ کے ساتھ بریکٹ میں کیا جائے جس کے مطابق پیش نظر لفظ کا احتیاطی ترجمہ ”نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے نہ گواہ کو (یا نہ لکھنے والا ضرر دے نہ گواہ، اور نہ کسی لکھنے والے کو ستایا جائے نہ گواہ کو) (یا اور نہ لکھنے والا ستائے اور نہ گواہ) جیسے انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ ایسے مواقع پر ترجمۃ القرآن میں اس عمومی اُصول پر عمل کرنے سے تین فوائد بھی واضح ہوں گے:

❶ ہر احتمال کے مطابق متن کا ترجمہ پورا ہوگا۔

❷ نظم قرآن کا اعجاز واضح ہوگا کہ وہ اپنی جامعیت میں ایسا معجز ہے کہ دوسری زبان اُس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

❸ ترجمہ کی حیثیت سے کلام اللہ کا احتیاطی تقاضا پورا ہوگا۔

باقی رہا یہ تصور کہ آیت کریمہ کے پیش نظر الفاظ میں مذکورہ متضاد معنی کیسے موجود ہیں؟

تو یہ اس طرح ہے کہ لفظ ”لَا يُضَارُّ“ علمِ تشریف کے مطابق باب ”مفاعله“ سے نہی کا صیغہ ہے اور مضاعف ہے۔ جس کی تعلیل کے بعد استعمالی صورت معلوم و مجہول دونوں کو شامل ہوتی ہے فرق محض اعتبار کا ہوتا ہے کہ معلوم المراد ہونے کی اصل صورت قبل التعلیل ”لَا يُضَارُّ“ ہے جبکہ مجہول المراد ہونے کی اصل صورت قبل التعلیل ”لَا يُضَارُّ“ ہے لیکن تعلیل کے بعد جو استعمالی اور عملی صورت ہے اُس میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے بلکہ معلوم و مجہول دونوں کے لیے ”لَا يُضَارُّ“ پڑھا جاتا ہے۔ معلوم المراد ہونے کی صورت میں آیت کریمہ کا ترجمہ ”اور ضرر نہ دے کاتب اور نہ گواہ“ جیسے انداز میں ہوگا جبکہ اُس کی ضد یعنی مجہول المراد ہونے کی صورت میں ترجمہ ”اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے اور نہ گواہ کو“ جیسے مجہول کے انداز میں ہوگا۔

انفرادی طور پر دونوں کے ترجمے درست ہونے کے باوجود اردو زبان میں یہاں پر کوئی

ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو اصل کی جامعیت کے قائم مقام اور اُس کے مطابق ہو سکے۔ ایسے میں

اُصول ترجمہ

مترجم کے لیے فن ترجمہ کے مذکورہ عمومی اُصول پر عمل کرنا ضروری اور ناگزیر قرار پاتا ہے ورنہ ترجمہ ایسا ہی غلط ہوگا جیسا اشرف علی تھانوی اور فتح محمد جالندھری کے مذکورہ ترجموں میں ہوا ہے کیوں کہ مترجم اگر اس احتیاطی اُصول پر عمل نہ کرے گا تو پھر دو صورتوں سے خالی نہ ہوگا۔

❶ دونوں کے حوالہ سے ترجمہ کو تسلسل میں کرے گا۔

❷ صرف ایک کے حوالہ سے ترجمہ پر اکتفا کرے گا جیسا مذکورہ مترجمین نے کیا ہے جبکہ یہ

دونوں غلط ہیں کہ ترجمہ کی تعریف سے ہی خلاف ہیں کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کہ ”وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام اور اُن کے مطابق ہو سکیں“ یہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں پر ترجمہ کے طور پر ایک ہی لفظ استعمال کیا جائے جو متن کے لفظ ”لا یضار“ کے قائم مقام اور اُس کے مطابق دونوں متضاد معنی کو شامل ہو جبکہ یہ چیز مذکورہ دونوں ترجموں میں دور بین میں بھی کہیں نظر نہیں آرہی تو پھر انہیں ترجمہ کی تعریف سے خلاف اور غلط محض نہ کہیں تو اور کیا کہیں لیکن الناس عنه غافلون۔

دوسری شرط:- ترجمہ کی عمومی شرائط کا اجتماعی وجود ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے ضروری ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ عام ترجمہ کی شرائط کی بہ نسبت ترجمۃ القرآن کی خاص شرائط میں دو قسم کی تخصیص ہے:

(i) یہ خاص کلام اللہ کے ترجمہ کی صحت سے متعلق ہیں جبکہ عام ترجمہ کی شرائط کسی بھی کلام کے ترجمہ کی صحت سے متعلق ہو سکتی ہیں عام اس سے کہ اللہ کا کلام ہو یا انسانوں کا۔

(ii) عربی سے دوسری زبان میں ترجمہ کی صحت سے متعلق ہیں بخلاف عام شرائط کے کہ وہ عربی سے عجمی میں ترجمہ سمیت کسی بھی عجمی زبان سے دوسری عجمی میں ترجمہ کی صحت سے متعلق ہو سکتی ہیں۔

حقائق کی اس روشنی میں عمومی شرائط کے اجتماع کو ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے ضروری کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

خلاصہ الکلام:- کسی بھی عام شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ قرآن شریف کا معیاری

ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یوں سمجھی جائے کہ کسی ترجمہ کے بامقصد اور ترجمہ کی تعریف پر منطبق ہونے کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بامحاورہ ہو یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ غلط ہوگا ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے کی بنا پر غلط قرار پانے والے تراجم کی ایک مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 197 کے حصہ ”وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ“ کا کیا گیا وہ ترجمہ ہے جسے السعودیۃ العربیۃ کی سرپرستی میں اہل حدیث علماء کرام کی دورکنی ٹیم نے کیا ہے جس میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبد الجبار کا نام سرفہرست ہے جسے ادارہ دارالسلام ہیڈ آفس الریاض السعودیۃ العربیۃ نے شائع کیا ہے اور پاکستان میں اسلام آباد، کراچی اور لاہور کے شورومز سے تقسیم ہو رہا ہے اُس کا نام ہے ”معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ“ اس میں پیش نظر آیت کریمہ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی سے اُس کو جانتا ہے اللہ“ جسے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اردو محاورہ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کا اردو محاورہ کے مطابق ترجمہ ”اور تم جو بھلائی کرو اللہ اُسے جانتا ہے، اور جو نیکی کرو اللہ اُسے جانتا ہے، اور جو کارِ خیر کرو گے اللہ اُسے ظاہر کرے گا“ جیسے کسی انداز کے بغیر ممکن نہیں ہے جو اردو محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کے محاورہ کے بھی مطابق ہیں لیکن مترجمین نے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو پس پشت ڈال کر تمام توجہ متن کی ترتیب پر مرکوز کی اور یہ نہیں جانا کہ متن کی ترتیب بحال رکھنے کی شرط صرف اُن جگہوں میں موثر ہے جہاں پر ترجمہ والی زبان کا محاورہ متن کی ترتیب کے مطابق ہو رہا ہو ورنہ ترجمہ کے محاورہ کو متن کی ترتیب پر ترجیح ہوتی ہے کہ اس میں ترجمہ سے مقصد کی تکمیل ہونے کے ساتھ متن کے اصل کلام یعنی کلام نفسی کے ساتھ بھی مطابقت ہوتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسا اللہ تعالیٰ نے مختلف عجمی زبان بولنے والے کچھ حضرات کے اصل کلام کو قرآن شریف کی خاص عربی زبان میں نقل فرمایا ہے جس میں دونوں زبانوں کی ترتیب غالب اکثریت سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اس کے

أصول ترجمہ

باوجود حکایت و ترجمہ والی قرآنی زبان کے محاورہ کو محکی عنہ والی عجمی زبان کے محاورہ سے خلاف نہیں کہا جاسکتا ورنہ نقل و حکایت اصل کے مطابق ہوگی نہ ترجمہ جو کلام العجم کی نقل و ترجمہ پر مشتمل تمام آیات کے کذب پر منتج ہوگا العیاذ باللہ۔ جس وجہ سے متن کی ترتیب کو محاورہ پر ترجیح دینے کو درایت تسلیم کرتی ہے نہ روایت۔ ورنہ ترجمہ ایسا ہی بے ڈھنگا اور کریہہ فی السمع ہوگا جیسا پیش نظر ترجمہ میں ہوا ہے۔ نیز ترجمۃ القرآن سے اصل مقصد ترجمہ والی زبان والوں کو بلا کم و کاست قرآن شریف کے مقاصد سے آگاہ کرنا ہے جو با محاورہ ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور با محاورہ ترجمہ وہی کہلاتا ہے جو اصل کے معانی و مقاصد کی فہمائش کے حوالہ سے دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو جس میں اصل کا محاورہ بطور متبوع ضروری ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کا محاورہ اُس کے تابع اور اُس پر متفرع ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے جس سے درج ذیل اصول وجود میں آتے ہیں:

پہلا اصول:۔ ترجمہ کے عرفی معنی اور اس کی تعریف پر منطبق اور با مقصد ترجمہ ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے، بے محاورہ ترجمہ مفید مقصد نہیں ہو سکتا۔

دوسرا اصول:۔ ترجمہ والی زبان کا محاورہ متن کی ترتیب کا نہیں بلکہ اُس کے محاورہ کا تابع ہوتا ہے۔

تیسرا اصول:۔ ترجمہ کی زبان کو متن کی ترتیب کا تابع کرنا ایسا ہی غلط ہے جیسا متن کے محاورہ کو ترجمہ کے محاورہ کا تابع کرنا غلط ہے۔

چوتھا اصول:۔ جس جگہ ترجمہ کی زبان کا محاورہ متن کی زبان کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ اس کی ترتیب بھی اُس کی ترتیب کے مطابق ہونا ممکن ہو وہیں پر ترجمہ کی صحت کے لیے ترتیب متن کی پابندی بھی شرط ہوتی ہے جس کے بغیر ترجمہ غلط ہو سکتا ہے۔

پانچواں اصول:۔ جس جگہ دونوں محاوروں کو ملحوظ خاطر رکھ کر ترجمہ کو با محاورہ کرنے میں متن

أصول ترجمہ

کی ترتیب بحال رہنے کا امکان نہ ہو وہیں پر ترتیب متن کی پابندی والی شرط غیر موثر بلکہ کالعدم ہوتی ہے کیوں کہ ترجمہ سے اصل مقصد جو متن کے معانی اصلہ اور مفہوم اول سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے با محاورہ ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ایسے میں سورۃ البقرہ، آیت نمبر 197 کے حصہ ”وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ“ کے اُس ترجمہ کو با محاورہ کہا جاسکتا ہے نہ معیاری جسے ادارہ درالسلام السعودیہ الریاض نے شائع کیا ہے، حقیقت میں اُس کی حیثیت ترجمۃ القرآن کی ہرگز نہیں بلکہ ترجمۃ الفاظ القرآن ہے جس میں بالترتیب الفاظ قرآن کے انفرادی معانی دوسری زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جبکہ ترجمۃ القرآن کلام اللہ کا ترجمہ ہے جو الفاظ و معانی کے مجموعہ سے عبارت ہے، محض الفاظ یا صرف معانی سے نہیں۔

افسوس بالانے افسوس:- مولانا حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبدالجبار کے اشتراک عمل سے کیا گیا یہ ترجمہ صرف اردو محاورہ سے خلاف ہے جبکہ اسی آیت کریمہ کے ترجمہ میں اشرف علی تھانوی، حافظ نذیر احمد دہلوی، عاشق الہی میرٹھی، علامہ وحید الزمان، فتح محمد خان جالندھری، مولانا تقی عثمانی، مولانا عبد الماجد دریابادی جیسے مشاہیر الہند نے جو فساد کیا ہے وہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے کے ساتھ علم الہی کے حوالہ سے اسلامی عقیدہ سے بھی خلاف ہے ان حضرات کے کیے ہوئے تراجم بالترتیب درج ذیل ہیں؛

① ”اور جو نیک کام کرو گے خدائے تعالیٰ کو اُس کی اطلاع ہوتی ہے۔“

② ”اور نیکی کا کوئی سا کام بھی کرو وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا۔“

③ ”اور جو کچھ تم کرو گے نیکی اُس کو اللہ جان لے گا۔“

④ ”اور جو نیک کام تم کرو گے اللہ کو معلوم ہو جاوے گا۔“

⑤ ”اور جو نیک کام تم کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا۔“

⑥ ”اور تم جو کوئی نیک کام کرو گے اللہ اُسے جان لے گا۔“

⑦ ”اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا۔“

أصول ترجمہ

اُردو محاورہ سے واقف وہ کون ہو سکتا ہے جو تراجم کے اس انداز کو اُس کے محاورہ کے مطابق کہہ سکے یا علم الہی سے متعلق ایسا عقیدہ، ایسے الفاظ اور ایسے انداز کلام کو جائز کہہ سکے نہ صرف اہل علم بلکہ ہر مومن مسلمان جانتا ہے کہ علم الہی کی کوئی شکل اور کوئی ایک صورت بھی ایسی نہیں ہے جو غیر سے مستفاد ہو، کسی اور کی طرف سے خبر اور اطلاع دینے کی راہ سے ہو تو پھر وہ کون سا مسلمان ہو سکتا ہے جو اول الذکر ترجمہ ”جونیک کام کرو گے خدائے تعالیٰ کو اُس کی اطلاع ہوتی ہے“ کے ان الفاظ اور اس انداز کو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق اور اُس کے ذاتی وازلی علم کے مطابق کہہ سکے۔ نیز ہر مومن مسلمان جانتا ہے کہ انسانوں کے ہر اچھے اور برے یعنی سب اعمال سے متعلق اللہ کو پہلے سے علم ہے جو ازلی ہے اور زمانہ کی قید اور ماضی، حال، مستقبل کی حدود سے ماوراء اور لامحدود ہے جس میں انقطاع کی گنجائش ہے نہ حدود و تغیر کا امکان تو پھر مذکورہ تراجم ”وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا، اُس کو اللہ جان لے گا، اللہ کو معلوم ہو جاوے گا، اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا“ کے جواز کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے اور کون سا مسلمان اسے اسلامی انداز کلام کہہ سکتا ہے؟ الغرض علم الہی سے متعلق اسلام میں ایسے عقیدہ کی گنجائش ہے نہ ایسے انداز کلام کی جس وجہ سے اُردو محاورہ کی پوری تاریخ میں بھی کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ لکھتے وقت اگر مترجمین حضرات ترجمہ کی تعریف کو ہی پیش نظر رکھتے کہ وہ ”اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام اور اُن کی متعارف حیثیات کے مطابق ہوں“ پھر بھی ایسی فحش غلطی نہ کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے کہ آیت کریمہ کے الفاظ ”یعلمہ اللہ“ کے عوض ترجمہ والی زبان سے جو الفاظ ہم استعمال کر رہے ہیں یہ اُن کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہیں کیوں کہ اُن کی عرفی حیثیت میں حدوث و انقطاع نہیں بلکہ دوام و استمرار اور ازلیت ہے تو پھر (وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا، اُس کو اللہ جان لے گا، اللہ کو معلوم ہو جاوے گا، اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا) جیسے حدوث و انقطاع کے یہ الفاظ اُن کے مطابق ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔ نیز یہ سب کچھ لکھتے وقت اگر وہ ترجمہ القرآن کی مخصوص شرط ”علم کلام پر عبور“ اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات

اصول ترجمہ

سے متعلق مسلمہ اسلامی عقائد کو پیش نظر رکھتے پھر بھی ایسی فحش غلطی نہ کرتے لیکن افسوس کہ یہ حضرات ترجمۃ القرآن کی شرائط کو خاطر میں لائے اور نہ اُس کی تعریف کو پیش نظر رکھا بلکہ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں کی طرح بغیر شرائط کے مترجم بننے کے شوق نے انہیں کدھر سے کدھر پہنچا دیا۔ (العیاذ باللہ)

بے محاورہ ترجمہ کی یہ مثالیں بتا رہی ہیں کہ ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف کتنا مظلوم ہے، جب مشاہیر الہند کے کیے ہوئے تراجم کی غلطیوں کا یہ عالم ہے تو پھر غیر معروف حضرات کے کیے ہوئے تراجم کا کہنا ہی کیا ہے اس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے کی بنا پر قرآن شریف کے جس ترجمہ کو بے محاورہ اور غلط قرار دیا جاتا ہے اُس کی مشتبہ نمونہ از خروارے ان مثالوں کے علاوہ بطور دانہ از انبارے دوسری مثال کے لیے سورۃ آل عمران، آیت نمبر 26 ”قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ کے اس ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے ”اے محمد! آپ اللہ تعالیٰ سے یوں کہیے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں“ یہ ترجمہ اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ہے جو دو وجہ سے ترجمہ والی زبان کے محاورے سے خلاف ہے:

پہلی وجہ:- اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جبکہ اردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنا متعارف نہیں ہے اور اردو زبان کے ماہرین اور اس کے امام سمجھے جانے والے حضرات سے بھی ایسا کوئی محاورہ اور کوئی مثال موجود نہیں ہے بلکہ سب نے اُس وحدہ لا شریک کی واحد و یکتا ذات کے لیے مفرد الفاظ استعمال کیے ہیں۔

دوسری وجہ:- اس میں آیت کریمہ کے ابتدائی حصہ کے ترجمہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

أصول ترجمہ

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کا ترجمہ اور بعد والے حصوں میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے خطاب کا ترجمہ بھی لفظ (آپ) میں کیا گیا ہے جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے سراسر خلاف ہے کیوں کہ اردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرنے میں لفظ آپ متعارف ہے نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کو خطاب کرنے میں بلکہ ہر دو طرف سے خطاب کے لیے حسب مناسب دوسرے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ پیش نظر آیت کریمہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

ایسے میں ترجمہ کے اس انداز کو با محاورہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے اور با محاورہ ہونے کے لیے معیار یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو اس سے قرآن شریف کے بے محاورہ ترجمہ کی پہچان آپ ہی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی تین قسمیں ہیں؛

پہلی قسم:- وہ جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہو جس کی مثالیں گزشتہ سطور میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

دوسری قسم:- وہ ہے جو متن کے محاورہ سے خلاف ہو اس کی **ایک مثال** مشہور نمونہ

از خروارے دیباجۃ سور القرآن یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا مولانا محمد جونا گڑھی کا کیا ہوا ترجمہ ہے ”شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے“ اس ترجمہ میں مولانا محمد جونا گڑھی منفرد نہیں ہے بلکہ اُن سے پہلے اور بعد بھی بہت سے مترجمین نے بسم اللہ شریف کا اسی انداز سے ترجمہ کیا ہے ہم یہاں پر مولانا جونا گڑھی کا حوالہ اس لیے دے رہے ہیں کہ اس ترجمہ کو سعودیہ العربیہ کے امور مذہبیہ اور وزارت الاوقاف و اشاعۃ القرآن میں بڑا اعتماد حاصل ہے اور السعودیہ العربیہ کے زیر اہتمام لاکھوں کی تعداد میں اس کی اشاعت و تقسیم کا اہتمام کیا جاتا ہے ہمارا مقصد اہل علم کو آگاہ کرنا ہے کہ سعودیہ

عربیہ کے امور مذہب میں دخیل اور مجمع الملک الفہد لطباعۃ القرآن کے نگران اعلیٰ عالی جناب ڈاکٹر عبداللہ ابن عبدالحسن الترمذی کے اعتماد یافتہ شخصیت کے ترجمہ کا یہ عالم ہے تو پھر دوسروں کے تراجم کا کہنا ہی کیا ہے۔ مولانا محمد جونا گڑھی اور ان جیسے دوسرے مترجمین کے کیے گئے یہ تمام تراجم اس لیے غلط ہیں کہ با محاورہ نہیں ہیں کیوں کہ ان میں ترجمہ والی زبان کے مفرد متن کا ترجمہ مرکب تام میں کیا گیا ہے جیسا ان کے الفاظ ”جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے“ سے صاف ظاہر ہے جس میں لفظ ”ہے“ لگا کر اسم جلال پر ”رحمن ورحیم“ کا حکم کیا گیا ہے یعنی اسم جلال کو مسند الیہ اور ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کو اُس کے لیے خبر اور مسند ظاہر کیا گیا ہے جو مرکب غیر تام و مفرد میں نہیں ہوتا بلکہ مرکب تام کا خاصہ ہے جو متن میں نہیں ہے کیوں کہ نحوی اصولوں کے مطابق یہاں پر اسم جلال موصوف اور اس کے بعد ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور صفات و موصوف سے مجموع مرکب ہونے والے الفاظ مرکب تام اور جملہ نہیں ہوتے کیوں کہ وہ جملہ کے مقابلہ میں ہمیشہ مفرد اور مرکب غیر تام ہی کہلاتے ہیں جس میں نحاۃ کی دورائے ہیں نہ بلغاء کی جس کے مطابق بسم اللہ شریف کا با محاورہ ترجمہ (اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا..... شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو با محاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہیں۔

تیسری قسم :- جو دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف ہو یعنی یک نہ شد و شد اس کی مثال کے لیے بطور دانے از انبارے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں“ جس میں لفظ ”ہیں“ کا حکم لگا کر جہاں متن کے محاورہ سے خلاف کیا ہے وہاں ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے بھی خلاف کیا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع

کے الفاظ استعمال کرنے کی کوئی مثال موجود نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی تعظیم وادب کو انسانوں کی تعظیم وادب پر قیاس کر کے ایسا لہجہ استعمال کرنے کا تعارف ہے تو پھر ترجمہ کے اس انوکھے انداز کو دونوں محاوروں سے خلاف کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ حقائق کی اس روشنی میں ترجمہ کی عمومی شرائط کے اجتماعی وجود کو ترجمہ القرآن کی مخصوص شرائط کا حصہ قرار دینے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت:- نظم قرآن یعنی آیت کریمہ اور اس کے الفاظ کی ترتیب کو

ملفوظ خاطر رکھنا ہر اس جگہ ترجمہ کی صحت کے لیے شرط قرار پاتا ہے جہاں پر ترجمہ کے الفاظ کو اس کے مطابق رکھنا ممکن ہو ورنہ دونوں زبانوں کے محاورہ کی مطابقت کو ترتیب پر ترجیح ہونے کی وجہ سے اس شرط کا تصور باقی نہیں رہتا کیوں کہ دونوں زبانوں میں الفاظ کی ترتیب کا توافق ضروری نہیں ہے کبھی ممکن ہوتا ہے کبھی ناممکن جبکہ ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے با محاورہ کرنا ضروری ہے۔ نیز ترجمہ کی تعریف میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کا متن کے محاورہ سے توافق معتبر ہے جبکہ الفاظ کی ترتیب کا توافق مسکوت عنہ کے درجہ میں ہے اور خارجی دلائل سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں۔ ہونے کی مثال کے لیے مشتے نمونہ اذخروارے سورۃ الاخلاص کا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”کہہ دے وہ اللہ ہے ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی“ سب ناظرین وقارئین پر واضح ہے کہ اس میں ترجمہ با محاورہ ہونے کے ساتھ اس کے الفاظ کی ترتیب بھی متن کی ترتیب کے عین مطابق ہے۔ اور نہ ہونے کی مثال کے لیے بطور دانے از انبارے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے اس ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے ”اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا“ جو با محاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے تو مطابق ہے لیکن متن کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے اگر اس کے مطابق کر کے یوں کہا جائے ”شروع سے نام اللہ جو بہت مہربان رحمت والا“ تو با محاورہ نہ رہے گا یعنی ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہو کر بے مقصد ہو گا نہ صرف اتنا بلکہ ترجمہ کی تعریف سے بھی خلاف ہو گا

أصول ترجمہ

کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کہ وہ ”قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں“ الفاظ کی انفرادی حیثیات کو شامل ہونے کی طرح اُن کی اجتماعی نوعیت کو بھی شامل ہے جس میں دونوں زبانوں کے محاورہ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ان حقائق کا فطری تقاضا ہے کہ جس جگہ ترتیب متن کی بحالی ممکن ہو وہاں پر اُس کی پابندی شرط ہو کہ وہ اصل ہے اور مزاحم و معارض موجود نہیں ہے جبکہ بغیر معارض کے اصل سے خلاف کرنا جائز نہیں ہے اس کی منفی مثالوں کے لیے مشتمل نمونہ از خروارے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا ایک مشہور ہندی عالم مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ”شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے“ جس میں اسم اللہ یعنی اللہ کی طرف منسوب نام جو متن میں مقدم ہے کو آخر میں رکھ کر ترتیب سے خلاف کیا گیا ہے جو کم از کم تین خرابیوں پر منتج ہے؛ پہلی خرابی:۔ خلاف الاصل ہے جبکہ معقول و موثر معارض کے بغیر اصل سے خلاف کرنا جائز نہیں ہے اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر قطعاً کوئی معارض موجود نہیں ہے بلکہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہوتے ہوئے ترجمہ کی ترتیب متن کی ترتیب کے مطابق ہونا ممکن ہے تو پھر ترجمہ کے اس بے ڈھنگے پن کا جواز ہی کیا ہے؟

دوسری خرابی:۔ متن کی بلاغی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ بسم اللہ میں لفظ ”ب“ یعنی جار و مجرور کا مجموعہ جسے علم کی زبان میں قائم مقام ظرف بھی کہتے ہیں بغیر عامل کے نہیں ہوتا جسے متعلق کہا جاتا ہے مفسرین کی روشنی میں یہاں پر اُس کے حوالہ سے متعدد احتمالات ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس سے موخر ہو اس صورت میں علم بلاغت کے مطابق تقدیم ماحقہ التاخیر سے مقصد حصر کا افادہ ہے کہ شروع کرنے کا عمل اسم اللہ کی مدد کے بغیر کسی اور سے نہیں ہے جبکہ ترجمہ کا یہ انداز حصر سے صریح خلاف ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جسے علم المعانی سے قدرے شناسائی ہو۔

تیسری خرابی:- ترتیب متن کی عرفانی اور واقعی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ اہل کشف عرفاء کے مطابق کائنات کا یہ پورا نظام ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کی ترتیب کے انداز پر وجود میں آیا ہے۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے اس کے پس منظر سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا ہے؛

”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ظہر العالم“ (۱)

یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کی اس ترتیب سے ہی عالم کا ظہور ہوا ہے۔

نیز اسم بمعنی وسم ہے یعنی پہچان و علامت جس کے مطابق دنیا کی ہر شے حق سبحانہ و تعالیٰ کی پہچان اور اُسے جاننے کی علامت ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے حضرت عبداللہ ابن عباس (رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا) کے حوالہ سے فرمایا:

”فی کل شیئی اسم من اسمائہ واسم کل شیئی من اسمہ“ (۲)

یعنی دنیا کی ہر شے میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کوئی نہ کوئی اسم کار فرما ہے یہاں تک کہ ہر شے کا اسم بھی اللہ تعالیٰ کے اسم سے ہے۔

اس کے مطابق اگر اردو زبان میں مضاف الیہ کو مضاف سے پہلے ذکر کرنے کا محاورہ نہ ہوتا اسم کا ترجمہ بھی لفظ ”اللہ“ سے پہلے کیا جاتا چہ جائیکہ اُس کی صفات یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ سے بھی موخر کرنا جائز ہو۔ پیش نظر شرط کی مزید توضیح کی خاطر **دوسری**

مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 203 کے حصہ ”وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيّامِ مَّعْدُوْدَاتٍ“ کے ڈپٹی نذیر احمد، فتح محمد خان جالندھری، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مفتی غلام سرور لاہوری، ڈاکٹر طاہر القادری، مولانا تقی عثمانی کے کیے ہوئے تراجم کو بھی دیکھا جاسکتا ہے جو بالترتیب اس طرح ہیں:

(۱) الفتوحات المکیہ، ج، ص: 102، مطبوعہ دار صادر بیروت۔

(۲) فتوح الغیب، مقالہ نمبر: 74، ص: 502، مطبوعہ النوریہ الرضویہ لاہور۔

اصول ترجمہ

- ❶ اور گنتی کے ان چند دنوں میں خدا کی یاد کرتے رہو۔
- ❷ اور قیام منی کے دنوں میں جو گنتی کے دن ہیں خدا کو یاد کرو۔
- ❸ اور اللہ کو ان چند گنے ہوئے دنوں میں برابر یاد کرتے رہو۔
- ❹ اور تشریق کے گنتی کے تین دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔
- ❺ اور اللہ کو ان گنتی کے چند دنوں میں خوب یاد کیا کرو۔

❻ اور اللہ کو گنتی کے (ان چند) دنوں میں (جب تم منی میں مقیم ہو) یاد کرتے رہو۔

جن میں ان چھ مشاہیر نے کسی مجبوری اور کسی عارضہ کے بغیر آیت کریمہ میں موخر الذکر الفاظ ”فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ“ کے ترجمہ کو ”وَإِذْكُرُوا اللَّهَ“ سے پہلے ذکر کر کے اُس کی ترتیب سے خلاف کیا ہے جبکہ ترجمہ کو محاورہ کے مطابق کرنے کے ساتھ یہاں پر متن کی ترتیب کے مطابق کرنا بھی ممکن ہے جیسا ”اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں، اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے دنوں میں“ جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے تو پھر اُس کی ترتیب سے خلاف کرنے کا کیا جواز ہے۔

متوقع اشتباہ کا ازالہ:-

کسی ضرورت داعیہ یا ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کی ترتیب سے خلاف کیے جانے والے تراجم کی ان مثالوں سے نا پختہ ذہنوں میں اس اشتباہ کا پیدا ہونا بعید نہیں ہے کہ ان کے مقابلہ میں جن تراجم کو با محاورہ ہونے کے ساتھ متن کی ترتیب کے مطابق قرار دے رہے ہو اُن میں بھی ترتیب متن کی پوری طرح موافقت نہیں ہے کیوں کہ اول الذکر ”اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں میں“ اور ثانی الذکر ”اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے دنوں میں“ فعل کے متعلق یعنی ”فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ“ کا ترجمہ اگرچہ فعل ”وَإِذْكُرُوا اللَّهَ“ سے موخر ہے جسے بالترتیب کہنا درست ہے لیکن فعل ”وَإِذْكُرُوا“ کا ترجمہ اسم جلال ”اللہ“ سے موخر ہونے کی وجہ سے اُس کی ترتیب سے خلاف ہے تو پھر ان کے مقابلہ میں اُن تراجم کو با محاورہ وبالترتیب قرار کیوں نہ دیا جائے جن میں متن کے ہر جزو کی ترتیب سے موافقت ہو رہی ہے جیسا (اور تم یاد کرو اللہ کو گنتی کے دنوں میں، اور تم یاد کرو اللہ کی گنتی کے دنوں میں، اور یاد کرو اللہ کو گنتی

أصول ترجمہ

کے چند دنوں میں) جیسے کسی بھی انداز کو دیکھا جاسکتا ہے جو با محاورہ ہونے کے ساتھ ترتیب متن کے بھی پوری طرح موافق ہیں۔

اس کا جواب سمجھنے کے لیے علی سبیل التہید چند مسلمات کو سمجھنے کی ضرورت ہے؛

پہلی تمہید:۔ قرآن شریف کے با محاورہ ترجمہ کی صرف ایک صورت ہے کہ دونوں محاوروں کے مطابق ہو۔

دوسری تمہید:۔ متن قرآن کے محاورہ میں اُس کی بلاغت و فصاحت بھی شامل ہیں یعنی فصاحت و بلاغت کے بغیر لسانِ قرآنی کا محاورہ متصور نہیں ہے اور ترجمہ کے محاورہ اُس کے محاورہ کے مطابق ہونے سے مطلب یہ ہے کہ اُس کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اندازِ کلام سے بھی خلاف نہ ہو۔

تیسری تمہید:۔ جس مقام پر ترجمہ کو متن قرآن کی ترتیب کے مطابق رکھنے میں ترجمہ کی فصاحت متاثر ہو رہی ہو یا کم از کم افصح کے مقابلہ میں فصیح ہو رہا ہو تب بھی ترجمہ کے محاورہ کو ترتیب متن پر ترجیح دینا ضروری ہے۔ ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے ان ناگزیر مسلمات کو ذہن میں مستحضر رکھنے کے بعد مذکورہ اشتباہ کا جواب آسان ہو جاتا ہے کہ جن تراجم کی ترتیب کو آیت کریمہ کی ترتیب کے ساتھ پوری طرح موافق کہا جا رہا ہے وہ فصیح نہیں ہیں جب فصیح نہیں تو پھر با محاورہ بھی نہیں ہیں جبکہ ترجمہ کا با محاورہ ہونا ضروری ہے۔

تیسری تمہید:۔ قرآن شریف کی جس آیت اور جس حصے کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی تمام متعارف حیثیات کا احاطہ ہو، متعارف حیثیات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ قرآن شریف کے ترجمہ کا تعلق اُس سے معلوم ہونے والے معانی سے ہے جنہیں مفہومِ اول کہا جاتا ہے اور قرآن شریف کے ترجمہ سے مقصد بھی ان ہی معانی سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہے اور یہ وہ معانی ہیں جنہیں اہل لسان یعنی عرب صرف سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ سکتے ہیں اور اہل عجم علومِ خادمہ لفہم

اصول ترجمہ

القرآن کے وسیلہ سے سمجھتے ہیں قرآن شریف کے ترجمہ سے غرض و غایت کا تعلق ان ہی کے ساتھ مختص ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ جمہور الناس ان ہی کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے ذمہ دار و مکلف ہیں جس وجہ سے ان ہی سے اہل عجم کو ترجمہ القرآن کے ذریعہ سے آگاہ کرنا امت پر فرض کیا گیا ہے جبکہ ان کے بعد نظم قرآن کے حسن میں لپٹے ہوئے وہ معانی و رموز اور معارف و اسرار جنہیں مفہوم ثانی اور مثانی القرآن جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ان کے ساتھ قرآن شریف کے ترجمہ کا تعلق ہے نہ جمہور الناس پر ان کا ادراک و عمل فرض ہے۔ ایسے میں ترجمہ القرآن کی مخصوص شرائط کے سلسلہ میں متن قرآن کی متعارف حیثیات کو پیش نظر رکھے بغیر چارہ کار نہیں ہے یہ وہ نکتہ ہے جس سے غفلت کی بنا پر مترجمین کی غالب اکثریت بے اعتدالیوں کے گھڑے میں گر رہی ہے اور تراجم پر تبصرہ کرنے والے معیاری تراجم کی تغلیط اور غیر معیاری کی تصویب کرنے کی معکوس العملی میں مبتلا نظر آرہی ہے۔ (فیما للعجب لهذا العجب)

الغرض ترجمہ القرآن کی مخصوص شرائط کے سلسلہ میں اس تیسری شرط (آیت کریمہ کی تمام متعارف حیثیات) کے احاطہ کے تحت ضروری امور درج ذیل ہیں:

① ترجمہ کی جانے والی آیات جن اشتقاقی الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں ان کے مشتق منہ اور اصل کی علی وجہ البصیرت پہچان ضروری ہے ورنہ ترجمہ غلط ہو سکتا ہے جس کی منفی مثالوں کی مشتے نمونہ از خروارے ایک مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 254 ”وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ“ کا وہ ترجمہ دیکھا جائے جو مولانا ریاض حسین شاہ نے کیا ہے ”اور دبیز اندھیروں میں تو درحقیقت کفر والے ہیں“ وہ کون سا ہوش مند انسان ہوگا جو پیش نظر آیت کریمہ کے اس ترجمہ کو یہاں پر درست کہہ سکے۔ اس کے غلط ہونے کی وجوہ اگرچہ متعدد ہیں تاہم یہاں پر ہمارا مقصد محض ایک وجہ کی توضیح ہے کہ دبیز اندھیرے متن کے لفظ ”الظَّالِمُونَ“ کے قائم مقام ہے نہ اس کے مطابق جس کی واحد وجہ یہی ہے کہ یہ اس کے اشتقاق سے خلاف ہے کیوں کہ وہ ”ظلمۃ“ سے نہیں بلکہ ”ظلم“ سے اشتقاق پا کر استعمال ہوا ہے جبکہ مترجم نے بزعم خویش

أصول ترجمہ

اُسے ”ظلمة“ سے مشتق سمجھ کر یہ ترجمہ کر ڈالا جسے سو فہم اور بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ لکھتے وقت اگر مترجم لفظ ”الظلمون“ کی اشتقاقی حیثیت پر غور کرتا اور ”ظلم“ و ”ظلمة“ کے مابین لغوی فرق کی تمیز کرتا تو ترجمہ القرآن کے نام سے خط کی یہ مثال قائم نہ کرتا۔ ایسے میں الفاظ قرآنی کی اشتقاقی حیثیت کو اور اُن کے اصل کو جاننا ترجمہ کی صحت کے لیے ناگزیر شرط نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

اس شرط کی اہمیت کے پیش نظر مزید وضاحت کی غرض سے دوسری مثال کے لیے سورۃ حم السجدہ، آیت نمبر 41 ”وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ“ کے وہ تراجم دیکھے جاسکتے ہیں جو مولانا محمد جونا گڑھی اور اشرف علی تھانوی نے کیے ہیں جو بالترتیب اس طرح ہیں (یہ بڑی با وقعت کتاب ہے جس کے پاس باطل پھٹک بھی نہیں سکتا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، اور یہ قرآن بڑی با وقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور اس کے پیچھے کی طرف سے) جن میں ”عزیز“ کا ترجمہ ”با وقعت“ میں کر کے اس کی اشتقاقی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے جس سے لغوی حیثیت سے خلاف ہونا آپ ہی لازم آ رہا ہے کیوں کہ صفت مشبہ کا یہ لفظ ”عزۃ“ سے مشتق ہے جبکہ لسان قرآنی کی لغت کے مطابق خود لفظ ”عزۃ“ بھی اور اس سے مشتق ہو کر استعمال ہونے والا لفظ ”عزیز“ بھی جن معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں اُن میں با وقعت جیسا کوئی مفہوم شامل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سید محمود بغدادی آلوسی نے امام جلال الدین السیوطی کے حوالہ سے جو تحقیق پیش کی ہے اُسی پر اکتفا کریں کیوں کہ وہ اس سلسلہ کا ایسا جوہر ہے جس کے بعد کسی کلام کی ضرورت ہی نہیں رہتی وہ یہ ہے کہ جب اس کا مفہوم قلیل الوجود اور نایاب ہونے کے ہو یا مکرم و معزز ہونے کے ہو یا عظیم الذات والصفات یا ذلت کی ضد میں ہو ان چاروں صورتوں میں مضارع مکسور العین سے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۸ ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ اور سورۃ ہود، آیت نمبر ۹۱ ”وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا

أصول ترجمہ

بَعَزِيزٌ“ اور سورۃ مجادلہ، آیت نمبر ۲۱ میں لفظ ”عزیز“ جس مصدر ”عَزَا، عَزَّةً، عَزَاةً“ میں سے جس سے بھی اشتقاق پا کر ”عزیز“ کی صورت میں آیا ہو اُس کا اصل استعمال ”عَزَزَ، يَعْزِزُ“ میں متصور ہوگا جو تلفظ میں سہولت لسانی کی غرض سے ادغام پا کر ”عَزَّ، يَعْزُّ“ کی معروف شکل میں آچکا ہے۔ اور سخت، گراں، دشوار جیسے کسی مفہوم میں ہونے کی صورت میں باب ”سَمِعَ، يَسْمَعُ“ سے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۲۸ ”عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ“ میں اس کا اصل استعمال ”عَزَزَ، يَعْزِزُ“ متصور ہوگا جو سہولت لسانی کی خاطر مدغم ہو کر ”عَزَّ، يَعْزُّ“ کی معروف تلفظ سے ”عزیز“ کی شکل اختیار کر چکا ہے اور کسی کو مدد دے کر غالب کرنے یا اس کی ضد یعنی کسی کے خلاف مدد دے کر اُسے مغلوب و ذلیل کرنے کے مفہوم میں ہونے کی صورت میں ”نَصَرَ، يَنْصُرُ“ سے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق سورۃ مجادلہ کی آیت نمبر ۲۱ ”كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ“ اور سورۃ القمر، آیت نمبر ۴۲ ”فَأَخَذْنَا هُمْ أَخَذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ“ کا اصل استعمال ”عَزَزَ، يَعْزِزُ“ متصور ہوگا جو ادغام کے بعد ”عَزَّ، يَعْزُّ“ کی معروف شکل سے ”عزیز“ کی صورت اختیار کی ہے۔

باقی رہا یہ تصور کہ یہ آخری دونوں مفہوم جو باب ”نَصَرَ، يَنْصُرُ“ سے استعمال ہوتے ہیں متعدی ہیں جبکہ صفت مشبہ کی ساخت فعل متعدی سے نہیں بلکہ فعل لازم سے ہوتی ہے۔ ایسے میں لفظ ”عزیز“ جیسے صفت مشبہ کے متعدی ہونے کا کیا جواز ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی لفظ ”رحمان ورحیم“ کا صفت مشبہ ہونے کے قبیل سے ہے کہ صفت مشبہ کے ان الفاظ کو وجود میں لانے سے قبل ان کے متعدی افعال کو باب ”كَرُمَ، يَكْرُمُ“ کے انداز پر رکھ کر ان کا اشتقاق کیا جاتا ہے، بہر حال لفظ ”عزیز“ اور اس کے اصل استعمال اور معانی و مفہوم سے متعلق حضرت محمود آلوسی نے جلال الدین السیوطی کے حوالہ سے جو تحقیق پیش کی ہے وہ اُن کے اپنے منظوم کلام میں اس طرح ہے:

أصول ترجمہ

يَا قَارِنَا كُتِبَ الْآدَابُ كُنْ يَقْظَا وَخَرِّ الْفَرْقُ فِي الْأَفْعَالِ تَحْرِيرَا
عَزَّ الْمَضَاعِفُ يَأْتِي فِي مَضَارِعِهِ تَثْلِيثُ عَيْنٍ بِفَرْقٍ جَاءَ مَشْهُورَا
فَمَا كَقَلٍّ وَضِدُّ الدَّلِّ مَعَ عَظْمٍ كَذَا كَرُمْتَ عَلَيْنَا جَاءَ مَكْسُورَا
وَمَا كَعَزَّ عَلَيْنَا الْحَالُ أَيْ صَعِبَتْ فَافْتَحْ مَضَارِعَهُ إِنْ كُنْتَ نَحْرِيرَا
وَهَذِهِ الْخَمْسَةُ الْأَفْعَالُ لِأَزْمَةٍ وَاضْمُمُ مَضَارِعَ فَعْلٍ لَيْسَ مَقْصُورَا
عَزَزْتُ ذِيْدَا بِمَعْنَى قَدْ غَلَبْتُ كَذَا أَعْتَشُهُ فَكَلَا ذَا جَاءَ مَآثُورَا
وَقِيلَ إِذَا كُنْتَ فِي ذِكْرِ الْقَنُوتِ وَلَا يَعِزُّ يَا رَبُّ مِنْ عَادِيْتِ مَكْسُورَا
وَأَشْكُرُ لَا هَلْ عُلُومُ الشَّرْعِ أَذْشَرُ حَوَا لَكَ الصَّوَابُ وَأَبْذُوَافِيهِ تَذَكِيرَا
امام سیوطی کے ان اشعار کا بالترتیب مفہوم یہ ہے کہ ”اے ادب کی کتابوں کو پڑھنے
والے بیدار رہو اور افعال میں فرق کو اچھی طرح لکھ، ”عَزَّ“ جو ثلاثی مجرد سے مضاعف ہے اس کے
مضارع میں عین پر تینوں حرکات آتی ہیں جن کا استعمال متفرق و مشہور معانی کے لیے آیا ہے تو پھر
جس کا استعمال کم ہونے کے مفہوم کے لیے، ذلت کی ضد کے لیے، عظیم ہونے کے لیے، مکرم ہونے
کے لیے ہو ان چاروں صورتوں میں مکسور العین آیا ہے اور جس کا استعمال ”عَزَّ عَلَيْنَا الْحَال“ جیسے
مفہوم کے لیے ہو یعنی سخت اور دشوار ہونے جیسے کسی بھی مفہوم کے لیے ہو تو اُس وقت اسے مفتوح
العین پڑھے اگر تو اہل علم ہے اور یہ پانچوں افعال لازم ہیں جو صرف فاعل پر تمام ہوتے ہیں مفعول
بہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور متعدی ہونے کی صورت میں اس کے مضارع کو مضموم العین پڑھے اس
صورت میں کبھی ”عَزَزْتُ ذِيْدَا“ یعنی میں نے ذید کو مغلوب و مقہور کیا، جیسے مفہوم میں ہوتا ہے اور
کبھی اس کی ضد یعنی میں نے اُس کو مدد دی کے مفہوم میں ہوتا ہے، لفظ ”عَزَّ“ کا استعمال ان دونوں
معانی کے لیے مستعمل آیا ہے۔ اور جب دعائے قنوت میں تو ”وَلَا يَعِزُّ يَا رَبُّ مِنْ عَادِيْتِ“

پڑھے تو اس کو بھی مکسور العین کہا گیا ہے اور علوم شرعیہ کے اہل کا شکر ادا کرے کہ انہوں نے ایسے

مشکل مسائل میں تیرے لیے صواب کی تشریح کی اور اس میں ہمیشہ یاد دہانی کا فریضہ انجام دیا۔ (۱) لفظ ”عزیز“ کی لغت کے حوالہ سے اس تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کے مفہوم میں باوقعت جیسے کسی معنی کی گنجائش نہیں ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ پیش نظر آیت کریمہ کے لفظ ”عزیز“ کا ترجمہ ”باوقعت“ میں کرنے والے یہ حضرات اگر اس کی اشتقاقی حیثیت کو پیش نظر رکھتے اور اشتقاق کی ہر صورت کے تحت پائے جانے والے معانی کا خیال رکھتے تو ایسی غلطی کبھی نہ کرتے۔ نیز اردو محاورہ کے مطابق باوقعت لفظ کا تعلق عرف عام سے ہے اور یہ کتاب سے نہیں بلکہ اشخاص سے متعلق ہوتا ہے کہ با اثر شخص کو باوقعت اور بے اثر آدمی کو بے وقعت کہا جاتا ہے۔ جبکہ کسی کتاب کی معنویت اور افادیت ظاہر کرنے کے لیے باوقعت نہیں بلکہ لفظ وقوع استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے میں آیت کریمہ کے مذکورہ ترجمہ کی حیثیت دونوں محاوروں سے خلاف ہے۔

پانچویں بحث:- جو ترجمہ القرآن کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے۔ اس کے دو زاویے ہیں:

پہلا زاویہ:- اسے وجود میں لانے سے متعلق ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ کر کے وجود میں لانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

دوسرا زاویہ:- اسے وجود میں لائے جانے کے بعد سے ہے کہ دستیاب ترجمہ القرآن کی کیا حیثیت ہے؟ کہ شریعت مقدسہ میں جو احکام قرآن شریف کے لیے ثابت ہیں آیا وہ اس پر بھی جاری ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

پہلا زاویہ:- جہاں تک قرآن مجید کا ترجمہ کرنے اور اسے وجود میں لانے کا مسئلہ ہے اس حوالہ سے درج ذیل حقائق کو جاننا ضروری ہے:

① متن قرآن کے بغیر نہ ہو ورنہ التباس الحق بالباطل کا ایسا ہی خطرہ ہو سکتا ہے جیسا یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان کے ہاتھ سے تورات و انجیل کا ہوا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی

(۱) امام السيوطي بحواله تفسير روح المعاني، ج: 3، ص: 114، مطبوعه بيروت۔

اُصولِ ترجمہ

سمجھ کے مطابق ترجمہ کر کے متن کے بغیر پھیلا دیا جنہیں ناواقف حال عوام نے تورات و انجیل سمجھا اور رفتہ رفتہ مرویام سے اصل تورات و انجیل نایاب ہوتے گئے۔ انجام کار اُن کی جگہ ان ترجموں نے لے لی اور آپس میں ان کا تضاد، شانِ الہی اور شانِ نبوت کے منافی انداز اور حقائق و بدیہیات سے برعکس گفتگو جیسے الفاظ و کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تورات و انجیل کے یہ مترجمین معیاری نہ تھے، جامع الشرائط نہ تھے اور ترجمہ میں کتاب اللہ کے مقاصد کی پابندی کرنے کے بجائے اپنی سمجھ اور اپنی پسند کو ترجیح دینے والے تھے ورنہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی کتاب میں تضاد ممکن نہیں ہے۔ شانِ الوہیت اور شانِ نبوت سے خلاف ہونے کا تصور نہیں ہے اور حقائق و بدیہیات کے منافی ہونے کا امکان نہیں ہے بلکہ دُنیا کی ہزاروں زبانوں کے مختلف الفاظ میں کیے گئے تراجم بھی اگر معیاری ہوں، شرائط کے مطابق اور مرادِ الہی کی پابندی پر مبنی ہوں پھر بھی اصل معانی و مقاصد کے حوالہ سے اُن میں قطعاً کوئی اختلاف و تضاد نہیں ہوتا کیوں کہ صرف قرآن شریف میں نہیں بلکہ کسی بھی کتاب اللہ میں تضاد و خرافات ممکن نہیں ہیں جبکہ تورات و انجیل کے نام سے دُنیا بھر میں مشہور ہونے والے یہ تراجم ان تمام محذورات سے بھرے پڑے ہیں جس سے ہر واقف حال انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ سب کچھ یہود و نصاریٰ کے قسیس و ربانی اور احبار و رہبان کہلانے والے ناقص ذمہ دارانِ مذہب کی ناقص کارکردگی ہے۔ قرآن شریف کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ تکوینی نظام کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ متن قرآن کے بغیر اُس کے ترجمہ کی اجازت اسلام نے نہیں دی ہے جس کا پس منظر اور سب سے بڑا فلسفہ التباس الحق بالباطل کا انسداد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پر یہ تصور نہ ہو وہاں پر اجازت ہے مثال کے طور پر جائز مقصد کے پیش نظر کسی آیت کریمہ کے ایک دو حصوں کا یا ایک دو چھوٹی آیتوں کا ترجمہ بغیر متن کے شائع کرنے یا بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے فقہاء احناف کی صف میں نہایت قابلِ اعتماد امام محمد کمال الدین ابن ہمام

أصول ترجمہ

المتونى 861ھ نے بھی اپنے سے پیشرو اسلاف کے حوالہ سے ایسا ہی لکھا ہے:

”اراد ان يكتب مصحفا بها يمنع وان فعل فى آية او آيتين لا“ (۱)

ترجمہ:- کوئی شخص فارسی میں قرآن لکھنا چاہے اُسے منع کیا جائے گا اور اگر ایک یا دو آیتوں میں ایسا کیا تو منع نہ کیا جائے گا۔

حضرت ابن ہمام سے متاخر فقہاء کرام نے بھی اسلاف سے منقول اس خاص جوازی صورت کے ساتھ اتفاق کیا ہے جیسا مفتی الدیار الشامیہ فی السنۃ المائۃ بعد الالف ہجری الامام علاؤ الدین الحسکفی المتونى 1088ھ نے لکھا ہے:

”وتجوز كتابة آية او آيتين بالفارسية لا اکثر“ (۲)

ترجمہ:- ایک یا دو آیتوں کو فارسی میں لکھنا جائز ہوگا زیادہ کا نہیں۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے دیار شامیہ کے دوسرے شہرہ آفاق مفتی فی السنۃ المائۃ الثانیۃ بعد الالف من الهجرة النبویہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ الیوم الدین محمد امین ابن عابدین المتونى 1252ھ نے بھی فتح القدیر کی مذکورہ عبارت کو نقل کرنے کے بعد تسلیم کے انداز میں بحال رکھی ہے۔ (۳)

فقہاء احناف کی ان عظیم ہستیوں سے منقول اس جوازی صورت سے متعلق ہم صرف اتنا اضافہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دو آیات تک کے جواز کا جو قول کیا گیا ہے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے مراد چھوٹی آیتیں ہوں وہ بھی اس شرط کے ساتھ مشروط کہ اُن کا ترجمہ کرنا آسان ہو اور کسی قسم کی غلطی یا مترجم کی رائے شامل ہونے کا امکان بھی نہ ہو ورنہ لمبی آیات یا وہ جن کے ترجمہ میں مغالطہ ہونے یا مترجم کی رائے داخل ہونے کا امکان ہو۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرہ، آیت نمبر 233، 282 جیسی کسی ایک طویل آیت میں بھی احتیاط کے منافی ہوگا اس کے علاوہ یہ بھی ہے

(۱) فتح القدیر، ج: 1، ص: 248، مطبوعہ نوریہ رضویہ سکھر پاکستان۔

(۲) الدر المختار، ج: 1، ص: 4، مطبوعہ امیر حمزہ کتب خانہ کوئٹہ پاکستان۔

(۳) فتاویٰ رد المحتار علی الدر المختار، ج: 1، ص: 359، مطبوعہ الماجدیہ کوئٹہ پاکستان۔

أصول ترجمہ

کہ قرآن شریف کی کسی سورت کا یا پورے قرآن شریف کا مستقل ترجمہ بغیر متن کے شائع کرنے میں اور ایک یا دو آیات کا ترجمہ بغیر متن کے شائع کرنے میں بڑا فرق ہے کہ پہلی صورت میں التباس الحق بالباطل کا امکان ہو سکتا ہے کہ ناواقف حال لوگ مترجم کی بے اعتدالی پر مشتمل غلط ترجمہ کو معنوی قرآن سمجھ کر گمراہ ہوں گے جبکہ دوسری صورت میں ایسا نہیں ہے کیوں کہ یہ مستقل نہیں بلکہ وقتی اور عارضی عمل ہے اس کے باوجود عام حالات میں احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ کسی ایک آیت کا ترجمہ بھی بغیر متن کے شائع نہ کیا جائے کیوں کہ فقہاء کرام کی لکھی ہوئی اس جوازی صورت کا تعلق عام حالات کے ساتھ نہیں بلکہ انسانی عوارضات اور مخصوص حالات کے ساتھ ہے۔ نیز ترجمہ اصل کے تابع اور اس پر مقرر ہونے کی بنیاد پر مقتضی ہے کہ اس سے پہلے آیت کریمہ لکھی جائے ورنہ ترجمہ کا تصور ہو سکتا ہے نہ تفسیر کا اسی فلسفہ کی بنیاد پر محمد کمال الدین ابن ہمام نے مذکورہ عبارت سے متصلاً بعد ترجمہ و تفسیر کی صرف اسی صورت کو جائز قرار دیا ہے اُن کے الفاظ یہ ہیں:

”فَإِنْ كَتَبَ الْقُرْآنَ وَتَفْسِيرَ كُلِّ حَرْفٍ وَتَرْجُمَتَهُ جَازٌ“ (۱)

ترجمہ:- اگر قرآن لکھ کر اس کے ہر لفظ کی تفسیر و ترجمہ لکھے جائز ہوگا۔

نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی مختلف زبانوں میں بلکہ پورے برصغیر کی مختلف زبانوں میں ترجمہ القرآن کا یہی طریقہ مروج ہے۔ خدا کرے کہ اسے دوام ملے علماء کرام کا یہ کردار قابل تحسین ہے کہ اگر اسلام کا کوئی اکاڈکانادان دوست متن قرآن کے بغیر ترجمہ شائع کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ یہ حضرات اُس کے انسداد کے لیے آواز اٹھاتے ہیں کاش دین کی حفاظت کے ذمہ داروں میں اس قسم بیداری معیاری اور غیر معیاری تراجم کی تمیز کے حوالہ سے بھی وجود میں آتی تو کیا ہی اچھا ہوتا لیکن وجہ فرق ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں ترجمہ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے آگاہی ضروری ہے۔ شرائط کا احاطہ اور احتیاطی تقاضوں کا احساس درکار ہے اور قرآن نہی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون میں مہارت ناگزیر ہے۔ جس میں ترقی کے بجائے دنیا انحطاط و تزلزل کی

(۱) فتح القدیر، ج: 1، ص: 248، مطبوعہ نورہی رضویہ سکھریا کستان۔

أصول ترجمہ

طرف جارہی ہے۔ تو پھر ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے درست و نادرست کی تمیز کہاں سے ہوگی۔ (الاشاء اللہ وقلیل ماہم ابقاہم اللہ وآدام وجودہم المسعود)

۲ قرآن شریف کا ترجمہ وجود میں لانے کے جواز کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کے مطابق ہو ورنہ کسی ایسے ترجمہ کو جائز کہا جاسکتا ہے نہ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے جو اس سے خلاف ہو اور ترجمۃ القرآن کی تعریف یہ ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلا جائے جو ان کے قائم مقام ہو سکیں۔ (۱) یعنی ان کی لسانی، مرادی، فنی، عرفی اور محاورتی گویا تمام قابل فہم و متعارف حیثیات کے مطابق ہو جس میں ترجمہ کے الفاظ کی انفرادی حیثیت سے آیت کریمہ کے انفرادی الفاظ کے مطابق ہونے کے ساتھ ان کی اجتماعی نوعیت ان کی اجتماعی نوعیت کے مطابق ہونے کے نتیجہ میں ترجمہ با محاورہ ہوتا ہے یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ترجمۃ القرآن کی اس تعریف کا اول حصہ یعنی قرآن شریف کے الفاظ سے بدل کے طور پر مذکور ہونیوالے الفاظ بمنزلہ جنس قریب ہے ترجمۃ القرآن کے لیے جبکہ دوسرا حصہ یعنی قرآنی الفاظ کے قائم مقام ہونے والی صفت بمنزلہ فصل قریب ہے اور جنس قریب و فصل قریب سے ترکیب پانے والی یہ تعریف ترجمۃ القرآن کے لیے حد تمام قرار پاتی ہے اور اہل علم سے یہ بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ کسی بھی محدود و معترف اور ماہیت کی فصل قریب اس کے لیے مقوم ہوتی ہے یعنی اس کے وجود و قوام میں داخل ہوتی ہے اس کے مطابق ترجمہ کے الفاظ جب تک قرآنی الفاظ کے قائم مقام یعنی ان کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق نہیں ہوتے اس وقت تک ترجمۃ القرآن کا حقیقی وجود ممکن نہیں ہوتا جب ترجمۃ القرآن کہلانے کا قابل ہی نہیں ہوتا تو پھر اس پر ترجمۃ القرآن کا اطلاق کرنا بھی جائز نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ترجمۃ القرآن کے نام سے پائے جانے والے کسی ایسے الفاظ و کلام کو معنوی قرآن سمجھنا جائز ہو سکتا ہے جبکہ حد تمام کے مطابق وجود میں آنے والا ترجمہ القرآن معنوی قرآن کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۱، ص: ۱۱۱، مطبوعہ حجازی القاہرہ مصر۔

أصول ترجمہ

خلاصۃ البحث :- ترجمہ کے الفاظ و کلام اگر قرآن شریف کے الفاظ اور ان کی کلامی حیثیت کے

مطابق نہیں ہیں تو انہیں چاہے ترجمہ کے نام سے یاد کیا جائے یا کسی دوسرے نام سے بہر حال ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل ہرگز نہیں ہوتے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے فلسفہ کے حصہ منطق کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے قانون سے عبارت ہے جو فکری غلطی سے بچا سکے یعنی اُسے پیش نظر رکھ کر فکر کرنے والے کو غلطی نہیں لگ سکتی اور اُس کے ترازو میں ہونے والی انسانی فکر کبھی

خطا نہیں ہو سکتی یہاں پر بھی قانون بمنزلہ جنس ہے منطق کے لیے جبکہ فکری خطائی سے بچانے والی صفت اس کے لیے بمنزلہ فصل ہے جب علم منطق کے لیے جنس و فصل ہونے کی حیثیت سے یہ دونوں بالترتیب پائے جائیں گے تب فن منطق کا وجود و قوام ممکن ہوگا ورنہ نہیں انجام کار منطق کا جو

ضابطہ و قانون فکری خطائی سے بچانے والی صفت کے بغیر پایا جائے وہ نہ صرف بے سود و بے مقصد ہوگا بلکہ منطق کہلانے کے قابل بھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح علم اصول فقہ ایک فن ہے جس کی جامع و مانع تعریف بشکل حد تام اس طرح ہے کہ وہ ایسے ضوابط سے عبارت ہے جن کی وساطت سے شرعی احکام کو ان کی تفصیلی دلائل سے مستنبط کیا جاسکتا ہے اس میں اصول کہلانے والے ضوابط

بمنزلہ جنس ہیں جبکہ شرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے سمجھنے کے لیے وسیلہ بننے والی صفت بمنزلہ فصل ہے جب یہ دونوں اسی ترتیب سے پائے جائیں گے تب اصول فقہ کا وجود و قیام ہوگا اور

دونوں کے مجموعے پر اصول فقہ کا اطلاق درست ہوگا ورنہ صفت مقومہ و ممیزہ کے بغیر برائے نام ضابطہ کا وجود و عدم برابر ہے۔ اسی طرح پیش نظر مسئلہ میں بھی ترجمہ کے الفاظ اور ان کی یہ صفت کہ

قرآنی الفاظ کے قائم مقام یعنی ان کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہونا بھی دونوں اپنی رُتبی ترتیب کے ساتھ جب پائے جائیں گے تب ترجمۃ القرآن کا وجود و قوام ممکن ہوگا، ترجمۃ القرآن کا اس پر اطلاق درست ہوگا۔ انجام کار ترجمہ بھی سودمند اور بامقصد کہلائے گا ورنہ بغیر تطابق کے محض

ترجمہ والے الفاظ کو ترجمہ کہا جائے یا کسی دوسرے نام سے یاد کیا جائے۔ بہر حال حقیقت کی نظر میں وہ ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ اسلام میں ترجمۃ القرآن کے نام سے ایسے الفاظ کی

اصول ترجمہ

اجازت ہو سکتی ہے نہ ایسے کلام کی یہ وہ حقیقت ہے جس سے انحراف کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے لیکن حقائق سے پردہ اٹھانے کے سوا ہم کچھ اور نہیں کر سکتے جبکہ ہمارے پچاس سالہ تجربہ کے مطابق قرآن شریف کا ترجمہ کرنے والوں کی غالب اکثریت اس حقیقت سے نا آشنا ہے جو بجائے خود المیہ ہے۔ ہم پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ اہل علم کو بتانا چاہتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف ”ابدال لفظہ بلفظہ تقوم مقامہا“ یا اس اجمال و اختصار سے زیادہ واضح اور سہل الفہم الفاظ میں ”ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامہا“ کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والے سے قرآن شریف کا ترجمہ کرنے میں کبھی بے اعتدالی نہیں ہو سکتی لیکن المترجمین عنہ غافلون یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر قرآن و سنت کا سیاسی اقتدار ہو تو ترجمۃ القرآن کی جامع و مانع تعریف سے خلاف ترجمہ کرنے والوں کی جگہ زندان کے سوا کہیں اور نہ ہوگی جس پر عمل حضرت امام مہدی کی آمد سے قبل ممکن ہوتا نظر نہیں آ رہا۔

۳ ترجمۃ القرآن کی مذکورہ جامع و مانع تعریف کے مطابق اس کی فصل مقوم کی پہچان یعنی یہ تمیز کرنا کہ ترجمہ کے الفاظ قرآنی الفاظ کے قائم مقام کہلانے اور ان کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق کہلانے کے قابل ہیں یا نہیں تاکہ سقیم سے سلیم کی تفریق کرنا آسان ہو جائے اور ترجمۃ القرآن کے نام سے التباس الحق بالباطل کے اندھیرے سے بچا جاسکے۔ اس کے لیے ان علوم میں دسترس ضروری ہے جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ کہلاتے ہیں جنہیں ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے شرائط بھی کہا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ ترجمۃ القرآن کی تعریف میں موجود اس فصل مقوم کی پہچان کے لیے شرائط ہیں جو کسی چیز کی صفت بحال متعلقہ کو اس کی صفت کہنے کی طرح یہاں پر بھی ترجمۃ القرآن کے فصل ممیز و مقوم کی پہچان کے لیے شرائط کو ترجمۃ القرآن کے لیے شرائط کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ ان سب کا اجتماعی وجود فصل مقوم کے وجود کو مستلزم ہے جبکہ فصل مقوم کا وجود ترجمۃ القرآن کے وجود کو مستلزم ہے اور قرآن شریف کا کیا گیا جو ترجمہ بھی اس قابل ہو کہ اسے ترجمۃ القرآن کہنا درست ہو وہ ہمیشہ صحیح و معیاری ہوتا ہے اسی طرح جن چیزوں کو ہم فصل

مقوم کی پہچان کے لیے شرط کہہ رہے ہیں اُن کی فوتگی فصل مقوم کی فوتگی کو مستلزم ہے اور اُس کی فوتگی ترجمۃ القرآن کی فوتگی کو مستلزم ہے جس کے مطابق قرآن شریف کا کیا گیا جو ترجمہ بھی شرائط سے منحرف ہو یعنی اُس کے الفاظ قرآنی الفاظ کے مطابق اور اُن کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہ ہو وہ ہر لحاظ سے کالعدم ہوتا ہے، بے سود و بے مقصد ہوتا ہے اور نادرست و غیر معیاری ہوتا ہے۔ ایسے میں جن چیزوں کو شرائط کہا جاتا ہے انہیں فصل مقوم کی پہچان کی طرف منسوب کر کے شرائط لتمیز الفصل المقوم کہا جائے یا ترجمۃ القرآن کی صحت کی طرف منسوب کر کے شرائط لصحت ترجمۃ القرآن کہا جائے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ ہر طرح جائز ہے نہ صرف اتنا بلکہ صحت ترجمۃ القرآن اور فصل مقوم لترجمۃ القرآن میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کیے بغیر نفس ترجمۃ القرآن کی طرف منسوب کر کے شرائط لترجمۃ القرآن کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اصل حقیقت تک رسائی کے بعد جواز کے حوالہ سے لفظی اطلاق و استعمال میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔

تفصیل بعد التفصیل:- ترجمۃ القرآن لکھنے اور دُنیا کی کسی بھی زبان میں اسے وجود دینے کے جواز کے لیے صرف ایک صورت ہے جو اُس کا صحیح و درست ہونا ہے ورنہ قرآن شریف کا غلط ترجمہ لکھنے اور غیر معیاری حضرات کو اس میدان میں آنے کا جواز ہرگز نہیں ہے اور اس کے صحیح و درست ہونا تب ہی ممکن ہوگا جب تعریف کے مطابق ہو اور تعریف کے مطابق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ شرائط کے مطابق ہو اور شرائط کے مطابق ہونا تب ممکن ہو سکتا ہے جب مترجم ان تمام شرائط کے جامع اور معیاری ہو ورنہ فاقد الشرائط اور غیر معیاری مترجم سے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں آنا ایسی ہی ناممکن ہے جیسا اونٹ کا دودھ دینا اسی فلسفہ کے مطابق نبی اکرم سید عالم ﷺ نے نا اہل کے لیے اسے ممنوع قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبؤ مقعده من النار“ (۱)

(۱) ترمذی، ج: 2، ص: 119، کتاب التفسیر۔

أصول ترجمہ

دوسری روایت میں فرمایا:

”من قال في القرآن برايه فاصاب فقد اخطاء“ (۱)

اس کی تشریح کرتے ہوئے محدثین کی غالب اکثریت نے یہی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ حضرات ہیں جو بغیر شرائط کے ترجمہ و تفسیر کرتے ہیں کیوں کہ شرائط اور قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون سے عاری یا ناقص حضرات کو اس میں آنا ہی جائز نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ مشہور مقالہ ”رمیۃ من غیر رام“ کے حسن اتفاق سے اُس کا کیا ہوا ترجمہ و تفسیر اگر درست ہو بھی جائے پھر بھی گناہ سے خالی نہیں ہوگا کیوں کہ فائدہ شرائط کا اس عمل میں آنا بجائے خود بے اعتدالی اور موجب سزا جرم ہے۔ ”لہو لگا کر خود کو شہیدوں میں“ شمار کرنے والوں کی طرح فائدہ شرائط کا مترجم بننے کو گناہ اور قابل سزا جرم قرار دینے میں محدثین کا اختلاف ہے نہ فقہاء کا اس سلسلہ میں وارد یہ روایات اگر بالفرض محدثین کے طبقہ ناقدین کی نگاہ میں ثابت نہ بھی ہوں پھر بھی اس کے مضمون کی صحت میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ محدثین سے لے کر فقہاء و مفسرین تک سب کے نزدیک فائدہ شرائط ترجمۃ القرآن کے لیے بھی نااہل ہوتا ہے تفسیر کے لیے بھی اس کے باوجود اُس کا مترجم بننا بالاجماع ناجائز و حرام ہے، شرعی حدود سے تجاوز اور معصیت ہے جس سے بچنے کے لیے ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے ”من قال في القرآن برايه فقد كفر“ ایک اور روایت میں ”فلیتبؤ مقعدہ من النار“ (۲) جیسے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس قسم روایات سے قطع نظر محض درلیہ کی روشنی میں دیکھا جائے تب بھی نتیجہ یہی آتا ہے کہ فائدہ شرائط اور ناقص شخص کا مترجم بننا جائز نہیں ہے۔ نیز قرآن شریف جامع العلوم والمعارف کتاب ہے اپنی زبان کی جملہ لسانی حیثیات سے لے کر دنیا بھر کے علوم و فنون اور عقلیات کے تمام زاویوں پر محیط ہے جس وجہ سے حدیث شریف میں اسے ”لا تنقضی عجائبہ“ جیسی صفت سے موصوف بتایا گیا ہے کہ جس علم اور جس فن کے زاویہ سے

(۱) ترمذی، ج: ۲، ص: ۱۱۹، کتاب التفسیر۔

(۲) ترمذی، ج: ۲، ص: ۱۱۹، کتاب التفسیر۔

أصول ترجمہ

بھی اس پر غور کیا جائے اس کے عجائبات و معارف لانہایت دکھائی دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کے ترجمہ کی صحت کے لیے جو شرائط اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں ان کی غالب اکثریت کا تعلق بھی ان ہی علوم و فنون کے ساتھ ہے جن میں دسترس کے بغیر مترجم بننے والے کی مثال اندھیرے میں تیر چلانے والے سے مختلف نہیں ہوگی اور اہل علم سے یہ بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں غلطی کے خطرناک نتائج ہوتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف خلاف واقعہ نسبت کرنے کے ساتھ التباس الحق بالباطل کا وبال بھی ہوتا ہے جس کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِنَّ الَّذِينَ يَفْتُرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ“ (۱)

اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے فرمایا:

”اتَّقُوا الْحَدِيثَ عَنِّي إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ“ (۲)

نیز فرمایا: ”لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّ الْكَذِبَ عَلَىَّ يُوَلِّجُ النَّارَ“ (۳)

اس سلسلہ میں تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ تفسیر کی صحت کے لیے شرائط کے جامع و معیاری حضرات پر حسب ضرورت قرآن شریف کی تفسیر کرنا اور اسے وجود میں لانا لازم ہونے کی طرح ترجمہ کی شرائط کے جامع و معیاری خوش قسمتوں پر بھی حسب ضرورت ترجمۃ القرآن لکھنا اور اسے وجود میں لانا شریعت مقدسہ کا ناگزیر حکم ہے اگر ضرورت کے وقت وہ اس سے کتراتے ہیں، کاہلی و سستی کرتے ہیں اور استطاعت کے باوجود خود کو اس شرف سے محروم رکھتے ہیں کتمانِ علم کی وعید میں آتے ہیں اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے فرمایا:

(۱) یونس: 69۔

(۲) ترمذی شریف، ج: 2، ص: 119، مطبوعہ میر محمد کتب خانہ کتاب محل کراچی۔

(۳) ابن ماجہ شریف، ص: 5، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی۔

أصول ترجمہ

”ممن رجل يحفظ علما فيكتمه الا أتى به يوم القيامة ملجماً بلجام من النار“ (۱)
باقی رہا یہ تصور کہ ترجمۃ القرآن کی شرائط کے جامع و معیاری حضرات پر شریعت کا یہ حکم کس درجہ میں ہے تو اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

❶ جس جگہ کسی اہل کتاب قوم کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا جا رہا ہو کہ تو حید الہی، بحث بعد الموت، مجازۃ اعمال اور عدل و انصاف کی اہمیت جیسے کسی بھی بین الاقوامی مسئلہ سے متعلق آیات قرآنی کا ترجمہ کیا جائے اور اس مطالبہ سے اُن کا مقصد مروجہ تورات و انجیل کے ساتھ اس کا تقابل کرنا ہو اور مطالبہ کرنے والے اس بات پر آمادہ بھی ہوں کہ قرآن شریف کے احکام تورات و انجیل کے فرامین و احکام سے زیادہ مناسب اور زیادہ جامع ثابت ہونے کی صورت میں اس پر ایمان لائیں گے۔

❷ کسی غیر مسلم عجم قوم یا جماعت سے فقط اتنی اُمید ہو کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اس پر ایمان لائے گی یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہوگی یا اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کا زہر پھیلانے سے باز آئے گی یا کسی بھی حوالہ سے اسلام کے حق میں سودمند ہونے کی اُمید ہو۔

❸ دُنیا کی کسی زبان اور معاشرہ میں جب قرآن شریف کے غلط ترجمے مروج ہو رہے ہوں عام اس سے کہ مترجم غیر مسلم ہو یا مسلم اناڑی جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم سے اور فنونِ آلیہ سے ہی بے خبر ہیں یا ان علوم و فنون میں نیم خواندہ اور ناقص ہوں یا ترجمہ کی شرائط کے جامع نہ ہو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو موجودہ دور میں غیر معیاری مترجمین کے ان تمام طبقوں کے ہاتھوں لکھے ہوئے تراجم کی بہتات ہے جنہیں قرآن شریف کی معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

(۱) ابن ماجہ، ص: 23، مطبوعہ اصح المطابع کراچی۔

اُصول ترجمہ

۴ جس جگہ کسی عجم معاشرہ یا کسی قوم کو اسلام کے خلاف نفرت دلانے کی غرض سے دیدہ و دانستہ طور پر سازش کے تحت قرآن کا غلط ترجمہ شائع کیا جا رہا ہو۔

۵ جس جگہ یا جس معاشرہ میں اس افتاد کا امکان زیادہ ہو کہ آئندہ چل کر فاقد الشرائط اور نااہل حضرات قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کی جسارت کریں گے اور غلط ترجمہ کر کے التباس الحق بالباطل کی راہ نکالیں گے۔

۶ جس معاشرہ میں موجود کسی جامع الشرائط معیاری شخصیت کو کسی قسم کی ایسی ناگزیر مجبوری لاحق ہو جس وجہ سے وہ خود پورے قرآن شریف کا ترجمہ نہیں لکھ سکتا اور لکھنے کو اس معاشرہ کے لیے تحفظ ایمان کا واحد ذریعہ سمجھتا ہو تو جتنا کر سکتا ہے یا جن سورتوں کا یا حسب مناسب جن آیات کا ترجمہ کر سکتا ہے اس کی ذمہ داری اُسی حد تک ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ (۱) ہر جگہ کا رہا ہے جس سے تجاوز نہیں ہو سکتا۔

۷ جس معاشرہ میں کچھ جامع الشرائط کا ملین پائے جاتے ہوں لیکن انہیں قرآن شریف کے ترجمہ کرنے کا علمی تجربہ نہ ہو جبکہ اس معاشرہ میں موجود واحد و یکتا جامع الشرائط تجربہ کار کو یہ احساس ہو رہا ہو کہ ترجمہ کے عمل میں آنے پر تجربہ کا فقدان ان کے علم پر غالب آ سکتا ہے۔ انجام کار انجانے میں ترجمہ غلط ہو سکتا ہے اس صورت میں بھی انہیں ترجمۃ القرآن کی مشق و تمرین کرا کر رہنمائی کرنا فرض عین قرار پاتا ہے جو اسلام کے مشہور اُصول ”مقدمة الواجب واجب“ کے زمرہ میں آتا ہے۔

ایسی تمام صورتوں میں جامع الشرائط حضرات پر فرض لازم قرار پاتا ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لائیں۔ دراصل یہ کام مسلم اسٹیٹ کا ہے کہ جامع الشرائط ہستیوں کی افزائش بھی کرے اور ان سے یہ کام بھی لے اور صحیح معنی میں مسلم اسٹیٹ یعنی خلافت علی منہاج النبوة کی عدم موجودگی میں اس کی فرضیت پوری اُمہ پر عائد ہوتی ہے جسے فرض کفایہ کہا جاتا ہے اور

(۱) البقرة: 286۔

أصول ترجمہ

ظاہر ہے کہ مسلم اُمہ میں موجود ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ ایسے مشکل امتحان میں اسلام کو سر بلند کرنے، تبلیغ بالقرآن کا حق ادا کرنے اور دفاع قرآن کا فریضہ انجام دینے کے لیے وہی کاملین آگے آ سکتے ہیں جنہیں نبی اکرم سید عالم ﷺ کے حقیقی وارث کہا جاتا ہے، جن کا وجود مسعود پوری اُمہ کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسا بدن کے لیے روح۔ قرآن شریف کا ترجمہ لکھ کر وجود میں لانا اُمہ پر فرض ہونے کی یہ چند مثالیں جو ہم نے ذکر کیں صرف مثال بقدر مثال ہیں ورنہ اس عمل کے فرض ہونے کی اور بھی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں جبکہ اس فریضہ کو عملی طور پر انجام دینے کی ذمہ داری جامع الشرائط کاملین کے سوا کسی اور پر عائد نہیں ہوتی۔ قرآن شریف کا ترجمہ کر کے وجود میں لانا فرض کفایہ یا فرض عین ہونے کی ان صورتوں کے علاوہ کبھی مستحب بھی ہوتا ہے یعنی کرے تو مستحق ثواب ہوگا اور نہ کرے تو عذاب نہیں۔ مثال کے طور پر:

❶ مسلم عجم کے کسی معاشرہ کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کے معانی سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کی واحد سبیل ترجمہ ہے جس میں قرآن شریف کے الفاظ کو ان کی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو الفاظ قرآنی کے مطابق ہوں جس میں ترجمہ کے الفاظ متن قرآن کے الفاظ کی تعداد کے مطابق نہ تھے ہوں اور ترجمانی و تفہیم اور تفسیر جیسے عمل دخل سے محفوظ ہو۔

❷ از خود کوئی جامع الشرائط ہستی یہ شوق کرے کہ ترجمہ کے ذریعہ قرآن شریف کے معانی و احکام سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرے کہ وہ کسی ترجمان یا ترجمانی اور تفسیر و تاویل جیسی مداخلت غیر کے بغیر خود معنوی قرآن سے استفادہ کر سکیں۔

ایسی تمام صورتوں میں جامع الشرائط حضرات کے لیے مستحب قرار پاتا ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کر کے دوسری زبان والوں کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔ ترجمہ القرآن کی جوازی صورتوں کے شرعی احکام مختلف ہونے کی طرح عدم جواز بھی یکساں نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

اصول ترجمہ

پہلی قسم:- فاقد الشرائط نا اہل کے لیے اس عمل میں آنا بالیقین حرام اور نادانستہ معصیت ہے جس میں فقہاء کی دورائے ہیں نہ محدثین کی یہ الگ بات ہے کہ اصحاب محراب و منبر کی غالب اکثریت اس سے غافل ہے لیکن کسی کی نا سمجھی و غفلت کی وجہ سے حقیقت نہیں بدلتی۔

دوسری قسم:- مترجم اکثر شرائط کے جامع ہونے کے باوجود خلوص نیت اور للہیت کی توفیق سے محروم ہو یا من پسند کو شرائط پر ترجیح دینے والا اور متعصب ہو۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ اس عمل میں جس شرح تناسب سے فساد ہوگا اسی کے مطابق عدم جواز کی شرح تناسب ہوگی جو حرام بھی ہو سکتا ہے مکروہ تحریم بھی، اسائت بھی ہو سکتا ہے، مکروہ تنزیہ اور خلاف اولیٰ بھی کیوں کہ شریعت کے احکام ہمیشہ مقاصد کے مطابق ہوتے ہیں۔

ترجمة القرآن کا دوسرا زاویہ:-

جہاں تک قرآن شریف کا لکھا گیا ترجمہ کی شرعی حیثیت ہے کہ اسے کس حد تک قرآن شریف کے کمالات اور اس کے شرعی احکام کا حامل کہا جاسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ: قرآن شریف کے مخصوص فضائل اور انفرادیات مثلاً اعجاز، فصاحت و بلاغت میں بے مثل ہونا، اور نماز میں قرائتہ بما تیسر من القرآن کا ناگزیر ہونا، الفاظ کی ترتیب اور نظم البیان کی لپیٹ میں لانا نہایت علوم و اسرار اور ماوراء الحس والعقل رموز و معارف کا پوشیدہ ہونا اور برزخ بین الکتاب والخطاب ہونے کے ساتھ نظم و نثر کے ترازو میں بین بین ہونا جیسی کسی صفت کا ترجمہ کے الفاظ میں آنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ ان میں سے کسی چیز کا ترجمہ پر اطلاق کرنا جائز ہو سکے۔ اس سے قبل بھی ہم بتا چکے ہیں کہ مخصوص دواعیات سے قطع نظر عام حالات میں قرآن شریف کا ترجمہ کرنے سے مقصد اس کے اُن معانی و مقاصد کو دوسری زبان والوں پر ظاہر کرنا ہوتا ہے جنہیں سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے پر عام لوگ مکلف ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فرمان ”وَمَنْ بَلَغَ“ (۱) سے مراد

(۱) الانعام: 19۔

اصول ترجمہ

ہیں یہ قرآن شریف کے وہی معانی ہیں جنہیں مفہوم اول اور معانی اولیہ بھی کہا جاتا ہے جنہیں لسان القرآن والے یعنی عرب محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ سکتے ہیں بشرطیکہ اس کی طرف توجہ ہو اور اہل عجم اُن علوم و فنون کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں جنہیں علوم خادمہ لفہم القرآن کہا جاتا ہے قرآن شریف کے ترجمہ سے اس مقصد کو سمجھنے کے بعد کسی شخص کو بھی اس بات میں تردد نہیں ہو سکتا کہ قرآن شریف کا کیا گیا ہر معیاری ترجمہ اُس کے معانی اولیہ سے عبارت ہے جس میں اعجاز کا تصور ہو سکتا ہے نہ قرآن شریف کے ساتھ مختص کسی اور صفت کا یہ الگ بات ہے کہ شرائط کے مطابق اور معیاری ترجمہ کے الفاظ قرآن شریف کے معانی اولیہ کے سوا کسی اور صفت سے عبارت نہ ہونے کے باوجود اُن رموز و معارف کے بھی منافی نہیں ہوتے جو نظم قرآن کی لپیٹ میں پوشیدہ، مثانی و مرموز الیہ ہوتے ہیں جن کی تعبیر اہل کشف حضرات اشارات کے عنوان سے کرتے ہیں ورنہ ترجمہ معیاری اور اصل کے مطابق کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ قرآن شریف کے کیے گئے ترجمہ کی حقیقت اور اس کے مظہر و مصداق پر تسلی ہونے کے بعد کہ یہ قرآن شریف کے معانی اولیہ سے عبارت ہے اس کی شرعی حیثیت آپ ہی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قرآن شریف کے الفاظ کا بدل ہونے کے ساتھ اُن کے کلامی معنی و مفہوم کا بھی مظہر ہے۔ الفاظ قرآنی کا بدل اس لیے کہ یہ ترجمہ القرآن کی تعریف کا رکن اور اُس کا لازمی جزو ہے جیسا اُس کی تعریف سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ”اببدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ سے عبارت ہے اور قرآن شریف کا ترکیبی و کلامی معنی اس لیے ہے کہ ترجمہ کرنے سے اصل مقصد و محرک ان ہی معانی سے دوسری زبان والے لوگوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے، گویا قرآن شریف کا کیا ہوا ترجمہ بیک وقت دو مختلف صفات کا حامل ہے کہ اس کے الفاظ کو الفاظ قرآنی سے بدل کہنا بھی درست ہے اور قرآن شریف کا مفہوم اول اور معانی اولیہ کہنا بھی درست ہے اسی فلسفہ کی بنیاد پر اسے معنوی قرآن بھی کہا جاسکتا ہے جو عین حقیقت ہے اور قرآن کا اس پر اطلاق اس لیے نہیں ہو سکتا کہ یہ محض معانی ہیں جبکہ قرآن شریف اپنے علمی اور اسمی مفہوم میں الفاظ و معانی کے مجموع مرکب سے عبارت ہے جیسا کہا جاتا ہے:

أصول ترجمہ

”هو اسم للنظم والمعنى جميعا في قول عامة العلماء“ (۱)

مگر یہ کہ اطلاق مجازی ہو اور اطلاق الکل علی الجزو کے قبیل سے مجاز مرسل ہو جیسا فتاویٰ رد المحتار علی الدر المختار میں ابن عابدین المتوفی 1252ھ نے لکھا ہے:

”والاعجمی انما یسمی قرآنا مجازا و کذا یصح نفی اسم القرآن عنه“ (۲)

اس سے قرآن شریف کے کیے ہوئے ترجمہ کی ایک اور حیثیت بھی واضح ہو رہی ہے کہ اسے الفاظ قرآنی کا ترجمہ کہنا درست ہے نہ قرآن شریف کے معانی کا بلکہ ترجمۃ القرآن اور کلام اللہ کا ترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ کلام اللہ یعنی قرآن شریف الفاظ و معانی دونوں سے مجموع مرکب کا نام ہے۔ اس حقیقت سے غفلت کی بنا پر المعهد العالی للقطاۃ فی الریاض المملکۃ السعودیہ کے مدیر المناع القطان نے ترجمۃ القرآن کو قرآن شریف کے معانی کا ترجمہ کہا ہے۔ (۳) جس سے اثر لے کر پاکستان کے کچھ علمی حلقے اور خاص کر الجامعۃ الاسلامیہ بین المملیٰ یونیورسٹی اسلام آباد کے ذمہ داروں نے بھی ترجمۃ القرآن کو ترجمۃ معانی القرآن کے نام سے مشہور کرنا شروع کر دیا ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

موصوف کی اس اختراع پر مکمل تبصرہ گزشتہ صفحات میں ہم کر چکے ہیں تاہم یہاں پر اس کی شرعی حیثیت سے متعلق بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی عقائد کی روشنی میں ترجمۃ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنا غلط محض ہے اس لیے کہ معانی کی طرف ترجمہ نہیں بلکہ ترجمانی منسوب ہوتی ہے جو کسی بھی اہل علم سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے تو پھر قرآن شریف سے متعلق ایسی خلاف حقیقت نسبت کرنے کا کیا جواز ہے اور اہل علم سے یہ بھی مخفی نہیں ہے کہ ترجمانی و ترجمہ کا عمل ایک دوسرے

(۱) کتاب الحسامی فی أصول الفقه بحث کتاب اللہ۔

(۲) فتاویٰ رد المحتار علی الدر المختار، ج: 1، ص: 358، مطبوعہ الماجدیہ کوئٹہ پاکستان۔

(۳) مباحث فی علوم القرآن للمناع القطان، ص: 285 تا ص: 289، مطبوعہ کتب

خانہ رشیدیہ محلہ جنگی پشاور پاکستان۔

أصول ترجمہ

سے مختلف ہیں کہ ترجمانی کا اولاً وبالذات تعلق معانی کے ساتھ ہونے کی وجہ سے الفاظ میں کمی و بیشی اور ایجاز و اطناب کا فرق ہو سکتا ہے جبکہ ترجمہ کا اولاً وبالذات تعلق کلام سے یعنی الفاظ و معانی سے مجموع مرکب کے ساتھ ہونے کی بنیاد پر کمی و بیشی جیسی کسی بھی تفریق کی گنجائش نہیں ہوتی جیسا ترجمۃ القرآن کی تعریف ”اببدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر اللتی تقوم مقامها“ سے آپ ہی ظاہر ہے۔ ایسے میں مباحث فی علوم القرآن کے سعودی مصنف جناب مناع القطان کے اس انداز کی اجازت اسلام کے کسی ایک مذہب میں بھی نہیں ہے چہ جائیکہ حنبلی مذہب میں اس کا تصور ہو سکے جبکہ اس کا ترجمان اور السعودیہ العربیہ کے اہل حدیث سے لے کر تمام حنبلی علماء کے نزدیک قابل اعتماد شخصیت حافظ ابن تیمیہ نے بھی لکھا ہے:

”وقال الجمهور من جميع الطوائف ان الکلام اسم للنظم والمعنى جميعا کما ان

الانسان المتکلم اسم للروح والجسم جميعا وانه اذا اطلق على احدهما فقريئة“ (۱)

ایسے میں ترجمۃ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنے کو نہ صرف اختراع بلکہ اختلاق کے

سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے علاوہ ترجمۃ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنے کے عدم جواز پر

ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ یہ انوکھے اور غیر مانوس الاستعمال لفظ مرکب اضافی کے قبیل سے ہے

کیوں کہ ترجمہ معانی القرآن کہنے میں لفظ ترجمہ مضاف ہے جبکہ معانی القرآن اُس کے لیے

مضاف الیہ ہے اور ظاہر ہے کہ مضاف و مضاف الیہ میں مغایرت ضروری ہے کیوں کہ کسی چیز کا اپنی

ذات کی طرف مضاف ہونے کو عقل تسلیم کرتی ہے نہ نقل جبکہ یہاں پر ایسا نہیں ہے کیوں کہ ترجمہ

کے الفاظ کے سوا معانی القرآن کا وجود ہی نہیں ہے بلکہ ہر معیاری ترجمہ کے الفاظ مفردہ میں قرآن شریف

کے الفاظ مفردہ کے معانی اور ان کی ترکیبی و ارتباطی حیثیت میں الفاظ قرآنی کے ارتباطی معانی

(۱) مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج: 12، ص: 35، مطبوعہ بامر خادم

الحرمین للتوزیع مجانا فی سبیل اللہ المکرمہ۔

أصول ترجمہ

موجود ہوتے ہیں۔ ایسے میں ترجمہ معانی القرآن جیسے اجنبی استعمال کے مضاف و مضاف الیہ کو ایک چیز کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ جو درایہ بھی باطل ہے روایت بھی۔

المختصر یہ کہ ترجمہ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنے کو عربی محاورہ میں جائز کہا جاسکتا ہے نہ عجمی انداز کلام میں اسی طرح عرف عام میں اس کی اجازت ہے نہ کسی اسلامی مذہب میں بلکہ اس کی حیثیت سعودیہ العربیہ سے اٹھنے والی بدعت کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس سے عجمی درس گاہوں کے ناواقف حال حضرات متاثر ہو رہے ہیں۔ اس کے عدم جواز پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب ترجمہ القرآن کو ترجمہ الفاظ القرآن کہنا مناسب نہیں ہے تو پھر ترجمہ معانی القرآن کہنا کیوں جائز ہو حالانکہ الفاظ القرآن کہنے میں جواز کا کچھ لائحہ موجود ہے کیوں کہ اس میں تین احتمالات ہو سکتے ہیں:

پہلا احتمال:- اس سے مراد قرآن شریف کے الفاظ مفردہ کا ترجمہ ہو لا بشرط شی کے درجہ میں۔

دوسرا احتمال:- اس سے مراد قرآن شریف کے الفاظ مفردہ کا ترجمہ ہو بشرط لا کے درجہ میں۔

تیسرا احتمال:- اس سے مراد قرآن شریف کے الفاظ کا ترجمہ ہو بشرط شی کے درجہ میں یعنی

الفاظ قرآنی من حیث الکلام۔

اسی آخری صورت یعنی الفاظ القرآن من حیث الکلام پر ترجمہ کا اطلاق کر کے ترجمہ الفاظ القرآن

کہنا درست ہو سکتا ہے کیوں کہ ایک لفظ کا دوسرے لفظ پر محمول ہونے سے مقصد ”اتحاد المفہومین

فی المصداق“ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جس میں علوم عقلیہ کے آئمہ کا اختلاف ہے نہ علوم نقلیہ و

لسانیہ کا منطق کے سلم العلوم میں ہے:

”الحمل اتحاد المتغائرين فی نحو من التعقل بحسب نحو آخر من الوجود

اتحادًا بالذات او بالعرض“ (۱)

(۱) سلم العلوم فی المنطق بحث تصدیقات۔

أصول ترجمہ

اور ظاہر ہے کہ ان دو لفظوں یعنی ترجمۃ الفاظ القرآن باعتبار الترتیب الکلامی اور ترجمۃ القرآن کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود مصداق دونوں کا ایک ہے اس کے باوجود ترجمۃ القرآن کو ترجمۃ الفاظ القرآن کہنا محض اس لیے مناسب نہیں ہے کہ پہلی دو صورتوں کے مصداق ترجمۃ القرآن کے مصداق سے مختلف ہیں کہ ان میں الفاظ کے ترکیبی و کلامی اعتبار کا وجود نہیں ہے جبکہ ترجمۃ القرآن محض الفاظ کا نہیں بلکہ الفاظ کلامی یعنی کلام اللہ کا ترجمہ ہوتا ہے ورنہ قرآن شریف کو محض الفاظ سے عبارت کہنا پڑے گا جس کا بطلان ایسا ہی واضح ہے جیسا محض معانی سے عبارت کہنے کا بطلان واضح ہے، جمہور اہل اسلام سے خلاف اور اختراع فی الدین ہے۔ (اعاذنا اللہ منہ)

حقائق کی اس روشنی میں ترجمۃ القرآن کے الفاظ کی مذکورہ دو صفات کہ یہ الفاظ قرآنی کے قائم مقام ہونے کے ساتھ معنوی قرآن بھی ہیں کے علاوہ مزید ایک اور حیثیت بھی معلوم ہو رہی ہے کہ یہ ترجمۃ القرآن کے لیے موضوع بحث بھی ہیں کیوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ فن ترجمہ کے ماتحت خاص فن اور مستقل صنف ہے اور کسی بھی فن میں موضوع بحث وہی چیز ہوتی ہے جس کے عوارضات و حالات سے بحث کی جاتی ہے جیسا علم تفسیر میں قرآن شریف کے احوال سے من حیث الدلالہ علی مراد اللہ تعالیٰ بحث ہونے کی بنیاد پر خود قرآن شریف اُس کا موضوع قرار پاتا ہے۔ اسی طرح ترجمۃ القرآن میں بھی ترجمہ کے الفاظ کی صحت و سقم اور معیاری و غیر معیاری اور فصیح و غریب جیسے احوال سے بحث ہونے کی بنا پر اس کا موضوع بھی ان الفاظ کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

قرآن شریف سے منسوب ہر صفت واجب التعظیم ہے:

اسلامی عقیدہ کے مطابق قرآن شریف سے منسوب ہر صفت اور ہر نسبت واجب التعظیم ہونے کی بنا پر ترجمہ کے یہ تینوں اوصاف انفرادی طور پر بھی واجب التعظیم قرار پاتے ہیں جبکہ بیک وقت تینوں کے اجتماعی طور پر حامل ہونے کی وجہ سے وجوب تعظیم کی وسعت تین گنا زیادہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ حقیقت میں قرآن نہ بلکہ معانی قرآن ہونے کے باوجود بعض احکام میں قرآن شریف

أصول ترجمہ

کے مساوی قرار پاتے ہیں جیسا تو ہیں و بے ادبی کا حرام و معصیت ہونا یعنی قرآن شریف کی اہانت و بے ادبی حرام ہونے کی طرح اُس کے ترجمہ کے ان الفاظ کی اہانت و بے ادبی بھی حرام ہے اور بغیر طہارت کے مس ناجائز و گناہ ہونا یعنی قرآن شریف کو بغیر طہارت کے مس کرنا گناہ و ناجائز ہونے کی طرح اُس کے ترجمہ کے الفاظ کو بغیر طہارت مس کرنا بھی گناہ و ناجائز ہے، حیض و نفاس والی عورت پر اسے پڑھنا اور چھونا ممنوع و گناہ ہونا یعنی جیسا قرآن کا پڑھنا اور اُسے چھونا حیض و نفاس والی عورت کے لیے ناجائز و گناہ ہے۔ اسی طرح اُس کے ترجمہ کو معنوی قرآن سمجھ کر پڑھنا اور چھونا بھی ممنوع و گناہ ہے، اسی طرح واجب التعظیم ہونا یعنی جس طرح قرآن شریف واجب التعظیم ہے ویسا اُس کا ترجمہ بھی معنوی قرآن ہونے کے ناطے واجب التعظیم ہے۔ اسی طرح فرضیت تبلیغ کا ادا ہونا یعنی جیسا اہل عرب کو نفس قرآن کی تبلیغ پہنچانے سے فریضہ ادا ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل عجم کو اُس کا ترجمہ پہنچانے سے بھی تبلیغ کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَأَوْحَىٰ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ“ (الانعام، 19)

سجدہ تلاوت کا لازم ہونا یعنی جیسا اصل قرآن میں سجدہ تلاوت کی آیت پڑھنے یا سننے سے سجدہ لازم آتا ہے اسی طرح اُس کا ترجمہ پڑھنے یا سننے سے بھی لازم ہوتا ہے۔ اور حالت جنابت جیسے کسی بھی حدیث اکبر کی حالت میں کتابت کا ممنوع و ناجائز ہونا یعنی جیسا جنابت کی حالت میں اصل قرآن کی کتابت کرنا ممنوع و ناجائز ہے اسی طرح اُس کا ترجمہ لکھنا بھی ممنوع و ناجائز ہے۔ فتاویٰ العالمگیریہ میں ہے:

”ولو كان القرآن مكتوباً بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة

وكذا عندهما على الصحيح“ (۱)

فتاویٰ البرازیہ میں ہے:

”ولو تلى بالفارسية تجب عليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع ولم

(۱) الفتاویٰ العالمگیریہ، ج: 1، ص: 39، مطبوعہ نوری کتب خانہ پشاور پاکستان۔

اصول ترجمہ

یفہم اذا اخبر السامع انه قراء آية السجدة“ (۱)

فتاویٰ الدر المختار میں ہے: ”يمنع قراءة قرآن بقصدہ ومسہ ولو مكتوبا بالفارسية

فی الاصح“ (۲)

فتاویٰ البحر الرائق فی شرح کنز الدقائق میں ہے: ”ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية

يحرم علی الجنب والحائض مسہ بالاجماع وهو الصحيح“ (۳)

قرآن شریف کو حاصل اس قسم احکام کا اُس کے ترجمہ کے لیے حاصل ہونے کا فلسفہ اس

کے تینوں اوصاف کا اجتماع ہے کہ بیک وقت ترجمۃ القرآن من حیث الفن کے لیے موضوع ہونے

کے ساتھ معنوی قرآن بھی ہیں اور الفاظ قرآنی سے بدل اور ان کے قائم مقام بھی ہیں جب ان میں

سے ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت سے موجب تعظیم ہے تو پھر ان کا اجتماع تین گنا زیادہ موجب تعظیم

کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی جس زبان میں بھی قرآن شریف کا لکھا ہوا ترجمہ پایا جاتا ہے وہ

اُس کے عرف عام میں معنوی قرآن کہلاتا ہے اور عرف عام کا یہ تاثر محض ترجمۃ القرآن کے ساتھ

خاص نہیں ہے بلکہ ہر کتاب کے ترجمہ کا یہی حال ہے چاہے عرشی ہو یا فرشی اور تورات و انجیل کے

پائے جانے والے تراجم جو تورات و انجیل کے نام سے مشہور ہو چکے ہیں اس کا فلسفہ بھی یہی کچھ ہے۔

حقائق کی اس روشنی میں قرآن شریف کے کیے گئے ترجمہ کی شرعی حیثیت و احکام واضح

ہونے کے ساتھ اس عمل میں آنے یعنی ترجمہ کر کے اسے وجود میں لانے والوں کی شرعی ذمہ

داریاں بھی ظاہر ہو رہی ہیں کہ یہ نہایت احتیاط طلب امر ہے، وسیع الجہات اور کثیر الشرائط ہے ایک

(۱) الفتاویٰ النبرازیہ علی هامش العالمگیریہ، ج: 1، ص: 156، مطبوعہ نوری کتب

خانہ پشاور پاکستان۔

(۲) الدر المختار فی شرح تنویر الابصار فی المذهب الحنفی، ج: 1، ص: 51، بحث

فی احکام الحيض والنفاس۔

(۳) البحر الرائق، ج: 1، ص: 212، دار المعرفہ بیروت۔

اصول ترجمہ

شرط سے خلاف ہونے پر بھی آیت کریمہ کا مفہوم کیا سے کیا ہو سکتا ہے یہاں تک کل مکاتب فکر علماء اسلام متفق ہیں اور سب کی ایک آواز ہے کہ کسی فاقد الشرائط نااہل کے لیے اس عمل میں آنا جائز نہیں ہے، چاہے دنیوی علوم میں بڑے سے بڑے مقام پر فائز کیوں نہ ہو اور شیخ الحدیث و مرشد الناس کہلانے والا ہی کیوں نہ ہو۔ عہد صحابہ سے لے کر آج تک الہیات کے طبقہ محدثین سے لے کر مفسرین اور طبقہ فقہاء تک کسی نے بھی بغیر شرائط کے مفسر بننے کی بھی اجازت نہیں دی ہے چہ جائیکہ ترجمہ کے عمل میں آنے کو جائز کہا جائے جبکہ ترجمہ کا معاملہ تفسیر کی بہ نسبت زیادہ مشکل اور ہمہ جہت قابل احتیاط ہے۔ نیز ان تمام حضرات نے اُن لوگوں کو حدیث نبوی ﷺ ”من قال فی القرآن بغير علم فليتبؤ مقعده من النار“ (ترمذی شریف، ج: 2، ص: 119، کتاب التفسیر) کا مصداق و مظہر قرار دیا ہے جو بغیر شرائط کے مفسر بننے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر بغیر شرائط کے مترجم بننے والوں کا کیا ہی حال ہوگا۔ مفتی الدیار الشامیہ محمد ابن عابدین نے فتاویٰ ردالمحتار میں علم کلام، علم الاصول، علم النحو، علم متن اللغة، علم المعانی اور علم البیان جیسے فنون کے بغیر تفسیر ناجائز ہونے سے متعلق ضمنی گفتگو میں لکھا ہے:

”وکل هذه آلة لعلم التفسير“ (۱)

اور ظاہر ہے کہ آلہ کے بغیر نہ صرف تفسیر بلکہ کوئی کام بھی درست نہیں ہوتا چہ جائیکہ قرآن شریف کے ترجمہ جیسا کثیر الشرائط عمل درست ہو سکے۔

مالکی المذہب مفسر ابو حیان الاندلسی المتوفی 754ھ نے قرآن فہمی کو اصل الاصول قرار دینے کے ساتھ دوسرے تمام علوم و فنون کو اس کی دست آوری کے لیے بمنزلہ آلہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”كتاب الله هو المقصد بالذات وغيره من العلوم له كالادوات“ (۲)

اور جن علوم و فنون کو قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ کہا ہے مفسر و مترجم میں اُن کے اجتماع کو ضروری شرط

(۱) فتاویٰ ردالمحتار، ج: 1، ص: 32، مطبوعہ ماجدیہ کوئٹہ پاکستان۔

(۲) خطبہ تفسیر البحر المحیط للامام ابی حیان الاندلسی الغرناطی۔

أصول ترجمہ

قرار دینے کے ساتھ ان کے فائدہ و ناقص سے متعلق لکھا ہے:

”فانه بمعزل عن فهم غوامض الكتاب وعن ادراك لطائف ماتضمنه من العجب العجائب وحظه من علم التفسير انما هو نقل اسطار وتكرار محفوظ على مر الاعصار“ (۱)

یہاں پر بھی وہی اصول ہے کہ جب بغیر شرائط کے تفسیر کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر ترجمہ کا حق کیوں ادا ہو جبکہ ترجمہ کا معاملہ تفسیر کے مقابلہ میں درجہا مشکل اور زیادہ قابل احتیاط ہے۔ شافعی المذہب مفسر امام جلال الدین السیوطی المتوفی 911ھ نے موقوف علیہ علوم و فنون کو ترجمہ و تفسیر کے لیے شرط قرار دینے کے بعد ان کے بغیر قرآن شریف میں رائے زنی کرنے والوں کو تفسیر بالرائے کی وعید میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے:

”لا یكون مفسر الا بتحصيلها فمن فسر بدونها كان مفسرا بالرأی المنهی عنه واذا فسر مع حصولها لم یكن مفسرا بالرأی المنهی عنه“ (۲)

تقریباً اسی قسم تفصیل الاتقان فی علوم القرآن میں بھی لکھی ہوئی موجود ہے (۳)

معتزلی المذہب مفسر جارا اللہ الزمخشری نے علم المعانی اور علم البیان میں پوری طرح مہارت کو قرآن فہمی کے لیے ضروری قرار دینے کے بعد ترجمہ و تفسیر کے لیے دوسری شرائط کے ناگزیر ہونے سے متعلق لکھا ہے:

”بعد ان یكون آخذا من سائر العلوم بحظ جامعاً بین امرین تحقیق و حفظ کثیر المطالعات، طویل المراجعات، قدر جمع زمانا ورجع الیه وردود علیہ

(۱) البحر المحیط، ج: 1، ص: 7، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

(۲) التبحیر فی التفسیر، ص: 330، للامام جلال الدین السیوطی المتوفی 911ھ، المطبوع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور۔

(۳) الاتقان فی علوم القرآن، ج: 2، ص: 182، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

أصول ترجمہ

فارسی علم الاعراب، مقدما فی حملة الكتاب“ (۱)

حنفی المذہب مفسر السید محمود البغدادی المتوفی 1270ھ نے اس موضوع سے متعلق کہ قرآن شریف کی تفسیر و ترجمہ کے عمل میں آنا کس کے لیے جائز اور کس کے لیے ناجائز ہے اپنے سے پیشروؤں کی تصریحات کو اختصار اور خلاصۃ الکلام کے طور پر لکھا ہے:

”فالذی ینبغی أن یعول علیہ أن من کان متبحراً فی علم اللسان مترقیاً منه إلی ذوق العرفان وله فی ریاض العلوم الدینیة أوفی مرتع، وفی حیاضها أصفی مکرع یدرک إعجاز القرآن بالوجدان لا بالتقلید وقد غدا ذهنه لما أغلق من دقائق التحقیقات احسن اقلید فذاک یجوز له ان یرتقی من علم التفسیر ذروتہ ویمتطی منه صہوتہ، وأما من صرف عمره بوساوس أرسطاطالیس واختار شوك القنافذ علی ریش الطواویس فهو بمعزل عن فهم غوامض الكتاب وإدراک ما تضمنه من العجب العجائب“ (۲)

جو علوم و فنون قرآن نہیں کے لیے بمنزلہ آلہ ہیں کہ اُن کی وساطت سے قرآن شریف کے متعارف معانی پہچانے جاتے ہیں جنہیں مفہوم اول یا المعانی الاولیہ کہا جاتا ہے اُن میں پوری طرح تجربہ اور عملی تمرین حاصل کیے بغیر ترجمہ و تفسیر کے عمل میں آنے والوں کو تفسیر بالرائے کی وعید میں شمار کرتے ہوئے مالکی المذہب مفسر الامام ابو عبد اللہ القرطبی المتوفی 671ھ نے لکھا ہے:

”فمن لم یحکم ظاہر التفسیر وبادر الی استنباط المعانی بمجرد فهم العربیہ کثر غلطه ودخل فی زمرة من فسر القرآن بالرائی“ (۳)

(۱) مقدمة الکشاف، ج: 1، ص: 17، لاجار اللہ الزمخشری المتوفی 538ھ۔

(۲) مقدمہ تفسیر روح المعانی، ج: 1، ص: 7، للعلامہ السید محمود البغدادی المتوفی 1270ھ، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔

(۳) الجامع لاحکام القرآن، للامام القرطبی، ج: 1، ص: 34، مطبوعہ الغزالی دمشق الشام۔

أصول ترجمہ

شرائط کے جامع ہوئے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کے ناجائز اور مستحق عذاب ہونے سے متعلق مشتے نمونہ ازخروارے متقدمین کی ان چند عبارات کے علاوہ ماضی قریب اور وقت حاضر کے تمام مکاتب فکر اہل علم نے بھی یہی کچھ کہا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ فاقد الشرائط و ناقص حضرات کو ترجمۃ القرآن کرنا جائز ہے نہ تفسیر کرنا بلکہ ایسے نااہلوں کا مترجم و مفسر بننا لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونے والوں سے مختلف نہیں ہے نہ صرف اتنا بلکہ ایسے حضرات حدیث نبوی ﷺ "مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" کے مظہر قرار پاتے ہیں۔ تفسیر مجمع البیان کے مصحح اور اُس کا مقدمہ لکھنے والے جعفری المذہب سکا لرحمد جواد البلاغی نے جارا اللہ الزمخشری کی بیان کردہ شرائط کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”لا يحل التعاظمي لمن عرى عنها وهو فيها ضالع“ (۱)

ایک اور اسکا لرا اور التفسیر الکاشف کے مصنف نے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 78 ”وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ الْأَمَانِي وَانْهُمْ لَا يُظْنُونَ“ کے تحت لکھا ہے:

”وفي هذه الآية دلالة واضحة على ان تفسير الكتاب والسنة لا يجوز بالتخرس والظن بل لا بد قبل كل شيء من العلم بقواعد التفسير وأصوله ومراعاة هذه القواعد في بيان مراد الله ورسوله حذرًا من الكذب عليهما والنسبة اليهما دون مبرر شرعي واول الشروط لصحة التفسير القرآنة والكتابة ثم العلوم العربية بشتى اقسامها من معرفة مفردات اللغة والصرف والنحو وعلم البيان والفقه وأصوله وعلم الكلام والالمام ببعض العلوم الاخرى التي يتصل بها تفسير بعض الآيات على ان هذه يمكن للمفسر ان يرجع في معرفتها لاهل الاختصاص“ (۲)

(۱) مقدمہ مجمع البیان، ج: 1، ص: 66، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران۔

(۲) التفسیر الکاشف لمحمد جواد مغنیہ، ج: 1، ص: 134، مطبوعہ دار العلم للملایین بیروت۔

أصول ترجمہ

ماضی قریب کے ایک اور مشہور حنفی المسلک سکالر انور شاہ کشمیری المتوفی 1352ھ نے لکھا ہے:

”ومما ينبغي ان لا يذهل عنه ان نظم القرآن لا يؤدى المراد فقط بل ينبى على الحقائق ويرمز اليها فعلى المترجم له بلفة أخرى ان يرعى ذلك النظم ثم ينظر الى لغة أخرى انها هل تؤدى مؤداه اولا ومن لا يبالى بذلك ربما يغير المراد“ (۱)

اس عبارت میں موصوف نے ترجمۃ القرآن کے صرف ایک شرط کی خلاف ورزی کا انجام بد بتایا ہے کہ اس کے فائدنا اہل کا کیا ہوا ترجمہ مراد الہی سے خلاف ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف کا ایسا ترجمہ کرنے کی اجازت اہل اسلام کے کسی بھی مذہب میں نہیں ہے جو مراد الہی سے خلاف ہوتا ہو تو پھر اس کا مال ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ (۲) کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مفتی محمد شفیع نے لکھا ہے:

”قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو و صرف اور بلاغت و ادب کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو کیوں کہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی معمولی ٹھڈ بڈھ رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور

(۱) فیض الباری شرح صحیح البخاری، ج 3، ص 7، مطبوعہ مکتبہ یعقوب الفراہی۔

(۲) ترمذی، ج 2، ص 119، میر محمد کراچی پاکستان۔

اصول ترجمہ

نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کریم کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پُرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں پُچھتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، دنیوی علوم و فنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو دُنیا کا کوئی صاحب عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لیے ڈاکٹر بننے کے لیے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی داں انجیئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجیئر بننا چاہے تو دُنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجیئر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آ سکتا، بلکہ اس کے لیے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجیئر بننے کے لیے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہو سکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کیے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لیے کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کر دے۔“ (۱)

(۱) معارف القرآن، ج: ۱، ص: ۵۳ تا ۵۴، مطبوعہ ادارہ المعارف کراچی نمبر ۱۴۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:-

الہیات پر سطحی نظر رکھنے والے نیم خواندہ حضرات کو یہاں پر اشتباہ ہو سکتا ہے کہ فاقد الشرائط اور نا اہل کے لیے قرآن شریف میں رائے زنی کرنے کے ممنوع و حرام ہونے سے متعلق اسلاف کی یہ تصریحات تفسیر سے متعلق ہیں ترجمہ کے بارے میں نہیں ہیں جبکہ یہاں پر موضوع سخن ترجمہ ہے تفسیر نہیں اور تفسیر و ترجمہ ایک دوسرے سے جدا فن ہیں۔ اُن کی تعریف و غرض اور موضوع بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تفسیر کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایسا فن ہے جس میں آیاتِ قرآنیہ کے احوال سے اس حیثیت سے بحث کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر دلالت کریں اور ترجمہ کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایسا فن ہے جس میں قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام اور مطابق ہو سکیں اور علم تفسیر کا موضوع خود قرآن شریف ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کا موضوع ترجمہ کے الفاظ ہیں اور علم تفسیر سے غرض و غایت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے مراد اور مقاصد قرآنیہ کی پہچان ہوتی ہے جبکہ ترجمہ سے مقصد دوسری زبان والوں کو قرآن شریف کے مقاصد و معانی سے آگاہی کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں تفسیر کی شرائط کے فاقد و نا اہل کے لیے قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کو ناجائز و حرام قرار دینا کون سا انصاف ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کا تصور تفسیر اور ترجمہ کے مابین نسبت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ترجمۃ القرآن کا لغوی مفہوم بھی وہی ہے جو عرفی مفہوم کہلاتا ہے یعنی قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا جو اُن کے قائم مقام اور اُن کی تمام قابل فہم حیثیات کے مطابق ہو سکیں جبکہ تفسیر کے دو الگ الگ مفہوم ہیں:

لغوی:- لغت کی زبان میں کسی چیز کے کھولنے اور ظاہر کرنے کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ مفردات

القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے: "الفسر اظهار المعنی المعقول"

عرفی:- جو الفاظ قرآنی کے مفہوم اور مرادِ الہی پر دلالت کرنے کی حیثیت میں اُن سے بحث

کرنے سے عبارت ہے۔

أصول ترجمہ

تفسیر کے ان دو مفاہیم کے مابین عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے کہ عرفی مفہوم میں تفسیر کی ہر شکل اور ہر فرد پر اس کا لغوی مفہوم صادق آتا ہے جس کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ ”کل تفسیر عرفی تفسیر لغوی“ لیکن اس سے برعکس نہیں ہے یعنی یوں نہیں کہا جاسکتا کہ ”کل تفسیر لغوی تفسیر عرفی“ جبکہ تفسیر کے یہ دونوں مفہوم ترجمہ کے مقابلہ میں عام مطلقا ہیں۔ جس کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ ”کل ترجمة القرآن المعیاری تفسیر“ یعنی قرآن شریف کا ہر معیاری ترجمہ اس کی تفسیر ہے کیوں کہ ترجمہ والی زبان میں مراد الہی کا اظہار ہو رہا ہے تو پھر اس حمل کے صدق میں کس کو شک ہو سکتا ہے لیکن اس سے برعکس نہیں ہو سکتا یعنی یوں نہیں کہا جاسکتا کہ ”کل تفسیر ترجمة“ کیوں کہ تفسیر میں متن کے الفاظ سے زیادہ الفاظ بھی ہو سکتے ہیں بلکہ تفسیر کی غالب اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے جبکہ ترجمہ میں زیادہ الفاظ کی گنجائش نہیں ہوتی مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی خاص مجبوری لاحق ہو جو بہت کم کہیں ہوتا ہے اس کے لیے بھی مخصوص اصول و ضوابط ہوتے ہیں جن کی تفصیل اس کتاب کے پہلے باب میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

باقی رہا یہ تصور کہ تفسیر کی جن اقل قلیل قسموں پر ترجمہ صادق آتا ہے ان کی کیا صورت ہے؟

تو اس کی مثالوں میں قرآن شریف کے وہ تمام تراجم شامل ہیں جنہیں ترجمۃ القرآن کی حقیقت سے نا آشنا حلقوں میں لفظی ترجمہ، ترجمہ تحت اللفظ اور تحت اللفظ ترجمہ جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

جن کی حقیقت تفسیر لفظی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جسے تعریف لفظی بھی کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ والی زبان میں قرآنی الفاظ کی ترتیب کے ساتھ تفسیر کی جاتی ہے جس میں کبھی کبھار بعض جگہوں میں ترجمۃ القرآن کی شکل بن جاتی ہے جسے حسن اتفاق کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا ترجمۃ القرآن کے نام سے اردو زبان میں لکھے گئے شاہ رفیع الدین کا ترجمہ ”القرآن الکریم“ گوجرانوالہ پاکستان، پنجاب کے مولانا ظریف القادری کا ترجمہ، اور حافظ صلاح الدین یوسف و معاونین کی ٹیم کا کیا ہوا ترجمہ بنام ”لفظ بہ لفظ روان اردو ترجمہ“ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ترجمۃ القرآن اور تفسیر کے مفاہیم کے مابین اس نسبت کو پیش نظر رکھنے والا ہر شخص سمجھتا ہے کہ تفسیر کے عمل میں آنے کے لیے شرائط کا

اصول ترجمہ

ترجمہ کے عمل میں آنے کے لیے شرط ہونا ضروری ہے کہ جو شخص تفسیر لکھنے کی شرائط کا جامع نہیں ہے وہ ترجمۃ القرآن لکھنے کے لیے بدرجہ اولیٰ نااہل ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس کا تفسیر لکھنا جائز نہیں ہے اُس کا مترجم قرآن بننا بدرجہ اولیٰ ناجائز و ممنوع ہے۔ نیز جو شخص فاقد الشرائط ہونے کے باوجود مفسر بن کر حدیث نبوی ﷺ ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ کا مستحق قرار پاتا ہے قرآن شریف کا مترجم بن کر بدرجہ اولیٰ اس کا سزاوار قرار پائے گا۔ الغرض اسلاف کی مذکورہ تصریحات کے مطابق جس کا مفسر بننا ممنوع و ناجائز ہے اُس کا مترجم قرآن بننا بدرجہ اولیٰ ناجائز و ممنوع اور گناہ ہے کیوں کہ مفسر بننے کے لیے ضروری شرائط کا جامع ہونے کے ساتھ مترجم قرآن بننے کے لیے اُن سے کچھ اضافی شرائط کا جامع ہونا بھی ضروری ہے جن کی مکمل تفصیل اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں اور ترجمہ کا معاملہ تفسیر کی بہ نسبت زیادہ مشکل اور ہمہ جہت قابل احتیاط ہے جس کے پیش نظر بلا تخصیص مسلک کل مکاتب فکر اسلاف کے اولین و آخرین کے نزدیک مفسر بننے کے لیے جملہ شرائط مترجم بننے کے لیے بھی ضروری قرار پاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلاف کے اولین و آخرین میں کسی ایک مکتب نے بھی فاقد الشرائط کو مترجم بننے کی اجازت نہیں دی ہے۔

کچھ تحسین اور کچھ شکوہ:- جن حضرات نے بغیر شرائط و اہلیت کے مترجم

و مفسر بننے والوں کو گناہ گار قرار دیا ہے، حدیث نبوی ﷺ ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ کا مصداق اور سزاوار عذاب قرار دیا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں شرعی احکام کا اظہار کیا ہے جو قابل تحسین ہے خاص کر زمرہ متاخرین اور ماضی قریب کے مفتی محمد شفیع نے اپنے مذکورہ کلام میں قرآن شریف پر ہونے والے جن مظالم کا رونا رویا ہے اور قرآن فہمی کے لیے صرف عربی زبان جاننے کو کافی و شافی کہنے والوں کی جن بے اعتدالیوں کا اشارہ دیا ہے اُسے مرض کی درست تشخیص کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ سینکڑوں کی تعداد میں لکھے گئے اُن غلط تراجم پر بھی ماتم کرنا چاہیے تھا جو مختلف مکاتب فکر کے ایسے حضرات نے کیا ہے اور کرتے جا رہے ہیں

اصول ترجمہ

جو شرائط کے جامع نہیں ہیں معیاری اور اس میدان کے شہسوار بننے کے قابل نہیں ہیں اور حدیث نبوی ﷺ ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعْهُ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ“ کی وعید سے مستثنیٰ بھی نہیں ہیں۔ ہمارے علماء کرام کے اس کردار کو تضاد کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک طرف فاقد شرائط نااہل کے مترجم بننے کو ناجائز اور سزاوار عذاب قرار دے رہے ہیں جو عین حقیقت ہے، دوسری طرف ایسے ناقص حضرات کے کیے ہوئے خلاف شرائط اور غلط تراجم کو قرآن مجید کی خدمت قرار دے رہے ہیں، کافی دشمنی کہہ رہے ہیں اور درست ہونے کی سند دے رہے ہیں اور یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ ان جیسا اچھا کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ (فیاللعجب لهذا العجب والتضاد) قول و عمل کے اس تضاد میں برصغیر پاک و ہند علماء کی غالب اکثریت مبتلا ہے جو المیہ سے کم نہیں ہے مشتے نمونہ از خردارے مفتی محمد شفیع بانی دارالعلوم کراچی پاکستان نے ایک جگہ ترجمۃ القرآن کو ہمہ جہت قابل احتیاط بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”تفسیر قرآن جو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہو اس میں سب سے اہم اور احتیاط کی چیز قرآن کا ترجمہ ہے کیوں کہ وہ اللہ کے کلام کی حکایت ہے، اس میں ادنیٰ سی کمی بیشی بھی اپنی طرف سے روا نہیں، اس لیے میں نے خود کوئی ترجمہ لکھنے کی ہمت نہیں کی۔“ (۱)

ہم اس کی تحسین کرتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں ترجمۃ القرآن کی اہمیت بتائی ہے اور اس میں شرائط سے ادنیٰ سے ادنیٰ کمی بیشی کو بھی ناروا و ناجائز قرار دیا ہے جو حدیث نبوی ﷺ کے مطابق اور حقیقت ہے لیکن اس کے پانچ صفحات بعد تفسیر شروع کرتے ہوئے قرآن شریف کی ابتدائی آیت ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اس سے خلاف ہے لکھا ہے کہ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

(۱) معارف القرآن، ج: 1، ص: 68۔

أصول ترجمہ

لسانِ قرآنی سے قدرے واقف حضرات بھی جانتے ہیں کہ یہ ترجمہ تین وجوہ سے غلط ہے:

پہلی وجہ:- اُس کی نحوی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ نحوی اصولوں کے مطابق یہاں پر اسمِ جلالت (اللہ) موصوف ہے جس کے بعد ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ اس کی صفت بعد الصفة ہیں اور موصوف و صفت کا مجموعہ جملہ ہوتا ہے نہ کلام بلکہ اس کی لسانی اور نحوی حیثیت مفرد کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کلام کے مقابلہ میں اسے مفرد کہنے میں اہل لسان کی دورائے ہیں نہ نحاۃ کی جس کے برعکس اس ترجمہ میں اسے جملہ ظاہر کیا گیا ہے جیسا اُس کے مذکورہ الفاظ ”جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں“ سے ظاہر ہے کیوں کہ اُردو محاورہ کے مطابق لفظ ”ہے“ ہیں“ جملہ کے ساتھ خاص ہیں جو الفاظ جملہ و کلام نہیں ہوتے اُن کے لیے انہیں استعمال نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں مذکورہ انداز کو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا معیاری ترجمہ کہنے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ بلغاء اور لسانِ قرآنی اسے تسلیم کرتی ہے نہ تفسیر۔

دوسری وجہ:- ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کی لسانی حیثیت دو حال سے خالی نہیں ہیں:

پہلا حال:- جار و مجرور یعنی بسم اللہ کے لیے عامل فعل ہوگا مثلاً (شروع کرتا ہوں) اس صورت میں پورے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف میں ایک جملہ ہوگا جبکہ مذکورہ ترجمہ میں اُس کے دو جملے ظاہر کیے گئے ہیں تو پھر اسے غلط محض کے سوا اور کیا کہا جائے۔

دوسرا حال:- جار و مجرور یعنی بسم اللہ کے لیے عامل مصدر ہوگا مثلاً (شروع اللہ کے نام سے، اللہ کے نام سے شروع) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے اس صورت میں پوری ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف ایک جملہ بھی نہیں ہوگا کیوں کہ نحوی اور بلاغی اصولوں کے مطابق مصدر اپنے فاعل یا قائم مقام فاعل سے مل کر شبہ جملہ بھی نہیں ہوتا چہ جائیکہ جملہ ہو تو پھر دو جملوں میں کیے گئے مذکورہ ترجمہ کو اُس کی لسانی اور نحوی حیثیت کے مطابق کون کہے۔

أصول ترجمہ

تیسری وجہ:- یہ دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف ہے کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لا شریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جبکہ شانِ الہی کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنے کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔ نیز قرآن شریف کی زبان یعنی عربی زبان میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے نہ اردو زبان میں بلکہ دونوں کے محاورہ سے خلاف ہے اور ترجمہ کی حقیقت سے آگاہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ صرف ایک کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی با محاورہ نہیں کہلاتا چہ جائیکہ دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف کو اصل کے مطابق اور با محاورہ کہا جاسکے۔

مترجمین پر افسوس کہ جب ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ شریف کا معیاری، با محاورہ اور شرائط کے مطابق ترجمہ (شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان بہت رحم والا، شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بے حد رحم والا، اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان بے حد رحم والا، شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان بے حد رحم والا) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو با محاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ جملہ شرائط پر بھی منطبق ہیں اور ترجمہ کی تعریف کے سانچے میں فٹ ہونے کی بدولت ہر قسم اعتراض سے بھی پاک و محفوظ ہیں۔ ہم مذکورہ غلط ترجمہ کرنے والے مترجمین سے زیادہ انہیں پذیرائی دینے والوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور انہیں کافی و شافی کہہ کر غلط تراجم کی ترویج کا سبب بننے والے مفتی محمد شفیع جیسے قابل ذکر حضرات سے شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس چیز کی اہمیت و احتیاط ظاہر کرنے میں لسان کی حد تک کمال کیا تھا آگے چل کر عمل کے میدان میں خود اُس کی دھجیاں اڑادی۔ (فیاللعجب لعدم مساعدة العمل مع القول واللعب) یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ لکھتے وقت اگر تفسیر معارف القرآن کے مصنف ترجمۃ القرآن کی فطری شرائط کو پیش نظر رکھتے یا اُس کی جامع و مانع تعریف پر نظر رکھتے یا کم از کم اتنا کہ ”بِسْمِ اللّٰهِ

أصول ترجمہ

الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ شریف کی لسانی اور نحوی یا بلاغی حیثیت کو متحضر رکھتے تو مذکورہ ترجمہ پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ اور اُس پر اپنی تفسیر کی بنیاد رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرتے لیکن اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہاں پر ”التَّعَصُّبُ إِذَا تَمَلَّكَ أَهْلَكَ“ کی کارستانی تھی یا ”حب الشيء يعمي ويصم“ کی کارفرمائی یا کسی اور سبب سے (واللہ اعلم) تفسیر معارف القرآن کے مصنف بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کے رنگ میں رنگے گئے اور سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی غلط تراجم کے مروج ہونے کا سبب بن گئے، جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ غلط اور خلاف شرائط لکھے گئے تراجم کو صحت کی سند دینے کی بے اعتدالی میں تفسیر معارف القرآن کے مصنف منفرد نہیں ہیں بلکہ یہ عام المیہ ہے خصوصیت مسلک سے قطع نظر برصغیر پاک و ہند علماء کی غالب اکثریت اس میں مبتلا ہے۔ ہم اپنی اس کتابی کاوش کے ذریعہ نہ صرف برصغیر پاک و ہند اہل علم کو بلکہ دنیا بھر کے اُن حضرات کو جو قرآن شریف کے ترجمہ سے استفادہ کے خواہاں ہیں، آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کر کے عجم اقوام کو اُس کے مقاصد سے آگاہ کرنا حسب ضرورت اُمہ پر فرض ہے اور یہ کام شرائط کے جامع حضرات کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح فاقد شرائط نا اہل چاہے بڑے سے بڑے دنیوی منصب پر فائز کیوں نہ ہوں، عوام کی نظر میں پیرو مرشد اور شیخ الحدیث و التفسیر کہلانے والے ہی کیوں نہ ہوں جب تک شرائط کا جامع نہ ہوں اُن کے لیے اس عمل میں آنا جائز نہیں ہے۔ اور دنیوی منصب یا مذہبی القاب سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس عمل میں آنے اور قرآن مجید کے مترجم بننے والوں کا انجام حدیث نبوی ﷺ ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ (۱) کا مظہر بننے کے سوا اور کچھ نہیں ہے (اعاذنا اللہ منہ)

طویل تجربہ کا خلاصہ:- اللہ کی توفیق سے مجھے قرآنی علوم سے اُس وقت سے لگاؤ

ہے جب سے درس نظامی سے فارغ تحصیل ہو کر عملی زندگی کا آغاز کیا ہے، الہیات کے درس و تدریس کے شعبہ سے منسلک ہوا اور معرفت کی وقع کتاب (فصوص الحکم) پڑھنے کے بعد قرآن

(۱) ترمذی شریف، ج 2 ص 119، مطبوعہ میر محمد کراچی۔

اُصول ترجمہ

مجید کی آفاقیت کا شعور پایا اور ہر سال دینی مدارس کے تعلیمی سال کے آخر میں تعطیلات کے دوران پابندی کے ساتھ علماء کرام کو ترجمہ قرآن پڑھانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس دوران علوم قرآنی کے مختلف انواع و امواج میں غوطہ زنی کا شرف پایا اور برصغیر پاک و ہند کے مختلف مکاتب فکر مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم کا مطالعہ کیا، شرائط کی روشنی میں تجزیہ کیا اور صحت و سقم کے حوالہ سے تجربہ کیا۔ نصف صدی پر محیط اس طویل تجربہ کا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال کے دوران کیے گئے ان تراجم کی غالب اکثریت غلط ہے، شرائط سے خلاف ہیں اور ترجمہ القرآن کی تعریف سے برعکس ہے انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مترجمین نے یہ لکھتے وقت ترجمہ القرآن کی جامع و مانع تعریف کو دل و دماغ میں مستحضر نہیں کیا تھا، اُس کی شرائط کا پاس نہیں رکھا تھا بلکہ دو تین کے استثناء کے بعد باقی سب نے حسب پسند جیسا چاہا ویسا لکھ دیا ہے اس کے ساتھ ہمارے تجربہ میں یہ بھی آیا ہے کہ جن جن حضرات نے ان پر تبصرہ کیا ہے اور انہیں صحت کی سند دی ہے۔ نیز وہ جنہوں نے انہیں کافی و شافی کہہ کر انہیں قرآن شریف کی خدمت قرار دیا ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی قرآن شریف کے تراجم پر تبصرہ کرنے اور معیاری و غیر معیاری کی تمیز بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا، یعنی شرائط کا جامع نہیں تھا کیوں کہ ترجمہ القرآن کی تعریف کو معیار بنا کر یا شرائط کو پیش نظر رکھ کر تبصرہ کرنے والا کوئی شخص بھی شرائط سے خلاف اور تعریف سے برعکس تراجم کو درست قرار نہیں دے سکتا اور نہ ہی لفظی اور با محاورہ ترجمہ یا تحت اللفظ اور تفسیری یا معانی کا ترجمہ جیسی مہمل و بے مقصد تقسیم کا تصور کر سکتا ہے کیوں کہ ترجمہ القرآن کی تعریف کہ وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں یعنی اُن کی تمام لسانی اور متعارف حیثیات کے مطابق ہو سکیں۔ ایسی تقسیمات کی متحمل نہیں ہے کیوں کہ اس کا مظہر با محاورہ ترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ قرآن شریف کا با محاورہ ترجمہ وہی کہلاتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ کسی ایک کے محاورہ سے بھی خلاف ہونے والا ترجمہ با محاورہ ہرگز نہیں بلکہ بے محاورہ

أصول ترجمہ

کہلاتا ہے اور با محاورہ ہونا تب ممکن ہو سکتا ہے جب تمام شرائط کے مطابق ہو جبکہ ترجمۃ القرآن کی جملہ شرائط کا وجود اور اُس کی تعریف کے مظہر کا وجود مساوی فی المصداق ہوتے ہیں یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کا مصداق موجود ہو لیکن شرائط کا اجتماعی وجود نہ ہو یا اس سے برعکس نہیں معیاری ترجمہ میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس حوالہ سے قضیہ ”کل ما صدق علیہ تعریف ترجمۃ القرآن صدق علیہ اجتماع شرائط الترجمة“ اسی طرح قضیہ ”کل ما صدق علیہ اجتماع شرائط الترجمة صدق علیہ تعریف ترجمۃ القرآن“ یہ دونوں ایسے ہی ناقابل انکار بدیہی ہیں جیسا قضیہ ”کل ما صدق علیہ الانسان صدق علیہ المتفکر“ اور قضیہ ”کل ما صدق علیہ المتفکر صدق علیہ الانسان“ ناقابل انکار بدیہی ہیں۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اُس کی شرائط سے آگاہ کوئی شخص بھی کسی خلاف شرط ترجمہ پر ترجمۃ القرآن کا اطلاق نہیں کر سکتا یعنی اُسے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ نہیں کہہ سکتا یہی حال اُس کی تعریف سے خلاف کیے گئے تراجم کا بھی ہے کہ اُسے قرآن شریف کا درست ترجمہ نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ کافی وثافی کہا جائے یا اُسے قرآن شریف کی خدمت قرار دیا جائے۔ نیز ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اُس کی شرائط کے اجتماع کے مابین اس نسبت کو سمجھنے والا کوئی شخص بھی ترجمۃ القرآن کو لفظی ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ کی طرف تقسیم کر سکتا ہے نہ تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ کے عنوان سے تقسیم کر سکتا ہے اور نہ ہی لفظ بہ لفظ ترجمہ اور تفسیری ترجمہ کے نام سے تقسیم کرنے کا سوچ سکتا ہے چہ جائیکہ ترجمہ معانی القرآن کے نام سے بدعت ایجاد کرنے کی جسارت کر سکے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف پر منطبق اور اُس کی شرائط کے مطابق ترجمہ با محاورہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جبکہ لفظ بہ لفظ، تحت اللفظ اور لفظی ترجمہ جیسے ناموں سے یاد کیے جانے والے تراجم ترجمۃ القرآن ہر گز نہیں بلکہ الفاظ قرآن کے ترجمے ہیں جنہیں تعریف لفظی اور تفسیر المفردات

اصول ترجمہ

بھی کہا جاتا ہے جبکہ قرآن شریف محض الفاظ قرآنی سے نہیں بلکہ الفاظ و معانی کے مجموعہ مرکب سے عبارت ہے۔ اسی طرح تفسیری ترجمہ اور ترجمۃ التفسیر پر بھی ترجمۃ القرآن کی تعریف صادق نہیں آتی کیوں کہ اس کی حقیقت مفسر کی ترجیح، اس کا دخل عمل اور اس کی تفسیر کا ترجمہ ہے قرآن مجید کا نہیں۔ حقائق کی اس روشنی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ کہنا کہ:

”لفظی ترجمے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے ہر ہر لفظ کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ہر آیت کے نیچے اس کا ترجمہ پڑھ کر جان لیتا ہے کہ اس آیت میں یہ کچھ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس فائدے کے ساتھ اس طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر عربی دان ناظر قرآن مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکتا۔

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانی عبارت، زور بیان، بلاغت زبان، اور تاثیر کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تاثر رونما ہونا تو درکنار ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟“ (۱)

اس کے ایک صفحہ بعد لکھا ہے:

”لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متاثر نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بین السطور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے

(۱) تفہیم القرآن، ج: 1، ص: 7، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

اصول ترجمہ

ایک طرف کلام اللہ اور دوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اُس غرض کے لیے تو عین مناسب ہے جس کی خاطر آدمی لفظی ترجمہ پڑھتا ہے، کیوں کہ اس طرح ہر لفظ اور ہر آیت کے مقابلے میں اس کا ترجمہ ملتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دوسری کتابوں کو پڑھتا اور اُن سے اثر قبول کرتا ہے، اُس طرح وہ ترجمہ قرآن کو نہ تو مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کر سکتا ہے کیوں کہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اس کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔“ (۱)

اس کے ایک صفحہ بعد لکھا ہے: ”لفظی ترجمے کے طریقے میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لیے میں نے ”ترجمانی“ کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں۔ اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو، اور کلام الہی کا مطلب و مدعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زور بیان بھی جہاں تک بس چلے ترجمانی میں منعکس ہو جائے۔“ (۲)

یہ سب کچھ مذکورہ حقائق سے غفلت کا نتیجہ اور بے مصرف کلام ہے اسی طرح حافظ صلاح الدین یوسف اور اُن کے معاونین کی شرکت عمل سے وجود میں آنے والا ترجمہ القرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ میں لکھا گیا یہ کلام:

”قرآن فہمی کے لیے لفظی ترجمہ ہی عوام کے لیے مناسب رہتا ہے۔ با محاورہ ترجمے سے

(۱) تفہیم القرآن، ج: 1، ص: 8، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

(۲) تفہیم القرآن، ج: 1، ص: 10، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

جو کلامِ الہی کی ترجمانی ہوتا ہے، زیادہ سلیس و رواں ہونے کی وجہ سے قرآن کا مفہوم تو آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن اس رواں دواں ترجمے کو بار بار پڑھنے کے باوجود، پڑھنے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قرآن کے فلاں لفظ کا ترجمہ کیا ہے اور فلاں کا کیا۔ یوں عمر بھر قرآن خوانی اور ترجمہ خوانی کے باوجود، وہ براہِ راست (ترجمے کے بغیر) قرآن خوانی کے لطف اور اس کے فہم سے اور اس کے اعجاز اور سحر بیانی سے محروم رہتا ہے۔“ (۱)

اور دوسری جگہ پر لکھا ہے: ”ہم یہاں اپنے اس احساس کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کی توثیق یا تائید بیسیوں دوسرے صاحبانِ علم نے بھی کی ہے اور ان سب آراء کا ملخص یہ ہے کہ قرآن مجید کا کما حقہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں، البتہ اس کی ترجمانی کی بہتر سے بہتر کوششوں اور اسالیب کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بس یہی ایک نقطہ نظر ہے جس کے پیشِ نظر ہر عہد کے مترجمین نے نئے سے نئے قرآنی تراجم پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔“ (۲)

اس کے بعد لکھا ہے: ”عملی تجربے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ بامحاورہ ترجمہ، لفظی ترجمے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ لفظی ترجمہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ بامحاورہ ترجمے میں الفاظ کو آگے پیچھے کرنے کی بھی گنجائش ہوتی ہے اور ترجمے میں الفاظ کے اضافے کی بھی۔ جبکہ لفظی ترجمے میں یہ دونوں سہولتیں نہیں ہوتیں۔ اس میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ عربی لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ آئے، اس لیے اس میں اختصار و جامعیت کا بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے اور تفصیل و اضافے سے بچنے کا التزام بھی۔ ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھنا اس کام کو مشکل سے مشکل تر بنا دیتا ہے، اس پر مستزاد یہ بات کہ قرآن کریم کے لفظ لفظ کا ایسا ترجمہ، جو اس کے مفہوم، زورِ بیان اور اعجاز کو مکمل طور پر اپنے اندر سمیٹ لے، ناممکن ہے۔ الفاظ کے دروبست اور زبان و بیان کی

(۱) ترجمۃ القرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو، ص: 17۔

(۲) ترجمۃ القرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو، ص: 9۔

تعبیرات کلام الہی کی تاثیر اور اس کی معنویت کو کسی بھی زبان میں منتقل کرنے سے قاصر ہیں۔“ (۱)

حافظ صلاح الدین ٹیم کے ان مقامات سے بھی وہی کچھ معلوم ہو رہا ہے جو سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مذکورہ کلام سے معلوم ہو رہا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ سید مودودی نے ترجمۃ القرآن کو لفظی ترجمہ کہہ کر اس کی کمزوریاں بیان کیں اور ان سے بچنے کے لیے ترجمہ کی راہ ترک کر کے ترجمانی کی راہ اختیار کی ہے جبکہ حافظ صلاح الدین پارٹی نے ترجمۃ القرآن کو لفظی ترجمہ اور ترجمانی کی طرف تقسیم کر کے ترجمانی کو ہی با محاورہ ترجمہ کہا ہے اور اپنے ترجمہ کو بین بین القسمین کہا ہے جسے درایہ کے مطابق کہا جاسکتا ہے نہ روایت کے اس کا پس منظر بھی مذکورہ حقائق سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ایک اور مشہور مترجم و مفسر پیر کرم شاہ الازہری نے تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ کی اس مہمل و بے مصرف تقسیم کو ذہراتے اور تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

”قرآن کریم کے اردو تراجم جو میری نظر سے گزرے ہیں وہ عموماً دو طرح کے ہیں:

ایک قسم تحت اللفظ تراجم کی ہے لیکن ان میں وہ زور بیان مفقود ہے جو قرآن کریم کا طرہ امتیاز بلکہ اس کی روح رواں ہے۔

دوسری قسم با محاورہ تراجم کی ہے۔ ان میں وقت یہ ہے کہ لفظ کہیں ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ دو سطر پہلے یا دو سطر بعد درج ہوتا ہے اور مطالعہ کرنے والا یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ میں جو نیچے لکھا ہوا ترجمہ پڑھ رہا ہوں اس کا تعلق کس کلمہ یا جملہ سے ہے۔

میں نے سعی کی ہے کہ ان دونوں طرزوں کو اس طرح یکجا کر دوں کہ کلام کا تسلسل اور روانی بھی برقرار رہے۔ زور بیان میں بھی (حتی الامکان) فرق نہ آنے پائے اور ہر کلمہ کا

(۱) ترجمۃ القرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو، ص: 18۔

أصول ترجمہ

ترجمہ اس کے نیچے بھی مرقوم ہو۔“ (۱)

اسی طرح مفتی محمد شفیع ترجمۃ القرآن کو قرآن شریف سے حکایت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”قرآن کا ترجمہ اللہ کے کلام کی حکایت ہے۔“ (۲)

یہ بھی مذکورہ حقائق سے غفلت کا نتیجہ ہے ورنہ ترجمۃ القرآن پر حکایت عن القرآن کے

اطلاق کا جواز ہرگز نہیں ہے یعنی قضیہ ”ترجمة القرآن حکایة عن القرآن“ کہنا کذب ہے

کیوں کہ اس کا نقیض یعنی ”ترجمة القرآن لیس حکایة عن القرآن“ کہنا صادق ہے۔ اس

پر دلیل یہ ہے کہ دوسرے کے کلام کی حکایت کرنے کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت:- عین اُسی کو مین و عن اُس کے اپنے الفاظ میں نقل کیا جائے، جسے روایت

باللفظ بھی کہتے ہیں۔

دوسری صورت:- اُس کے صرف معانی کو نقل کیا جائے جسے روایت بالمعنی بھی کہا جاتا ہے۔

اور سب جانتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن میں ان میں سے کوئی ایک صورت بھی ممکن نہیں

ہے اول اس لیے کہ اس صورت میں ترجمہ کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ دوم اس لیے کہ متن قرآن

کے بغیر محض ترجمہ لکھنا جائز نہیں ہے تو پھر ”ترجمة القرآن لیس بحکایة عن القرآن“ کا جملہ

صادق نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ انجام کار یہ کہ مصنف معارف القرآن کا ترجمۃ القرآن کو کتاب اللہ

سے حکایت قرار دینے کا پس منظر بھی مذکورہ حقائق سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ورنہ ان

کتاب پر نظر رکھنے والوں سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم اس کتاب کے ذریعہ

مذہب سے دُنیا کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ ترجمہ کے نام سے کتاب اللہ کو چوں چوں کا مرہ

(۱) ضیاء القرآن، ص: 12، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور پاکستان۔

(۲) معارف القرآن، ج: 1، ص: 68، حصہ تمہید، مطبوعہ ادارہ معارف القرآن

أصول ترجمہ

بنانے کے گناہ سے اجتناب کیا جائے اور اُس کے ترجمہ کے لیے واحد فطری طریقہ کو اپنایا جائے جو ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اُس کی شرائط کی تفصیل اور ان کے مابین نسبت کو پیش نظر رکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مذکورہ حقائق سے غفلت کے نتیجہ میں جنم پانے والی تمام غلطیوں کی فہرست میں قابلِ تعجب اور نہایت مضحکہ خیز غلطی وہ ہے جس میں ترجمۃ القرآن کی اس تعبیر کو ہی غلط کہہ کر اس کی جگہ ترجمہ معانی القرآن کہا جا رہا ہے کنگ سعود یونیورسٹی الریاض کے لیکچرار حافظ عتیق الرحمن نے لکھا ہے:

”مختلف زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی نص کا بعینہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں پیش کرنا انسانی بساط سے باہر ہے۔ انتہائی کامیاب مترجم بھی صرف قریب ترین مفہوم پیش کر سکتا ہے جس سے ”گزارا“ چل جاتا ہے یہ تو عام عبارات کا حال ہے۔ قرآن کریم کی آیات تو ویسے بھی ”معجزہ“ ہیں، ان کا ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علماء نے ”ترجمہ قرآن“ کو غلط عبارت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ درست عبارت ”ترجمہ معانی القرآن“ ہے۔“ (۱)

ہم اُن علماء پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے ترجمۃ القرآن کی اس فطری اور درست تعبیر کو غلط کہا ہے یا اس کی جگہ ترجمۃ معانی القرآن جیسی غیر فطری تعبیر کا سبق دے رہے ہیں۔ ہمارا تجربہ بتا رہا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں کچھ نیم خواندہ علماء کے سعودیہ کے کچھ علماء سے اختلاط سے جنم پانے والا یہ غیر فطری نام اور نامعقول تعبیر مذکورہ حقائق سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور حافظ عتیق الرحمن ولد مولانا عبدالرحمن کیلانی نے اس کے چار صفحہ بعد لفظی یا بامحاورہ ترجمہ کے عنوان سے لکھا ہے:

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن، ص: 1 تا 2، مطبوعہ دارالسلام و سن پورہ لاہور پاکستان۔

أصول ترجمہ

”تراجم میں عموماً اس قضیہ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کہ ترجمہ لفظی ہو یا بالمحاورہ ہو۔ اگر ترجمہ لفظی ہو تو مفہوم سمجھ آنا مشکل ہے کیوں کہ مضاف مضاف الیہ اور صفہ موصوف وغیرہ اردو اور عربی میں ایک ہی ترتیب سے نہیں ہوتے۔ اسی طرح بعض اوقات بالمحاورہ ترجمہ عربی نص سے کافی مختلف ہو جاتا ہے۔ ہم نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔“ (۱)

ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اس کی شرائط کا اجتماع اور ان کے مابین مساوات کی نسبت کو جاننے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ مذکورہ حقائق سے غفلت کا نتیجہ ہے، بے مصرف اور مہمل کلام ہے اور غیر فطری تعبیر ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی تجربہ ہے کہ جناب حافظ عتیق الرحمن کیلانی اس خلاف روایت و درایت تعبیر پر جن علماء کو متفق کہہ رہے ہیں وہ سعودیہ اور ہندوپاک کے محدود ذہن والے چند حضرات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو عربی مفہوم میں ترجمہ القرآن کی حقیقت، اُس کی جامع و مانع تعریف سے بے خبر، اُس کی شرائط کی تفصیل سے نا آشنا اور شرائط کے اجتماعی وجود اور تعریف کے مصداق کے مابین مساوات کی نسبت سے غفلت کی بنا پر خود بھی خطاء فکری میں مبتلا ہیں دوسروں کو بھی غلط راہ دکھا رہے ہیں۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کی بنیاد کا ازالہ کیا جائے جو مندرجہ ذیل حقائق کی پہچان سے ہی ممکن ہو سکتا ہے:

① ترجمۃ القرآن کی تعریف کہ وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام یعنی اُن کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہوں جن میں اُن کے لغوی معنی سے لے کر مرادی معنی تک اور لسانی حیثیت کے جملہ پہلوؤں سے لے کر محاورتی حیثیات تک سب شامل ہیں۔

② ترجمہ کے الفاظ بمنزلہ جنس ہیں یعنی جنس قریب ہیں۔ ترجمۃ القرآن کے لیے جبکہ

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن، ص: 7، مطبوعہ دارالسلام و سن پورہ لاہور پاکستان۔

أصول ترجمہ

مطابقت والی صفت یعنی اصل کی جملہ متعارف حیثیات کے مطابق ہونے والی صفت بمنزلہ فصل ہے یعنی فصل قریب اور معیار ممیز ہے ترجمۃ القرآن کے لیے۔

۳ ترجمۃ القرآن سے غرض و غایت کہ ترجمہ والی زبان کے لوگوں کو قرآن شریف کے اُن معانی و مقاصد سے آگاہ کرنا ہے جنہیں مفہومِ اول اور معانیِ اصلیہ بھی کہا جاتا ہے جنہیں لسانِ قرآنی والے عام حالات میں محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھتے ہیں اور اہل عجم قرآنِ فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون کے ذریعے سے سمجھتے ہیں جبکہ ان کے علاوہ وہ معانی و معارف جنہیں مفہومِ ثانی کہا جاتا ہے جنہیں جاننے اور اُن پر عمل کرنے پر عام انسان مکلف نہیں ہیں اور اُن کی معرفت صرف اُن مقدس خواص کو ہی نصیب ہو سکتی ہے جو حدیث نبوی ﷺ ”من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم يعلم“ (۱) کے شرف پر فائز ہوتے ہیں جس میں عربی و عجمی کی تفریق نہیں ہے۔

اسی طرح اعجاز اور فصاحت و بلاغت میں انسانی استطاعت سے ماوراء ہونے جیسی وہ بے شمار خصوصیات جو قرآن شریف کے ساتھ مختص ہیں ایسی کسی چیز کے ساتھ بھی ترجمہ کا تعلق نہیں ہوتا۔

۴ ترجمۃ القرآن کی تفصیلی شرائط سے آگاہی اور یہ سمجھنا کہ تمام شرائط کا اجتماعی وجود قرآن شریف کے با محاورہ ترجمہ کو لازم ہے یعنی با محاورہ ترجمہ اور شرائط کا اجتماعی وجود باہم لازم و ملزوم ہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ قرآن شریف کا ترجمہ با محاورہ ہو لیکن شرائط کا اجتماعی وجود نہ ہو یا شرائط کا اجتماعی وجود ہو لیکن ترجمہ با محاورہ نہ ہو۔

۵ قرآن شریف کا درست اور معیاری ترجمہ اپنے عرفی مفہوم میں ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے اور با محاورہ ترجمہ کی صرف ایک صورت ہوتی ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو اور

(۱) روح المعانی، ج: ۱، ص: ۹۱، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت۔

أصول ترجمہ

بامقصد ترجمہ بھی یہی ہوتا ہے اور ترجمہ القرآن کی تعریف کا مظہر بھی یہی ہے۔ ترجمہ القرآن کے حوالہ سے ان حقائق کو پیش نظر رکھنے والے اُسے لفظی ترجمہ، بامحاورہ ترجمہ، تحت اللفظ ترجمہ تفسیری ترجمہ یا معنوی ترجمہ جیسی مہمل تقسیمات کی طرف منقسم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے کیوں کہ جس چیز کو لفظی ترجمہ کہا جاتا ہے وہ ترجمہ القرآن نہیں بلکہ ترجمہ الفاظ القرآن ہے جسے ترجمہ والی زبان کے حوالہ سے مفردات کی تفسیر اور تعریف لفظی بھی کہا جاسکتا ہے جس پر ترجمہ القرآن کا حمل درست نہیں ہے کیوں کہ قرآن محض الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ و معانی کے مجموع مرکب سے عبارت ہے۔ نیز اس میں ترجمہ القرآن کے تصور کے لیے ناگزیر جزو "تقوم مقامها" مفقود ہے تو پھر ترجمہ القرآن کا اُس پر اطلاق کیونکر درست ہو۔ اسی طرح جس چیز کو تفسیری ترجمہ کہا جاتا ہے یا الترجمة التفسیریہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جیسا مباحث فی علوم القرآن کے سعودی مصنف المناع القطان نے کیا ہے:

”حيث قال ويخلق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذا قاموا بتفسير للقرآن يتوخى فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجع ثم يترجم هذا التفسير بامانة وبراعة فان هذا يقال فيه (ترجمة تفسير القرآن) او (ترجمة تفسيرية) بمعنى شرح الكلام وبيان معناه (بلغة اخرى)“ (۱)

اُس پر بھی ترجمہ القرآن کی تعریف صادق نہیں آتی کیوں کہ وہ مترجم کی سوچ اور اُس کی فکری فہم کے نتیجہ کی تعبیر ہے، جسے معانی کی ترجمانی بھی کہا جاسکتا ہے جبکہ ترجمہ القرآن میں قرآنی الفاظ کے مطابق نئے نئے الفاظ ہوتے ہیں اور اُن کا اصل کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے جس میں مترجم کی رائے کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جیسا ترجمہ القرآن کی تعریف

(۱) مباحث فی علوم القرآن، ص: 288، مطبوعہ المكتبة الرشیدیہ جنگی محلہ

اُصول ترجمہ

”هو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ سے بالکل واضح ہے۔ اسی طرح جس چیز کو ترجمہ معانی القرآن کہا جاتا ہے اُس پر بھی ترجمہ القرآن کی تعریف صادق نہیں آتی کیوں کہ قرآن شریف صرف معانی کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ و معانی کے مجموعہ مرکب سے عبارت ہے۔ نیز ترجمہ القرآن جیسی فطری اور متعارف تعبیر کے مقابلہ میں جو حضرات ترجمہ معانی القرآن کہتے ہیں اُن کے نزدیک معانی سے مراد مترجم کی فکری کاوش ہے جیسے مجمع الملک فہد لطباعة المصحف الشريف کے ذمہ داروں نے اس کا اعتراف کیا ہے اور مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ مع حاشیہ حافظ صلاح الدین یوسف جو مصحف شریف چھاپا گیا ہے۔ اُس کے مقدمہ میں صاف لکھا ہے:

”انالندرك ان ترجمة معانى القرآن الكريم مهما بلغت دقتها فانها ستكون قاصرة عن اداء المعانى العظيمة التي يحويها النص القرآنى المعجز وان المعانى التى يؤديها الترجمة انما هى حصيلة ما بلغه علم المترجم فى فهم كتاب الله الكريم وانه يعثر بها ما يعثرى عمل البشر كله من خطأ ونقص“ (۱)

جبکہ حقیقت میں قرآن مجید کا ترجمہ کسی مفسر کی فکری کاوش کی تعبیر ہے نہ کسی مترجم کے نتیجہ فکر کا ترجمہ بلکہ وہ فن ترجمہ کے ماتحت مستقل صنف ہے جس کی تعریف، غرض، موضوع سب سے جدا ہونے کی طرح شرائط بھی امتیازی ہیں اور احتیاطی تقاضے و لوازمات بھی سب سے مختلف ہیں کسی مترجم کے نتیجہ فکر کا تابع اور اُس پر متفرع ہونے کی بجائے اپنی تعریف پر منطبق اور شرائط کے مطابق ہونے کے سوا اور کسی چیز کے مقتضی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف کے سلسلہ دراز میں بھی کسی نے اسے ترجمہ معانی القرآن کے نام سے یاد نہیں کیا بلکہ کل مکاتیب فکر اہل اسلام کے قابل ذکر حضرات میں سے جس نے بھی اس حوالہ سے کچھ کلام کیا ہے ترجمہ القرآن ہی کہا ہے۔ ایسے میں

(۱) مقدمہ، ص: 1، القرآن الكريم و ترجمہ معانیہ و تفسیرہ الى اللغة الارديه۔

أصول ترجمہ

برصغیر پاک و ہند کے کچھ نیم خواندہ علماء کا سعودیہ عربیہ کے علماء سے اختلاط کے اس جنم ”ترجمۃ معانی القرآن“ کو نامعقول بدعت کہے بغیر کون رہ سکتا ہے جو نہ صرف کل مکاتب فکر اسلاف سے خلاف ہے بلکہ درایت و روایت سے بھی برعکس ہے۔ جس کی عمر 20 سال سے زیادہ نہیں ہے اور جائے پیدائش سعودیہ عربیہ کے سوا کہیں اور نہیں ہے جہاں تک اس کا ایجاد و اختلاق سعودیہ کے ساتھ خاص ہونا ہے یہ سب پر ظاہر ہے کہ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے اسلام اور کرہ ارض کے مختلف خطوں میں موجود محافظین اسلام میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا ہے جہاں تک اس کی مدت ایجاد 20 سال سے زیادہ نہ ہونے کا تصور ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ترجمۃ القرآن کے فطری نام کی تغلیط کر کے اس کی جگہ ترجمۃ القرآن کی یہ انوکھی تعبیر 1417ھ میں اُس وقت سامنے آئی جب مجمع الملک فہد لطباعت المصحف الشریف نے مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ مع حاشیہ حافظ صلاح الدین یوسف شائع کیا اُس کی پیشانی پر لکھا گیا ”القرآن الکریم و ترجمۃ معانیہ الی اللغة الاردیہ“ اس کے علاوہ مذکورہ ادارہ مختلف زبانوں میں مترجم قرآن مجید شائع کر کے دُنیا بھر کے حجاج و زائرین میں تقسیم کر رہا ہے اُن سب میں ترجمۃ القرآن کی جگہ ترجمہ معانی القرآن لکھا جا رہا ہے اور دُنیا کی مختلف زبانوں میں اس کی اتنی تشہیر کی جا رہی ہے جس سے گوبلز کا شیطانی مقولہ ”جھوٹ اتنا بولو کہ سچ محسوس کیا جائے“ یاد آنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی کچھ جامعات بھی اس سے رنگ لے رہے ہیں۔ جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہمارے تجربہ میں یہ بھی آیا ہے کہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت اور اس کی شرائط اور احتیاطی تقاضوں سے ناواقف حضرات کی نظر میں یہ عام سی بات ہے جبکہ حقیقت میں التباس الحق بالباطل کی راہ ہے ترجمۃ القرآن کے فریضہ کو اُس کے فطری سانچے سے نکال کر مترجم کی اور اُس کی ذہنی ترجیح کے تابع کرنے کے مترادف ہے جس پر کل مکاتب فکر اہل اسلام کے اسلاف راضی ہیں نہ اخلاف کے اہل بصیرت، یہ جو کچھ میں نے لکھا میرے ضمیر کی آواز تھی، ایمان کا مقتضا تھا اور قرآن مجید کی

أصول ترجمہ

حفاظت کے حوالہ سے شرعی مسؤلیت تھی جس کا اظہار مجھ پر فرض تھا۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

اللهم انت تعلم ان هذا ليس الاجهد المقل لحق كلامك المجيد فتقبله بكرمك
واجعله وسيلة لفتح عيون بصيرة علماء الاسلام وانا على يقين بانه لا يغفر
الذنوب الا انت فاغفر لي ذنوبي كلها جلها ودقها ظاهرها وباطنها وما انت
اعلم به، وليس في شعوري فلك الحمد اولاً وآخر اظاهراً وباطناً

وصلی اللہ علی حبیبہ سید العلمین والہ السادات الطیبین الطاہرین
وصحابتہ الکاملین المکملین وعلی من اتبعہم الی یوم الدین بفضلک
وكرمک یا اکرم الاکرمین

وانا العبد الضعیف

پیر محمد چستی طریقہ و سلوکا، المسلم مذہباً، الحنفی

مسکنا، اچترالی مولذا، البشاوری مسکنا

خادم القرآن فی الجامعة الغوثیہ المعینیہ

فی بلدة بشاور پاکستان

یوم الجمعة: ۱۷: ۱۲: ۱۴۳۶ھ

وفق

2/10/2015



[Click For More Books](#)

[For More Books Madni Library Group Whatsapp +923139319528](#)

أصول تفسیر: اس کتاب میں اسلام اور کفر کے مابین حد فاصل سے دنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب جب سے چھپی ہے تب سے مختلف مکاتب فکر کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف کفر تقسیم کرنے کی مذموم روش میں کافی توقف آیا ہے، اس موضوع میں اولین، جامع اور سب کے لیے قابل تسلیم تصنیف ہونے کی بنا پر اسے عام مقبولیت حاصل ہے اور ہر مکتبہ فکر کے دارالافتاء کو اس کی ضرورت ہے گویا تکفیر کے لیے شرعی معیار کو سمجھنے کے حوالہ سے مسلمانوں کے کل مکاتب فکر کو اس کی ضرورت ہے جس وجہ سے اندرون ملک اور بیرون ملک اس کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

انفرا، والیہاد فی الاسلام: اس میں جہاد سے متعلق جو بھی گوشے ممکن تھے اُن سب کا احاطہ کیا گیا ہے اور فدائی حملوں کی شرعی حیثیت، اُس کی تاریخ اور اُس کی قسمیں اور ہر قسم کے شرعی احکام سے دُنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔ جسے پڑھنا اور سمجھنا دورِ حاضر کے ہر مسلمان کی ضرورت ہے نہ صرف اہل اسلام بلکہ غیر مسلم دانشوروں کے لیے مفید ہے کہ انہیں اسے پڑھنے کے بعد جہاد کے حوالہ سے اسلامی احکام تک رسائی ہو سکتی ہے تاکہ اس نام کو غلط استعمال کرنے والوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام کی جو بدنامی ہو رہی ہے اُس کا ازالہ ہو سکے۔

تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن: اس میں برصغیر پاک و ہند کے 34 مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم کا تقابلی موازنہ کیا گیا ہے لیکن اس کے تقابلی جائزہ پر تفسیر کا پہلو غالب ہے جس میں قرآن شریف کی متعدد آیات مقدسہ کی ایسی دلربا و دلکش اور اطمینان بخش تفسیر پیش کی گئی ہے جو کتب تفسیر کے ہزاروں صفحات میں نہیں ملتی جس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر تحقیق و تفسیر یقیناً و بدیہیات پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناقابل انکار ہے اور ہر بات باحوالہ ہے جس وجہ سے اسے تمام قرآنی علوم کا خزانہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

التوضیح الإجم فی شرح فصوص الحکم: موجودہ پُرفتن دور میں کہ جہاں دجل و فریب کو شریعت و طریقت بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، سلوک و عرفان کی ابجد سے بے خبر بُہال طریقت و سلوک کی راہ کو بدنام کر رہے ہیں، حقیقی مشائخ ناپید ہوتے جا رہے ہیں بالخصوص شیخ اکبر رحمہ اللہ کی تعلیمات کو سمجھنے کا ذوق رکھنے والے بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس صورتحال میں شیخ اکبر رحمہ اللہ کی سلوک و عرفان کے اسرار و رموز سے لبریز تحریر فصوص الحکم شریف کو سمجھنے کے لیے حضور شیخ المشائخ حضرت قبلہ پیر محمد چشتی رحمہ اللہ نے ”خطبہ فصوص الحکم“ کی توضیح و تشریح کرنے کا بیڑہ اس نیت سے اٹھایا کہ جہاں ایک طرف شیخ اکبر رحمہ اللہ کی اس مشہور تحریر کو سمجھنے کے لیے ”پیر کامل“ میسر آئے گا تو دوسری طرف سلوک و عرفان کی مکمل روح کو بھی شریعت مطہرہ کی روشنی میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

الکتبۃ النظارۃ

مسجد حضرت ابوالیوب انصاریؓ گھنٹہ گھر پشاور
0300-5893316 | 0335-8317496

مکتبہ اناجی

دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکتوت پشاور شہر
www.aawazehaq.org

Click For More Books

أصول تفسیر: اس کتاب میں اسلام اور کفر کے مابین حد فاصل سے دنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب جب سے چھپی ہے تب سے مختلف مکاتب فکر کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف کفر تقسیم کرنے کی مذموم روش میں کافی توقف آیا ہے، اس موضوع میں اولین، جامع اور سب کے لیے قابل تسلیم تصنیف ہونے کی بنا پر اسے عام مقبولیت حاصل ہے اور ہر مکتبہ فکر کے دارالافتاء کو اس کی ضرورت ہے گویا تکفیر کے لیے شرعی معیار کو سمجھنے کے حوالہ سے مسلمانوں کے کل مکاتب فکر کو اس کی ضرورت ہے جس وجہ سے اندرون ملک اور بیرون ملک اس کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

انفرا، والیہاد فی الاسلام: اس میں جہاد سے متعلق جو بھی گوشے ممکن تھے اُن سب کا احاطہ کیا گیا ہے اور فدائی حملوں کی شرعی حیثیت، اُس کی تاریخ اور اُس کی قسمیں اور ہر قسم کے شرعی احکام سے دُنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔ جسے پڑھنا اور سمجھنا دور حاضر کے ہر مسلمان کی ضرورت ہے نہ صرف اہل اسلام بلکہ غیر مسلم دانشوروں کے لیے مفید ہے کہ انہیں اسے پڑھنے کے بعد جہاد کے حوالہ سے اسلامی احکام تک رسائی ہو سکتی ہے تاکہ اس نام کو غلط استعمال کرنے والوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام کی جو بدنامی ہو رہی ہے اُس کا ازالہ ہو سکے۔

تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن: اس میں برصغیر پاک و ہند کے 34 مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم کا تقابلی موازنہ کیا گیا ہے لیکن اس کے تقابلی جائزہ پر تفسیر کا پہلو غالب ہے جس میں قرآن شریف کی متعدد آیات مقدسہ کی ایسی دلربا و دلکش اور اطمینان بخش تفسیر پیش کی گئی ہے جو کتب تفسیر کے ہزاروں صفحات میں نہیں ملتی جس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر تحقیق و تفسیر یقیناً و بدیہیات پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناقابل انکار ہے اور ہر بات باحوالہ ہے جس وجہ سے اسے تمام قرآنی علوم کا خزانہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

التوضیح الإجم فی شرح فصوص الحکم: موجودہ پُرفتن دور میں کہ جہاں دجل و فریب کو شریعت و طریقت بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، سلوک و عرفان کی ابجد سے بے خبر بُہال طریقت و سلوک کی راہ کو بدنام کر رہے ہیں، حقیقی مشائخ ناپید ہوتے جا رہے ہیں بالخصوص شیخ اکبر رحمہ اللہ کی تعلیمات کو سمجھنے کا ذوق رکھنے والے بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس صورتحال میں شیخ اکبر رحمہ اللہ کی سلوک و عرفان کے اسرار و رموز سے لبریز تحریر فصوص الحکم شریف کو سمجھنے کے لیے حضور شیخ المشائخ حضرت قبلہ پیر محمد چشتی رحمہ اللہ نے ”خطبہ فصوص الحکم“ کی توضیح و تشریح کرنے کا بیڑہ اس نیت سے اٹھایا کہ جہاں ایک طرف شیخ اکبر رحمہ اللہ کی اس مشہور تحریر کو سمجھنے کے لیے ”پیر کامل“ میسر آئے گا تو دوسری طرف سلوک و عرفان کی مکمل روح کو بھی شریعت مطہرہ کی روشنی میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

الْمَكْتَبَةُ النَّظَامِيَّةُ

مسجد حضرت ابوالیوب انصاریؓ گھنٹہ گھر پشاور
0300-5893316 | 0335-8317496

مکتبہ اہل حق

دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکتوت پشاور شہر
www.aawazehaq.org

Click For More Books

For More Books Madni Library Group Whatsapp +923139319528